گھر کے ہر فرد کے لیے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

بہار نمبر

مارچ 2014

نگرانِ اعلیٰ

معراج رسول

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی سے خوبصورت ملاقات

عنیزہ سید، نفعت سراج، نایاب جیلانی

و دیگر مشہور رائٹرز کی پُر بہار کاوشیں

مدیرۂ اعلیٰ: عذرا رسول

مدیرہ: انجم انصار .... معاون: آمنہ حماد

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ھاکی اسٹیڈیم کراچی

مستقل عنوانات



شعبہ اشتہارات

نیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789 نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

نمائندہ لاہور سید افراز علی نازش 0332-4214400 رانا اے حمید 0323-2895528

ماڈل: مہوش .... میک اپ: روز بیوٹی پارلر .... فوٹو گرافر: موسیٰ رضا



جلد 41 • شمارہ 12 • مارچ 2014 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •

پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجھے کچھ کہنا ہے......!

کسی بھی چھوٹے بچے کو کھلونا دے کر بہلا لیا جاتا ہے مگر کچھ ہی دنوں بعد وہ اس کھلونے سے بیزار...... اور کسی نئی چیز کی جانب راغب ہو جاتا ہے...... اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ پرانی چیزیں غیر اہم ہو جاتی ہیں اور نئی چیزوں میں دلچسپی بڑھتی جاتی ہے اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے کہ خوشی کوئی ایسا اسٹیشن نہیں ہے جہاں سفر رک جائے بلکہ درحقیقت یہ انداز سفر ہے۔ خوشی اگر کوئی منزل ہوتی تو ہم وہاں پہنچنے کے بعد آگے بڑھنے سے انکار کر دیتے لیکن خوشی نہ اسٹیشن ہے اور نہ منزل، خوشی تو مسافر کے انداز سفر کا نام ہے۔

کسی منزل کو پہنچ جانا اہم نہیں بلکہ اہم وہ جدوجہد ہے جو ہم کرتے ہیں۔ جب آپ ایک مقصد کی تکمیل کرتے ہیں تو پھر کرنے کے لیے کچھ اور باقی نہیں رہ جاتا، سوائے اس کے کہ اب اس سے زیادہ بہتر اور دلچسپ مقصد کا تعین کریں اور اس کی تکمیل کی جدوجہد شروع کریں اور اسی لیے زندگی کو جہد مسلسل کا نام دیا گیا ہے اور کامیابی وہ احساس ہے جو آپ کو دوران سفر ہوتا ہے، وہ احساس نہیں ہے جو منزل پر پہنچ کر ہوتا ہے۔ برنارڈ شاہ نے ایک مرتبہ کہا تھا۔ ''میں کامیابی سے دہشت زدہ رہتا ہوں۔ کامیاب ہو جانے کا مطلب ہے کہ میں نے دنیا میں اپنا کام تمام کر لیا ہے، بالکل اس نر مکڑے کی طرح جسے تخلیق کا عمل مکمل کرتے ہی اس کی مادہ ہلاک کر دیتی ہے۔ مجھے وہ زندگی پسند ہے جو جہد مسلسل سے رقم ہو اور جس میں ایک نا تمام مقصد ہمیشہ پیش نظر ہو۔'' اور آج آپ سے مجھے بھی یہی کہنا ہے کہ اپنے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر وقت ضائع کرنے سے یہ بہتر ہے کہ اپنے مقصد حیات کو سمجھیں، جانیں اور اس کی تکمیل میں لگ جائیں...... تو آپ کی زندگی جو بنجر و ویران بنی ہوئی ہے وہ آپ کی اس مثبت سوچ کے باعث گلزار بن جائے گی۔ انشاءاللہ!

مدیرہ
انجم انصار

(اے مسلمانو) تمہارا دوست تو صرف اللہ ہے اور اس کا (برگزیدہ) رسول اور وہ مسلمان جو (نہایت) خشوع کی حالت میں نماز پڑھا کرتے ہیں اور زکوۃ دیا کرتے ہیں (۵۵) اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں سے دوستی کرے گا تو (وہ اللہ کے گروہ میں داخل ہو جائے گا اور) بے شک اللہ ہی کا گروہ غالب (رہتا) ہے (۵۶) اے مسلمانو جن لوگوں نے تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل بنا رکھا ہے یعنی وہ لوگ جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے اور کافر، انہیں اپنا دوست نہ بناؤ اور اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو اگر تم ایمان دار ہو (۵۷) اور (ان لوگوں کی شرارت یہاں تک ہے کہ) جب تم نماز کی طرف (لوگوں کو) بلاتے ہو (یعنی اذان دیتے ہو تو) وہ اس سے ہنسی کھیل کرتے ہیں یہ (صرف) اس سبب سے کہ وہ بے عقل لوگ ہیں (۵۸) آپ ﷺ کہہ دو کہ اے کتاب والو تم ہم پر سوا اس کے کیا عیب لگاتے ہو کہ ہم اللہ پر اور اس کتاب پر جو ہماری طرف نازل کی گئی اور اس پر جو (ہم سے) پہلے نازل کی گئی تھی ایمان لے آئے ہیں اور بے شک تمہارے بہت لوگ بدکار ہیں (۵۹) (اے نبی ﷺ ان سے) کہہ دو کہ کیا تمہیں اللہ کے نزدیک بہ اعتبار جزا کے اس سے زیادہ برے شخص کی (جسے تم برا کہتے ہو) خبر دوں (لو اچھا سنو) جسے اللہ لعنت کرے اور اس پر غصہ ہو اور ان میں سے (بعض کو) بندر اور سور بنا دیا ہو اور اس نے طاغوت کی پرستش کی ہو یہی لوگ بہ اعتبار مرتبے کے بہت برے اور راہ راست سے بہت گمراہ ہیں (۶۰) اور جب تمہارے پاس آتے ہیں (تو) کہتے ہیں ہم ایمان لائے ہیں حالانکہ وہ بے شک کفر کے ساتھ (تمہارے پاس) داخل ہوئے تھے اور وہ کفر (ہی) کے ساتھ (تمہارے پاس سے) نکل کر گئے اور اللہ اس چیز کو جسے وہ چھپاتے ہیں خوب جانتا ہے (۶۱)

(سورۂ مائدہ آیت نمبر ۵۵ تا ۶۱)



سیدنا حامد ﷺ

۷۔ حضرت ابن مسعودؓ سے منقول ہے کہ رسول کریم ﷺ کی انگشت مبارک سے پانی کے چشمے جاری ہوتے ہوئے ہم نے دیکھے اور یہ بھی ہم نے دیکھا کہ کھاتے وقت کھانا بھی تسبیح کرتا تھا۔ (بخاری)

۸۔ آنحضرت ﷺ تمام احیان میں (کھڑے ہو کر، بیٹھے ہوئے، کروٹ پر لیٹے ہوئے) اللہ کا ذکر فرماتے تھے۔ (مسلم)

۳۔ الرائے:

۱: پھیلتی ہوئی ریاست کے انتظام و دیکھ بھال، اس کے بے شمار فرائض، جس کے صرف آپ ﷺ تنہا ہی رہنما تھے۔ یہ آپ ﷺ کی زبردست طاقت، قوت اور ذہنی بصارت کی وجہ سے ممکن ہوا کہ آپ ﷺ کسی سے مغلوب نہ ہوئے۔ ان تمام باتوں سے آپ ﷺ کے روحانی جوش و خروش، خدا سے بے پناہ عقیدت اور اپنے مقصد سے محبت میں فرق نہ آیا۔ اپنی حکمرانی کے اتنے سالوں بعد بھی وہ مکمل سچ کے ساتھ یہ کہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

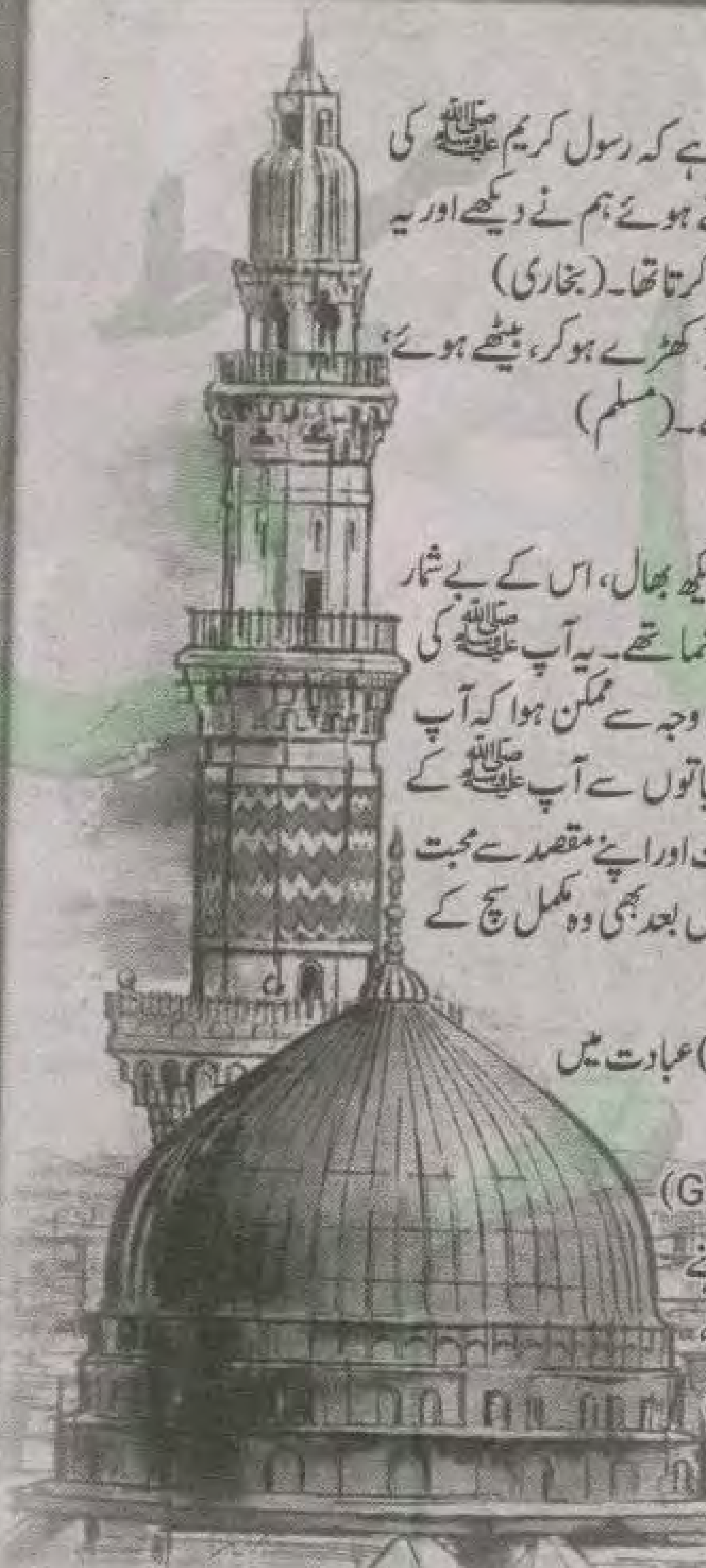
"میری سب سے بڑی خوشی (سکون) عبادت میں ہے۔" (ڈرے کاٹ)

(G, M Dray cott Mahomet,1916)

۲: آنحضرت ﷺ اکثر خاموش رہنے والے بکثرت اللہ کا ذکر کرنے والے، لغویات سے دور، بہترین عقل اور بہترین رائے والے تھے۔

(فرنچ پروفیسر سیڈیو)

(قیصرہ حیات کی کتاب 'انوار اسماء النبی ﷺ')





امانت

رفعت سراج قسط 15

لہو سے سینچنے پڑتے ہیں برگ و بار کے موسم
بظاہر یوں لگا دینا شجر آسان کتنا ہے
جنہوں نے دھوپ کی دشواریاں جھیلیں بتائیں گے
بدن پر سایۂ دیوار و در آسان کتنا ہے
شکستِ خاک سے لے کر نمو یابی کے منظر تک
ذرا دشوار ہے رستہ مگر آسان کتنا ہے

بات ایک امانت ہے، ذات ایک امانت ہے عفت ایک امانت ہے، زندگی خدا کی امانت ہے، زمین کے وجود پر سورج کی روشنی امانت ہے، تاروں کا نور ...... چاند کی چاندنی امانت...... امانت کو خیانت سے بدل دیا جائے تو چہار سو اندھیروں کا راج ہے۔ اسی اندھیرے میں امانت کی تابانیاں پھر سے روشنی کی کرنیں بکھیرتے ہوئے چہار سو اجالا کردیتی ہیں۔

امانت و خیانت کو واضح کرتی ایک پُردرد مگر خوب صورت تحریر

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ڈاکٹر مہر جان نیورو سرجن تھیں۔ اپنی بہن گل جان اور بیٹیوں رابعہ اور رومانہ کے لیے ایک سخت گیر بہن اور ماں تھیں۔ وہ ہر کسی کو شک کی نگاہ سے دیکھتی تھیں...... اصیل خان ان کے گھر کا ایک ملازم اور معتمد خاص تھا۔ کائناز اپنے دادا شاہ عالم کے ساتھ ڈاکٹر مہر جان کے پڑوس میں رہتی ہے وہ اور روما بیسٹ فرینڈز ہیں۔ ایس پی شاہ زمان خان، جابر علی کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے اس کی بیٹی کی شادی کے لیے اپنے ایک شریک کاروبار وارث علی کا رشتہ دیتا ہے جو برہان کو ناقابلِ قبول ہوتا ہے۔ گل جان، رابی کو مہر جان کی دی ہوئی ساڑی دیتی ہے کہ وہ تیار ہو جائے۔ کائناز کہتی ہے تو شاہ عالم اسے روما کے گھر لے جاتا ہے۔ صابرہ کی برہان سے بات ہوتی ہے تو وہ کائناز کے بارے میں پوچھتی ہے۔ سہراب خان رابی کی شکل دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے۔ رابی، شاہ عالم کے ساتھ ان کے گھر چلی جاتی ہے۔ مہر جان ایک بار پھر آئی سی یو میں داخل ہو گئی تھیں۔ صابرہ بالآخر ستارہ کو بتاتی ہے کہ شادی اس کی ہو رہی ہے۔ مہر جان کو ہوش آتا ہے تو گل جان کو پتا چلتا ہے کہ ان کا ذہن ماضی کی باتیں یاد کر رہا ہے اور وہ حال کو فراموش کر چکی ہیں۔ گل جان، شاہ عالم کو بتاتی ہے کہ وہ مہر جان کا علاج نہیں کرائے گی اور وہ روما کو بھی کچھ دن کے لیے اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دے دیں جس پر شاہ عالم کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ صابرہ، ستارہ کی رخصتی کے بعد بہت روتی ہے کہ ستارہ یہ کہہ کر گئی ہے کہ وہ اب کبھی اس گھر میں نہیں آئے گی۔ روما فکر مند ہوتی ہے کہ وہ کب تک مہر جان کے سامنے نہیں جائے گی۔ وارث علی اپنی بیوی ستارہ کے انداز دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے وہ بغیر کسی جھجک یا گھبراہٹ کے وارث علی سے بات چیت کر رہی تھی۔ ستارہ، برہان کو فون کر کے بتاتی ہے کہ شبینہ کی جگہ اس کی شادی ہوگئی ہے اور وہ اس سے ملنے اس کے گھر آ سکتا ہے۔ گل جان، مہر جان کو اکیلا نہیں چھوڑتی ان کے ہی کمرے میں لیٹ کر ماضی میں گم ہو جاتی ہے جب وہ مہر جان سے کہتی ہے کہ اسے لگتا ہے کہ وہ اصیل خان سے محبت نہیں کرتی۔ مہر جان اس بات کی نفی کرتی ہے۔ برہان، ستارہ سے ملنے اس کے گھر جاتا ہے تو فون کر کے وارث علی سے ایڈریس سمجھتا ہے وارث علی برہان کی آمد سے تھوڑا پریشان ہو جاتا ہے۔ ستارہ، برہان کو بتاتی ہے کہ اب وہ اس گھر میں کبھی نہیں جائے گی۔ برہان اسے سمجھاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہر مشکل میں وہ اس کے ساتھ ہے۔ صابرہ، ستارہ سے ملنے کے لیے بے چین ہوتی ہے۔ جابر علی، ایس پی سے ولیمے کی بابت دریافت کرتا ہے تو وہ اسے جھوٹی تسلیاں دے کر مطمئن کر دیتا ہے۔ رابی، برہان کو دیکھ کر سوچ میں پڑ جاتی ہے کہ وہ کون ہے۔ روما، شاہ عالم کے گھر آجاتی ہے۔ کائناز اسے پڑھنے کے لیے بلاتی ہے تو وہ اگلے دن سے پڑھنے کا کہتی ہے۔ جابر علی، ستارہ کے گھر آتا ہے تو وہ اسے ملے بغیر نوکر سے ایک پرچہ بھجوا دیتی ہے جس میں وہ لکھتی ہے کہ وہ سمجھ لے کہ ستارہ مر چکی ہے۔ اب وہ کبھی اس سے نہیں ملے گی۔ جابر علی سے اپنی یہ بے عزتی ہضم نہیں ہوتی اسے چپ لگ جاتی ہے۔ شاہ عالم، اصیل خان سے رابی اور روما کے والد کے بارے میں دریافت کرتے ہیں لیکن اصیل خان کو مشکل میں دیکھ کر بتانے پر اصرار نہیں کیا۔ ستارہ، وارث علی سے کہتی ہے کہ اگر ڈرائیور اپنی بیوی کو اپنے ساتھ ہی لے آئے تو اسے آسانی ہو جائے گی۔ جابر علی کی خاموشی صابرہ کے لیے بہت پریشان کن تھی۔ کانسٹیبل جابر علی کو ریڈ کرنے سے منع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ علاقہ وارث علی کا ہے۔ ایس پی، جابر علی کو منع کرتا ہے لیکن جابر علی کہتا ہے کہ جو آرڈر اسے ملا ہے وہ اس پر عمل ضرور کرے گا۔ ایس پی شاہ زمان، وارث علی کو جابر علی کے ارادوں کے بارے میں بتاتا ہے۔ مہر جان سرونٹ کوارٹر میں جاتی ہے اور اصیل خان کو دیکھ کر اس سے پوچھتی ہیں کہ وہ کون ہے۔ اصیل خان، مہر جان کو جواب دینے کے بجائے نماز کی نیت باندھ لیتا ہے۔ ستارہ، وارث علی کی بات پر حیران رہ جاتی ہے۔ جابر علی ستارہ سے اپنے ساتھ چلنے کو کہتا ہے تو وہ منع کر دیتی ہے۔ ستارہ منع کرتی ہے تو جابر علی ستارہ کو گولی مار دیتا ہے۔ صابرہ فکر مند ہوتی ہے کہ جابر علی بغیر ناشتے کے کہاں چلا گیا ہے۔ وارث علی...... جابر علی کے اس عمل پر حیران ہوتا ہے اور گرفتاری سے ڈراتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ وہ اپنی گرفتاری کا انتظار کر رہا ہے۔ برہان کو خبر ملتی ہے تو وہ فوراً اپنے گھر پہنچتا ہے۔ برہان، کائناز کو پڑھانے نہیں آتا اور نہ کوئی فون کرتا ہے تو شاہ عالم خود فون کرتے ہیں تو موبائل آف ملتا ہے۔ مہر جان، اصیل خان کو پہچانتی نہیں ہے اور اس سے پوچھتی ہے کہ وہ کون ہے اور اسے کس نے رکھا...... ایس پی شاہ زمان، جابر علی سے کہتا ہے کہ وہ مجسٹریٹ کے سامنے وارث علی کا نام نہ لے لیکن جابر علی اس کی بات ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ شاہ عالم اخبار میں لگی خبر میں برہان کا نام پڑھ کر چونکتے ہیں برہان، شاہ عالم کا فون دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ شبینہ، فائزہ کو بتاتی ہے کہ برہان اسپتال میں ہے کیونکہ ابھی ستارہ کا پوسٹ مارٹم نہیں ہوا۔

اب آگے پڑھیں

برہان اپنے کمرے میں آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ سیل فون اس کے ہاتھ میں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی خیال میں اس بری طرح کھو چکا ہے کہ اسے وقت اور آس پاس کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ اس کے دماغ میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں، وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اسپتال سے آیا تھا۔

ستارہ کی لاش کا پوسٹ مارٹم ابھی تک نہیں ہوا تھا...... مگر اسے زندگی کا ایک نیا تجربہ ہوا تھا...... اپنے بہت بڑے دکھ کو سوچتے سوچتے اسپتال پہنچا تو اسے پتا چلا کہ وہ اس دنیا میں اکیلا دکھی اور آزمائشی دور سے گزرنے والا نہیں...... پوسٹ مارٹم کے لیے خدا جانے کتنی لاشیں آئی ہوئی تھیں اور ہر لاش اپنی جگہ ایک کہانی تھی۔ ایک رشتہ تھی، ایک تعلق تھا ایک روح کا لباس تھا۔ وہ روح جو دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے رشتوں میں الجھی ہوئی تھی...... اپنی زندگی کے مختلف کرداروں سے کھیل رہی تھی۔

زندگی کا کھیل شاید کسی گہرے کنویں کے آس پاس ہی ہوتا رہتا ہے۔ بس کھیلتے کھیلتے پاؤں پھسلا اور انسان تاریک کنویں کے اندر گرتا چلا گیا۔ کنواں بھی اتنا گہرا اور تاریک کہ جھانک کر دیکھو تو خوف سے جھرجھری آجائے۔

وہ نہ جانے کب تک اسی طرح خیالات میں کھویا رہتا کہ اسے اچانک کائناز اور شاہ عالم کا خیال آیا اور یاد آیا کہ شاہ عالم نے اسے کئی مرتبہ فون ٹرائی کیا تھا اور وہ ابھی تک ان سے بات نہیں کر پایا۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے تمام سوئے ہوئے حواس جاگ اٹھے، اس نے جلدی سے موبائل کی طرف دیکھا ایک لمحے سوچا اور شاہ عالم کا نمبر پریس کرنے لگا، نمبر پریس کرنے کے بعد اس نے فون کان سے لگایا رنگ جا رہی تھی۔ بیل کی آواز اس کے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ ہونے لگی۔ اس کا دل جیسے موبائل میں جا کر دھڑکنے لگا۔ بہر حال اس کی کال ریسیو ہوئی اور شاہ عالم کی پُر وقار آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”السلام علیکم......!“ برہان جلدی سے سنبھل گیا اور بڑی آہستہ آواز میں گویا ہوا۔

”وعلیکم اسلام...... کیسے ہیں شاہ صاحب؟“

”بیٹا...... یہ تو مجھے آپ سے پوچھنا ہے، کوئی خیر خبر نہیں ہے آپ کی۔“ شاہ عالم بہت محبت اور اپنائیت سے کہہ رہے تھے۔

برہان کو سمجھ نہیں آئی کہ اب وہ ان کی بات کے جواب میں کیا بولے۔

”میں خیریت سے ہوں شاہ صاحب، آپ کو...... اس لیے فون کیا ہے کہ...... آپ لوگ میرا مطلب ہے کہ آپ اور کائناز اب میرا انتظار مت کیجیے گا۔“

”کیا مطلب......؟“ شاہ عالم یوں چونک کر گویا ہوئے جیسے برہان نے کوئی دھماکا کر دیا ہو۔

”شاہ صاحب بات یہ ہے کہ میں ایسے ضروری کاموں میں پھنس گیا ہوں کہ مجھے ٹیوشن کے لیے وقت نکالنا بہت مشکل لگ رہا ہے۔“ برہان نے جیسے اپنی ساری قوت مجتمع کر کے ایک فیصلہ سنایا تھا لیکن دوسری جانب اس کی بات کو فیصلہ نہیں سمجھا گیا۔ صرف ایک بات کے طور پر سنا گیا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہو بیٹا؟“ شاہ عالم اسی شفیق انداز میں کہہ رہے تھے۔ ”آپ کے لیے اگر...... کوئی اور وقت مناسب ہے تو ہم تعاون کرنے کے لیے تیار نہیں...... ایک بار آپ ہم سے ملیں تو سہی۔“ شاہ عالم یوں بات کر رہے تھے جیسے انہوں نے صبح سے بس صرف یہی کچھ سوچا تھا۔ کوئی اخبار نہیں پڑھا کوئی خبر نہیں پڑھی کچھ بھی نہیں ہوا۔ صبح ہوئی پھر شام ہوگئی۔ وہ چاہ رہے تھے کہ برہان خود سے کچھ بولے۔ انہیں اچھا نہیں لگا کہ

برہان سے کہیں کہ بیٹا اخبار میں ایک خبر لگی ہے کہیں اس کا تعلق تم سے تو نہیں۔

برہان، شاہ صاحب کی بات سن کر پھر جیسے سوچ میں پڑ گیا کہ آخر اس باب کو کیسے بند کرے۔ یہ چیپٹر کیسے کلوز ہوگا...... آخر وہ شاہ عالم کو کس طرح سمجھائے کہ اب وہ اپنے فرائض کی ادائیگی سے قاصر ہے کیونکہ وہ ذہنی طور پر اس طرح الجھا ہوا ہے کہ اپنے کام پر توجہ نہیں دے سکے گا...... بلکہ کام کا حق ادا نہیں کر سکے گا۔

"کیا سوچنے لگے بیٹا؟ میں آپ سے یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر آپ کو یہ ٹائم سوٹ نہیں کرتا تو آپ کوئی اور ٹائم رکھ لیں...... کیونکہ ہمارے لیے کسی اور بلکہ کسی نئے ٹیوٹر کا بندوبست کرنا کچھ اتنا آسان نہیں ہے...... بیٹا آپ سمجھتے ہیں ناں بچی کا معاملہ ہے۔ ہر بندے کے سامنے اسے نہیں بٹھایا جا سکتا۔ آپ پر بڑا بھروسا ہے، اعتبار ہے بلکہ یوں سمجھیں کہ آپ تو ہمارے دل میں بس گئے ہیں۔ وہ جو ایک اندھا اعتبار ہوتا ہے ناں بس اسی اعتبار کا رشتہ قائم ہو گیا ہے آپ کے ساتھ۔" شاہ عالم بظاہر عام سے انداز میں اپنی بات کر رہے تھے حالانکہ ان کے تمام حواس برہان کی طرف سے کچھ سننے کے منتظر تھے آخر وہ کب بولے گا...... کچھ تو بولے کہ اخبار میں چھپنے والی وہ خبر اس برہان سے تعلق نہیں رکھتی...... وہ کوئی اور برہان ہے۔

"شاہ صاحب بات یہ ہے کہ میری بہن کی ڈیتھ ہو گئی ہے اور آپ کو پتا ہے گھر میں جب ڈیتھ ہو جاتی ہے تو تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ امی کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ آنے جانے والوں کے ساتھ سلام دعا کرنے کے بھی قابل نہیں ہیں اب ظاہر ہے یہ ذمّے داری مجھے ہی پوری کرنی ہے۔" برہان کو آخر کار ایک مناسب جواب سوجھ ہی گیا اور اس جواب میں شاہ عالم کے لیے بہت بڑی اطلاع بھی تھی۔ ان کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

"ہاں اخبار میں تو کسی لڑکی کے قتل کا ذکر ہے۔ کیا وہ...... لڑکی اسی برہان کی بہن ہے۔" سوال ذہن میں تو آیا پر ہونٹوں تک نہ آسکا کیونکہ ڈیتھ کی خبر سُنی اس لیے تعزیتی کلمات تو کہنے ضروری تھے۔

"بہت دکھ ہوا بیٹا! آپ سے اتنی دیر سے بات ہو رہی تھی۔ آپ نے اتنی اہم خبر اب سنائی۔ آپ بس یہی کہہ دیتے...... شاہ صاحب میری بہن کی ڈیتھ ہو گئی ہے، اس لیے معذرت...... آگے کا پھر ہم خود سوچ لیتے کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔ بہر حال بہت افسوس ہوا۔ کیا آپ کی بہن کی طبیعت ناساز تھی۔ اسپتال میں ایڈمٹ تھیں؟" شاہ صاحب اپنی فطرت کے خلاف انجان بننے پر مجبور تھے۔ حالانکہ جی تو چاہتا تھا کہ سیدھے پوچھ لیں کہ وہ صبح اخبار میں جو خبر لگی ہے، وہ آپ کے گھرانے کے بارے میں تو نہیں ہے لیکن ان کی طبیعت اور وضع داری اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

"شاہ صاحب میری بہن بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ میں آپ سے زیادہ گھما پھرا کر بات کر ہی نہیں سکتا۔ بس یوں سمجھیں کہ اتنی دیر سے ہمت کر رہا تھا کہ آپ کو بتا دوں کہ میری بہن کا مرڈر ہو گیا ہے اور مرڈر بھی میرے باپ کے ہاتھوں ہوا ہے۔"

شاہ صاحب نے جب یہ سنا تو انہیں یوں لگا کہ جیسے روح نے اذیت کا سلگتا ہوا لبادہ اوڑھ لیا ہو۔ کسی طرف سے راہِ نجات نہ ہو...... سر سے پاؤں تک ایک جیسی آنچ ہو۔

"بیٹا یہ تو بہت بڑا حادثہ ہے۔" انہوں نے بہ مشکل کہا تھا کہ اب بھی ان کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ کہیں ہاں میں نے اس قسم کی کوئی خبر پڑھی تھی۔

"جی شاہ صاحب! ہم تو کھڑے کھڑے زندہ دفن ہو گئے۔ بس یوں سمجھیں کہ اب تو صرف ایک ہی کام

یاد ہے اور وہ یہ کہ کسی کونے میں بیٹھ کر اپنی بدنصیبی کا ماتم کرتے رہیں اور تو کچھ کرنے کے قابل نہیں ہیں۔" برہان آخر کار بول پڑا وہ تمام لفظ اس کی زبان سے ادا ہو گئے جنہیں ادا کرنے کے لیے پیش بندی کر رہا تھا۔ بڑے حساب کتاب کر رہا تھا، ایک لفظ منہ سے نکلا تو سارے لفظ اس کے تعاقب میں یوں بھاگے جیسے وہ کوئی راہِ نجات ڈھونڈ رہے تھے۔

"ایسی باتیں نہ کریں بیٹا...میں تو یہ سن کر چکرا کر رہ گیا ہوں۔ اس وقت تو مجھے بالکل سمجھ نہیں آرہی تھی کہ میں آپ سے کیا کہوں۔ بہر حال آپ کے گھر آنا چاہوں گا...... تاکہ آپ کے سامنے بیٹھ کر آپ کا غم بانٹنے کی کوشش کروں اور میں بوڑھا کمزور انسان کیا کر سکتا ہوں...... بیٹا مجھے اس وقت کچھ سمجھ نہیں آرہی۔" شاہ صاحب کی آواز کی لرزش بتا رہی تھی کہ اس وقت ان کے اعصاب جواب دے رہے تھے۔

"شاہ صاحب آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں، ہونے والی بات تو ہو گئی......" برہان نے بہر حال کہا تھا۔

"نہیں بیٹا......! آپ ہمارے گھر آرہے تھے ہم بہت خوش تھے بلکہ خوش ہیں کہ ایک تعلق بن گیا تھا اور جب انسان ایک دوسرے سے تعلق بنا لیتے ہیں تو خوشی اور غمی کے موقع پر انہیں ایک دوسرے کے سامنے بھی نظر آنا چاہیے، یہ انسانیت کے اصول ہیں۔"

"چھوڑیں شاہ صاحب! انسانیت کے اصول بڑے اجنبی سے لگ رہے ہیں یہ الفاظ۔" برہان برجستہ اور بے ساختہ بولا تھا اس کے لہجے کا کرب فون کے ساتھ شاہ صاحب کی شریانوں میں بھی دوڑنے لگا۔

"بیٹا کسی اور وجہ سے آپ منع کر رہے ہیں تو یہ دوسری بات ہے لیکن میں آپ سے اصرار کرتا ہوں کہ آپ اپنے گھر کا ایڈریس دے دیجیے تاکہ میں سہولت سے آپ کے پاس پہنچ جاؤں۔ بیٹا اگر میں آپ سے نہیں مل سکا تو یقین کریں میں کچھ بھی نہیں کر سکوں گا۔ ایک عجیب سی بے کلی لاحق ہو گئی ہے۔ آپ سے ملے بغیر وہ دور نہیں ہو سکے گی۔" شاہ صاحب کے انداز میں اصرار بھی تھا اور دباؤ بھی۔ برہان اس دباؤ کو برداشت کرنے کی قوت کھو چکا تھا کیونکہ اس کے اعصاب شل تھے۔

"ٹھیک ہے شاہ صاحب، میں کوشش کرتا ہوں کہ آپ کو ایڈریس سمجھا سکوں۔ یقین کیجیے یوں لگ رہا ہے جیسے میری تو بولنے کی طاقت بھی ختم ہوتی جا رہی ہو۔" برہان کے لہجے میں عجیب شکستگی جھلک رہی تھی۔ شاہ عالم کے انسان دوست مزاج پر یہ شکستگی بہت بوجھل تھی بہت بڑا بار تھی۔

"آپ سینڈ کر دیجیے...... میں جانتا ہوں کہ آپ اس وقت بہت تھکے ہوئے ہوں گے۔ میں چاہوں گا کہ جب آپ تھوڑا سا آرام کر لیں تو میں آپ کی والدہ کے پاس تعزیت کے لیے آؤں۔" شاہ صاحب کے لہجے میں دکھ کی شدت اپنے کمال پر تھی...... وہ تو خود بات کرنے کے قابل نہیں تھے بڑی مشکل سے بول رہے تھے۔

"ٹھیک ہے شاہ صاحب، فون کرنے کا بہت بہت شکریہ...... اللہ حافظ۔" برہان نے اتنا کہا اور موبائل بند کر دیا اور دوبارہ کرسی کی ٹیک سے پشت لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے وہ سکون کی تلاش میں اضطراب سے گزر رہا تھا۔

شاہ عالم برہان سے بات کرنے کے بعد سکتے کی کیفیت میں اپنی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ جنبش محال تھی۔ وہ اٹھنا چاہتے تھے، تھوڑی سی چہل قدمی کرنا چاہتے تھے لیکن ایک اضطراب سا لاحق ہو گیا تھا۔ عجیب سی بے چینی...... ایسی بے چینی کہ ذہن کسی کام کی طرف متوجہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

☆☆☆

رابی اپنی دُھن میں باہر لان تک آئی تھی۔ یہ سوچ کر کہ تھوڑی دیر چہل قدمی کر کے اپنے ذہن کو ادھر اُدھر کرے...... بند کمرے میں تو یوں لگتا تھا کہ قیامت تک کی سوچیں کمرے میں قید ہوگئی اور ان کا وحشیانہ رقص اس کے اردگرد ہو رہا ہے وہ جس طرف دیکھتی ہے نئی سوچ کا راستہ بند ملتا ہے۔ بس انہی الٹے سیدھے خیالات سے گھبرا کر وہ باہر آئی تھی۔ شاہ صاحب پر نظر پڑتے ہی اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ وہ جب سے اس گھر میں آئی تھی، شاہ صاحب کو اس کیفیت میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شاہ صاحب کی پیشانی کی رگیں ابھر چکی تھیں اور اُبھری لکیریں بہت دور سے دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ ایک statue کے مانند دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھے بیٹھے تھے۔ دور سے دیکھنے والے کو یہ گمان ہوتا تھا جیسے وہ مراقبہ کر رہے ہوں۔ ان کی یہ کیفیت دیکھ کر رابی دیوانہ وار بھاگ کر ان کے پاس آئی تھی۔

''دادا جان! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے، آپ اس طرح کیوں بیٹھے ہیں؟'' رابی کی آواز گویا عیسیٰ کا قُم تھی۔ شاہ صاحب کے وجود میں جیسے زندگی دوڑ گئی۔ انہوں نے پلکیں اٹھا کر رابی کی طرف دیکھا اور زبردستی مسکرائے۔

''کچھ نہیں بیٹا بس...... ویسے ہی کچھ سوچ رہا تھا۔''

''ایسا کیا سوچ رہے تھے دادا جان...... یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی بت بیٹھا ہے۔ پہلے میں نے دور سے دیکھا تو خیال آیا کہ شاید آپ بیٹھ کر نماز پڑھ رہے ہیں پھر سوچا یہ نماز کا انداز تو نہیں ہے...... میں ڈر گئی کہ کہیں آپ کی طبیعت نہ خراب ہوگئی ہو۔ شاید آپ سے اٹھا نہیں جا رہا۔ اس لیے آپ کے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر ہیں۔'' رابی بڑے غور سے شاہ صاحب کے چہرے کے تاثرات سے کچھ اخذ کرنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔

''ارے نہیں بیٹا...... بس ایک بڑی افسوس ناک خبر آئی اور ذہن پتا نہیں کہاں سے کہاں دوڑیں لگانے لگا۔''

''افسوس ناک خبر......؟'' رابی نے چونک کر شاہ صاحب کی طرف دیکھا۔

''جی بیٹا......؟ کائناز کو پڑھانے جو سر آرہے تھے اُن کے ساتھ بڑی ٹریجڈی ہوگئی ہے۔ میری تو عقل حیران ہے اتنا نفیس اور اتنا قابل بچہ...... اس کا بیک گراؤنڈ بہت ستھرا، اجلا محسوس ہوتا تھا لیکن باپ نے...... اپنی ہی بیٹی کا مرڈر کر دیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ...... ایسا کیا ہوگیا تھا۔ بیٹا، قتل کوئی معمولی واقعہ نہیں ہوتا اور وہ بھی بیٹی کا اپنے باپ کے ہاتھوں قتل۔'' شاہ صاحب بول رہے تھے اور رابی حیرت اور صدمے کی کیفیت میں پتھر بن کر شاہ صاحب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی تو اپنی گویائی جواب دے چکی تھی۔ حالانکہ وہ تو بے تحاشا سوال کرنا چاہتی تھی۔ شاہ صاحب کی بات سنتے ہی لاتعداد سوال اس کے دماغ میں آندھیوں کی طرح ٹکرانے لگے تھے مگر وہ کچھ بول ہی نہیں پا رہی تھی۔

''بیٹا آپ بیٹھ جائیں۔'' شاہ صاحب نے اس کی کیفیت دیکھی اور سنگی بینچ پر اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ رابی شاہ صاحب کی آواز سے جیسے گہری نیند سے جاگ گئی اور جلدی سے ان کے برابر بیٹھ گئی اور بڑی بے ساختگی اور غیر ارادی طور پر شاہ صاحب کے بازو پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے۔

''دادا جان! وہ جو سر کائناز کو پڑھانے آرہے تھے۔ وہ جنہیں میں نے کل بھی دیکھا تھا نہیں شاید...... پرسوں؟'' رابی اپنے حافظے پر زور ڈالنے لگی۔

''ہاں، ہاں بیٹا کائناز کو ابھی تک ایک ہی سر نے ٹیوشن دی ہے۔''

''وہ سر، ان کی بہن کا مرڈر ہوگیا ہے؟ وہ بھی ان کے فادر کے ہاتھوں...؟'' رابی کی خوف سے جیسے گھگی سی بندھنے لگی۔ چونکہ خبروں کی حد تک تو یہ برداشت ہوتا تھا لیکن اپنے ملنے جلنے والوں میں ایسا حادثہ پہلی

مرتبہ اس نے زندگی میں سنا تھا۔ اس کے تو ہاتھ ٹھنڈے برف ہوگئے اور چہرے پر سرخی کے بجائے سفیدی ظاہر ہونے لگی۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے مگر الفاظ گم تھے۔

شاہ صاحب نے بہ مشکل خود کو سنبھالا۔ زندگی کے تجربے کی لاٹھی کو پکڑا...... چونکہ اس لاٹھی سے انسان حوصلہ بھی پکڑتا ہے پھر رابی کے سر پر ہاتھ رکھ کر گویا اسے تسلی دی کہ وہ اپنے آپ کو سنبھالے۔

''بیٹا آپ اپنے حصے میں آئی تکلیف کو سب سے بڑا سمجھ رہی تھیں ناں...... اب یہ دیکھیں کہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا...... میں اس شریف گھرانے کے دکھ کو محسوس کر رہا ہوں۔ اس گھرانے کا ایک ہونہار بچہ...... جس کا مستقبل داؤ پر لگ گیا ہے جو بغیر جرم کے ذلت کی آخری حدوں سے گزر رہا ہے۔ دکھ سے میرا کلیجا پھٹنے لگا ہے۔''

''دادا جان! سچ مجھے تو سن کر اتنا دکھ ہو رہا ہے کہ سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ یہ سب کچھ سن کر مجھے کیا کہنا چاہیے...... کوئی لفظ ہی نہیں میرے پاس۔'' شاہ صاحب کی بات سن کر رابی نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔

''ہاں بیٹا...... اچانک کالی آندھی آجائے اور سوتے میں آجائے یا......''

''گہری نیند لگتے ہی سیلاب کا ریلا آجائے اور......'' رابی نے سہمے سہمے انداز میں کہا اور بغیر سوچے سمجھے شاہ صاحب کے کندھے سے اپنا سر یوں ٹکا دیا...... جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت لگتا ہے۔ شاہ صاحب کے وجود کو محسوس کر کے وہ کسی خوف کو دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

شاہ صاحب کے ہونٹ ایک دوسرے میں یوں پیوست ہو چکے تھے کہ دیکھنے والے کو لگتا تھا کہ اب وہ بصد اصرار بھی ایک لفظ نہیں بولیں گے۔

☆☆☆

''بابا جان! بابا جان!'' مہرجان وحشت زدہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی اپنے مرحوم باپ کو صدائیں دے رہی تھیں۔ کئی مرتبہ وہ بابا جان کہہ کر آخر تھک کر ایک دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئیں اور تھکے تھکے لہجے میں گویا ہوئیں آواز خاصی مدھم تھی...... ''بابا جان آپ کہاں ہیں۔ میں آپ کو آواز دے رہی ہوں آپ سنتے کیوں نہیں؟''

اسی وقت گل جان ان کی آواز کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں تک آگئی تھی۔ مہرجان کے پاس آکر جیسے اس نے سکون کی سانس لی کیونکہ وہ مہرجان کی تلاش میں اِدھر اُدھر چکراتی پھر رہی تھی۔ پھر وہ مہرجان کے پاس جا کر آہستہ آواز میں گویا ہوئی تھی۔

''بی بی جان! بابا تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔ آپ آرام کریں، آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''تم چھوڑو مجھے!'' مہرجان نے فوراً گل جان کی گرفت سے خود کو آزاد کرانے کی کوشش کی...... مگر گل جان کی گرفت کافی مضبوط تھی کیونکہ وہ مہرجان کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے ہر طرح کی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھی۔

''بی بی جان میں کہہ رہی ہوں ناں بابا جان ابھی گھر پر نہیں ہیں۔''

''گھر پر نہیں ہیں؟'' مہرجان نے چونک کر گل جان کی طرف دیکھا۔ ''پھر کہاں ہیں؟ کیا زمینوں پر گئے ہیں؟'' وہ اب بڑی معصومیت سے گل جان کو دیکھ کر سوال کر رہی تھیں۔

''جی......'' گل جان نے نظریں جھکا کر کہا۔

''تو مجھ سے مل کر کیوں نہیں گئے؟'' مہرجان کے چہرے پر تفکر اور اداسی صاف نظر آرہی تھی۔

''شاید آپ سو رہی تھیں؟'' گل جان کو یہی جواب سوجھا۔

''اچھا، میں سو رہی تھی۔'' مہر جان اپنے حافظے پر جیسے زور ڈالنے لگیں۔ ''بابا جان زمینوں پر چلے گئے؟'' انہوں نے جیسے خود سے سوال کیا۔

''جی!'' گل جان کو ایک مرتبہ پھر جی کہنا تھا۔

''مجھ سے ملے بغیر زمینوں پر چلے گئے، تم جھوٹ بول رہی ہو گل جان ...... بابا جان جب تک میری پیشانی نہ چوم لیں گھر سے باہر نہیں جاتے۔ میں بیٹا ہوں ان کا، وہ مجھے کہتے ہیں میں ان کا رائٹ ہینڈ ہوں تو وہ ...... مجھ سے ملے بغیر کیسے چلے گئے؟'' مہر جان پریشانی کی کیفیت میں خود کلامی میں مبتلا ہو چکی تھیں۔

''اچھا چھوڑیں، آپ اپنے کمرے میں آئیں پھر میں بتاتی ہوں کہ کس وجہ سے ان کو جلدی جانا پڑا۔ ورنہ وہ آپ سے مل کر ضرور جاتے ......'' گل جان نے اب ضروری خیال کیا کہ مہر جان کو ایک بھرپور تسلی کی ضرورت ہے پھر انہیں ایک طرح سے کھینچتے ہوئے آگے کی طرف بڑھی مگر مہر جان نے آگے قدم بڑھانے سے خود کو روک لیا اور گھور کر گل جان کی طرف دیکھنے لگیں۔ وہ ان کی نظروں کی تاب نہیں لاسکتی تھی اس نے اپنی نظریں فوراً جھکا لیں۔

''وہ گل جان ......!''

''جی بی بی جان!''

''بابا کہاں ہیں؟''

''بی بی جان بتایا تو ہے ناں وہ زمینوں پر چلے گئے ہیں۔'' مہر جان نے فوراً سر ہلایا جیسے ان کی تسلی ہو گئی ہے۔

''اچھا اچھا زمینوں پر چلے گئے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ گل جان کے ساتھ آگے قدم بڑھانے لگیں۔ کاریڈور عبور کر کے وہ اس موڑ پر مڑیں جہاں پہلا کمرا ہی مہر جان کا تھا۔ کمرے کے سامنے پہنچ کر گل جان نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور دروازہ دھیرے سے پش کیا لیکن مہر جان نے پہلے کی طرح گل جان کے ساتھ قدم بڑھانے سے انکار کر دیا اور کسی پتھر کی طرح اپنی جگہ جم کر کھڑی ہو گئیں۔

''آئیں ناں بی بی جان۔'' اس نے ایک غیر ارادی نظر مہر جان پر دوڑائی۔

''گل جان۔''

''جی بی بی جان۔''

''بابا کہاں ہیں؟''

گل جان کے چہرے پر گہری بے بسی نے ڈیرا ڈال لیا۔ اب جیسے اسے منہ سے ایک لفظ نکالنا مشکل تھا۔ اٹک اٹک کر ...... بے دم کیفیت میں گویا ہوئی۔

''زمینوں پر گئے ہیں ...... بی بی جان۔''

''اچھا ......!'' مہر جان نے پھر جیسے اپنے حافظے پر زور ڈالنے کی کوشش کی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے آگے قدم بڑھایا۔ گل جان دروازہ نیم وا کر چکی تھی۔ مہر جان پہلے اندر داخل ہوئیں اور گل جان ان کے پیچھے پیچھے۔

مہر جان نے خالی خالی نظریں کمرے میں دوڑائیں پھر پلٹ کر گل جان کی طرف دیکھا۔

''گل جان ......''

گل جان کو یوں محسوس ہوا جیسے ان کی آواز کسی کنویں سے باہر آ رہی ہو۔

''جی بی بی جان!'' گل جان کا لہجہ نہایت شکستہ تھا۔

''وہ میں تم سے یہ پوچھ رہی تھی کہ بابا جان کہاں ہیں؟'' گل جان کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ ہونٹ تھر تھرانے لگے۔ دل نے بے بسی سے سینے کی دیواروں سے سر پٹخنا شروع کر دیا۔

''جی بی بی جان ...... بابا بہت اچھی جگہ چلے گئے ہیں جہاں ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔ کوئی غم نہیں ہوتا۔ کوئی منحوس خبر سنانے والی آواز نہیں آتی۔'' یہ کہہ کر وہ گرنے کے انداز میں مہر جان کی آرام کرسی پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا ...... مہر جان اس کی طرف بچوں کی سی معصومیت سے حیرت سے ایک ٹک تک رہی تھیں۔

☆☆☆

برہان اپنے کمرے میں آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ اس کا ذہن اس وقت بالکل خالی تھا اور وہ کوشش کر رہا تھا کہ کوئی خیال اس پر قابض نہ ہونے پائے۔ وہ کچھ دیر خالی الذہن رہ کر کچھ سکون کا احساس چاہتا تھا۔ اعصاب شکن دوڑ ...... تعزیت کے لیے آنے والوں کا لامتناہی سلسلہ ...... وقفے وقفے سے بین کرتی ہوئی ماں ...... اسے یوں لگ رہا تھا کہ اگر چند گھڑیاں اسے سکون کی نہ ملیں تو اس کا دماغ ایک دھماکے سے پھٹ جائے گا۔ اس لیے وہ اپنی قوتِ ارادی سے کام لے کر ذہن کو بالکل خالی رکھنے کے جتن کر رہا تھا مگر وہ کب ہوتا ہے جو انسان کا ارادہ ہوتا ہے۔ آزمائش جب اللہ کی طرف سے لکھ دی جاتی ہے تو اس کا دورانیہ بھی اللہ کا ہی طے شدہ ہوتا ہے اور اپنے متعین وقت سے پہلے وہ آزمائشیں ختم نہیں ہوتیں۔

صابرہ دھڑ سے دروازہ کھول کر اندر آ گئی تھی۔ برہان ہڑ بڑا کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ صابرہ کے بال بکھرے ہوئے تھے، آنکھیں رو رو کر اتنی سوج چکی تھیں ... یوں لگتا تھا کہ بس اشارے سے بند ہو جائیں گی۔

''کیا بات ہے امی؟ امی آپ کو تو میں نے نیند کی گولی دی تھی آپ سوئی نہیں؟''

''میں سونا نہیں چاہتی برہان ...... تھوک دی تھی میں نے وہ، تمہارا دل رکھنے کے لیے منہ میں رکھ لی تھی۔ میں سونا نہیں چاہتی ...... ارے میں کیسے سوؤں؟'' صابرہ پھٹ پڑی۔

''امی آپ خود ہی تو کہتی ہیں جب ہم چھوٹے تھے آپ کے ساتھ تعزیت کے لیے جاتے تھے تو آپ ان لوگوں سے یہی کہتی تھیں، صبر کریں۔ مرنے والوں کے ساتھ کون مرتا ہے۔ ماں بھی اپنے بچے کے ساتھ قبر میں نہیں لیٹتی۔ اس کو یاد کر کے روتی ضرور رہتی ہے اس کے ساتھ زندہ دفن تو نہیں ہوتی ...... پھر ...... پھر کہاں گئے وہ الفاظ ...... دوسروں کو بانٹ دیے ...... اپنے لیے کچھ نہیں بچایا؟ صبر کرنا ہوگا کیونکہ اس کے سوا کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔'' برہان کھڑا ہو کر ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کڑوا سچ بول رہا تھا جو بہت ضروری تھا، اس نشتر کی طرح جس سے زخم صاف کیا جاتا ہے تاکہ زخم اچھا ہو جائے۔

''گھر کے چپے چپے پر ستارہ بال کھولے کھڑی ہے برہان، میں کیسے سوؤں، میری بیٹی کو ابھی تک قبر نصیب نہیں ہوئی، اس کی روح بھٹکتی پھر رہی ہے۔'' صابرہ اب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''امی خدا کے واسطے خود کو سنبھالیں۔ ہماری خاطر ہی سہی ...... ہم تو ابھی نہیں مرے ...... زندہ ہیں۔'' برہان نے تڑپ کر ماں کو سینے سے لگا لیا۔

''ارے بس کرو، سب نے اس دل کے ساتھ کھیلنے کی قسم کھائی ہے کیا؟'' صابرہ نے ایک دم برہان کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

''امی میں تو آپ کو سمجھا رہا ہوں۔ قیامت آنے سے پہلے قیامت کا خوف خوفزدہ کر دیتا ہے۔''

"لیکن قیامت آ کر گزر جائے تو پھر کیا کریں...... ہاں بیٹا میرے لیے تو حشر ہی برپا ہو گیا...... باپ تمہارا جیل کی سلاخوں کے پیچھے اور بیٹی بے گور و کفن......" بولتے بولتے صابرہ کی آواز پھر بھرا گئی۔

"ایک جنگ جس میں آپ پچیس سال سے مبتلا تھیں۔ امی وہ جنگ ختم ہو گئی۔ یہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔ جب برداشت ختم ہو جاتی ہے تو جنگ شروع ہو جاتی ہے لیکن جنگ سے بھی مراد پوری نہیں ہوتی...... چاروں طرف ملبے کا ڈھیر اور راکھ اڑتی دکھائی دیتی ہے۔ پھر اس راکھ کے ڈھیر پر امن کی باتیں ہوتی ہیں۔ بچے ہوئے لوگوں کی زندگی بچانے کی باتیں ہوتی ہیں یہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔ یہی ہوتا جائے گا...... آپ کو صبر کرنا ہو گا، آپ کی تو ماں نے آپ کا نام ہی صابرہ رکھا تھا۔ یوں لگتا ہے کہ ہماری نانی بہت بڑی ولی اللہ تھیں۔ انہوں نے لوح محفوظ پر لکھا ہوا آپ کا مقدر پڑھ لیا تھا۔ اس لیے آپ کا نام بڑے پیار سے صابرہ رکھا تھا۔" برہان تڑپ تڑپ کر رونا چاہتا تھا...... مگر دور دور تک کوئی ایسا دامن نہیں تھا جس میں وہ اپنے آنسو جذب کرتا...... ماں کے سامنے ایک بھی آنسو ٹپکانا گویا ایک نئی قیامت کو دعوت دینا تھا۔ وہ کس طرح سمجھ رہا تھا اور اس پر کیا گزر رہی تھی پیار کرنے والی ماں بھی نہیں سمجھ سکتی تھی۔ اس نے ماں کو اپنے دونوں بازوؤں میں سمیٹ کر یوں اپنے سینے سے لگا لیا جیسے وہ ماں نہ ہو ڈری سہمی بچی ہو۔

☆☆☆

وارث علی، ایس پی کے ساتھ اس کے مخصوص اور پسندیدہ ریسٹورنٹ میں بیٹھا ہوا تھا۔ آج دونوں کے چہرے پر تفکرات کا جال بچھا ہوا تھا۔ مستی اور قہقہے نہیں تھے، مدہوشی نہیں تھی۔ خود کو دھوکا دینے والی مسکراہٹ نہیں تھی۔

"وہ اپنی بیٹی کے قتل کا الزام تم پر بھی ڈال سکتا ہے۔ کیس کو الجھا سکتا ہے۔ وارث علی......" ایس پی اتنی آہستہ آواز میں گویا ہوا جیسے سرگوشی کر رہا ہو۔

"مگر اس کی بیٹی کا قتل اس کے اپنے لائسنس یافتہ ریوالور سے ہوا ہے۔" وارث علی نے اپنے فطری اعتماد سے جواب دیا تھا۔ اگرچہ تفکرات کے سائے اس کے چہرے پر اسی طرح نقش تھے۔

"مگر اس کی بیٹی کا قتل تمہارے گھر پر ہوا ہے...... اگر جائے وقوعہ کوئی اور ہوتی تو کیس کو پیچیدہ نہیں کیا جا سکتا تھا جیسے کہ آج اخبارات میں کئی شہ سرخیاں لگی ہیں۔ قیاس آرائیاں کی جا رہی ہیں شاید باپ نے بیٹی کو بدچلنی کے شبے میں قتل کر دیا۔ یہ تو ابتدائی خبریں ہیں...... ابھی تو پاپا رازی اور electronic media ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جائیں گے۔ آدم بو آدم بو کرتے ہوئے پولیس والوں سے زیادہ جاسوسی کریں گے...... یار یہ ایجنسیاں کیا جاسوسی کریں گی اس میڈیا نے تو سب کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا ہے۔ سمندروں کی تہ میں اتر جاتے ہیں خبریں لانے کے لیے۔" ایس پی اب ایک تواتر سے بولا تھا۔

"چھوڑیں سر جی، کیوں ڈرا رہے ہیں۔ میں نے ابھی تک بہت صاف ستھرا کام کیا ہے۔ سچائی جاننے کے لیے میڈیا کو میری قبر میں اترنا ہو گا۔ اس کی تو بات چھوڑ دیں آپ۔"

"کتنی بھی صفائی سے کام لو وارث علی، جرم نشان ضرور چھوڑتا ہے کہیں نہ کہیں چوک ہو جاتی ہے۔" ایس پی نے بلا ارادہ ہی کہہ دیا تھا یونہی ایک بات ذہن میں آئی اور بے ساختگی میں منہ سے نکل گئی۔

"سر جی اگر آپ نے ہمت ہار دی ہے تو کوئی بات نہیں ہے مجھے کیوں ڈرائے جا رہے ہیں؟" وارث علی نے بڑی ناراض، ناراض نظروں سے ایس پی کی طرف دیکھا تھا۔

"میں تمہیں ڈرا نہیں رہا وارث علی، میں تو ہوشیار، خبردار کر رہا ہوں۔ دیکھو اپنا پاسپورٹ تیار رکھو...... ہو سکے تو کسی بھی ملک کا تین مہینے کا ویزا ابھی لگوا لو اگر تفتیش شروع ہو گئی اور ای سی ایل میں تمہارا نام ڈال دیا تو تمہارے ساتھ، ساتھ دس پندرہ لوگ اندر ہو جائیں گے۔" ایس پی نے اپنی دانست میں بڑی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کرتے ہوئے مشورہ دیا تھا۔

"سر جی میں ڈرنے والا نہیں اور پاسپورٹ ہمیشہ تیار رہتا ہے۔"

"ڈرتے بھی نہیں ہو اور پاسپورٹ بھی تیار رکھتے ہو واہ...... بھئی واہ......" ایس پی اب معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"سر جی جینا چاہتا ہوں اس لیے پاسپورٹ تیار رکھتا ہوں اور یہ جو ہم جیسے لوگوں پر غراتے رہتے ہیں۔ یہ کون سا گنگا نہا کر آئے ہیں۔ باہر سے جوائیڈ کے نام پر کروڑوں ڈالر آتے ہیں وہ کہاں غائب ہو جاتے ہیں، انہی لوگوں کے پاس آتے ہیں ناں جنہیں ہم جیسوں کو پھانسی لگانے کا اختیار ملتا ہے۔"

"چھوڑو وارث علی، اس وقت صرف اپنی جان بچانے کی فکر کرو، ارے جابر علی کم نہیں ہے بہت شیطان دماغ کا مالک ہے۔ اگر وہ اتنا ذہین نہ ہوتا تو اسے راستے سے ہٹا دینا...... نہ تمہارے لیے مشکل تھا نہ میرے لیے...... لیکن اس کا مرنا ہمارے لیے اور بڑا عذاب بن جاتا...... اندر کی بات جانتا ہوں میں وہ صرف پولیس افسر نہیں ہے اوپر والے جو ایماندار آفیسر بیٹھے ہیں ناں ان کا بڑا صحیح کا مہرا ہے۔"

"جانتا ہوں...... جانتا ہوں...... سر جی اتنا بے خبر میں بھی نہیں ہوں، ورنہ اس کی بیٹی سے نکاح کرنے کے بجائے اس کے خاندان کا ہی صفایا کرا دیتا لیکن آپ اسے سمجھا دو کہ اس نے اگر مجسٹریٹ کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات کی تو ابھی اس کے دو بچے باقی ہیں۔" وارث علی کے لہجے میں ایک درندہ غرانے لگا۔

ایس پی نے یوں گردن ہلائی جیسے وہ وارث علی سے اتفاق کر رہا ہو۔

☆☆☆

رابی سوچتے، سوچتے تھک گئی، اعصاب شل ہو گئے۔ ایک عجیب سے دکھ نے اسے گھیر لیا تھا جیسے وہ چلتے چلتے گرد باد میں الجھ گئی ہو۔ کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے...... دل چاہا کہ روما اور کائناز کے پاس جائے اور ان کو یہ ہولناک خبر سنائے مگر رات بڑھتی جا رہی تھی دوسرا خیال یہی آیا کہ وہ دونوں تو اتنی بے وقوف ہیں کہ عجیب چیخ پکار کر دیں گی۔ وہ جو اس وقت گھر میں سکون کی فضا ہے تہ و بالا ہو جائے گی۔

اسے اندازہ تھا کہ شاہ عالم بھی جاگ رہے ہوں گے۔ برہان ایک ٹیوٹر صحیح مگر اس کے ساتھ ایک تعلق قائم ہو چکا تھا، گھر میں آنا جانا تھا۔ اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کو یکسر ذہن سے نکال کر تو نہیں پھینکا جا سکتا تھا۔ وہ برہان جسے ایک دفعہ دیکھا تو دوبارہ دیکھنے کی تمنا جاگی۔ بس ایک جھلک سی دکھا کر پردے کے پیچھے چلا گیا۔ جو پردے کے پیچھے چلا جاتا ہے وہ زیادہ یاد آتا ہے جو سامنے ہوتا ہے اسے تو یاد کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

رابی کو برہان کی زندگی میں ہونے والے حادثے سے زیادہ برہان کی سوچ تھی۔ وہ تو ایک بار اسے بہت توجہ سے...... دیکھنا چاہتی تھی مگر شاید...... نہیں دیکھ پائے گی۔ اتنے بڑے حادثے کے بعد وہ لوگوں کا سامنا کیسے کر سکتا ہے...... وہ پولیس افسر کا بیٹا تھا تو ٹیوشن کیوں پڑھاتا تھا۔ پولیس افسر تو بہت مالدار ہوتے ہیں شاید شوق میں پڑھاتا ہو گا۔ اس طرح کے مختلف خیالات نے رابی کو جیسے تھکا مارا۔ وہ گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

تاحدِ نگاہ جو دروازہ دکھائی دیتا تھا وہ بند تھا۔ بند دروازوں کے بیچ سے گزرتے ہوئے وہ باہر کھلی فضا میں چلی آئی۔ باہر آتے ہی یک دم اسے خیال آیا کہ وہ شاہ عالم کے گھر میں ہے اور چند قدم کے فاصلے پر اس کا اپنا گھر موجود ہے لیکن وہ اپنے گھر میں نہیں ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس کی توجہ گل جان اور مہر جان کی طرف چلی گئی۔ ایک عجیب سی ہوک اٹھی اور گل جان سے ملنے کے لیے دل بے تاب ہونے لگا۔

اس نے گیٹ کے قریب بنے ہوئے کیبن کی چارپائی پر گارڈ کو لیٹا ہوا دیکھا اور اس کے قریب آئی۔

''وہ بات سنو کیا نام ہے تمہارا؟'' گارڈ جو اونگھ رہا تھا ایک دم ہڑبڑا کر بیٹھ گیا۔

''جی بی بی جی......''

''وہ میں اپنے گھر جا رہی ہوں تھوڑی دیر کے لیے، پندرہ بیس منٹ بعد واپس آجاؤں گی۔''

''جی بی بی جی۔'' گارڈ بڑی سرعت سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے بڑے سے گیٹ کا ذیلی دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی رابی گیٹ پار کر گئی۔

☆☆☆

مہر جان اپنے کمرے سے نکل کر گھر کے پچھلے حصے سے ہو کر نوکروں کے کوارٹروں کی طرف چلی آئی تھیں۔ تمام کوارٹرز کے دروازے بند تھے۔ سوائے اصیل خان کے کوارٹر کے۔

مہر جان نے گردن اندر گھسا کر جھانک کر دیکھا۔ اصیل خان اپنے لیے قہوہ تیار کر رہا تھا۔ وہ اپنے خیال میں اس قدر مستغرق تھا کہ اس کی توجہ ماحول پر نہیں تھی۔

''سنو بڑے میاں، گل جان کہاں ہے؟'' مہر جان کی آواز اس کے عقب سے آئی تو وہ جیسے اچھل گیا۔ پلٹ کر دیکھا اور بے بسی کی کیفیت آنکھوں سے جھانکنے لگی...... گویا سوچ رہا تھا کہ اب پندرہ منٹ کا ایک نیا امتحان شروع ہے۔ اس نے کچھ بولنے کے بجائے انکار میں سر ہلا دیا۔

مہر جان نے برا سا منہ بنا کر اصیل خان کی طرف دیکھا اور بڑبڑاتی چلی گئیں .... ان کی آواز اصیل خان کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔

''اس لڑکی کی انہی باتوں پر غصہ آتا ہے۔ انٹر میں پڑھ رہی ہے مگر ابھی تک گڑیوں کی شادی کرتی ہے۔ نان سینس، پتا نہیں کہاں غائب ہو گئی۔''

اصیل خان نے دکھ کی کیفیت قہوے کے ایک گھونٹ میں سمونے کی کوشش کی لیکن کپ اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے رہ گیا۔ اس کے عقب سے پھر مہر جان کی آواز آئی تھی۔

''حاجی صاحب آپ کون ہیں، میں آپ سے بات کر رہی ہوں۔'' اصیل خان نے پلٹ کر دیکھنے کے بجائے قہوے کا دوسرا گھونٹ لیا۔ نہ اس نے پلٹ کر دیکھا نہ اس نے مہر جان کی بات کا جواب دیا۔

مہر جان غصے سے گھورتی ہوئی اب واپس چلی گئی تھیں۔ اصیل خان آگے بڑھا اور دروازہ اندر سے مقفل کر دیا۔

☆☆☆

رابی، گل جان کے ساتھ گھر کے اندر داخل ہوئی، گیٹ تو چوکیدار نے کھولا تھا مگر گھر کا داخلی دروازہ گل جان نے کھولا تھا۔ دونوں کی نظر ایک ساتھ مہر جان کے کمرے کے کھلے ہوئے دروازے پر پڑی...... گل جان کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

''ارے یہ بی بی جان کے کمرے کا دروازہ کس نے کھولا۔ میں تو انہیں سوتا ہوا چھوڑ کر گئی تھی۔'' یہ کہہ کر وہ گھبرائی گھبرائی سی کمرے میں داخل ہوئی۔ رابی نے بھی اس کی تقلید کی۔

گل جان نظریں گھما گھما کر مہر جان کو تلاش کر رہی تھی۔

''ارے یہ بی بی جان کہاں چلی گئیں۔ واش روم کا دروازہ بھی کھلا ہے، لائٹ بند ہے۔'' یہ کہتے ہوئے گل جان نے واش روم کا دروازہ بند کر دیا اور فکرمندی سے زیادہ عجلت زدہ انداز میں کمرے سے باہر آگئی۔

''میں نے فرسٹ اور سیکنڈ فلور کو جانے والے راستے تو بند کیے ہوئے ہیں کیونکہ وہ چھت پہ چلی جاتی ہیں پتا ہی نہیں چلتا اور ہم یہاں ڈھونڈتے رہتے ہیں۔''

''لان میں بھی نہیں تھیں لان سے تو ابھی ابھی میں اندر آئی ہوں۔ یا اللہ کہاں چلی گئیں۔ کہیں میرے یا روما کے کمرے میں تو نہیں ہیں۔'' رابی نے کہا۔

''نہیں، نہیں وہ تو میں نے تم دونوں کے جانے کے بعد لاک کر دیے تھے۔ میرے کمرے کا دروازہ بھی بند ہے اسے بھی میں لاک کر دیتی ہوں کیونکہ اپنے کمرے سے نکل کر میرے کمرے میں چلی جاتی ہیں تو پورا کمرا پھیلا دیتی ہیں کچھ نہ کچھ ڈھونڈتی ہیں۔ میری فلانی کتاب یہاں رکھی تھی...... میری ایک تصویر یہاں رکھی تھی...... اصیل خان نے لاسٹ ٹائم مجھے جو گفٹ دیا تھا۔''

''اصیل خان نے؟'' رابی کے چاروں طرف پے در پے کئی دھماکے ہوئے۔ گل جان نے اپنی حماقت پر اپنا سر پیٹ لیا تھا...... آناً فاناً اسے سوچنا تھا کہ وہ اب کیا بات بنائے۔

رابی ہکا بکا گل جان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''ارے بیٹا! میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ بتاؤ اصیل خان...... مہر جان کو کیوں گفٹ دے گا۔ وہ دے سکتا ہے کیا؟ لیکن جب ڈھونڈنے لگتیں ہیں تو اس طرح الٹی سیدھی باتیں کرتی ہیں...... کہ اصیل خان نے گفٹ دیا تھا تو کبھی...... ہمارے بابا جان کا نام لیتی ہیں کہ انہوں نے مجھے پتا نہیں کیا دیا تھا اور وہ نہیں مل رہا...... وہ ایسے بول جاتی ہیں۔'' گل جان نے جلدی، جلدی بات بنائی تو رابی کو بھی سکون سا مل گیا۔

سوچنے لگی کہ ہاں جب ان کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے تو وہ ایسی باتیں ہی کریں گی۔

''یا اللہ کہاں چلی گئیں''، پھر ایک دم اپنے سر پر ہاتھ مار کر بولی۔ ''لگتا ہے کہ وہ پیچھے والے راستے سے لان کی طرف نکلی ہیں...... ورنہ اور کہاں جا سکتی ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ اس راستے کی طرف بڑھی جس راستے کی طرف گمان غالب تھا کہ یہاں سے گئی ہوں گی۔

رابی نے اسی طرح سابقہ انداز میں گل جان کی تقلید کی، دونوں آگے پیچھے چلتی ہوئیں گھر کے اس حصے کی طرف نکل آئیں جہاں ایک ساتھ کئی نوکروں کے کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ سب کوارٹروں کا دروازہ بند تھا لیکن اصیل خان کے دروازے کے سامنے مہر جان کھڑی ہوئی بند دروازے کو بری طرح پیٹ رہی تھیں۔

''بڑے میاں میں تم سے پوچھ رہی ہوں گل جان کہاں ہے۔ حاجی صاحب آپ بولتے کیوں نہیں...... یہ لڑکی بہت پریشان کرتی ہے۔ انٹر میں پڑھ رہی ہے مگر ابھی تک گڑیوں کی شادیاں کرتی ہے۔ پاگل ہے بالکل پتا نہیں کہاں چلی گئی...... ارے حاجی صاحب آپ بولتے کیوں نہیں۔ اندر سے دروازہ بند کر کے کیوں بیٹھ گئے ہیں۔ میں کوئی آپ کا سر پھاڑنے آئی ہوں۔''

اس سے پیشتر کہ وہ مزید کچھ بولتیں گل جان نے انہیں جا لیا اور مہر جان کا بازو تھام کر بولی۔

"آپ یہاں ہیں، میں اندر کتنی دیر سے آپ کو ڈھونڈ رہی تھی۔"

"تم مجھے ڈھونڈ رہی تھیں؟ میں تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔ بس اب ہم دونوں ایک دوسرے کو ڈھونڈتے ہی رہتے ہیں...... تمہاری تو گڑیا کی بارات جانے والی ہوگی، تم تو وہاں مصروف ہوگی...... بابا کہیں بھی جاؤ مجھے بتا کر جایا کرو، پاگل ہو جاتی ہوں میں تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر۔" بولتے بولتے مہر جان کی نظر رابی پر پڑ گئی تھی۔ جو ہکا بکا کھڑی مہر جان کی طرف دیکھ رہی تھی اور محویت کا یہ عالم تھا کہ پلکیں جھپکنا محال تھا۔

"یہ لڑکی کون ہے اور اس کے چہرے پر نشان کیسے ہیں، افوہ کیا بے چاری جل گئی تھی؟" جواب میں خاموشی تھی۔

مہر جان، گل جان کی گرفت سے اپنا بازو چھڑا کر بڑی تیزی سے رابی کے قریب آئی اور اس کا چہرہ بہت غور سے دیکھنے لگی۔

رابی کو مہر جان سے عجیب سا خوف آنے لگا۔ ریڑھ کی ہڈی میں ایک کرنٹ سا دوڑ گیا۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔ وہ جتنا پیچھے ہٹتی تھی مہر جان اس سے دوگنا آگے آتی تھیں اور لگتا تھا بس اُن کا چہرہ رابی کے چہرے سے چھونے لگے گا۔ رابی نے بے اختیار اپنے دونوں ہاتھ آگے کر کے انہیں خود سے دور کرنے کی کوشش کی۔ اسی آن میں گل جان قریب آچکی تھی اس نے پھر مہر جان کو کندھوں سے تھام لیا۔

"چلیں بی بی جان، اندر چلتے ہیں۔"

"ارے گل جان یہ کون لڑکی ہے؟ ہمارے کسی نوکر کی بیٹی ہے؟ اس کے چہرے پر نشان کیسے ہیں؟ لگتا ہے یہ کسی ایکسیڈنٹ میں زخمی ہوئی ہے یا اپنے گھر میں روٹی ووٹی پکاتے ہوئے جل گئی ہوگی یا یہ شروع سے ہی ایسی ہے؟" مہر جان مسلسل بولے جا رہی تھیں اور رابی کا دماغ جیسے فضا میں معلق ہو چکا تھا۔ اس کے لیے یہ انتہائی ناقابلِ یقین اور ناقابلِ بیان تھا۔ اس کے تصور میں اتنی اونچی اڑان بھرنے کی طاقت نہیں تھی کہ وہ یہ سب کچھ پہلے سے سوچ سکتی۔ یہ سب کچھ تو اس کے تصور میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ وہ مہر جان تو نہیں تھیں جن کا روپ قیامت تک کے لیے آنکھوں میں بس چکا تھا۔ یہ تو بالکل نئی اور اجنبی سی عورت تھی جسے اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

"یہ لڑکی کون ہے؟"

"بی بی جان آپ آئیں میرے ساتھ!"

"نہیں، پہلے تم بتاؤ یہ لڑکی کون ہے؟"

"خدا کے لیے آپ اندر آئیں بی بی جان، میں آپ کو بتاتی ہوں یہ لڑکی کون ہے۔" گل جان اب زبردستی مہر جان کو اپنے ساتھ گھسیٹتی لے جا رہی تھی اور مہر جان پلٹ، پلٹ کر رابی کو دیکھ رہی تھیں۔

"افوہ مجھے چھوڑو ناں، یہ بتاؤ یہ لڑکی کون ہے؟"

رابی نے بہ مشکل اپنا چہرہ موڑ کر ان دونوں کو جاتے ہوئے دیکھا کاریڈور کی اس حد تک جہاں داخل ہونے کے بعد وجود اوجھل ہو جاتے تھے۔ اس نے مہر جان کی طرف دیکھا۔ اندر گم ہونے سے پیشتر بھی رابی کی طرف دیکھا تھا اور ان کی آواز رابی کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ "یہ لڑکی کون ہے؟ یہ لڑکی کون ہے؟" یہ ایک آواز تھی کہ ایک بازگشت جو گونجتے گونجتے عرش کو چھونے کے لیے بے تاب تھی۔



شاہ عالم اپنے کمرے میں کوئی پسندیدہ کتاب پڑھ کر خود کو بہلانے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ آج معمول سے ہٹ کر اُن کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا...... ورنہ وہ اس وقت تک تو میڈیسن لے کر سو جایا کرتے تھے۔ کتاب پڑھتے، پڑھتے بھی ان کا ذہن کہیں اور پہنچ جاتا تھا۔ یہ کیفیت بڑی بے اختیاری تھی۔ وہ پوری کوشش کر رہے تھے کہ اپنے ذہن کو کنٹرول میں رکھیں اور کسی طرح سو جائیں۔ کتاب پر نظریں جمی ہوئی تھیں۔ ذہن پھر قلابازی کھا چکا تھا بار بار ذہن برہان کی طرف چلا جاتا تھا۔

جمعہ، جمعہ آٹھ دن ہوئے تھے... برہان سے شناسائی کو۔ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ اس لڑکے نے آخر کیا جادو کیا ہے کہ وہ چوبیس گھنٹے میں کسی نہ کسی وقت کسی حوالے سے یاد آ جاتا ہے اور اب جبکہ یہ بات دل میں آ چکی تھی کہ اس وقت وہ کتنے بڑے بحران سے گزر رہا ہے۔ ذہن اُدھر سے ہٹ کر ہی نہیں دے رہا تھا۔ بات یہ نہیں تھی کہ برہان کے نہ آنے سے کائناز کا بہت نقصان ہو رہا تھا یا ان کو اچھا اور نیا ٹیوٹر نہیں ملے گا مگر انسانیت کے لیے دردمندی رکھنے والا دل انہیں بے چین کیے ہوئے تھا۔

وہ اس وقت بری طرح چونک پڑے جب ان کے دروازے پر کسی نے بہت آہستہ، آہستہ سے دستک دی بے اختیار ان کی نظریں وال کلاک کی طرف اٹھ گئیں۔

”اس وقت......؟ کائناز میرے کمرے میں تو کبھی نہیں آ سکتی کیونکہ اسے پتا ہے کہ اس وقت تک میں سو چکا ہوتا ہوں شاید کوئی نوکر ہے......“ سوچتے ہی انہوں نے بلند آواز سے پوچھا۔

”کون ہے؟“ دروازے کے دوسری طرف سے رابی کی آواز کمرے کے ماحول میں گونجی۔

”دادا جان......! میں ہوں رابی۔“ شاہ عالم پریشانی کے عالم میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئے۔

”رابی اس وقت...... الٰہی رحم کرنا مجھ پر بھی اور ان معصوم بچیوں پر بھی۔“ وہ سوچتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھے اور دروازہ کھول دیا اور بڑی بے تابی سے رابی کے چہرے کا جائزہ لینے لگے۔ ”خیریت تو ہے بیٹا!“

”جی دادا جان...... سوری میں نے اس وقت آپ کو ڈسٹرب کیا۔ مگر...... مگر مجھے پتا نہیں کیوں...... اکیلے کمرے میں اتنی وحشت ہو رہی ہے...... میں ڈرپوک تو کبھی نہیں تھی لیکن...... اس وقت مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“

شاہ عالم نے اسے اندر آنے کے لیے راستہ دیا...... رابی یوں تیزی سے اندر آ گئی۔ جیسے وہ اندر آنے کے لیے بڑی بے تاب تھی۔ شاہ عالم نے دروازہ کھول دیا اور رابی کو صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ رابی بڑی تابعداری سے اشارہ ملتے ہی بیٹھ گئی۔

”کیوں ڈر لگ رہا ہے بیٹا...... سوتے میں کوئی خواب دیکھ لیا ہے کیا...... یا تم بھی اس حادثے کے بارے میں سوچ رہی ہو جو اس بے چارے ٹیوٹر کے ساتھ پیش آیا ہے۔“ شاہ عالم نے رابی کا ذہن سیکنڈ کے ہزارویں لمحے میں کسی اور طرف موڑ دیا۔

”مجھے تو اماں جان کے علاوہ کسی کا خیال ہی نہیں آیا، یہ تو میں بھول ہی گئی کہ آج کی تاریخ میں ایک بہت بڑے حادثے کی خبر بھی ملی ہے، یا اللہ کیا آج حادثوں کا دن ہے۔“ وہ سوچ رہی تھی۔

”کیا بات ہے بیٹا، میں آپ سے بات کر رہا ہوں۔“ شاہ عالم نے اپنے مخصوص شفیق انداز میں رابی کو متوجہ کیا۔

”نہیں دادا جان، میں تو اماں جان کے بارے میں سوچ رہی ہوں...... دادا جان وہ میں گئی تھی ناں۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں خالہ جان سے ملوں اور بہت ساری باتیں کروں۔ کائناز اور روما کو میں

نے ڈسٹرب نہیں کیا...... انہیں صبح کالج جانا ہوتا ہے کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی تو میں گھر چلی گئی تھی۔“

”اوہ......“ شاہ عالم کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”تو بیٹا آپ گھر سے ہو کر آ رہی ہو۔ مجھے تو پتا ہی نہیں چلا۔“

”جی دادا جان میں سمجھی کہ آپ آرام کر رہے ہیں، آپ کو ڈسٹرب کیوں کروں۔ کون سا دور جا رہی ہوں، گھر ہی تو جا رہی ہوں۔ پندرہ بیس منٹ، آدھے گھنٹے میں واپس آ جاؤں گی۔“

”اچھا، اچھا تو پھر ہو گئیں خالہ جانی سے باتیں لیکن آپ تو کہہ رہی ہیں کہ آپ کو ڈر لگ رہا ہے۔ ایسی کیا بات ہے بیٹا کس بات سے ڈر لگ رہا ہے۔“

”دادا جان آج پہلی مرتبہ میں نے اماں جان کو ایسے حال میں دیکھا کہ...... میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ اماں جان...... اماں جان بڑی عجیب سی لگیں۔ بڑی عجیب باتیں کر رہی تھیں...... اماں جان تو وہ اماں جان ہی نظر نہیں آئیں...... وہ تو...... وہ تو بالکل کوئی نئی عورت بن گئی ہیں جو میرے لیے بالکل اجنبی ہے۔“ رابی بے ربط انداز میں جیسے اُڑتے ہوئے لفظوں کو پکڑ، پکڑ کر اپنی گرفت میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”سمجھ گیا میں...... تو آپ اس وجہ سے پریشان ہیں...... ڈاکٹر صاحبہ نے آپ سے کیا باتیں کیں؟“

”دادا جان انہوں نے تو مجھے پہچانا ہی نہیں...... خالہ جانی سے کہہ رہی تھیں...... یہ لڑکی کون ہے...... بار بار پوچھ رہی تھیں...... دادا جان وہ ایک بات کو بار بار پوچھتی ہیں۔ میں، میں سمجھ نہیں پائی کہ میں نے یہ ایک دم سے کیا دیکھ لیا...... مجھے تو یوں لگ رہا ہے کہ میں ابھی تک خواب دیکھ رہی ہوں...... اماں جان نہیں تھیں وہ...... وہ تو کوئی اور ہیں۔“

شاہ عالم، رابی کی باتوں سے اندازہ لگا چکے تھے کہ یہ کم عمر لڑکی جو اپنے علم...... معلومات اور اعتماد کی وجہ سے سمجھتی تھی کہ وہ بہت میچور، بہت بولڈ بہت زمانہ شناس ہو چکی ہے۔ ایک حادثے کی تاب نہ لا سکی۔ کم عمری کا پیمانہ تنگ اور چھوٹا تھا کہ نئے، نئے حادثات اس میں سے چھلکے پڑ رہے تھے۔ انہوں نے بڑی شفقت سے رابی کے سر پر ہاتھ رکھا۔ سر پر ہاتھ رکھنے کا یہ عمل بڑا مشفقانہ اور تسلی آمیز تھا۔

”میں ڈاکٹر صاحبہ کی حالت کو اس کمرے میں بیٹھ کر بھی سمجھ سکتا ہوں۔ گل جان بی بی مجھے ان کی کیفیت سے آگاہ کر چکی ہیں اور ان کی بیماری کا نام بھی بتا چکی ہیں۔ آپ کے لیے یہ بالکل نئی بات تھی اس لیے آپ پریشان ہو گئیں۔ آپ فکر نہ کریں بیٹا...... میں گل جان بی بی کو فورس کروں گا کہ وہ ڈاکٹر صاحبہ کا علاج کرائیں۔ آج کی دنیا میں کسی بھی مرض کا علاج کرانا کوئی خیال اور خواب کی بات نہیں ہے۔ بڑی، بڑی پیچیدہ بیماریوں کا، بہت ڈرا دینے والے امراض کا بڑی خوبی سے علاج ہو جاتا ہے۔ بس شرط یہی ہے کہ اللہ کو تمام اختیارات کا مالک جان کر اس پر بھروسا رکھا جائے۔ اس سے بہت اچھی امیدیں وابستہ کی جائیں اور حق یہی ہے کہ اللہ کے حکم کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوتا، پتا بھی نہیں ہلتا...... بیماری بھی اس کی طرف سے اور شفا بھی اس کی طرف سے۔“

”لیکن دادا جان آپ نے اماں جان کو بہت قریب سے نہیں دیکھا، میرا مطلب ہے ان دنوں میں، وہ تو اتنی چینج ہو گئی ہیں کہ لگتا ہے اب ان کے لیے کوئی دوا کوئی علاج نہیں ہے۔“

”خدانخواستہ!“ شاہ عالم نے فوراً رابی کی بات کاٹ دی۔ ”بیٹا......! آپ چھوٹی بچی ہو آپ کا تجربہ آپ کا علم بہت محدود ہے۔ یہی فرق ہوتا ہے بڑی عمر اور چھوٹی عمر میں...... چھوٹی عمر میں چھوٹا سا حادثہ بھی قیامت ہوتا ہے اور بڑی عمر میں انسان قدم، قدم پر اپنے تجربے کی لاٹھی سے کام لیتا ہے۔ جاؤ شاباش سو جاؤ۔ میں گل جان بی بی سے موقع محل دیکھ کر بات کرتا ہوں کہ وہ ڈاکٹر صاحبہ کا علاج کرانے پر توجہ دیں جو اُن کا فرض

اور ڈاکٹر صاحبہ کا حق ہے۔“

رابی نے شاہ عالم کی طرف دیکھ کر ایک گہری سانس لی اس کے ذہن میں پھر سوال ابھرا تھا کہ ایک دم ہوش وحواس کھودینے والی مہرجان کسی معجزے سے ہی ٹھیک ہوسکتی ہیں۔ بزرگوں اور ڈاکٹروں کا کام تسلی دینا ہی ہوتا ہے۔

”ٹھیک ہے دادا جان آپ آرام کیجیے، میں نے اس وقت آپ کو ڈسٹرب کیا پلیز مجھے معاف کردیجیے گا مگر مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی اس لیے میں..... آپ کے پاس آگئی تھی۔“

”کوئی بات نہیں بیٹا اگر آپ نہ آتیں اور صبح مجھے پتا چلتا کہ آپ رات کو میرے پاس آنا چاہ رہی تھیں اور نہیں آئیں تو مجھے دکھ ہوتا۔ کوئی تکلف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کائناز کا دادا ہوں، آپ کا بھی دادا ہوں۔ آپ گھڑی دیکھ کر مجھ سے ملنے کا نہ سوچا کریں۔ جب جی چاہے میرے پاس آجائیں، میں برا نہیں مانوں گا بلکہ مجھے اچھا لگے گا کہ میری وجہ سے آپ کو کچھ سکون ملا......“

”بہت بہت شکریہ دادا جان۔“ رابی کہتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی۔

شاہ عالم نے اس کی طرف دیکھا اور جانے کس خیال سے مسکرانے لگے۔ ایسی مسکراہٹ جس کے اندر شفقت، دردمندی اور انسانیت کی لاج تھی۔

☆☆☆

”بیٹا میں تو کل ہی آنا چاہتا تھا۔ بس یہ سوچ کر رک گیا کہ آپ بہت تھکے ہوئے ہوں گے۔ رات کو تھوڑا آرام کرلیں۔ تعزیت ہی تو کرنی ہے اور اس کے علاوہ ہم کیا کرسکتے ہیں۔“ شاہ عالم اپنی گاڑی ڈرائیور کے ساتھ برہان کے گھر صبح دس بجے ہی پہنچ چکے تھے۔ کائناز اور روما کے کالج روانہ ہوتے ہی وہ برہان کے پاس چلے آئے تھے۔

برہان نے تو ان کی ہدایت کے مطابق فوراً ہی اپنے گھر کا پتا بذریعہ text ان کو دے دیا تھا۔

”آپ کا بہت بہت شکریہ...... شاہ صاحب کہ آپ ایسے موقع پر میرے گھر تشریف لائے بہت زحمت ہوئی آپ کو۔“ برہان بہت شائستہ انداز میں سر جھکائے کہہ رہا تھا۔

”ارے نہیں، نہیں بیٹا......! شکریہ کس بات کا، یہ تو ہمارا فرض تھا۔ میں آپ سے اس وقت کوئی سوال نہیں کروں گا کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ میں آپ کے زخم ہرے کروں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ جب بے بسی کے مقام پر مشکل آن پہنچی ہو تو سوائے صبر کے کوئی دوسرا راستہ نہیں ملتا۔ آپ حوصلے اور صبر سے کام لیں۔ آپ کے گھر میں یقیناً آپ کی بہت ضرورت ہے۔ آپ کے حوصلے سے آپ کی ماں کو بھی حوصلہ ملے گا۔“ شاہ صاحب بڑی دلسوزی سے برہان سے ہم کلام تھے۔

برہان سر جھکائے یوں سن رہا تھا جیسے اس کے اپنے پاس کرنے کے لیے کوئی بات نہیں ہو۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور تفکرات کے رنگ تھے لیکن الفاظ گم تھے یوں بھی تعزیتی کلمات سننے کے بعد انسان سوچتا ہی رہ جاتا ہے کہ جواب میں کیا کہے۔

”بس آپ کا حال دریافت کرنے آپ کو صبر کی تلقین کرنے آیا تھا، اب میں چلوں گا...... مجھے اجازت دیجیے۔“ شاہ صاحب نے برہان کی مسلسل اور گہری خاموشی کو محسوس کرکے نشست برخاست کرنا مناسب سمجھا۔

”نہیں، نہیں شاہ صاحب آپ ایسے کیسے جاسکتے ہیں، پہلی مرتبہ آپ میرے گھر آئے ہیں۔ میری بہن

چائے تیار کرچکی ہوگی۔“

”کیسی باتیں کرتے ہیں بیٹا آپ...... یہ کوئی چائے پانی کا موقع ہے۔ ہم لوگوں کو تو خود آپ لوگوں کا خیال کرنا چاہیے۔ چائے پانی کا پوچھنا چاہیے نہ کہ آپ سے یہ توقع کریں کہ آپ ہمیں انٹرٹین کریں۔ بس آپ خود کو سنبھالیں اپنے گھر والوں کا خیال کریں۔ رہی ٹیوشن کی بات تو فی الحال اُدھر سے اپنا ذہن ہٹالیں۔“

”پھر بھی شاہ صاحب اچھا نہیں لگتا، آپ پہلی مرتبہ آئے ہیں ایک کپ چائے تو پی لیں۔“

”بیٹا میں ناشتا کرتے ہی نکل کھڑا ہوا تھا۔ شاید آپ کے علم میں نہیں کہ میں چائے زیادہ نہیں پیتا۔ ہارٹ پیشنٹ ہوں.... احتیاط کرتا ہوں۔“

”ہارٹ پیشنٹ!“ شاہ عالم کی بات سن کر برہان نے چونک کر پہلی بار کوئی بات کی تھی۔

”ہاں بیٹا...... دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں۔ آگے میں نہیں بولوں گا اس لیے کہ آگے کا مصرعہ آپ کے زخم ہرے کردے گا اور شاید میرے بھی...... بس اب اجازت چاہوں گا۔“ شاہ صاحب کھڑے ہوگئے۔ برہان بھی اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ شاہ صاحب نے بے اختیاری کیفیت میں اسے گلے لگالیا اور اس کی پشت پر یوں ہاتھ پھیرنے لگے جیسے خاموشی کی زبان میں اسے تسلی دے رہے ہوں حوصلے جگا رہے ہوں۔

☆☆☆

”تم پھر چھٹی کرکے بیٹھ گئی ہو.... آخر مسئلہ کیا ہے؟“ شائستہ بیگم، فائزہ کے کمرے میں آکر بڑے خفا خفا انداز میں پوچھ رہی تھیں۔

”بس ممی میرا دل نہیں چاہ رہا...... آپ کو تو پتا ہی ہے ناں کیوں نہیں دل چاہ رہا، شبینہ میری بہت پیاری بہت ہی زیادہ پیاری دوست ہے ناں اس کے ساتھ اتنا بڑا سانحہ ہوا ہے ابھی تک مجھے یقین نہیں آرہا...... میں اگر کالج چلی جاتی کون سا مجھ سے پڑھا جاتا۔ رئیلی ممی میں بہت پریشان ہوں۔“ فائزہ بڑی معصومیت سے اپنی دلی کیفیت بیان کررہی تھی۔

”دماغ خراب ہے تمہارا...... یہ دنیا ہے...... دنیا میں روز کچھ نیا ہوجاتا ہے اور کسی کے ساتھ بھی اتنی زیادہ attachment اچھی نہیں ہوتی کہ انسان...... non practical ہوکر رہ جائے تمہارے پریشان ہونے سے اور چھٹی کرنے سے اسے کوئی فائدہ ہوگا نہ تمہیں۔“ شائستہ بیگم اپنی غلطی کا تاثر چھپا کر بظاہر بڑے نارمل انداز میں بات کررہی تھیں۔

”ممی فرق تو کوئی نہیں پڑے گا۔ خدانخواستہ آپ کی کسی دوست کے ساتھ کوئی حادثہ ہوجاتا...... کیا آپ اسی طرح ریلیکس رہتیں۔“ فائزہ نے اب بڑے بے ادب انداز میں بات کی اور اتنے بڑے حادثے کا حوالہ دیا شائستہ بیگم اپنی جگہ تھرا کر رہ گئی۔

”تم ہوش میں تو ہو فائزہ، الٹی سیدھی باتیں کیے جارہی ہو خدا نہ کرے کہ میری کسی دوست کے ساتھ اس طرح کا حادثہ ہو اور دیکھو اب تمہیں شبینہ سے دوستی رکھنی ہی نہیں چاہیے...... میرا مطلب ہے اب یہ سلسلہ continue نہیں رہنا چاہیے۔ بس یہیں اسٹاپ کردو اسے۔“ شائستہ بیگم کی باتیں سن کر فائزہ نے آنکھیں پھاڑ کر ماں کی طرف دیکھا۔

”کیا مطلب ممی...... میں شبینہ سے دوستی ختم کروں...... مگر کیوں؟ اس کا کیا قصور ہے؟“

”بیٹا اس کا کوئی قصور نہیں ہے لیکن اس قسم کا بیک گراؤنڈ رکھنے والے لوگوں کے ساتھ فرینڈ شپ بنانے سے مسئلے ہو جاتے ہیں وہ جو کہتے ہیں ناں دوست، دوست سے پہچانا جاتا ہے اور دوست کا reference بن جاتا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ لوگ تمہیں شبینہ کے قریب دیکھیں، اس کی دوست سمجھیں۔“ شائستہ بیگم نے پھر بے ربط انداز میں اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی۔

”وہی تو پوچھ رہی ہوں ممی......! شبینہ کا اس میں قصور کیا ہے؟ میں کیوں اس سے دوستی ختم کروں۔ ایسے وقت میں ہی تو دوست کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔“ فائزہ نے جرح کی۔

”خاموش ہو جاؤ جو کچھ ہم جانتے اور سمجھتے ہیں ابھی وہ تم نہیں سمجھ سکتیں۔ شبینہ کے باپ نے مرڈر کیا ہے اور جن گھروں میں ایسے حادثات ہوتے ہیں ان گھروں سے کوئی بھی تعلق رکھنا پسند نہیں کرتا۔ جو بھی ان سے تعلق رکھتا ہے انہی کی طرح سمجھا جاتا ہے۔ فضول میں بدنامی ملتی ہے۔ لوگ بھی شک بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔“

”لوگوں کا کیا ہے ممی دیکھنے دیں مجھے لوگوں کی پروا نہیں ہے۔“

”تمہیں لوگوں کی پروا نہیں ہے۔ مجھے تو ہے، دیکھو فائزہ آج میں تمہیں صاف، صاف بتا رہی ہوں۔ شبینہ کا سوشل اسٹیٹس اور تمہارا بہت مختلف ہے۔ بندہ اپنے calibre اور status کے لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے تو اچھا لگتا ہے۔“ شائستہ بیگم نے اب صاف، صاف بات کرنا زیادہ مناسب خیال کیا۔

”دوست کا اسٹیٹس نہیں دیکھا جاتا۔ دوستی تو تبھی ہوتی ہے جب کیمسٹری میچ ہوتی ہے اور کیمسٹری میچ ہونے کے لیے اسٹیٹس کا same ہونا ضروری نہیں۔“ فائزہ نے اپنی دانست میں بڑی بھاری تقریر کی۔

شائستہ بیگم تو ویسے ہی اس کی جرح سے عاجز آ چکی تھیں جل بھن کر اس کی طرف دیکھا...... کیونکہ جب سے انہیں یہ خبر ملی تھی ایک پل کے لیے بھی ان کو چین نہیں ملا تھا۔ بس موقع کی طاق میں تھیں اتنا تو انہیں بھی اندازہ تھا کہ فائزہ اگر آج کالج گئی تو شبینہ اسے دکھائی نہیں دے گی۔ اس لیے انہوں نے سوچا تھا کہ آج جب وہ کالج سے آجائے گی تو اسے پاس بٹھا کر محبت سے یہ سب کچھ سمجھائیں گی لیکن یہ اتفاق ہی تھا۔ فائزہ کالج نہیں گئی تھی اور ماں سے اس کا سامنا ہو گیا تھا۔

”ممی میں شبینہ کو نہیں چھوڑ سکتی آپ یہ دیکھیں کہ میری کزنز اور آپ کے سرکل میں میری کتنی ہم عمر لڑکیاں ہیں مگر میری کسی سے دوستی نہیں ہے۔ مجھے خود بھی نہیں پتا شبینہ مجھے کیوں اتنی اچھی لگتی ہے یا اس سے میری کیمسٹری کیسے میچ ہو گئی...... آئی ڈونٹ نو......“

”دوستی کو دوستی کی حد تک رکھتے ہیں، پاگلوں کی طرح دوستی نہیں کرتے۔ بس ٹھیک ہے دعا سلام اور ایک دوسرے سے common issues share کرنا کافی ہوتا ہے اتنی دوستی کافی ہوتی ہے اس سے آگے بڑھنا ٹھیک نہیں ہے۔ ہر چیز کی حد ہوتی ہے۔ دوستی کی بھی ایک حد ہونی چاہیے۔“ شائستہ بیگم نے اسے قائل کرنے کے لیے پورا زور لگایا۔

”ممی دوستی کی کوئی لمٹس نہیں ہوتیں، دنیا میں سب سے خوب صورت رشتہ دوستی ہی کا تو ہوتا ہے۔“

”لیکن کوئی رشتہ ماں سے زیادہ نہیں ہوتا بے وقوف لڑکی۔“ شائستہ بیگم اب برہم ہو گئیں...... ”میں تمہاری ماں ہوں، تمہیں دنیا میں دوست سے زیادہ ماں کی ضرورت رہے گی۔ دوست بہت مل جاتے ہیں لیکن ماں صرف ایک ہوتی ہے۔ میں جب تمہیں کہہ رہی ہوں کہ مجھے اب تمہارا شبینہ سے ملنا جلنا اچھا نہیں لگے گا تو

میں مینٹلی ٹارچر کا شکار ہو جاؤں گی۔ بے چینی محسوس کروں گی، تمہیں سمجھ کیوں نہیں آتی۔“ شائستہ بیگم نے اب ڈانٹ ڈپٹ کا انداز اپنایا تھا۔

فائزہ ماں کو غصے میں دیکھ کر وقتی طور پر خاموش ہو گئی، وہ شبینہ کے حق میں کتنے بھی دلائل دیتی ماں کی طرف سے یہی جواب آنا تھا کہ شبینہ کی دوستی پسند نہیں۔ اتنی ذہین تو وہ تھی کہ ماں کے منہ سے ایک جملہ بار بار سننے کے بجائے وہ خاموشی اختیار کر لیتی سو اب اس نے خاموشی اختیار کی اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اپنے انداز سے یہ ظاہر کیا کہ اسے شائستہ بیگم سے کوئی بات ہی نہیں کرنی۔

شائستہ بیگم نے چند لمحے اس کی طرف دیکھا پھر بنا کچھ بولے اس کے کمرے سے باہر چلی گئیں۔

فائزہ گرنے کے انداز میں تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ اس کے دل پر منوں بوجھ آپڑا تھا۔ شبینہ سے دوستی ختم......؟

☆☆☆

شبینہ گھر کے ایک کونے کھدرے میں گھسی ہوئی سر کو جھکائے جانے کیا سوچ چکی تھی کہ برہان اسے تلاش کرتا ہوا اِدھر چلا آیا۔ شبینہ، برہان کو دیکھ کر جیسے کسی دھیان سے ایک دم چونکی تھی۔ اس کے چہرے پر گہری یاسیت جیسے ہمیشہ کے لیے ڈیرا ڈال چکی تھی۔

”یہاں کیوں بیٹھی ہو شبینہ......؟“ برہان نے بڑی گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

”پھر کہاں بیٹھوں بھائی......! امی کے سامنے جاتی ہوں تو امی کی باتیں مجھے پریشان کر دیتی ہیں۔ مجھے سمجھ ہی نہیں آتی کہ میں امی کو کس طرح بہلاؤں اور کیسے انہیں تسلی دوں...... بس اِدھر آ کے بیٹھ گئی۔ خاموشی اور اکیلے پن میں کچھ سکون سا مل رہا ہے......“ شبینہ کے لہجے میں اڈتی ہوئی شکستگی برہان کے لہو میں کانچ کے ٹکڑے بن کر پھیلنے لگی۔

”خود کو سنبھالو شبینہ، دیکھو ناں ہمارے چاروں طرف گہرے اندھیرے پھیل چکے ہیں۔ مگر ہم کسی کی وجہ سے حرام موت کو تو گلے نہیں لگا سکتے ناں، ان گھپ اندھیروں کے بیچ میں سے ہی کہیں روشنی کا نشان ملے گا اور ہم دونوں مل کر ڈھونڈیں گے۔“ اس نے شبینہ کی طرف دیکھا اور بولا۔

یہ سنتے ہی شبینہ کی آنکھوں سے تو اتر سے آنسو بہنے لگے۔ وہ کچھ وقت تک آنسو بہاتی رہی اور ساتھ ساتھ

پوچھتی رہی۔

برہان خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا، دیکھتا...... شبینہ کی طرف تھا ذہن تو خدا جانے کہاں، کہاں کی اڑانیں بھر رہا تھا۔

''بھائی آپ کی ابا جان سے ملاقات ہوئی؟'' شبینہ نے ہچکچاتے ہوئے بالآخر وہ سوال کر ہی دیا جو کئی دفعہ کی کوشش کے باوجود اس کے ہونٹوں تک نہیں آپا رہا تھا۔ لفظ ابا جان پر برہان یوں چونکا تھا جیسے اسے کسی نے بہت بلندی سے نیچے پٹخا ہو۔

''ابا جان......'' وہ خود کلامی کے انداز میں گویا ہوا۔ انداز میں بڑی بے ساختگی تھی...... چند لمحے خالی الذہن شبینہ کی طرف دیکھتا رہا پھر بہت حوصلے اور وقار سے گویا ہوا۔ ''مجھے...... سمجھ نہیں آ رہی شبینہ کہ مجھے ابا جان سے ملنا چاہیے یا نہیں۔ ان کے ہاتھ میری بے گناہ معصوم بہن کے خون سے رنگے ہوئے ہیں...... میں ان کے سامنے اگر جاؤں گا...... تو میری آنکھوں میں سوائے نفرت کے کچھ نہیں ہوگا...... شبینہ یقین کرو کچھ دن پہلے تک مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ نفرت کس بلا کا نام ہے۔ ابا جان ڈانٹتے تھے، پھٹکارتے تھے برا بھلا کہتے تھے مگر میں ہمیشہ یہی سوچ کر خود کو سمجھاتا تھا کہ یہ ابا جان کی عادت ہے آخر وہ ہمارے باپ ہیں...... بہت محبت کرتے ہیں، پولیس ڈیپارٹمنٹ میں اللہ جانے کس کس کی باتیں سنتے ہیں ہم چار بندے ان کی ذمے داری ہیں جو وہ نبھا رہے ہیں۔ میں نے کبھی ابا جان کے لیے نفرت کا جذبہ محسوس نہیں کیا بلکہ میں تو یہ سوچا کرتا تھا کہ کچھ دن بعد جب میری تعلیم مکمل ہو جائے گی تو میں اچھی جاب کی تلاش میں وقت ضائع نہیں کروں گا جو جاب بھی مل جائے گی کر لوں گا تاکہ ابا جی کا بوجھ بٹا سکوں۔ ان کی ذمے داری ہلکی کروں بس مگر......'' برہان بولتے بولتے رک گیا...... اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

شبینہ نے پوری آنکھیں کھول کر بھائی کا چہرہ دیکھا...... لفظ مگر کے آگے بہت کچھ تھا...... مگر شبینہ اندازوں کے گھوڑے نہیں دوڑانا چاہتی تھی وہ چاہتی تھی مگر کے بعد جو کچھ بولنا ہے برہان جلدی سے کہہ دے۔

''مگر میں ابا جان سے نہیں ملوں گا۔ نہ میں ان کی ضمانتوں کے لیے اِدھر اُدھر مارا مارا پھروں گا...... میں کسی وکیل کے پاس جاؤں گا نہ میں جھوٹی گواہیاں خریدوں گا اور ابا جان کی رہائی کے لیے بڑے سے بڑا وکیل کرنا ایسا مسئلہ نہیں ہے لیکن کیوں کروں، ان کو جھوٹ بولنے کے پیسے دوں، مظلوم منوں مٹی کے نیچے...... ظلم کرنے والے کے لیے بھاگ دوڑ...... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' شاید برہان اپنی قوتِ برداشت اس سے زیادہ نہیں آزما سکتا تھا...... اتنا کہتے ہی وہ شبینہ کے سامنے سے ہٹ گیا لیکن شبینہ کو بھی ایک سوچ دے کر چلا گیا۔

باپ کا حق ادا کیا جائے؟ مظلوم بہن کے خون کا بدلہ لیا جائے؟ کتنا خوفناک اور مشکل ترین دوراہا تھا کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ اِدھر جائیں یا اُدھر......

☆☆☆

کائناز اور روما آنکھیں پھاڑے رابی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''کیا کہہ رہی ہیں آپا......؟'' کائناز نے روما سے پہلے خود کو سنبھال لیا تھا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہوں کائناز...... مجھے تو کل ہی پتا چل گیا تھا، میں سوچ رہی تھی کہ شاید دادا جان نے تم دونوں کو بھی بتا دیا ہوگا......''

''اوہ مائی گاڈ...... یہ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''کیا نہیں ہو سکتا، سہراب خان چھتیسویں شادی کر سکتا ہے......'' کائناز حیران ہو کر رابی کی طرف دیکھنے لگی۔ کائناز کی آنکھوں میں بڑی حیرت اور معصومیت تھی۔

''چھتیسویں شادی 36means...... مگر......'' کہہ کر وہ رک گئی اور بڑی معصومیت اور سادگی سے کہنے لگی۔ ''لیکن آپا خالہ جانی کہہ رہی تھیں کہ شاید وہ ان کی تیسری یا چوتھی شادی تھی۔''

''یہ decleared شادی تھی میں ان شادیوں کی بات کر رہی ہوں جو اس نے دنیا سے چھپائی ہوئی ہوں گی ایسے لوگ جب تک پچاس ساٹھ شادیاں نہ کریں ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔''

روما اور کائناز دونوں نے ایک جیسی حرکت بے ساختہ کی تھی۔ یعنی اپنے دونوں ہاتھ سر پر مارے تھے۔

''پچاس ساٹھ شادیاں توبہ کریں رابی آپا...... آپ نے بھی حد کر دی ہے...... میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے سر تو اتنے اچھے ہیں، ظاہر ہے ان کی بہن بھی بہت اچھی ہوں گی۔ ان کے ابو بھی بہت اچھے ہوں گے تو اس طرح کے لوگوں کے ہاں تو یہ مرڈر وغیرہ نہیں ہوتے۔ کرمنل لوگ تو دوسرے ہوتے ہیں ناں مطلب غلط، غلط کام کرتے ہیں۔''

''اچھا تم رہنے دو۔'' رابی نے فوراً ٹوک دیا تھا۔ ''کچھ لوگ...... کرائم کرتے ہیں لیکن ان کی شکل سے لگتا ہے کہ وہ ابھی تک دودھ کو دودو بولتے ہیں۔ اس دنیا میں جو چہرے دھوکا دیتے ہیں ان کی تعداد بھی بہت ہے کوئی کم نہیں ہے۔''

''لیکن آپا آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔ سر برہان کسی کرمنل فیملی سے belong کرتے ہیں؟'' روما اسی طرح معصومیت سے پلکیں جھپکاتے ہوئے رابی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ رابی کی آنکھوں میں برہان کا نام سن کر جگنو سے چمکنے لگے تھے کیونکہ اس نے تو اس کا دوسری مرتبہ دیدار کرنے کے لیے گھڑیاں گنی تھیں۔ مہر جان کے گھر میں رہتے ہوئے شاید یہ خوب صورت جذبات اور احساسات اس کے دل میں پیدا ہو ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ وہاں گھر کے کھڑکیاں دروازے تو بند تھے ہی انسانوں کے دماغ کے سارے خلیوں کو بھی کنٹرول میں رکھا جاتا تھا۔ ایک ذرا سی آزادی کا احساس ہوا اور کوئی سامنے آ کھڑا ہوا۔

''آپا، آپ کیا سوچ رہی ہیں کہاں کھو گئیں؟'' کائناز نے رابی کو گم صم دیکھ کر فوراً کہا تھا۔ کائناز اور روما کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ رابی ایک دم اپنے کسی خوب صورت جہان سے چھلانگ مار کر ان کے

درمیان آگئی۔

"کتنے دکھ کی بات ہے، ہے ناں آپا......"

"بہت دکھ کی بات ہے۔" رابی کے لہجے میں جو معنی چھپے ہوئے تھے ان دونوں کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکتی تھی مگر انداز معنی خیز تھا۔

"اب تو سر ہمیں پڑھانے بھی نہیں آئیں گے۔"

"ظاہر ہے۔" روما نے کائناز کی بات کے جواب میں فوراً ہی کہا تھا۔

"انہیں کتنی شرمندگی محسوس ہو رہی ہوگی۔ رابی آپا بتا رہی تھیں کل کے اخبار میں نیوز بھی لگی تھی آج کے اخبار میں بھی آئی ہوگی...... کیونکہ بندہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کا ہے، اب یہ لوگ کچھ دن تک چیخ و پکار کریں گے کسی نہ کسی بہانے سے اخبار میں نیوز لگتی رہیں گی ہو سکتا ہے کہ ہم لوگوں کو اخبار سے ہی پتا چل جائے کہ اصل مسئلہ کیا ہے۔" روما اور کائناز نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"لیکن آپا ہمیں پتا بھی چل گیا۔ مسئلہ کیا تھا تو ہمیں کیا فائدہ......" روما بڑی سنجیدگی اور وقار سے گویا ہوئی

"ہاں روما ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے آپا! ہمارا تو نقصان ہو گیا ناں...... پتا نہیں نیا ٹیوٹر کیسا ملے گا۔"

"تمہیں نئے ٹیوٹر کی پڑ گئی کائناز، یہ تو سوچو ان لوگوں پر اس وقت کیا بیت رہی ہوگی۔" رابی نے اپنے چہرے پر لاشعوری طور پر انگلیاں پھیرتے ہوئے...... کسی خیال میں کھو کر کہا تھا۔

روما اور کائناز پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ سوال ختم ہو چکے تھے جواب کوئی نہیں تھا۔



جابر علی لاک اپ کے ٹھنڈے فرش پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا ہوا تھا۔ بے شمار خیالات آرہے تھے اور کوئی خیال ایسا نہیں تھا جس میں اس کے گہرے کنویں سے باہر آنے کا کوئی امکان ہوتا...... وہ جانے کب تک مختلف خیالات کی یلغار میں بہتا رہتا کہ معاً اس کے کانوں میں سپاہی کی آواز آئی جو اسے مخاطب کر رہا تھا۔

وہ سپاہی سالوں سے اس کی ماتحتی میں کام کر رہا تھا اس کی آواز وہ ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔

"سر آپ، آپ سوئے نہیں، رات کافی ہو گئی ہے۔" سپاہی اسے سر کہہ رہا تھا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اقبالی مجرم ہے۔ لاک اپ کے پیچھے ہے...... لاک اپ کے پیچھے جاتے ہی اس کے سارے پھول، ستارے مٹی کے ڈھیر بن گئے تھے اس کے باوجود سپاہی اسے سر کہہ رہا تھا۔

اس نے سر اٹھا کر سپاہی کی طرف دیکھا مگر اس کے پاس شاید کرنے کے لیے کوئی بات ہی نہیں تھی دوبارہ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

"سر وہ میں آپ سے یہ پوچھ رہا تھا کہ ابھی تک آپ کے گھر سے کسی نے رابطہ نہیں کیا۔ کوئی آپ سے ملنے نہیں آیا؟" سپاہی کی بات سن کر جابر علی جیسے کسی گہرے دھیان سے چونک گیا اس نے سپاہی کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھا اب بھی اس کے پاس سپاہی سے کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

"سر وہ میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں، سالوں آپ کی ماتحتی میں کام کیا ہے۔ اس پورے پولیس اسٹیشن میں آپ سے زیادہ ایماندار افسر میں نے نہیں دیکھا۔ آپ سے پہلے جس افسر کے ساتھ کام کر رہا تھا اس کے ساتھ دفتر کے کام کے علاوہ بھی بہت کام کرنا پڑتا تھا مگر آپ نے مجھے کبھی آفس سے باہر کا کام نہیں کہا۔ میرے

دل میں آپ کی بہت عزت ہے اس کے باوجود کہ آپ پر قتل کا الزام ہے۔''
''الزام نہیں ہے مہر داد خان۔'' جابر علی کی آواز نے ماحول کے سناٹے کو چیر کر رکھ دیا۔ وہ اپنی مخصوص بلند آواز میں گویا ہوا تھا۔ سپاہی مہر داد خان حیران نظروں سے جابر علی کی طرف دیکھنے لگا۔
''الزام نہیں ہے سر مگر مجھے یقین نہیں آرہا کہ کوئی انسان اپنی اولاد کو کیسے موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے؟''
''تم پولیس ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتے ہو...... روز ہی بڑی عجیب وغریب اور انوکھی خبریں سنتے ہو، اس کے باوجود تمہیں یقین نہیں آرہا...... حیرت ہے۔'' جابر علی اب گھٹنوں پر ہاتھوں کا زور ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا اور آہستہ، آہستہ چلتا ہوا لاک اپ کی سلاخوں کے قریب آگیا۔
مہر داد خان آنکھیں پھاڑے جابر علی کی طرف دیکھ رہا تھا۔
''لیکن سر آپ جیسا نمازی، پرہیز گار خوفِ خدا رکھنے والا ایمانداری سے ڈیوٹی دینے والا...... وہ یہ غیر قانونی قدم کیسے اٹھا سکتا ہے۔ مجھے یہ بات سمجھ ہی نہیں آرہی۔'' مہر داد خان بہت آہستہ آواز میں بات کر رہا تھا اور ساتھ میں اِدھر اُدھر بھی دیکھ رہا تھا کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا، سن تو نہیں رہا۔
''مہر داد خان تم اپنے کام سے کام رکھو۔ اب میں نہ تمہارا افسر ہوں اور نہ تم میرے ماتحت...... چند روز میں تمہیں نیا افسر مل جائے گا، تم ایمانداری سے اپنا کام کرو جس نے جو کیا ہے وہ بھگت لے گا۔''
''سر میں آپ سے یہ عرض کر رہا تھا کہ آپ کب سے لاک اپ میں بند ہیں، آپ کے گھر سے کوئی نہیں آیا۔ نہ کسی کا فون آیا نہ کسی نے آپ کے بارے میں کچھ پوچھا تو بس یوں ہی میرے دل میں خیال آیا کہ میں آپ سے پوچھ لوں کہ میں آپ کے کسی کام آسکتا ہوں۔'' مہر داد خان حقِ وفاداری ادا کر رہا تھا۔
جابر علی کی آنکھوں میں اس کے لیے بڑے اچھے جذبات دکھائی دیے۔ اس نے قدر دان نظروں سے مہر داد خان کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''بہت بہت شکریہ مہر داد خان اس اندھیرے میں تم مجھے بہت اپنے، اپنے سے محسوس ہو رہے ہو مگر شاید اب مجھے کسی اپنے کی ضرورت نہیں، میں نے ایک جرم کیا، میری نظر میں اگرچہ وہ جرم نہیں مگر قانون کی کتابوں میں اسے جرم لکھا گیا ہے اور جرم کے ساتھ سزا بھی لکھی ہوتی ہے، میں ہر طرح کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں، ہوسکتا ہے مجھے پھانسی لگ جائے۔'' جابر علی اب خود کلامی کے انداز میں بات کر رہا تھا۔
''سر آپ تو خود قانون کی پاسداری کرنے والوں میں سے ہیں پھر یہ کیا ہوگیا؟'' مہر داد خان حیران پریشان بس اسے تکے جا رہا تھا۔
''میں نے کہا ناں مہر داد خان تم میری فکر مت کرو، میں اندر سے بالکل مطمئن ہوں۔ میں نے بے ایمانوں کے سامنے، غداروں کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ جن نافرمانوں کے اللہ کے سامنے سر نہیں جھکتے ان کے سامنے سر جھکانے سے تو بہتر ہے کہ بندہ پھانسی چڑھ جائے۔'' جابر علی اب سوچ سوچ کر بول رہا تھا اس کی آنکھوں سے لگتا تھا کہ جیسے وہ تصور میں کچھ دیکھ رہا ہے۔
''آپ کی بات ٹھیک ہے سر، ظلم کے آگے سر جھکانا تو خود ایک جرم ہے مگر سچ پوچھیں تو مجھے بہت دکھ ہے۔ ایک کے سامنے پوچھ لیں یا سو کے سامنے میں تو یہی گواہی دوں گا کہ میں نے آپ جیسا ایماندار افسر ابھی تک نہیں دیکھا۔''
''بہت بہت شکریہ......! مہر داد خان، میں تمہاری اس عزت افزائی کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔'' جابر علی ایک روبوٹ کے انداز میں گویا ہوا۔

”میرے لائق کوئی خدمت؟“ مہرداد خان نے اسی مؤدبانہ انداز میں پوچھا تھا۔

”نہیں......! اب شاید مجھے کسی خدمت کی ضرورت نہیں ساری زندگی سچ بولتا رہا...... جان بچانے کے لیے جھوٹ نہیں بولوں گا۔“ جابر علی کی آنکھوں میں اس کی فطری انتہاپسندی بہت نمایاں تھی۔

☆☆☆

اصیل خان گھر کے لان کی سنگی بینچ پر بیٹھا کسی گہرے خیال میں گم تھا۔ گل جان تسبیح پڑھتی ہوئی برآمدے میں نکل آئی چونکہ مہرجان نیند کی گولیوں کے زیرِاثر گہری نیند سوچکی تھیں اور اس کا دل اندر کمرے میں گھبرانے لگا۔ باہر آتے ہی اس کی نظر اصیل خان پر پڑی تھی۔ وہ تسبیح کے دانے گراتے گراتے رک گئی۔ ایک سوچ اس کی آنکھوں میں جھلکی اور وہ آہستہ، آہستہ چلتے ہوئے اصیل خان کے قریب آگئی۔ وہ اصیل خان کے بالکل قریب آچکی تھی مگر اصیل خان کو جیسے آس پاس کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ وہ کسی اور دنیا میں سیر کناں تھا۔

”میں نے تمہیں منع کیا تھا اصیل خان، تم کوٹھی کے کسی حصے میں دکھائی نہیں دو گے مگر پھر تم یہاں لان میں آکر بیٹھ گئے۔“

”آپ خواہ مخواہ ڈر رہی ہیں گل جان بی بی، ڈاکٹر صاحبہ نے اگر مجھے پہچان بھی لیا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ اصیل خان نے مطمئن لہجے میں گویا گل جان کو تسلی دی۔

”کچھ برا بھی تو ہوسکتا ہے اصیل خان...... ان کی حالت زیادہ خراب ہوسکتی ہے۔ مجھے اپنی بہن کو چند دن ہر غم سے دور دیکھنے کی تمنا ہے، وہ آج کل ہنستی بھی ہیں، مسکراتی بھی ہیں،...... ترس گئی تھی میں اُن کی ہنسی کو...... بس اب تو یہی دل چاہتا ہے کہ وہ ہنستی مسکراتی رہیں اور میں انہیں دیکھتی رہوں۔“

”گل جان بی بی یہ خود کو دھوکا دینے والی بات ہے۔ وہ سب کچھ بھول چکی ہیں اس لیے ہنستی مسکراتی ہیں لیکن کسی بھی وقت سب کچھ انہیں یاد آسکتا ہے۔ جس طرح سے اچانک وہ سب کچھ بھول بیٹھیں اسی طرح سے اچانک انہیں بہت کچھ یاد بھی تو آسکتا ہے۔“ اصیل خان الجھی، الجھی کیفیت میں بول رہا تھا۔

”تم تو خود اپنے حواس کھو بیٹھے ہو اصیل خان...... کوئی فلم چل رہی ہے کہ منٹ میں یادداشت گئی اور منٹ میں واپس آگئی۔ تمہاری ڈاکٹر سے بات نہیں ہوئی مگر میری ڈاکٹر سے بہت تفصیل سے بات ہوئی ہے۔“ گل جان اب قدرے جھنجلا کر خفا خفا انداز میں گویا ہوئی۔

”آپ سے ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟“ اصیل خان نے بڑی بے تابی سے پوچھا تھا۔

”کچھ نہیں...... ڈاکٹر یہ کہہ رہا تھا کہ یہ سب اچانک تو نہیں ہوا ان کے ساتھ کافی عرصے سے مسئلے چل رہے تھے۔ ذہنی حالت تو مدت سے نارمل نہیں تھی۔ وہ جو اتنا چیختی تھیں، چلاتی تھیں تو وہ کہہ رہا تھا کہ ان کا بلڈ پریشر ہی ہائی رہتا تھا۔ شکر ہے کہ انہیں attack یا haemorrhage نہیں ہوا ورنہ زیادہ عرصہ بلڈ پریشر ہائی رہتا ہے تو فالج یا ہارٹ اٹیک کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔“ گل جان جیسے اپنی یادداشت پر زور ڈال کر بات کررہی تھی۔ جو ڈاکٹر کے ساتھ اس کی بات چیت ہوئی تھی اسے حافظے میں لانے کی بہت کوشش کررہی تھی جیسے بکھرے، بکھرے خیال اس کی یادداشت کو متاثر کررہے تھے۔

”وہ تو ٹھیک ہے گل جان بی بی! آج کل ہر تیسرے بندے کا بلڈ پریشر ہائی رہتا ہے۔ اس لیے لوگوں میں برداشت بھی ختم ہوگئی ہے۔ بات بات پر لڑنے مرنے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں لیکن خود کو پیشنٹ ماننے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوتا۔“ اصیل خان نے آہستہ آواز میں سر جھکا کر جواب دیا۔

”ڈاکٹر بھی یہی کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحبہ کو ڈاکٹر ہونے کے ناتے پتا ہونا چاہیے تھا کہ ان کا بی پی نارمل نہیں رہتا، انہوں نے توجہ ہی نہیں دی۔ شاید وہ خود کو بالکل فٹ سمجھتی تھیں اور دوسرے لوگوں کو اَن فٹ......“ یہ کہہ کر گل جان نے ایک گہری سانس لی تھی۔

”لیکن گل جان بی بی، ہائی بلڈ پریشر سے دماغی مرض کا کیا تعلق بھلا...... یہ تو نفسیاتی بیماری ہوئی ناں......؟“

”ہاں......!“ گل جان، اصیل خان کی بات سن کر کچھ سوچتے ہوئے بولی...... ”کچھ سمجھ ہی نہیں آرہی اصیل خان، کچھ تو تھا جو بی بی جان کے اندر پل رہا تھا...... دیکھو ناں بندہ نہ خوش رہے اور نہ دوسروں کو خوش دیکھنا چاہے، ہر وقت صرف اور صرف اپنے حکم کی تعمیل چاہے۔ ذرا سی مرضی کے خلاف بات ہوجائے تو اتنا ہنگامہ کرے کہ در و دیوار کانپنے لگیں۔ یہ نارمل رویہ تو نہیں ہوسکتا ناں اصیل خان! اس کا مطلب ہے ڈاکٹر صحیح کہتا ہے کہ وہ بہت عرصے سے اب نارمل زندگی گزار رہی تھیں۔ میں تو سمجھو ان پڑھ ہی ہوں میں کیسے سمجھ سکتی تھی لیکن ان کے ساتھ جو ڈاکٹر تھے کم از کم انہیں تو اس بات کا اندازہ ہوجانا چاہیے تھا...... پتا نہیں یہ ایک دم سے کیا ہوگیا۔“ گل جان جیسے اندازے لگاتی لگاتی تھک گئی آخری جملہ اس نے بڑے کوفت بھرے انداز میں کہا تھا۔

”گل جان بی بی زبان ساتھ نہیں دے رہی ایک بات ہونٹوں تک آتے، آتے رک جاتی ہے۔“ اصیل خان ہچکچاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”بول دو اصیل خان کچھ فرق نہیں پڑتا ہم تو طوفان کی پیش گوئی سے لے کر طوفان آنے کے بعد کے سارے منظروں سے نمٹ چکے ہیں، فارغ ہوگئے ہیں۔ اب تو بس قیامت ہی آئے گی اور وہ تو سب کے لیے آئے گی۔“ گل جان کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ اور لہجے میں بلا کا زہر تھا۔

اصیل خان کا سر مزید جھکتا چلا گیا۔

”کہو اصیل خان کیا کہہ رہے تھے۔“ گل جان اس کی خاموشی سے تنگ آکر بولی۔

”بس گل جان بی بی، میں تو بچیوں کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ انہی کی بات کرنا چاہ رہا تھا۔ ان دونوں کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے۔ ظاہر ہے ڈاکٹر صاحبہ تو فی الحال ان کے لیے نہ سوچ سکتی ہیں اور نہ کچھ کرسکتی ہیں۔“ اصیل خان نے جیسے بہت مشکل سے گل جان سے یہ بات کہی تھی، اس کے لہجے سے لگتا تھا کہ لفظ جیسے کسی پُل صراط سے گزرتے ہوئے آگے بڑھنے کے بجائے دائیں بائیں گہری کھائیوں میں گر رہے ہوں۔

”اب تم بچیوں کی فکر مت کرو اصیل خان، بچیاں بہت سکون سے ہیں۔ شکر ہے انہوں نے بھی سکون کی سانسیں لی ہیں۔ ان بچیوں کے سکون کی دشمن میری بہن نہیں تھی...... میں...... اور تم تھے۔ اصیل خان یہ کتنا بڑا سچ ہے لیکن ہم دونوں کو برداشت کرنا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے وہاں سے پلٹ گئی۔

☆☆☆

”کیا خیال ہے وارث علی ہم اس چوہے سے کچھ زیادہ ہی نہیں ڈر گئے تھے۔“ ایس پی اس وقت تازہ دم اور پُرسکون دکھائی دے رہا تھا جیسے اس نے اپنے سارے بڑے، بڑے مسئلوں کا کوئی اچھا حل ڈھونڈ لیا ہو۔ وارث علی نے ایس پی کی بات سن کر ایک زبردست قہقہہ لگایا تھا۔

”سر جی سمندر کا سینہ چیر کر آگے بڑھتا ہوا جہاز کتنا عظیم دکھائی دیتا ہے۔ چوہا اس میں چھوڑ دیں بس اس کا ایک سوراخ کردینا ہی کافی ہے...... جہاز میں ایک چھوٹا سا سوراخ ہوا اور پورا جہاز غرق...... کیا سمجھے

سر......!''

وارث علی کی بات سن کر جواباً ایس پی نے بھی اس کی طرح قہقہہ لگایا تھا۔

''جواب نہیں وارث علی تمہارا! کیا دلیلوں کے ساتھ جواب دیتے ہو...... اگر تم وکیل بن گئے ہوتے تو شاید ہی کوئی مقدمہ ہارتے۔'' ایس پی نے وارث علی کی مداح سرائی کی' آخر کیوں نہ کرتا۔ یہ وارث علی ہی تو تھا جس کے دم سے اس کے فارن کرنسی اکاؤنٹ کھل گئے تھے۔

''ہار ماننا تو وارث علی نے سیکھا ہی نہیں۔'' وارث علی نے بڑے مغرور انداز میں سگریٹ نکالتے ہوئے ایس پی کی طرف دیکھا تھا' آنکھوں میں غرور اور تکبر کے تاثرات تھے جبکہ ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''اب اتنا زیادہ اوور کانفیڈنٹ ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ بندہ لاک اپ میں ہے' لفظوں کے ہیر پھیر سے کیس پلٹ سکتا ہے۔ مجھے تو باوثوق ذرائع سے پتا چلا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اس کے پاس ایسے ثبوت ہیں کہ اس اسٹیشن کے بہت سے لوگ بڑی آسانی سے قانون کی گرفت میں آسکتے ہیں اور وہ یہ ثبوت عدالت میں ضرور پیش کرے گا۔ اکیلا پھانسی نہیں چڑھے گا۔'' ایس پی اب پُرتفکر انداز میں وارث علی کی طرف دیکھ کر بولا تھا۔

''ایسی کی تیسی اس کے ثبوتوں کی، ہم بھی شطرنج کھیلنا جانتے ہیں۔ کچھ نہیں کر سکتا وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ سر جی آپ آرام سے روٹی پانی کریں کوئی ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں۔ ہم بھی شطرنج کے پرانے کھلاڑی ہیں' وہ ایک مہرہ آگے بڑھائے گا ہماری طرف سے تین چلیں گے۔''

''کیا مطلب......؟'' ایس پی نے وارث علی کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ وارث علی کے منہ سے بہت کچھ صاف، صاف سننا چاہتا ہوتا کہ وہ زیادہ پُرسکون ہو جائے...... کیونکہ جرم کتنا ہی چھپا ہوا کیوں نہ ہو جرم کرنے والے کے دل میں کانٹے کی طرح کسی نہ کسی وقت کھٹک ہی جاتا ہے۔

''میں جابر علی کی مقتولہ بیٹی کا شوہرِ نامدار ہوں سر جی...... پکی رشتے داری ہے' ابھی اس کی ایک بیٹی اور بیٹا موجود ہیں ان کو مہرے بنا کر کھیلیں گے۔''

''اچھا......؟'' وارث علی کی بات سن کر ایس پی نے بڑی دلچسپی سے اس کی طرف دیکھا جیسے وارث علی کی بلائیں لے رہا ہو...... حالانکہ اس کے پاس تو قوت کے بہت سے لوازمات موجود تھے۔ وارث علی کے پاس کوئی نام کوئی عہدہ نہیں تھا صرف پیسہ تھا اور پیسہ بھی ایسا جیسے کسی کا کالا منہ رگڑ رگڑ کر صاف کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ بلیک منی کو وائٹ منی بنانے کی کوشش......

''سر جی اتنی سی بات ہے آپ بھی ذہن میں بٹھالیں اور پُرسکون ہو جائیں کہ وہ اندر ہے اور ہم باہر...... باہر والے پاور میں ہوتے ہیں سر جی۔'' یہ کہہ کر وارث علی نے پھر اپنا مخصوص شیطانی قہقہہ بلند کیا تھا۔

ایس پی بھی مسکرا رہا تھا جیسے نظروں ہی نظروں میں اس پر نثار ہو رہا تھا۔ ایسا ساتھ تو نصیب سے ملتا ہے جو تسلیاں بھی دے اور نوٹ بھی۔

''سر آپ فکر نہ کریں، شہ ہمارے پاس ہے۔'' اس نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے تصور میں جیسے جابر علی کو دیکھ کر اس کا مذاق اڑایا تھا۔

''تو پھر کھیلو!'' ایس پی نے اس کی سگریٹ کی ڈبیا کی طرف ہاتھ بڑھایا...... پولیس افسر تھا۔ اس کے سامنے وارث علی کی سگریٹ کی ڈبیا بڑی تھی اسے کیا پڑی تھی کہ اپنی سگریٹ نکالتا۔

جاری ہے



میں بھلا کون ہوں

روئی ہوں آج کھل کے بڑی مدتوں کے بعد
بادل جو آسمان پہ چھائے تھے چھٹ گئے
کس دھیان سے پرانی کتابیں کھلی تھیں کل
آئی ہوا تو کتنے ورق ہی الٹ گئے

8 مارچ ''یوم خواتین'' کے حوالے سے عاشفہ مسعود کی پُراثر تحریر......

میرا بڑا بیٹا اسکول جاتے ہوئے آج پھر تاکید کر کے گیا ہے۔

''اماں آج آپ کو میری ڈائری میں اپنا انٹرویو ضرور دینا ہے۔ آج کوئی کام کا بہانہ نہیں چلے گا۔ آپ کو تو کبھی فرصت ہی نہیں ملتی۔ بس جو بھی ہو آج یہ کام ضرور ہونا چاہیے۔'' سو ہم نے جیسے تیسے کر کے کام سمیٹے اور ڈائری نکال کر بیٹھ گئے۔ جب سے بڑا بیٹا سینئر اسکول گیا ہے۔ اسے ڈائری لکھنے کا شوق

ہوگیا ہے اور آج کل وہ اپنی ڈائری میں اپنے دوستوں اور گھر والوں کے انٹرویوز لے رہا ہے۔ ہمارا تعارف بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو ہماری نادیدہ مصروفیت کی وجہ سے کئی دن سے ٹل رہا تھا۔ ورنہ بقول ساسو ماں۔ ”گھر میں کام ہی کیا ہے، اتنے ملازمین کی موجودگی میں صرف ایک کھانا ہی تو پکانا ہوتا ہے۔ وہ بھی نہ مرچیں نہ مسالا کوٹنا، نہ آٹا پیسنا، دنیا میں عورتیں کیا، کیا نہیں کرتیں۔ ارے کام تو ہم نے اپنے دور میں کیا ہے۔“ یعنی اماں جی کا جوانی نامہ شروع۔

ہمارا خیال تھا پانچ دس منٹ کا کام ہے جلد نبٹ جائے گا مگر اوپر لکھا تھا۔

”اللہ کو حاضر و ناظر جان کر سچ لکھیں۔“

”اوہ میرے بھولے بیٹے، ہم پاکستانیوں نے کب اللہ کو حاضر و ناظر سمجھا ہے!“

”سب سے پہلا سوال آپ کا نام؟“

”ہم سوچ رہے ہیں ہمارا اصل نام کیا ہے۔ ابا نے خوب سوچ سمجھ کر ہمارا نام قاصرۃ الطرفین رکھا، یہ نام اسکول کالج یا پھر شناختی کارڈ اور آخری مرتبہ شاید نکاح نامہ میں لکھا گیا۔ ہمارا نام تو مختلف ادوار میں مختلف رہا۔ اسکول میں داخلے کے بعد جب اپنی پہچان بننی شروع ہوتی ہے تو ہماری پہچان ہمارے ابا بنے جو کہ ایک نامور ادیب اور استاد تھے۔

”اچھا تو آپ طاہر صاحب کی بیٹی ہیں۔ باپ اتنا قابل اور آپ کے اتنے کم نمبر۔“ اب انہیں کون سمجھائے کہ قائداعظم کے بھی نمبر کم آتے رہے ہیں۔

”یہ تقریر تم لکھوا لو تم تو طاہر صاحب کی بیٹی ہو۔“ دوسری آواز آئی۔

”اوہ، اچھا باپ سے مضمون لکھوایا ہے اسی لیے پہلی پوزیشن آگئی۔“ غرض تعلیمی میدان میں ابا ہی ہماری پہچان بنے۔ کوئی قابلِ ذکر کام کیا یا غلطی، نام ابا ہی کا لیا گیا بقول بانو قدسیہ، گھنے درختوں کے نیچے پرورش پانے والے پیڑ کم ہی تناور ہوتے ہیں۔“ سو ہم بھی زندگی کے کسی میدان میں تناور نہ ہوئے پڑھائی کے بعد شادی جس کے بعد آپ کا تعارف یوں ہوتا ہے۔ ”علی کی بیوی، مسز علی، بیگم علی۔“ سے ہر جگہ کام چل جاتا۔ دو سال بعد ماں کے عہدے پر فائز ہوئے تو نام بدل کر ولی کی اماں بن گئے سو یہ تعارف اب تک برقرار ہے اب ان میں سے ہم کون سا نام لکھیں۔ سمجھ نہیں آرہی۔

”اگلا سوال آپ کی تاریخ پیدائش؟“

اس معاملے میں ہم عورتیں بھی ناں...... حقیقت سے نظریں چراتی ہیں لیکن مرد بھی تو ہمیں اس کام پر مجبور کرتے ہیں۔ خود بے شک پچاس کے ہوں شادی کے لیے رال ہمیشہ بیس سالہ لڑکی پر ٹپکتی ہے۔ اپنے سے دس سالہ چھوٹی عورت بھی ایک دو بچوں کے بعد بوڑھی لگنے لگتی ہے۔ پچھلے دنوں ایک شادی میں تقریباً تمام خاندان موجود تھا۔ ہم فارغ بیٹھے بور ہو رہے تھے تو ایک ریسرچ تمام کپلز پر شروع کی...... جس کا نتیجہ حیرت انگیز نکلا۔ تمام خواتین مختلف بیماریوں مثلاً بی پی، شوگر، جوڑوں کے درد اور گھٹنوں کے درد کا شکار اور مرد حضرات خوش باش، فرسٹ کلاس، صحت مند...... ایسے میں کون فورٹی پلس ہونے کا اعتراف کرے...... جیسے یہ بھولے بیٹھے ہیں ہم کیوں یاد دلائیں۔ ہم تو اس ڈر سے اپنی سالگرہ بھی نہیں مناتے چلو اس سوال کو رہنے دیں۔

”اگلا سوال تعلیم کے بارے میں ہے؟“

اس کا جواب بھی بہت مشکل ہے۔ آپ نے تعلیم کے میدان میں جتنے بھی معرکے مارے ہوں جیسے بھی قابل طالبِ علم رہے ہوں۔ آخر کار رہنا تو وہی بے وقوف عورت ہی ہے ناں...... وہی چولھا چکی آپ کا میدانِ عمل ٹھہرتا ہے اور آپ کی ڈگری آپ کے میکے کے کسی پرانے صندوق یا کاغذوں والی دراز کی زینت بنی رہتی ہے۔ چاہے زمانۂ طالبِ علمی میں آپ کو شیکسپئر ازبر رہا ہو آپ کا حلیہ ایسا ہو جاتا ہے کہ بچے آپ کی ہمدردی میں آپ کو چھوٹی، چھوٹی باتیں اردو میں سمجھانے لگتے ہیں یا پھر کہیں گے ”رہنے دیں اماں، یہ انگلش والا میں خود کرلوں گا۔“ ابھی چند دن پہلے ہمارا چھوٹا بیٹا کہنے لگا۔

”اماں اگر آپ نے اچھا پڑھا ہوتا تو پھر آپ بھی اچھی سی جاب کرتیں اور آپ کو گھر میں ماسیوں والے کام نہ کرنے پڑتے۔“ بہت کم عمری سے ہی عاصمہ جہانگیر اور شاہدہ جمیل جیسی خواتین ہمارا آئیڈیل تھیں۔ ایف ایس سی میں اچھے نمبر آنے کے بعد ایل ایل بی میں گولڈ میڈلسٹ ہوئے پھر بھی خیالوں میں بس کالا کوٹ صرف خواب ہی رہا۔ حقیقت میں پہننا نصیب نہ ہوا۔ پہلے اماں رکاوٹ بنیں۔ ”بھئی ایسے کام اپنے گھر جا کر کرنا۔“ پھر مجازی خدا نے حقیقی خدا بننے کی کوشش کی۔

”کورٹ کچہری میں بھلا ہمارے گھر کی عورتیں...... ناممکن...... اس گھر میں رہتے ہوئے ایسا سوچنا بھی مت۔“ آج کل ہم سوچ رہے ہیں اپنا ہی گھر بنالیں۔ جہاں ہماری مرضی تو چلے مگر ابھی اتنی سیونگز نہیں۔

”اگلا سوال آپ کا پسندیدہ رنگ؟“

کافی دیر سوچنے کے بعد بھی رنگ سمجھ میں نہیں آیا۔ اصل میں ہماری اور ان کی پسند ندی کے دو کناروں کی طرح ہے جو آپس میں مل نہیں سکتی جو رنگ اور پرنٹ ہمیں بھاتا، ان کی نظر میں انتہائی فضول ٹھہرتا۔ ہمارے انتہائی شوق سے بنوائے جہیز کے کپڑے ہم پہن کر تیار ہوتے تو موصوف فرماتے۔

”تمہارے پاس کوئی ڈھنگ کا جوڑا نہیں، اس کو فوراً بدلو۔“ ہمارا پسندیدہ رنگ ایک زمانے میں سرخ تھا اور ان کا شجرہ کہیں نہ کہیں جا کر اسپین اور بُل سے ملتا ہے۔ ان کی طرف سے شادی سے پہلے پہلی فرمائش یہی آئی تھی کہ شادی کا سوٹ کسی ہلکے رنگ کا ہو سرخ بالکل نہ ہو...... اور ہمارا لالوں لال جہیز ہمارے ارمانوں کا تو جنازہ نکل گیا۔ اب شادی کے اتنے سالوں بعد ان کو ہمارے کپڑے تو کیا ہم بھی ٹھیک سے نظر نہیں آتے...... لیکن اب ہمارا مسئلہ ہماری ساسو ماں ہیں۔ ہمیں اپنی اور ان کی شاپنگ اکھٹی کرنی ہوتی ہے، ہم اپنی طرف سے جو سوبر رنگ اور پرنٹ ان کے لیے لیتے وہی آف وائٹ، براؤن، اسکن یا گرے سوٹ ہمارا مقدر بن جاتے اور ہمارے اپنے لیے پسند کیے جانے والے پنک، گرین یا برائٹ بلیو سوٹ انہیں پسند آتے ہیں۔ ان کی بیٹیاں اماں کے ان سوٹوں کے رنگ یا پرنٹ کو ناپسند کرتیں تو جھٹ کہا جاتا ”بیٹا ہم کون سا بازار جاتے ہیں ہمیں تو جو لادے صبر شکر سے پہن لیتے ہیں۔“ ایک مرتبہ بہت پسند آنے پر ہم نے ایک جیسے دو سوٹ لے لیے۔ دیکھ کر بولیں۔ ”بیٹا وردی تو ہمیں اپنے اسکول کے زمانے میں بھی پسند نہیں تھی۔“ ایک دو مرتبہ ہم اپنے لیے کافی شوخ سوٹ پسند کر کے لائے۔ انہیں نہ جانے ہماری پسند کی کیسے خبر ہوگئی۔ وہ سوٹ انہوں نے خود تو نہ پہنے البتہ ہمیں اپنی بیاہتا نندوں کے بدن پر نظر آئے۔

”اگلا سوال پسندیدہ لباس کے بارے میں؟“

ساڑی اور صرف ساڑی...... جو ہم آج تک نہیں پہن سکے۔ بچپن سے ہمیں فلمسٹار زیبا اور اس کی ساڑیاں بہت پسند تھیں۔ کیا گریس فل لگتی تھی زیبا ساڑی باندھ کر۔ بھلا ہو پڑوسی ملک کے ڈراموں کا جہاں ہر ویمپ بھی ساڑی پہنے نظر آتی ہے۔ یوں بھی میاں جی کی نظر میں ساڑی انتہائی واہیات لباس ہے۔ شادی کے بعد کسی فنکشن میں پہننے کا بہت دل چاہا بھی تو یہ سوچ کر رہ گئے کہ ساڑی کے ساتھ بچے کیسے سنبھالیں گے۔ میاں جی تو کہیں جاتے ہی بچوں کی وجہ سے گدھے کے سینگوں کی طرح غائب ہو جاتے ہیں۔ ویسے بھی لباس کے معاملے میں ان

کی پسند مشرق تو ہماری مغرب ہمیں ہمیشہ سے ہاف سلیوز فرنٹ اوپن یا لوز شرٹ پسند...... اور انہیں یہ ملنگوں والے کپڑے سخت زہر لگتے۔ انہیں فل بازو والی ٹپیکل شلوار قمیص پسند ہے جو ہمارے نزدیک انتہائی فضول ہے۔ کون گھر میں سارا دن فٹنگ والے کپڑے پہن کر دوپٹا سنبھالتا پھرے۔

"اگلا سوال پسندیدہ کھانے کے بارے میں؟"

اب باری تھی پسندیدہ کھانا لکھنے کی۔ یہ ہماری ایک اور دُکھتی رگ ہے۔ ہم پکے سبزی خور یعنی ہربی ورس ... اور یہ کارنی ورس یعنی گوشت خور...... اور بچے صرف چکن خور...... ایک کھانا باپ کی پسند کا بنتا تو دوسرا بچوں کی پسند کا اور تیسرا پرہیزی اماں کے لیے۔ اب چوتھا سالن کون بنائے وہ بھی صرف اپنے لیے۔ چھٹی والے دن چکن بریانی اور مٹن پلاؤ کا مقابلہ ہوتا ہے۔ ایسے میں بیچارے مٹر پلاؤ کو کون پوچھے۔ ساری گرمیاں گزر گئیں قیمہ کریلے کھانے کی حسرت ہی رہی۔ صرف اپنے لیے گرمی میں اتنا مشکل سالن کون بنائے۔ ابھی پچھلی گرمیوں میں تین گھنٹے کی مشقت کر کے قیمہ بھرے کریلے بنائے۔ بچوں اور شوہر صاحب نے دیکھتے ہی منہ بنالیا۔ ہم نے بھی اعلان کردیا نہ کسی کو کباب فرائی کر کے دیں گے نہ ہی انڈا۔ باپ بیٹوں نے قیمہ نکالا اور کریلے فوجی وردیوں کی طرح ایک طرف ڈھیر کردیے۔ میز سے اٹھتے ہوئے انہوں نے ارشاد فرمایا۔ "اس سے تو بہتر تھا صرف قیمہ ہی بنا لیتیں یہ بکرے کی کھالیں تو نہ اتارنی پڑتیں۔" اور تو اور اماں نے بھی کہا۔ "بہو دو کریلے کھول کر قیمہ پانی ڈال کر گرم کردو۔ اب میرے دانت کہاں جو اتنا خشک سالن کھاؤں۔" ہم جو اتنی دیر سے میز پر بیٹھے بکرے کی کھالیں اتار اتار کر دے رہے تھے واک آؤٹ کر گئے عجیب بد ذوق لوگ ہیں ہم بھی کہاں ڈائری سے نکل کر اپنی دکھ بھری رُوداد سنانے لگے خیر آگے بڑھیے۔

"اگلا سوال پسندیدہ خوشبو کے بارے میں تھا"

اس مہنگائی کے دور میں بجٹ دو، دو پرفیوم خریدنے کی اجازت کہاں دیتا ہے۔ ایک پرفیوم خریدا جائے گا جو ظاہر ہے ان کا ہوگا۔ ہم بھی بہ وقتِ ضرورت اسی مردانہ پرفیوم سے کام چلالیں گے پھر خوشبودار پاؤڈر کا چھوٹا ڈبا ہی کافی ہوگا۔ البتہ راشن خریدتے ہوئے اپنے پسندیدہ پرفیوم اٹھا اٹھا کر ضرور دیکھتے۔

"اگلا سوال پسندیدہ ٹی وی پروگرام؟"

اس کا جواب مشکل ہے ہمارے ہاں چوبیس میں سے بارہ گھنٹے تو ضرور ٹی وی چلتا ہے۔ دن بھر صرف کارٹون شام میں بھی بچوں اور باپ میں بحث ہوتی ہے۔ کرنٹ افیئر چلے گا یا انگلش چینلز...... ہم کسی فلم یا ڈرامے کے بارے میں سن بھی لیں تو مہینوں اسے دیکھنے کا پروگرام بناتے ہیں۔

"اگلا سوال پسندیدہ میوزک؟"

یہ بھی ایک بڑی وجۂ تنازع ہے۔ گانا سننے کا مزہ تو لانگ ڈرائیو میں آتا ہے۔ سفر میں پہلے ان کی پسند چلتی ہے۔ جہاں پر گانے پر بچوں کا احتجاج بلند ہوتا ہے۔ یوں دو تین گانوں کے بعد بچے جیت جاتے ہیں پھر بچے ہوتے ہیں اور ان کا دھنا دھن میوزک...... ہماری پسند کی غزلیں، فوک یا کلاسیکل سنتے ہی بچوں کی بوریت شروع...... بڑا بیٹا ایک دن پوچھنے لگا۔

"اماں پرانے زمانے کے لوگ ہر وقت روتے کیوں رہتے تھے۔ خوشی کے موقع پر بھی رو رو کر گاتے تھے۔"

"اگلا سوال تھا پسندیدہ شاعر، ادیب گلوکار......؟"

یہ کون لوگ ہیں سوچ کر بھی یاد نہیں آرہا تو یہ یہ انٹرویو ہے کہ یادوں کی پٹاری...... کھانا بنانے کا وقت بھی نہیں ملا۔" اس ساری کتھا کا مطلب یہ نہیں کہ ہم عورتیں مظلومائیں ہیں۔ بلکہ اس میں بیشتر قصور ہمارا اپنا ہے۔ خودساختہ مظلومیت اور خودترسی ایک بڑی بیماری ہے جو ہم عورتوں کو اکثر لاحق رہتی ہے۔ ہم اپنی ذات کو ہمیشہ خود نظر انداز کرتے ہیں۔ ہم خود کو جتنی اہمیت دیں گے۔ دوسرے بھی ہمیں اسی حساب سے اہم سمجھیں گے۔ ہم جس قدر پیچھے ہٹتے جائیں گے دوسروں کے لیے میدان کھلتا جائے گا۔

بقول مرحومہ ہما وسیم۔ (ڈاکٹر وسیم اکرم کی بیوی)

"ہم پاکستانی عورتیں اپنی ضرورت سے ایک گلاس پانی بھی نہیں پیتیں۔ جب کوئی دوسرا مانگے گا تب ہم بھی پی لیں گے۔" ہم سارے گھر کا کام نپٹانے کے باوجود سارا دن خود بھوکے رہ لیں گے مگر اپنے لیے ایک چائے کا کپ بنانا دشوار لگتا ہے۔ اپنے تئیں قربانیاں دیتے دیتے جب ساس بنتے ہیں تو خسیس ہوجاتے ہیں اور اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کی زندگیاں بھی مشکل کردیتے ہیں۔ اشفاق احمد بابا صاحبا میں لکھتے ہیں۔

"مجھے اپنے مقابلے میں دوسروں سے زیادہ محبت کرنا ہے۔ دوسروں کا زیادہ خیال رکھنا ہے کا یہ تصور کتنا ہی ارفع کیوں نہ نظر آئے حقیقت میں بہت غلط ہے۔ اپنے آپ کو چھوڑ کر دوسروں سے محبت کرنے سے شخصیت دو نیم ہوجاتی ہے۔ دو حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ روح کے خلاف جنگ شروع ہوجاتی ہے۔ جہاں جنگ ہوتی ہے وہاں ہر شے مکروہ اور بدصورت ہوجاتی ہے یہ جنگ کا راستہ کبھی نیکی کی طرف نہیں جاتا۔"

یہ گھر، یہ شوہر، یہ بچے اگرچہ ہم پر بہت زیادہ حق رکھتے ہیں مگر اس سے زیادہ حق ہم پر خود ہماری اپنی ذات کا ہے اور ہمارے اللہ کا...... جس کو ہم گرہستی میں سب سے زیادہ نظر انداز کرتے ہیں۔ ظہر کا وضو کر کے عصر تک اِدھر اُدھر کے چھوٹے، چھوٹے فضول کام کرتے رہیں گے نماز کا وقت نہیں ملے گا اگر ملا بھی تو کچھ اس طرح کہ نماز کے دوران سارا دھیان کسی کام یا بچے کی طرف...... روبوٹ کی طرح بے روح نمازیں، بقول اشفاق احمد "التحیات کے بعد تو بے چینی سی لگ جاتی ہے کہ کب سلام پھیریں اور کب بھاگیں باقی دعا اگلے ٹائم سہی......" حالانکہ سوچنے کی بات ہے اصل ساتھ تو اللہ کا ہے...... رہے گھر اور بچے......

بقول پروین شاکر......

"میں ماں ہوں میری قسمت جدائی ہے۔"

شاعر بھی کیا خوب ہوتے ہیں دریا کو کوزے میں بند کردیتے ہیں کسی شاعرہ کی یہ نظم ہر عورت کی نظم ہے

ادھوری عورت

بے معنی حیات کی بامعنی باتیں
بیزار دِن بے کیف راتیں
میرے لیے میرے پاس وقت نہیں
یہ دکھ صدیوں سے کاٹ رہا ہے میری رگِ جاں
میں نہ مانگوں تو میرے لیے محبت نہیں
میں تمام دن کی تھکن
اپنی روح میں اتار لیتی ہوں مجھ سے وابستہ ہیں جو
ان کے لیے زندگی سہل کرنے کی تمنا میں
اپنے لیے سانس بھی
انہی سے مستعار لیتی ہوں مگر کبھی
جب آئینہ مجھے میرا چہرہ دکھائے
گھر کے کاموں سے جی اٹھ جائے
تو میری خالی آنکھیں
بے ساختہ آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں
اور میرے اندر کوئی ہے
جو کہتا ہے خدایا!
میری حیات کو بھی جمیل کردے
یا پھر میری زندگی کے معنی تبدیل کردے

ناولٹ

ترکِ وفا

نایاب جیلانی

دوسرا حصہ



اس کا انکار کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا جو گھر کی فضا پُر امن رہ جاتی۔ عینی تک اس کا انکار من وعن پہنچ چکا تھا سو اس کے تیور بگڑتے دیر نہیں لگی تھی۔ اس نے اپنے تئیں کھلم کھلا اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔ پہلے مارے باندھے کچن میں چلی جاتی تھی اب اعلانیہ طور پر بائیکاٹ کر چکی تھی۔ اور بات صرف کھانا بنانے تک محدود نہیں تھی۔ اس نے کچھ دن بعد کچن الگ کرنے کا بھی شوشا چھوڑ دیا۔ وہ اوپر

والے پورشن میں الگ ہونے کا ارادہ رکھتی تھی۔ ابھی بات صرف ممی کے کانوں میں اس نے انڈیل دی تھی۔ فی الحال اس پر عمل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ چونکہ وہ ذی شاہ کو آخری حد تک منانے کی کوشش کرنا چاہتی تھی اور ذی شاہ تو گویا ان لوگوں سے قطعاً بے نیاز ہو چکا تھا۔ آفس کے علاوہ اس کی صرف ایک ہی مصروفیت تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت مالا کے ساتھ گزارتا تھا۔ اس سے بے معنی ڈھیروں باتیں کرتا، اسے لطیفے سناتا، بار بار ہنساتا...... اور وہ بہت ہنستی بھی تھی، اس کی باتوں کو انجوائے بھی کرتی تھی مگر بولتی پھر بھی نہیں تھی۔ ذی شاہ کے پاس مالا کی پچھلی زندگی سے متعلق کوئی تصویریں، مووی وغیرہ نہیں تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ مالا سے اس کی گزشتہ زندگی کی باتیں کرے۔ اسے پچھلی باتیں یاد دلائے... تاکہ مالا کچھ ردِعمل ظاہر کرے...... وہ اس سے باتیں کرنے کی کوشش کرے...... اپنی زبان کے زنگ اتارے...... کچھ نہیں تو اپنے سگے بھائی سے کچھ دل کے کہے...... اپنے دل کا سارا حبس، گھٹن اور زہر باہر نکال دے۔ اندر کے غبار کو، آنسوؤں کو لفظوں میں بہادے مگر وہ کچھ بولتی ہی نہ تھی۔

اس دن بھی ذی شاہ، مالا کو زبردستی ایک قریبی پارک میں لے آیا تھا۔ یہاں چھوٹے، چھوٹے بچوں نے ہنگامہ مچایا ہوا تھا۔ بے فکر خوش باش چہرے، ہنستے کھلکھلاتے لوگ تھے۔ شاید ان لوگوں کو غم چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔ مالا بہت ترسی ہوئی نظروں سے ان معصوم بچوں کو دیکھ رہی تھی۔ خصوصاً اس بچے کو جو پرام میں لیٹا قلقاریاں مار رہا تھا۔ اس کی ماں قریب ہی خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ مالا ایک ٹک اس معصوم سے بچے کو دیکھ رہی تھی جو بار بار اپنی ماں کی طرف ہمکتا تھا۔ بچے کے چہرے کو پیاسی نظروں سے دیکھتی مالا کی آنکھوں میں حسرت کرلا رہی تھی۔ ذی شاہ سے یہ منظر دیکھا نہیں گیا۔ اس نے اپنی نگاہوں کا رخ موڑ لیا تھا پھر اس نے مالا کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

''کیا دیکھ رہی ہو مالا! یہ بچہ تمہیں اچھا لگ رہا ہے! چلو میں تھوڑی دیر کے لیے اسے تمہارے پاس لے آتا ہوں۔'' وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کر ذرا فاصلے پر موجود اس بچے کی ماں تک آیا تھا۔ مالا کے چہرے پر جو ممتا سی لپک رہی تھی، گویا وہ بچے کو گود میں اٹھانا چاہتی تھی کم از کم اس کے تاثرات سے ذی شاہ یہی اندازہ لگا پایا تھا جیسے ہی وہ مالا کی دلی خواہش کو جان چکا تو اس نے عمل کرنے میں لمحے بھر کی دیر نہیں کی تھی۔ مالا حیران آنکھوں سے اسے اٹھ کر بچے کی ماں کے قریب جاتا دیکھ رہی تھی پھر اس نے اپنے بھائی کو اس اجنبی عورت سے ہم کلام ہوتے دیکھا تھا۔ وہ اس عورت سے بہت ہی لجاجت کے ساتھ گویا تھا۔

''میں کچھ دیر کے لیے آپ کا بچہ لے جاؤں؟ صرف اس سامنے والی بینچ تک۔ میری بہن کچھ وقت آپ کے بچے کے ساتھ گزارنا چاہتی ہے۔'' جانے وہ اسے کون سے جواز دے رہا تھا۔ وہ عورت کچھ دیر تو ذی شاہ کو حیرت سے دیکھتی رہی پھر شاید اس کی پرسنالٹی، شائستگی اور باوقار انداز سے متاثر ہو گئی تھی۔ اس نے ذی شاہ کی التجا پر غور کرتے ہوئے ذرا فاصلے پر موجود اس بینچ کی طرف دیکھا جہاں ایک بہت ہی کامنی سی کچھ کچھ کھوئی لڑکی ایک ٹک پرام کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ بچے کی ماں نے کچھ تذبذب کے عالم میں سر ہلا کر بچہ پرام میں سے نکال کر ذی شاہ کے ہاتھوں میں تھما دیا پھر جب وہ بچہ لے کر مالا کی طرف آیا تو اس کی آنکھوں میں ایک الگ سی جوت اِک عجیب سی چمک دکھائی دینے لگی تھی۔ اس نے بچہ مالا کی گود میں ڈالا تو وہ بے قرار نظروں سے بچے کے نقش کھوجنے لگی۔ گویا بچے کے

معصوم نقوش میں کچھ تلاش رہی تھی۔ کچھ دیر مالا کی بے قراری کا مشاہدہ کرنے کے بعد ذی شاہ نے بہت پیار سے اسے مخاطب کیا تھا۔

''مالا! تمہیں بچے اچھے لگتے ہیں؟'' مالا کو بہت ہی مضطرب سے انداز میں بچے کو والہانہ پیار کرتے دیکھ کر وہ پوچھ رہا تھا۔ مگر ظاہری بات تھی، مالا نے اس کی بات کا جواب نہیں دینا تھا لیکن اس نے اثبات میں سر ہلا کر جو ردِعمل ظاہر کیا تھا مالا کے اندر اس تحریک نے ذی شاہ کی آنکھوں میں امید کے دیے، ستارے روشن کر دیے تھے۔ وہ صحت مندی کی طرف تو پلٹ چکی تھی تاہم نارمل لوگوں کی طرح اب ردِعمل بھی ظاہر کرنے لگی تھی۔ منہ سے اب بھی اگرچہ نہیں بولتی تھی تاہم وہ اس کے تاثرات سے اندر کا حال جان لیتا تھا...... وہ مالا کے مزاج کو بہت اچھی طرح سے سمجھنے لگا تھا۔ بن کہے اس کے دل کی خواہش کو جان لیتا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں کے تاثرات کو بھی پڑھنے لگا تھا۔ اسے افسوس ہوتا تھا پچھلے تین سال سے انہوں نے مالا کو اس کے حال پر چھوڑ کر اچھا نہیں کیا تھا۔ اپنے اندر کے غموں کو اس نے کبھی اپنی ماں سے بھی شیئر نہیں کیا تھا اور اب ذی شاہ کا دل چاہتا تھا کہ وہ اپنے اندر کے غبار، دھند، کرب و اذیت کو اسے اپنی ماں، بہن، دوست، بھائی سب کچھ سمجھ کر شیئر کرے...... اسے اپنے اوپر بیتی اذیت کی کہانی سنائے۔

اس وقت ایک اجنبی بچے پر والہانہ پیار لُٹاتی مالا کو وہ کس کرب کے عالم میں دیکھ رہا تھا، ذی شاہ کے دل میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں.... وہ دکھ کی جانے کون سی منزلوں سے گزر رہی تھی۔ یقیناً یہ ممتا کا پل صراط تھا۔ وہ جسے کھو چکی تھی، اس کے غم کو اس بچے کی صورت میں تازہ کر رہی تھی۔ کیسا پُر اذیت، تکلیف دہ منظر تھا۔ ذی شاہ کی آنکھوں کی سطح گیلی ہونے لگی۔ تب اسے اپنے پیچھے ایک ہلکی سی آواز سنائی دی تھی۔ یقیناً وہ بچے کی ماں تھی جو اِن لوگوں پر ہی نگاہیں جمائے کھڑی تھی۔ اب بچے کو لینے یقیناً ان کے قریب آئی تھی۔

''کیا میں اپنا بچہ لے سکتی ہوں؟'' اس نے ذی شاہ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا تھا تب وہ نگاہوں کا رخ موڑ کر بچے کی ماں کو دیکھنے لگا جو مضطرب سی اپنا بچہ واپس لینے آئی تھی۔ یقیناً بچہ بھی ماں کو سامنے دیکھ کر اس کی طرف ہمکنے لگا تھا۔ ذی شاہ نے مالا کی گود سے بچہ لے کر بے قرار کھڑی خاتون کو تھما دیا تھا جو بچے کو گود میں لے کر کچھ... پُرسکون ہو گئی تھی۔ وہ اپنے فطری تجسس کی بدولت کچھ پوچھے بنا رہ نہیں سکی۔

''آپ کی بہن کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے کیا......؟'' اس نے مضطرب سی مالا کو دیکھ کر ذی شاہ سے سوال کیا تھا جو مالا کی بے قرار نگاہوں کا ارتکاز محسوس کر چکنے کے باوجود بھی کچھ بے نیاز کھڑا تھا۔ یقیناً وہ بچے کی ماں سے اس کے بچے کو دوبارہ نہیں لے سکتا تھا۔

''بس یہی سمجھ لیں۔'' وہ مبہم سے انداز میں بولا تھا۔

''کیا ان کے بچے نہیں ہیں؟'' خاتون کی یقیناً

سنہری کرنیں

☆ پریشان ہونا انسان کے انسان ہونے کی دلیل ہے لیکن پریشان رہنا انسان کے اللہ پر یقین نہ ہونے کی دلیل ہے۔

☆ ہمیشہ قدر کریں، ان تین چیزوں کی۔ اعتبار، وعدہ اور رشتہ۔ یہ سب جب ٹوٹتے ہیں تو کوئی شور سنائی نہیں دیتا مگر دل میں ایک گہری خاموشی اتر جاتی ہے۔

از: عروبہ ناز، کوٹلی

تشفی نہیں ہوئی تھی۔ وہ مزید سوال کرنا چاہتی تھی۔ اس کے چہرے پر مالا کے لیے ہمدردی تھی جو ذی شاہ کو اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

''نہیں......'' اس نے ایک لفظی جواب دے کر ٹالنا چاہا تھا مگر یہ خاتون فی الحال ٹلنے والی نہیں تھی۔ اب وہ اسے مالا کے علاج کا مشورہ دے رہی تھی، اس کے شوہر کا پوچھ رہی تھی۔ کسی مایہ ناز گائنا کالوجسٹ کا ذکر کر رہی تھی۔ ذی شاہ عجیب مصیبت میں پھنسا جھنجلا رہا تھا۔ اس نے خاتون کو تحمل سے جواب دیا۔

''آپ کے نیک مشوروں کا بہت شکریہ۔'' وہ بہت نرمی سے ہم کلام تھا کیونکہ خاتون اس کی محسنہ تھی۔ کچھ دیر پہلے اس نے ذی شاہ پر احسان کیا تھا سو وہ اپنے لب ولہجہ کو سخت نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اس کا انداز یقیناً جان چھڑوانے والا تھا۔ سو وہ معذرت کر کے جلد ہی مالا کو ساتھ لیے وہاں سے اٹھ گیا تھا مگر اس نے محسوس کیا تھا کہ مالا پہلے کی نسبت آج کافی خوش اور پُرجوش نظر آ رہی تھی گھر آ کر بھی وہ پہلے کی طرح کمرے میں بند نہیں ہوئی تھی بلکہ بندیا کے پاس کچن میں کھڑی سلاد کے لیے سبزی وغیرہ کاٹنے لگی تھی۔ اس کے چہرے پر بجھی الوہی سی مسکراہٹ ذی شاہ کو اگلی صبح تک بھی دکھائی دیتی رہی تھی اور شاید مالا کے رویّے میں پہلی مرتبہ تبدیلی محسوس کر کے ممی اور بندیا بھی بہت پُرامید ہو چکی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اگلی سہ پہر مالا بغیر کسی کے کہے لان میں بیٹھی ذی شاہ کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ زندگی کی طرف دھیرے دھیرے ہی سہی لوٹنے لگی تھی اور یہ خوش آئند عمل تھا۔

اس سے اگلے دن ذی شاہ مالا کو پارک لے جانے کے بجائے شاپنگ کے لیے لے آیا تھا مگر مالا بجائے بوتیکس کی طرف ٹوائے شاپس کو دیکھ، دیکھ کر ان کی طرف بڑھ رہی تھی کچھ سوچ کر وہ اسے ٹوائے شاپ کی طرف لے آیا تھا تب مالا نے کتنے ہی جوش اور جذبے کے ساتھ ڈھیروں کھلونے خرید لیے تھے...... اب وہ چھوٹے، چھوٹے کپڑے خرید رہی تھی۔ چوسنیاں اور فیڈر لے رہی تھی۔ ڈول ہاؤس اور بےبی ہاؤس پیک کروا رہی تھی۔ آج وہ عام دنوں سے ہٹ کر بہت خوش تھی۔ اس کی سرخ رنگت میں عجیب سی چمک نظر آ رہی تھی۔ چمکیلی آنکھیں خوشی سے دمک رہی تھیں...اور ذی شاہ بہن کو خوش دیکھ کر اندر تک خود ہی سرشار ہو رہا تھا۔ اس کی کوششیں رنگ لا رہی تھیں۔ جب وہ ڈھیروں شاپنگ بیگ کے ساتھ مالا کو لیے گھر واپس آیا تب اس کی پہلی مڈبھیڑ عینی سے ہوئی تھی۔ وہ اس کی طنزیہ نظروں سے بے نیاز اپنے کمرے میں چلا گیا تھا جبکہ بندیا بہت جوش کے عالم میں عینی کو نظر انداز کر کے مالا کی شاپنگ دیکھ رہی تھی مگر ایک، ایک چیز کو شاپر سے نکالتے ہوئے اس کا چہرہ فق ہو رہا تھا جبکہ عینی اس کی حالت سے لطف اندوز ہوتی تمسخرانہ انداز میں ہنس رہی تھی۔

''تمہاری بہن ابھی تک ان لوگوں کے سحر سے نہیں نکلی...... ابھی تک ان لوگوں کے سحر میں گرفتار ہے جن لوگوں نے اسے کتے کی طرح دھتکار دیا، انہی کی یاد میں دن رات مرتی ہے۔'' عینی کے چبھتے ہوئے الفاظ نے بندیا سمیت مالا کو بھی متوحش کر دیا تھا۔ وہ پھٹی، پھٹی نظروں سے کبھی عینی کو اور کبھی چھوٹے، چھوٹے کھلونوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ دھواں، دھواں ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں ریت چبھنے لگی تھی۔ ان ننھے منے کھلونوں سے خون ٹپک رہا تھا۔

''اسے یقین دلاؤ، کس کے خواب وخیال میں گم ہے یہ......؟ اور جو اتنے پیسے اجاڑ کر یہ ڈھیر اٹھا لائی ہے آخر کس کے لیے......؟ اسے تم لوگ احساس کیوں نہیں دلاتے؟ وہ بچہ تو کب کا مر چکا...... جس کے لیے ابھی تک خریداری کرتی پھرتی ہے۔'' عینی کے سفاک جملوں نے اور زہریلے لہجے نے سیڑھیاں اترتے ذی شاہ کو بھی جامد کر دیا تھا۔ لمحے بھر کے لیے تو وہ بھونچکا رہ گیا تھا۔ اسے عینی کے منہ سے نکلے شعلوں کا سارا عکس مالا کے چہرے پر دکھائی دے رہا تھا۔ مالا جو اب بھی ساکت کھڑی عینی کو دیکھ رہی تھی۔ عینی کے الفاظ دہکتے انگارے معلوم ہو رہے تھے۔ وہ گویا کسی بھڑکتے گڑھے پر کھڑی تھی جس میں عینی نے اسے دھکا دے کر گرا دیا تھا۔ اب وہ منہ کے بل گری کراہ رہی تھی، چلّا رہی تھی، چیخ رہی تھی۔ اس کے وجود پر چھالے ابھر رہے تھے۔ آنکھوں سے خون نکل رہا تھا۔ دل درد کے احساس سے پھٹ رہا تھا۔ وہ اذیت کی انتہا پر کھڑی تھی۔ اس کی نگاہیں جانے کون، کون سا دردناک منظر دیکھ رہی تھیں۔ شاید وہ ایک مرے ہوئے نومولود کو دیکھ رہی تھی یا اپنے محبوب شوہر کو دیکھ رہی تھی۔ یا ایک خوفناک آنکھوں والی حسینہ کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایسی خوفناک آنکھیں کسی کی نہیں دیکھی تھیں۔ اس نے زندگی میں آج تک اتنی برفیلی اور روح تک کو خوف میں مبتلا کر دینے والی آنکھیں نہیں دیکھی تھیں۔ وہ ایسی ہی خوف وہراس میں مبتلا کر دینے والی آنکھیں تھیں۔ اس نے بڑی، بڑی خوب صورت آنکھیں دیکھی تھیں۔ غزالی آنکھیں، خواب ناک آنکھیں، تابناک آنکھیں، خمار آلود آنکھیں، گہری آنکھیں، لمبی آنکھیں، بولتی آنکھیں مگر اتنی سرد اور برفیلی آنکھیں کسی کی نہیں دیکھی تھیں۔

علی عیسٰی کی بہن کے چہرے پر ایسی ہی آنکھیں سجی تھیں۔ روح کو سنسنا دینے والی، خوف میں جکڑ دینے والی، اندر تک کو کھوج لینے والی، جاسوس آنکھیں، کھوجتی آنکھیں، ذہنوں میں گھس جانے والی، سوچ کو کھرچ دینے والی، مقابل کو اندر تک پڑھ لینے والی آنکھیں۔ وہ کسی کی سوچ کو اندر سے نوچ لانے کی صلاحیت رکھتی تھی، اس کو ذہن کھوجنے کا چسکا تھا مالا نہیں جانتی تھی علی عیسٰی کی بہن کو ذہنوں اور سوچ میں گھسنے کا اسم آتا تھا۔ ان آنکھوں کا خوف اور برفیلی لہر آج تین سال گزر جانے کے بعد بھی مالا کے دل کو دہلا گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ عینی کے چہرے پر بھی ویسی ہی آنکھیں سج گئی ہیں مگر مون کی آنکھوں جیسی یہ آنکھیں نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھیں میچ کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔ وہ اس منظر سے بھاگنا چاہتی تھی، وہ کسی تنہا گوشے کی طرف لپکنا چاہتی تھی۔ وہ خود کو ایک کمرے میں بند کر لینا چاہتی تھی مگر وہ کچھ بھی نہیں کر پائی۔ وہ اپنے بھائی کو قریب آنے سے بھی روک نہیں پائی تھی۔ وہ اسے اونچا بولنے سے بھی منع نہیں کر پائی تھی۔ حالانکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ذی شاہ، عینی پر چلّائے، اس پر غصہ کرے...... عینی نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ عینی شاید ٹھیک ہی کہتی تھی۔ مالا ابھی تک انہی لوگوں کے حصار میں تھی جن لوگوں نے اسے کتے کی طرح دھتکار دیا تھا۔ وہ عینی کے تلخ مگر سچے الفاظ کو تسلیم کرنے کے باوجود بہت اذیت میں تھی۔ عینی نے آج اس کے ہر زخم سے کھرنڈ جو اتار دیا تھا۔ عینی نے آج تین سال پہلے کی ساری اذیتوں کو اس کی آنکھوں میں بھر دیا تھا۔

اس نے غم آلود آنکھوں سے اپنے بھائی کو دیکھا جو اس کے اندر کے اضطراب اور ٹوٹ پھوٹ کو محسوس کر کے بھابی پر چلّا رہا تھا۔ وہ اسے ٹوٹتا بکھرتا دیکھ کر تحمل کا مظاہرہ نہیں کر سکا تھا۔ وہ عینی پر الٹ پڑا تھا۔

''میری بہن کو کچھ ہوا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' وہ مالا کی پتلیاں الٹتے دیکھ کر چلّا رہا تھا۔ وہ عینی کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ عینی، دیور کو اچانک آتا دیکھ کر خفت زدہ رہ گئی تھی۔ اسے اپنی صفائی میں بولنے کے لیے کوئی الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ ذی شاہ کو اب کوئی وضاحت بھی نہیں چاہیے تھی۔ وہ بہن کی

بگڑی حالت کو دیکھ کر مزید زہر پھونکنا ترک کر کے اس کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ مالا کا سہا دل ان بھاری لفظوں کی اذیت نہ سہتے ہوئے مدھم پڑ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اب بھی کچھ بھولے بسرے مناظر کھوج رہی تھیں۔ کبھی اِک مرا ہوا تو مولود سامنے آجاتا۔ کبھی علی عیسیٰ کا مسکراتا چہرہ دل دھڑکا دیتا...... کبھی ہون کی برفیلی نگاہیں اسے خوف میں مبتلا کر دیتیں اور کبھی اسے اپنے بھائی کا چہرہ اپنی طرف متوجہ کر لیتا۔ وہ آج بھی بہت دن پہلے کی طرح سے مالا سے التجا کرتے کہہ رہا تھا۔

''تو اپنے دکھ مجھ سے کیوں نہیں کہتی؟ مجھے بتا، تیرے ساتھ علی عیسیٰ نے کیا، کیا تھا؟ آخر تین سال پہلے کیا ہوا؟ مجھے بتا مالا......! میں تیرے سارے دکھوں کا مداوا کروں گا، میں تیرے مجرم کو انجام تک پہنچاؤں گا۔'' اس کا بھائی آج بھی سوال کر رہا تھا، مالا آج بھی خاموش تھی، وہ اسے کیا بتاتی؟ وہ اپنے بھائی کو بھلا کیا بتا سکتی تھی اسے کسی کی برفیلی نگاہوں نے منجمد کر دیا تھا۔ وہ کسی کی خوفناک ترین آنکھوں کی دہشت میں مبتلا ہوگئی تھی۔ اسے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی کی حسین تر آنکھوں سے بھی خوف آیا تھا۔

کیا خوب صورت آنکھیں بھی کسی کو سہما سکتی ہیں؟ کیا حسین چہرے بھی دہشت زدہ کر دیتے ہیں؟ شاید ایسا نہیں ہوتا...... مگر مالا کے ساتھ ایسا ضرور ہوا تھا۔ وہ ایک ملکوتی حسن رکھنے والی اپنی ہی ہم عمر ایک لڑکی سے پہلے ہی روز ہراساں ہوگئی تھی۔ مالا کو اس لڑکی کے سحر انگیز حسن نے خوفزدہ کر دیا تھا۔ وہ اس لڑکی کی آنکھوں کے سہا دینے والے تاثر سے پہلی ملاقات میں ہی دہشت زدہ رہ گئی تھی۔

اسے زندگی میں پہلی مرتبہ ایک حسین آنکھیں رکھنے والی لڑکی نے خوف کے قعر میں گرا دیا تھا۔ وہ تین سال گزر جانے کے بعد بھی اس لڑکی کی آنکھوں کے اس پہلے تاثر کے حصار سے نکل نہیں پائی تھی شاید اس لڑکی نے مالا کے وجود پر کوئی اسم پڑھ کر پھونک دیا تھا۔ اس لڑکی نے مالا کے ساتھ کیا اچھا کیا تھا؟ وہ اپنے بھائی کو بھلا کیا بتاتی؟ وہ اپنے بھائی کو کس طرح بتاتی......

اسے دودھ جیسے بگولوں میں بھیگتی اس شام کو ایک ایک منظر یاد تھا جب لاہور سے اڑنے والا جہاز من ہائیم کی سرزمین سے پہلے فرینکفرٹ کے نواحی جنگلات پر اڑ رہا تھا۔ اس دن کچھ دیر کے لیے آسمان صاف ہوگیا تھا۔ زمین پر ہریالی بکھری تھی۔ اور سبزے کے چوکور ٹکڑے فرش پر جلوہ افروز تھے۔ جنگلات کا رنگ سیاہی مائل تھا، مرغزار ہرے تھے اور کھیتوں کی طویل چادر بھی پھیلی تھی۔ دور کہیں پہاڑوں کے بیچ چاندنی کی لہریں پھوٹ رہی تھیں۔ یہ شاید آبشاریں تھیں۔ کہیں پانی کی وسیع ٹکڑے دریاؤں کے مانند نظر آرہے تھے۔ سرزمینِ جرمن یوں لگتی تھی گویا سبزے کا کوئی وسیع کھیت ہو جس میں بھوری، سبز، سنہری، زعفرانی، بسنتی فصل کی تر و تازہ کٹائی ہوئی ہو...... سبزے میں گھرے سفید مکانوں والے دیہات اور شہری آبادیاں سرخ بتیوں کے مانند نظر آتی تھیں۔ جہاز بلندی سے پستی کی طرف آرہا تھا۔ منزل بہت قریب تھی، گویا دو ہاتھ کا درمیان میں فاصلہ ہو...... چہار سو دھنکی ہوئی روئی دکھائی دیتی تھی۔ سفید نرم نرم گولے اڑ رہے تھے۔ اس اجنبی دیس کی فضا میں بھی اپنائیت بھری مہک رچی تھی۔ یہ مہک نہ جانے کہاں سے اٹھ رہی تھی۔ یہ نرم نرم محبت بھری باس کہاں سے آرہی تھی۔ شاید دریاؤں کے قریب ''بیلے'' پر بہار رُت کا موسم گزر رہا تھا۔ رنگ رنگ کے پھول لہرا رہے تھے۔ خوشبو کی مہکار میں محبت کہاں سے گوندھی گئی تھی۔

یہ نگر کسی شاعر کا خواب اور کسی مصنف کی کہانی کا مرکزی کردار بن سکتا تھا۔ اسی من ہائیم میں جانے کیسی، کیسی محبت کی کہانیاں پروان چڑھی تھیں۔ محبت

اس شہر کی نس نس میں سانس لیتی تھی اور میرین چرچ کے اونچے نوکیلے کلس پر سسکاریاں لے کر دم توڑ دیتی تھی۔

یہ علی عیسیٰ کا من ہائیم، وائن ہائیم تھا۔ من ہائیم سے بارہ میل پر واقعی یہ چھوٹا سا پہاڑی شہر تھا۔ وائن ہائیم یعنی شراب کے نشے میں مخمور یہاں انسان نہیں، طلسماتی رومانوی کردار بسا کرتے تھے۔ کالی چمکتی سڑکوں پر چلتے پھرتے نظر آیا کرتے تھے۔ اس شہر کی فضا میں محبت رچی ہوئی تھی۔

سرمئی سڑکوں پر خوش پوشاک خوب صورت لوگ چلتے تھے...... اور شیشوں کی دکانوں میں چینی کی گڑیا جیسی سیلز گرلز راہ چلتوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھیں۔

اس شہر کے پس منظر میں بلند پہاڑوں کی سرمئی چوٹیاں تھیں اور انہی پہاڑوں پر کہیں کہیں سفید خوب صورت مکان... جانے ان پتھروں پر یہ مکان کھڑے کیسے تھے۔

کسٹم سے فارغ ہو کر جب وہ ڈیڈی اور چاچو کی ہمراہی میں ائرپورٹ کی جگمگاتی دنیا سے باہر آئی تو آس پاس وہی اپنائیت بھری مہک چکراتی ہوئی اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تھی۔ کچھ بولتی کچھ کہتی، کچھ مدہوش کرتی خوشبو...... اس نے نگاہ اٹھا کر سامنے دیکھا تو وہ اپنائیت بھری مہکار مجسم انسانی روپ میں دکھائی دینے لگی تھی۔ وہ ایک دم متحیر رہ گئی تھی۔ اس کی نگاہوں نے پہلی مرتبہ علی عیسیٰ کو دیکھا تھا۔

وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا۔ اس نے اپنے باپ اور بھائیوں کے بعد علی عیسیٰ کو دیکھا تھا، وہ اسے دیکھ کر مایوس ہرگز نہیں ہوئی تھی جبکہ مایوس تو علی عیسیٰ بھی اسے دیکھ کر نہیں ہوا تھا۔ اس نے باپ اور تایا کی موجودگی میں صرف ایک مرتبہ مالا کی طرف دیکھا تھا۔ اسے مالا بہت ڈری سہمی نظر آئی تھی۔

ان کے درمیان باقاعدہ بات چیت کا آغاز کچھ دیر بعد ہوا تھا۔ تعارفی مرحلے کی ضرورت تو نہیں

تھی تاہم حسیب چاچو نے یہ رسم پھر بھی نبھائی تھی۔ وہ بہت تفاخر سے اپنے لاڈلے بیٹے کو دیکھ کر ڈیڈی سے کہہ رہے تھے۔

”میں ناں کہتا تھا عیسیٰ ضرور آئے گا۔ چاہے کتنا بھی مصروف کیوں نہ ہو۔ ساری میٹنگز بھاڑ میں جھونک کر بھی چلا آئے گا۔ میرا یقین کچھ غلط نہیں تھا۔“ وہ بیٹے سے گلے مل کر اب بہت جوش سے ڈیڈی کو بتا رہے تھے۔ ڈیڈی اپنے بھائی کے یقین پر ان کے اس بھروسے کی تکمیل پر مسکرا رہے تھے۔

اسے حسیب چاچو کچھ جذباتی سے لگے تھے تاہم علی عیسیٰ ان سے بہت مختلف تھا۔ اس میں بہت ضبط، تحمل اور ٹھہراؤ نظر آ رہا تھا۔ وہ سنجیدہ نہیں تھا تاہم بہت سلجھا ہوا نظر آتا تھا۔ جلد باز نہیں تھا، ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرتا تھا جبکہ چاچو نہ صرف تیز گفتار تھے بلکہ کچھ جلد باز بھی نظر آتے تھے۔ ہر کام عجلت اور جلد بازی میں کرنے والے تھے...... مگر اپنی ان خامیوں سے الگ بہت شفیق اور محبت کرنے والے باپ تھے...... اور مالا کو لگتا تھا وہ علی عیسیٰ کے عشق میں گرفتار تھے۔ پورے سفر کے دوران اور اب تک وہ علی عیسیٰ کے گیت گانے میں ہی مصروف تھے۔ ڈیڈی اس کی تعریفوں پر بہت خوش نظر آ رہے تھے تاہم وہ اپنے باپ کے بے لاگ تبصروں پر کچھ جھینپا جھینپا بیٹھا ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ وہ انہیں خود لینے آیا تھا اور بہت اہم میٹنگ چھوڑ کر آیا تھا حالانکہ چاچو نے اسے منع بھی کیا تھا اگر وہ بہت مصروف ہے تو نہ آئے مگر علی عیسیٰ ان کے منع کرنے کے باوجود بھی چلا آیا تھا۔

”بھائی جان! آپ کو میرا بیٹا کیسا لگا؟ یقین مانیں پورے مشرق سے لے کر مغرب تک میرے بیٹے جیسا فرمانبردار داماد آپ کو کہیں نہیں ملے گا۔ میں دعوے سے کہہ رہا ہوں۔“ چاچو مڑ مڑ کر ڈیڈی کو مخاطب کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو اردو میں ہو رہی تھی۔ مالا کو لگا، علی عیسیٰ اردو سمجھتا ہے اور وہ ان کی باتوں کو زیرِ لب مسکرا کر انجوائے بھی کر رہا تھا مگر وہ چاچو کی طرح مڑ مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ تاہم جب چاچو مسکراتے ہوئے اپنی عجلت پسندانہ فطرت کے باعث اگلا لائحہ عمل بھی دہرانے لگے تھے تب علی عیسیٰ نے کچھ چونک کر پیچھے ایک نظر دیکھا تھا۔ وہ مرر میں دیکھنے کے بجائے گردن موڑ کر دیکھنے کے بعد دوبارہ سے سیدھا ہو گیا تھا جبکہ چاچو اپنی دھن میں مگن کہہ رہے تھے۔

”کل کا دن آپ کا ریسٹ ہوگا...... پرسوں شام کو نگاہ جما کر میرے بیٹے کا تفصیلی ایکسرے ملاحظہ کر کے نکاح کا وقت مقرر کر لیجیے گا۔“ وہ بہت ہلکے پھلکے لہجے میں کہتے ہوئے اچانک سنجیدہ ہو گئے تھے اور مالا کی تو چاچو کی جلد بازیاں دیکھ کر سانس تک رک گئی۔ تبھی علی عیسیٰ نے بھی مڑ کر دیکھا تھا پھر چاچو کی طرف متوجہ ہو گیا جو اسے ڈپٹتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

”تم نے کارڈ چھپوائے یا نہیں؟“ یہ اہم بات پوچھنے کا انہیں اب خیال آیا تھا اور جوں ہی انہیں خیال آیا وہ ساری باتیں بھلا کر علی عیسیٰ کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

”یہ کام میں بھول سکتا تھا کیا......؟“ اس نے زیرِ لب مسکرا کر باپ کو مطمئن کرنا چاہا تھا مگر وہ مطمئن ہرگز نہیں ہوئے تھے۔

”کارڈ چھپ گئے تھے تو انہیں تقسیم بھی کروا دیتے۔ یہ کام تم نے سوزن کے ذمے لگا دینا تھا۔ ویسے تو سارے زمانے میں پھرتی رہتی ہے۔“ انہوں نے اس کی خالہ زاد بہن کا ذکر کیا تھا۔ سوزن اس کی کزن اور موون کی بیسٹ فرینڈ تھی۔ عموماً انہی کے گھر میں رہتی تھی۔ آج کل نہ جانے کہاں غائب تھی۔ سننے میں آیا تھا کہ اپنے باپ سے ملنے گئی ہے۔

”یہ کام بھی ہو چکا ہے۔“ علی عیسیٰ نے باپ کو تسلی دی تھی۔ یقیناً وہ ان سے بھی زیادہ عجلت پسندی کا مظاہرہ کر چکا تھا۔ مالا ان باپ بیٹے کی عجلت پسندی

...... پر سخت حیران تھی۔ کچھ دیر پہلے والی علی عیسیٰ کے متعلق اس کی رائے بھی بدل چکی تھی۔ یقیناً وہ اپنے باپ کی طرح ہی عجلت پسند تھا مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی وہ فرمانبردار بھی بہت تھا...... باپ کے حکم کو کیسے نظر انداز کر دیتا جبکہ وہ اس کی شادی طے کرنے سے پہلے ہی کارڈ چھپوانے کا حکم نامہ جاری کر چکے تھے۔

”ویٹس ویری گڈ میری جان......! تم نے آدھی فکر میری مُکا دی ہے۔“ اب وہ ایک مرتبہ پھر پرانی جون میں آ چکے تھے۔ مگر علی عیسیٰ کے چہرے پر خاصی فکر مندی نظر آ رہی تھی۔ وہ کچھ پریشان اور مضطرب تھا۔ مالا نے پہلے بیٹھ کر کن انکھیوں سے علی عیسیٰ کے چہرے پر پھیلے تفکر کا اندازہ لگا لیا تھا۔ جانے وہ ایک دم پریشان کیوں ہو گیا تھا اور جانے اسے پریشان دیکھ کر مالا کا دل کیوں بجھنے لگا تھا۔ اسے علی عیسیٰ کا پریشان ہونا پریشان کر رہا تھا۔ اسے اس کے چہرے کی بے چینی مضطرب کر رہی تھی۔ وہ مسکراتا ہوا ایک دم متفکر کیوں ہو گیا تھا۔ مالا کتنی بے بس تھی، وہ علی عیسیٰ کو براہِ راست مخاطب نہیں کر سکتی تھی مگر کچھ دیر بعد چاچو کے پوچھنے پر علی عیسیٰ نے اپنی فکر اور پریشانی کو ظاہر کر دیا تھا۔ وہ چاچو سے انتہائی خفا لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”آپ نے جو کارڈز پر ڈیٹ لکھوانے کو کہا تھا، وہ کل کی ہے جبکہ نکاح آپ پرسوں کریں گے۔ حد ہے پاپا! تایا جان نے جو ایکسرے پرسوں کرنا ہے وہ آج ہی کر لیں تاکہ نکاح اپنے وقت پر ہو جائے۔“ وہ بالکل چاچو جیسا ہی تھا سنجیدگی سے بولتا ہوا کہیں کہیں مزاحیہ انداز میں گفتگو کو موڑ دیتا ہوا۔ اب بھی بہت سنجیدگی سے بات کرتے ہوئے آخر میں وہ تھوڑا اشرارتی سا ہو گیا تھا۔ اس کی انتہائی شستہ رواں اردو کو سن کر جہاں مالا کی جان میں جان آئی تھی وہیں ڈیڈی اور چاچو بھی بے ساختہ ہنس پڑے تھے۔

”تمہارا بھی کوئی جواب نہیں حسیب......“ ڈیڈی نے مسکرا کر چاچو کو چھیڑا تھا۔ وہ ان کی جلد بازی پر مالا کی طرح کچھ کچھ متحیر بھی تھے تاہم مالا کو لگتا تھا وہ دونوں بھائی پاکستان میں ہی سب کچھ طے کر کے آئے تھے۔

”تایا جان! میں نے پاپا سے کہا تھا کہ آپ لوگ آ جائیں پھر باقی کے معاملات دیکھ لیں گے مگر پاپا کی ایک ہی ضد تھی۔ اگر میرے آنے تک کارڈز نہ چھپوائے...... تو تمہیں جرمنی سے بے دخل کروا دوں گا۔“ علی عیسیٰ کی مسکراتی آواز ایک مرتبہ پھر انہیں اپنی طرف متوجہ کر چکی تھی۔ تمام سفر بہت ہلکی پھلکی گفتگو کے دوران کٹا تھا۔ چاچو اور اس کی چھیڑ چھاڑ نوک جھوک میں ذرا بھی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اسی سفر کے دوران اسے پتا چلا تھا کہ کل شام اس کا نکاح ہے۔ یہ ایک عجیب سی شادی تھی۔ کم از کم مالا کو تو بہت عجیب لگ رہی تھی۔ جس میں ایک دلہن اپنے دولہا کے پاس سمندر پار سے آئی تھی۔ حالانکہ اس میں کچھ عجیب نہیں تھا مگر ایسے تجربے سے وہ پہلی مرتبہ گزر رہی تھی سو سب کچھ بہت نیا، الگ اور عجیب نظر آ رہا تھا۔

اسی سفر میں علی عیسیٰ نے دو چار مرتبہ خود ہی اسے مخاطب بھی کیا تھا۔ ڈیڈی اور چاچو کی موجودگی میں وہ کچھ جھینپ رہی تھی تاہم اسے ہوں ہاں میں جواب تو دینا ہی تھا۔ وہ نہ بھی بولتی تب بھی چاچو نے زبردستی ہر بات میں اسے گھسیٹ لینا تھا۔ اس پورے سفر کے دوران میٹھا میٹھا نہایت شیریں انداز میں بولتا علی عیسیٰ ڈیڈی کو ہی نہیں بلکہ مالا کو بھی اپنا گرویدہ کر چکا تھا۔ چاچو نے صحیح کہا تھا ان کے بیٹے کو دیکھ کر وہ دونوں باپ بیٹی اس کے عشق میں مبتلا ہو چکے تھے۔ وہ ایسا ہی تھا جسے دیکھ کر بس اس سے محبت کی جاتی۔

سرمئی سڑک پر فراٹے بھرتی اس کی لاڈلی

benz ایک بہت ہی خوب صورت مکان کے سامنے آرکی تھی۔ benz سے عشق کی بھی ایک الگ کہانی علی عیسیٰ نے اسے سنائی تھی۔ دورانِ سفر بہت کم گفتگو ان دونوں کے درمیان ہوئی تھی اس کے باوجود جب گیراج سے ڈیڈی اور چاچو نکل کر اندر چلے گئے اور وہ ان لوگوں کا سامان ڈگی میں سے نکال رہا تھا تب مالا ایک دم رک گئی تھی۔ اسے منہ اٹھا کر اندر چلے جانا کچھ مناسب نہیں لگا تھا وہ بھی اس صورت میں جب اتنا ڈھیر سامان وہ اکیلے ہی ڈھونے ... والا تھا۔

تب مالا نے سوچا، وہ کچھ سامان اٹھانے میں اس کی مدد کرے گی، اسے رکتا دیکھ کر وہ کچھ ٹھٹک گیا تھا۔ مگر سامان اٹھا کر اندر لے جانے سے پہلے اس نے اپنی پیاری benz کی ونڈ اسکرین بہت اچھی طرح چمکا دی تھی حالانکہ اس کی گاڑی پر ذرا سی گرد بھی نہیں تھی اس کے باوجود...... دلجمعی سے گاڑی صاف کر کے مالا کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"تمہارے آنے سے پہلے میری زندگی میں بس benz تھی۔ مجھے اس سے لافانی محبت ہے مگر اب میں اس محبت کرنا چھوڑ کر بس تم سے محبت کروں گا۔ مجھے تم بہت اچھی لگی ہو، ایک دم معصوم اور دلنشین...... لگتا ہے، تمہاری سوچ پر کسی کے نام کی ہلکی سی بھی گرد نہیں پڑی۔ میں جوہر شناس ہوں ڈیئر......! اتنا حیران کیوں ہوتی ہو...... چلو تم اندر آؤ...... میں سامان اٹھاتا ہوں...... benz کو تو چمکا دیا ہے...... اب یہ صبح آفس جانے کے لیے تیار ہے...... خیر، آفس سے تو کل چھٹی کروں گا۔ آفٹر آل، اتنی دور سے مہمان آئے ہیں۔ ان کو ٹائم دینا تو بنتا ہے، مہمان بھی چونکہ خاص الخاص ہیں...... سو وقت بھی زیادہ دینا ہوگا۔ میری باتیں تو ختم نہ ہوں گی۔ چلو اندر چلتے ہیں...... تم بھی کیا سوچتی ہوگی، گاڑی میں کیسا بیا بنا ہوا تھا۔" وہ بغیر رکے بولے گیا۔

"دراصل تایا جان کی موجودگی میں ذرا کم بول رہا تھا۔ حالانکہ ہم دونوں باپ، بیٹا بہت منہ پھٹ اور باتونی ہیں۔ تم ہماری باتیں سن سن کر کبھی بور نہیں ہو گی۔ میں یہ دعوے کے ساتھ کہتا ہوں۔" علی عیسیٰ اپنی benz سے زیادہ تیز بولنے والا تھا۔ مالا نے فی الفور ایک مرتبہ پھر اپنی رائے بدل لی تھی۔ وہ منہ کھولے حیرانی سے اسے بولتا سن اور دیکھ رہی تھی۔ اسے علی عیسیٰ کا بولنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ بہت نرم ملائم لہجے میں بولتا تھا...... بہت میٹھا اور دل آویز انداز ...... اسے دلوں میں گھر کرنا آتا تھا۔ اسے مالا کے دل میں گھر بنانا تھا۔ اسے دلوں میں گھر بنانا اور دلوں میں بسنا آتا تھا۔ وہ مالا کے دل میں ہمیشہ کے لیے رچ بس گیا تھا۔ وہ عمر بھر کے لیے سمندر پار سے آئی اس چھوٹی سی لڑکی کے دل میں ٹھہر گیا تھا۔ وہ اس لڑکی کی آنکھ کا پہلا خواب تھا۔ وہ benz سے محبت چھوڑ کر سمندر پار سے اپنے بہت پیاروں کو چھوڑ کر آئی اس ڈری سہمی لڑکی سے محبت کرنے لگا تھا۔ وہ benz سے محبت مذاقاً نہیں کرتا تھا۔ اسے اپنی گاڑی سے بہت پیار تھا اور وہ اس کی حفاظت بھی بہت کرتا تھا۔ مالا کو اچھی طرح یاد تھا۔ ایک دن کسی جذباتی لمحے کی قید میں اس نے مالا سے کہا تھا۔ "خدانخواستہ تم میری زندگی سے چلی گئیں تو یہ benz بھی میرے ساتھ نہیں رہے گی۔" وہ جو کہتا تھا ٹھیک ہی کہتا تھا اور اکثر اپنی کہی باتوں پر عمل بھی کر دکھاتا تھا۔ اس نے سچ کہا تھا۔ مالا اس کی کمپنی میں کبھی بور نہیں ہوئی تھی...... اور نہ وہ اس کی کہی بات کو کبھی جھٹلا پائی تھی۔

اس بھیگتی سرمئی شام محض گیراج سے لے کر اندرونی حصے تک کے دوران علی عیسیٰ نے کتنی ..... بے تکلف فضا قائم کر لی تھی۔ اجنبیت کی گویا ایک، ایک دیوار کو ہمیشہ کے لیے گرا دیا تھا۔

یہاں آتے ہوئے جتنے اس کے دل میں خدشے تھے سب ایک، ایک کر کے فنا ہو گئے تھے۔

اگلی صبح اتنی چمکیلی، تابناک اور روشن تھی کہ مالا کی زندگی میں ایسی کوئی سحر آج سے پہلے طلوع نہیں ہوئی تھی۔ علی عیسیٰ کے خوب صورت گھر میں یہ اس کی پہلی سویر تھی انتہائی دلنشین اور جگمگاتی ہوئی...... آج ڈیڈی اور چاچو بھی بے انتہا خوش تھے۔ رات کو شادی کی تقریب تھی تاہم یہ گھر شادی والا ہرگز نہیں لگ رہا تھا۔ یہاں ڈیڈی، چاچو اور علی عیسیٰ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ وہ حیران تھی، رات سے اس نے چاچو کی اکلوتی بیٹی مون کو نہیں دیکھا تھا۔ نہ وہ ان لوگوں سے ملنے آئی تھی۔ جب وہ صبح اٹھ کر نیچے آئی تب بہت ہی اشتیاق سے جگمگ کرتے کچن میں علی عیسیٰ کھڑا ناشتا بنا رہا تھا۔ وہ بہت ہی مصروف نظر آرہا تھا اور اس کے برابر یقیناً کلینر (ملازمہ) کھڑی تھی۔ وہ علی عیسیٰ کی ناشتا بنانے میں مدد کر رہی تھی اور یقیناً علی عیسیٰ اس کے ناشتے بنانے سے مطمئن نظر نہیں آرہا تھا۔ تبھی اسے مختلف قسم کی ہدایات دیتا خود بھی کام میں لگا ہوا تھا۔ اسے موجود پا کر وہ کچھ حیران سا مڑا۔

"اتنی جلدی اٹھ گئیں تم، میں تو سوچ رہا تھا کہ لنچ ٹائم تک اٹھو گی۔ اِدھر بریک فاسٹ کم لنچ ریڈی ہو رہا ہے۔" وہ مسکراتا ہوا اس کی معلومات میں اضافہ کر رہا تھا۔ گویا ناشتے کے بجائے لنچ کرنا تھا۔

"میں بھوک کی کچی نہیں، ڈنر تک کا بھی انتظار کر سکتی ہوں۔" مالا نے کندھے اچکا کر علی عیسیٰ کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ کچن میں جائزہ لینے نہیں آئی تھی... بلکہ مختلف پکوانوں کی خوشبو کا پیچھا کرتی علی عیسیٰ کو تلاش رہی تھی۔ کچن تک آنے میں اسے دشواری نہیں ہوئی۔ وہ علی عیسیٰ کی آواز پہچان چکی تھی۔ یقیناً وہ ملازمہ کے ساتھ کسی اور زبان میں بات کر رہا تھا۔ اب چونکہ وہ کچن میں آچکی تھی سو فارغ بیٹھنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ وہ دو قدم کا فاصلہ مٹاتی کوکنگ رینج تک آگئی۔ تب اس جرمن ملازمہ نے مسکرا کر اسے خوش آمدید کہا تھا۔ وہ چھبیس ستائیس سال کی لڑکی تھی۔ ذرا موٹی سی مگر خاصی خوش اخلاق تھی اس سے مسکرا کر اپنی زبان میں پوچھنے لگی۔ مالا جو اس کی عمر کا اندازہ کر رہی تھی کچھ چونک سی گئی۔

اس کا اخلاق لہجے سے چھلک رہا تھا۔ بہت میٹھے لہجے میں نہ جانے کیا بول رہی تھی۔ مالا ہونق سی علی عیسیٰ کا منہ تکنے لگی۔ تب اس نے فرائنگ پین میں آلو کے قتلے فرائی کرتے ہوئے اسے بتایا تھا۔

"نینی تمہارا حال پوچھ رہی ہے۔ اسے تم سے مل کر بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے۔" علی عیسیٰ کے وضاحتی انداز کو ملاحظہ کر کے جواباً مالا نے بھی خاصے جوش کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ اخلاق کے بدلے... بداخلاقی نہیں دکھا سکتی تھی۔ اس کے نرم رویے کو محسوس کر کے نینی کچھ اور پھیلتی نہ جانے پھر کون سی رگت مت کرنے لگی تھی۔

اب کہ نینی نے بولتے ہوئے سنگترے کا جوس اس کے سامنے کیا تھا۔ مالا نے یہی سمجھا وہ اس سے پوچھ رہی ہے کہ جوس لوگی یا نہیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تب ایک مرتبہ پھر علی عیسیٰ نے مداخلت کی تھی۔

وہ اسے بغیر شرمندہ کیے بہت نرمی سے بتا رہا تھا۔

"نینی پوچھ رہی ہے تم کیا کھانا پسند کرو گی؟"

علی عیسیٰ گویا ان دونوں کے درمیان گفتگو بڑھانے کا سبب بن گیا تھا۔ اس نے مالا کو بتایا تھا نینی کو انگلش نہیں آتی، وہ صرف اپنی مادری زبان میں بات کر سکتی تھی۔ تب مالا کو لگا اسے دیواروں سے ہی زیادہ ہم کلام ہونا پڑے گا۔ ظاہر سی بات تھی چند دن تک علی عیسیٰ گھر میں تھا بعد میں اسے دفتر بھی جانا تھا۔ تب نہ جانے اس کا کیا بنتا......؟ مگر وہ بعد کی باتوں کو ابھی سے نہیں سوچنا چاہتی تھی۔ کچھ دیر بعد نینی نے جوس اور فرائی شدہ قیمہ سلائس میں سجا کر اس کے سامنے رکھا تھا۔

"لنچ بس تیاری کے آخری مراحل میں ہے تب

تک تم جوس اور سینڈوچ کھالو۔" علی عیسیٰ، نینی کو برتن لگانے کا کہہ کر اس کے سامنے رکھے اسٹول پر بیٹھ گیا تھا۔ اب وہ اس کے سامنے بھلا کیسے کھاتی؟ جو ایک گھونٹ جوس کا بھرا تھا۔ وہی حلق میں پھنس گیا تھا۔ اسے لگا، وہ کبھی اس کے سامنے کچھ کھا نہیں سکے گی۔ وہ بہت پُرشوق نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مگر شاید وہ اسے نہیں سینڈوچ کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے سینڈوچز کو چکھا تک نہیں تھا۔

"کیا تمہیں پسند نہیں آیا؟ آج تو سب کچھ دیسی بنایا ہے، تم اسے چکھو تو سہی۔" اب وہ اتنے پیار سے مجبور کر رہا تھا تب مالا کو سینڈوچ چکھنا ہی پڑا۔ وہ تو شاید اسے پورا سینڈوچ کھلا کر اٹھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ سو مالا نے اس کا دھیان بٹانے کی غرض سے کہا۔

"مون کہاں ہے؟ وہ نظر نہیں آئی؟" مالا کو موضوع بدلنے کے لیے اتنا اچھا مون کے علاوہ ٹاپک نہیں مل سکتا تھا۔ اس کا سوال سن کر علی عیسیٰ قدرے بجھ سا گیا تھا۔ اس کے چہرے کی جوت بھی ہلکی پڑ گئی تھی۔ وہ اتنا اداس اور مضطرب نہ جانے کیوں ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا وہ اپنا سوال پھر سے دُہرائے مگر اس کے سوال دُہرانے سے پہلے ہی علی عیسیٰ نے بہت بجھے لہجے میں بتایا تھا۔

"مون ہماری نانی کی طرف ہوتی ہے۔ ممی کے بعد اسے نانی نے اپنے پاس رکھ لیا تھا پھر بعد میں پاپا اسے لے آئے مگر اب وہ پھر نانی کے گھر چلی گئی ہے۔ ہماری گروس موتر بہت نائس ہیں۔" علی عیسیٰ نے مون کے متعلق بتاتے ہوئے شاید بہت ساری باتوں کو چھپا لیا تھا۔ اس نے مالا کو یہ نہیں بتایا تھا مون اِن باپ، بیٹے کے ساتھ لڑائی کر کے گئی ہے اور وہ ان دونوں سے ناراض تھی۔ علی عیسیٰ نے مزید مون کے متعلق بات کرنے سے گریز کرتے ہوئے نینی کے بلانے پر اسے باہر آنے کا اشارہ کیا تھا۔ کچھ دیر بعد ڈیڈی اور چاچو بھی آ گئے تھے۔ کھانا بہت ہی خوشگوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔ جانے کون کون سی ڈشز تھیں۔ ان کے نام جانے بغیر کھانے کی لذت اور ذائقے کو انجوائے کرتے ہوئے وہ علی عیسیٰ اور چاچو کی مزیدار گفتگو سن رہی تھی۔ تب چاچو نے مالا کو دیکھ کر شرارتی انداز میں کہا۔

"تم بہت خوش ہو رہی ہو ناں...... کہ جرمن فوڈ دیسی کھانوں جیسا ملا جلا ہے تو بیٹا......! زیادہ خوش فہمی میں مبتلا مت ہونا...... یہ تو آج میرے بیٹے نے خاص الخاص تم لوگوں کے لیے ہال براتن، سوین، گے میش تر سالات، اور دوت کوہل جیسے آئٹم بنوائے ہیں۔ بالکل دیسی کھانوں جیسی لذت اور ذائقہ ہے تاکہ تم آتے ساتھ فاقے کرنے نہ لگ جاؤ۔" چاچو کی شرارتی نظریں محسوس کر کے مالا کچھ جھینپ گئی تھی جبکہ علی عیسیٰ نے فوراً مالا کی طرف داری کی تھی۔

"پاپا! یہ ہمارے کھانے بھی اتنے ہی ذوق شوق سے کھائے گی مجھے پورا یقین ہے۔" علی عیسیٰ نے نہ جانے کس رو میں اس کی طرفداری کرتے ہوئے اتنا بڑا دعویٰ کر لیا تھا۔ اِدھر تو چاچو فوراً اس کا امتحان لینے پر تیار ہو چکے تھے۔ وہ شاید بیٹے کا دعویٰ بودا ثابت کرنا چاہتے تھے۔ وہ تو ہال براتن کو بہ مشکل نگل رہی تھی...... اب وہ ان باپ بیٹے کی گفتگو سن کر مزید دہل گئی۔ چاچو نے ایک پیالے میں ڈھیروں کریم سے گندھی ایک میٹھی چیز ڈال کر مالا کی طرف بڑھا دی تھی۔ سفید کریم میں لتھڑی وہ کوئی ناخ تنش تھی شاید برفی یا گلاب جامن کی موٹی سی گولی۔ مالا میٹھا بہت کم کھاتی تھی اور یہ عجیب سی سویٹ ڈش تو اس کے حلق سے نیچے اتر ہی نہیں سکتی تھی مگر چونکہ چاچو نے علی عیسیٰ کو چیلنج دے دیا تھا سو وہ علی عیسیٰ کی ہتکی کیسے گوارا کر سکتی تھی۔

اس نے بہت خوشگوار انداز میں (دل ہی دل میں نہایت تکلیف اور مشقت سے) چمچ بھر کے منہ میں رکھ لیا تھا...... اور مالا کی یہ کوشش علی عیسیٰ کو مسکرانے

پر مجبور کر گئی تھی۔ اب وہ دوسرا اسپون بھر کر منہ میں رکھ رہی تھی۔ اسے یہ کرسٹل کی شیوسل (پیالہ) خالی کرنا تھی جو ناخ تنش کی گولی اردبیرے، اناناس، یغیر زخ اور کریم سے بھری "کے پک" سے تیار اور لبالب بھری تھی۔ اتنی مٹھاس کو ہضم کرنا آسان نہیں تھا...... مگر وہ علی عیسیٰ کے ٹہوکے دینے اور منع کرنے کے باوجود بھی مسلسل کھائے جا رہی تھی۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ مالا سے اتنا میٹھا بہ مشکل کھایا گیا ہوگا مگر وہ اس کے منع کرنے کے باوجود بابا کا چیلنج پورا کر چکی تھی۔ اس نے علی عیسیٰ کے کہے لفظوں کی لاج رکھ لی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پر موجود سب افراد حیران تھے۔ تب چاچو نے فوراً اسے انعام کے طور پر ایک بوسے کے ساتھ کچھ بڑے نوٹ بھی دیے تھے۔ وہ اس انعام پر ایک مرتبہ پھر جھینپ گئی تھی تاہم اگلے تین ماہ تک چاچو مالا کو اسی بات پر چھیڑتے رہے تھے۔

اسی خوشگوار اور گلابی شام وہ علی عیسیٰ کی زندگی میں شامل ہو گئی تھی۔ نقرئی آبشاروں کے درمیان موجود اس سرخ ہوٹل میں ان کی شادی اور نکاح کی تقریب بہت دھوم دھام سے انجام پائی تھی۔ سیکڑوں لوگوں نے شادی میں شرکت کی تھی۔ نہ جانے چاچو کے کس کس بندے سے گہرے مراسم تھے۔ یہاں تو رنگ و بو کا سیلاب اتر آیا تھا۔ حسین تر جگمگاتے ملبوسات میں تتلیاں اڑتی پھر رہی تھیں۔

یہاں کلاسیکی موسیقی کا ایک پروگرام بھی ہونے والا تھا۔ علی عیسیٰ کے کئی دوست سُر سنگیت کی تانیں لگا رہے تھے۔ ماحول بہت خوشگوار تھا۔ تبھی مشرقی لبادے میں لپٹی سرخ لہنگے کو زیب تن کیے مالا نے محسوس کیا تھا کہ علی عیسیٰ اس کے آس پاس کہیں نہیں ہے۔ جانے وہ نکاح کے بعد کہاں چلا گیا تھا؟ مالا کے دل میں کہیں دور بے چینیاں چٹکیاں بھر رہی تھیں۔ یہ سحر انگیز محفلِ موسیقی بھی اس کا دل خوش نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کے دل کی ہر خوشی علی عیسیٰ کے ساتھ ہی تو جُڑی تھی۔ اس کی سوچیں وسوسوں کے گرد چکر کھا رہی تھیں۔ جب ایک دم پورا ہال اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔ اس کا دل لمحے بھر کے لیے رک سا گیا تھا پھر کچھ دیر بعد ہوٹل کا ہال موم بتی کی مدھم روشنیوں سے سحر انگیز طور پر روشن ہو گیا تھا۔ ویٹرز اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے کچھ موم بتیوں کو روشن کر رہے تھے۔

پھر مالا کی آنکھوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا تھا۔ انٹرنس ڈور سے داخل ہوتا علی عیسیٰ ریڈ کارپٹ پر کسی کا ہاتھ تھامے چل رہا تھا۔ اس کے برابر ریشمی روک پر سیاہ موتیوں سے بھری شرٹ پہنے ایک بہت خوب صورت لڑکی سج، سج کر قدم اٹھا رہی تھی۔ اس کے بال بہت لمبے تھے، اتنے لمبے اور سرخ تھے گویا ریشم کی سرخ آبشار ہو...... اس نے بالوں کی بہت اونچی پونی کر رکھی تھی اور اس پونی میں نگینے جڑے تھے۔ سر پر یاقوت اور ہیرے سے سجا کراؤن پہن رکھا تھا۔ اس لڑکی کا سر جھکا ہوا تھا۔ اور وہ اسٹیج تک سر جھکائے ہی آئی تھی۔ اس کے بالوں کی لمبائی دیکھ کر مالا کو اپنے گھنے، لمبے سیاہ بال کچھ چھوٹے محسوس ہونے لگے تھے اور اس کے کراؤن سے نکلتی روشنیوں کا کوئی انت نہیں تھا۔

علی عیسیٰ اس لڑکی کو بالکل اس کے سامنے لے آیا تھا۔ اب وہ بہت خوشگوار موڈ میں اس لڑکی کا مالا سے تعارف کروا رہا تھا۔

"یہ مون ہے میری چھوٹی بہن۔" علی عیسیٰ کے لہجے میں اپنی بہن کے لیے بہت محبت تھی تو گویا وہ مون کو منا کر بالآخر لے ہی آیا تھا۔ جانے وہ اس کے ساتھ آ کیسے گئی تھی؟ مالا نے سنا تھا، وہ بہت ضدی اور ہٹ دھرم ہے، اپنی کہی بات سے پیچھے نہیں ہٹتی۔ وہ بہت غصہ ور اور عجیب سا مزاج رکھتی تھی۔ اتنی مختصر سی دیر میں بھی مالا اس کے بارے میں بہت کچھ جان گئی تھی۔ اسے مون بہت نخریلی محسوس ہوئی تھی۔ ایک دم مغرور سی، کچھ کچھ اُکھڑا اور بہت ہی عجیب...... وہ

عجیب کیوں تھی؟ پہلی ملاقات میں ہی وہ مالا کو بہت عجیب لگی تھی۔ دراصل وہ بہت ہی عجیب تھی۔ مالا کو وہ ساحرہ یا جادوگرنی لگی تھی۔ وہ تھی ہی کوئی..... جادوگرنی... اس نے اپنے باپ اور بھائی پر کوئی جادو پھونک رکھا تھا...... وہ ان سے لڑتی، جھگڑتی، غصہ کرتی مگر وہ دونوں اس کے سامنے مٹی کا بت بن جاتے تھے۔ وہ جو مرضی کہتی، بولتی، باتیں سناتی، دل کی بھڑاس نکالتی کبھی چاچو اور علی عیسیٰ کی مون کے سامنے بولنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس کے سامنے سانس تک روک لیتے تھے۔ کبھی پلٹ کر جواب نہیں دیتے تھے۔ مون کے سامنے ان دونوں کے تمام الفاظ گم ہو جاتے تھے۔ یہ ساری چیزیں اس نے کچھ ہی عرصے میں شدت سے نوٹ کرلی تھیں۔

یہ باتیں اگرچہ بہت معنی رکھتی تھیں، مون کا رویہ نظر انداز کیے جانے والا تو کبھی نہیں رہا تھا تاہم جس چیز نے پہلی مرتبہ مالا کو ٹھٹکایا تھا، وہ مون کی جھکی آنکھیں تھیں۔ مون اپنی آنکھوں کو اٹھاتی ہی نہیں تھی۔ وہ کسی کی طرف بھی نہیں دیکھتی تھی۔ اس نے سر جھکا رکھا تھا۔ وہ اپنی پلکیں اوپر اٹھا کر کسی کی سمت نہیں دیکھتی تھی۔ اس نے مالا پر ایک اچٹتی سی سرسری نگاہ تک نہیں ڈالی تھی۔ تب مالا کو پہلی مرتبہ بہت عجیب سا محسوس ہوا تھا۔ گویا وہ اس قابل تھی ہی نہیں کہ مون اپنی اکلوتی بھابی کو عام سی نگاہ سے ہی دیکھ لیتی۔ وہ اتنی مغرور تھی کہ اپنے سامنے کسی کو انسان ہی نہیں سمجھتی تھی۔ اسے سرسری لہجے میں بھی اس کا احوال دریافت کرنا نہیں آیا تھا اور دیکھنے کی بات تو بہت دور تھی۔ مالا کو مون کا انداز انارمل نہیں لگا تھا۔ دراصل وہ نارمل تھی ہی نہیں۔ اس کی حرکتیں، انداز بہت عجیب تھے مگر جب اس نے مدھم روشنیوں سے سجے ہال میں وائلن بجانا شروع کیا تو یوں لگا گویا ویوالدی وینس کے سان مارکو گرجے میں وائلن بجا رہا ہے۔ موسیقی کی زبان اسے سمجھ ضرور آتی تھی مگر مون نے آلاتِ موسیقی سے جانے کون، کون سے سُر نکالے تھے۔ اس نے پورے ہال کو منجمد کر دیا تھا کہ کونے سے ہلکی سی آواز تک سنائی نہیں دیتی تھی۔ گویا مون نے ویوالدی کے سُروں کا سحر پھونک دیا تھا۔ کسی متنفس کی آواز تک کانوں میں سنائی نہیں دیتی تھی۔ کہیں کہیں چمکیلے فنجانوں، بلوریں گلاسوں کی کھنک فضا میں ارتعاش پیدا کرتی تھی۔

سفید رنگت والی دل آویز مسکراہٹوں کو رنگے ہوئے ہونٹوں پر سجائے ویٹریسز مختلف اور مہنگے ترین مشروب کے جام لیے اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی جو مہمانوں کو ٹیسٹ، ذائقے، لذت اور خواہش کے مطابق فوراً فراہم کیا جا رہا تھا۔ یہ بہت بڑے پیمانے پر تقریب تھی۔ اتنے مہمانوں کا مالا نے تصور بھی نہیں کیا تھا گھر میں تو کوئی زیادہ لوگ نہیں تھے۔ تاہم ہوٹل میں رنگ، رنگ اور نسل، نسل کے لوگ اکٹھے ہوئے تھے اور یہ لوگ ویوالدی کے سُروں کی محبت میں مبتلا تھے۔ کچھ مون کو فن کا مظاہرہ کرنے میں مہارت بھی بہت تھی۔ وہ سر جھکائے لانبی پلکوں کی جھالر تانے اپنی دُھن میں مگن تھی۔ اس کا یاقوت اور ہیروں سے سجا کراؤن سرخ بالوں کی جگمگاہٹ بڑھا رہا تھا۔ یہ طلسم تب ٹوٹا جب اس نے ویوالدی کے بعد اگلے کچھ نمبر باخ موسیقاروں کے سُروں کی لے میں سنائے۔ باخ باپ اور باخ بیٹے کی موسیقی کا ذائقہ بھی ہومر اور ہیرنگ جیسا تھا۔ بوڑھے باخ کے سُر الگ رنگ رکھتے تھے، الگ سُر، ذائقہ اور لذت رکھتے تھے جبکہ جوان باخ کے سُروں کی لذت کچھ اور تھی۔

مالا نے غور کیا تو اسے اندازہ ہوا یہاں سب موسیقی کے دلدادہ بیٹھے تھے۔ موسیقی کے دیوانے اور موسیقی کے عشق میں گرفتار حاضرینِ محفل کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ یہ لمحاتی طلسم تب ٹوٹا جب مون نے وائلن بجانا ترک کیا اور ریکارڈ پلیئر سے سُر ایک مرتبہ پھر بکھرنے لگے تھے۔ موسیقی میں کتنی غذائیت

تھی یہ پہلی مرتبہ مالا نے یہاں آ کر جانا تھا۔

مالا کو اس تقریب میں مون کی شمولیت بس یوں لگی گویا وہ انہیں وائلن کے سُر سنانے آئی تھی۔ ڈنر سے پہلے ہی وہ اپنے بھائی کو جانے کون سے جواز دے کر چلی گئی تھی تاہم علی عیسیٰ کی تانتے (خالہ) کافی دیر تک رکی...... وہ بھی اگرچہ اپنی بھانجی کی طرح خاصی اکھڑی، اکھڑی تھی البتہ وہ تقریب کو چھوڑ کر گئی نہیں تھی جبکہ مون تو یوں لگتا تھا گویا جان چھڑا کر بھاگ گئی ہے۔ یہ علی عیسیٰ کی لاڈلی بہن سے مالا کی پہلی عجیب تر ملاقات تھی اور اس نے مون کی تانتے کے ہمراہ ایک اور چہرہ بھی دیکھا تھا جانے وہ کون تھی؟

☆☆☆

مون سے اس کی اگلی ملاقات شادی کے دو ہفتے بعد ہوئی تھی۔ یہ دو ہفتے کتنے خوشگوار گزرے تھے۔ مالا ان کو لفظوں میں بیان نہیں کرسکتی تھی۔ ڈیڈی واپس چلے گئے تھے جبکہ وہ علی عیسیٰ کی ہمراہی میں گویا بادلوں کے رتھ پر سوار تھی۔ چاچو نے کہا تھا علی عیسیٰ مالا کو پورا من ہائیم، وائن ہائیم گھما کر لائے۔ دراصل یہ ان کا ہنی مون پیریڈ تھا۔ علی نے کہا تھا وہ جتنا مرضی اس کی فراغت سے فائدہ اٹھالے کیونکہ اگلے بہت سارے دنوں میں وہ ڈھیر سارا مصروف ہونے والا تھا مگر یہ دن اس نے مالا کے نام کر دیے تھے تب ہیروں کے مانند دمکتی مالا کا رنگ روپ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ عیسیٰ اسے اکثر چھیڑتا۔

''اسم بامسمیٰ ہو تم، سچ میں میرے گلے کا ہار بن گئی ہو۔'' اس کے نام کا حوالہ علی عیسیٰ کی چھیڑ تھا۔ وہ کبھی اسے ہار سنگار کہتا، کبھی گلوبند، کبھی موتیوں کی مالا...... کبھی گلابوں کی مالا، کبھی موتیے اور جوہی کی مالا۔

ان دو ہفتوں میں عیسیٰ نے اسے سوپر مارکیٹ سے لے کر کونڈی تورے، پارفیومیری، کاؤف ہاؤس تک ایک، ایک جگہ دکھا دی تھی۔ مالا کو ان بڑے، بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹورز میں سے جو جگہ سب سے بڑھ کر پسند آئی تھی وہ شپیل وارن لادن تھی یعنی کھلونوں کی دکان...... شیشے کے چمکتے شیلف پر سجے رنگ، رنگ کے کھلونے، چینی کی گڑیا، کانچ کی مورتیاں، اس کا دل چاہ رہا تھا وہ کھلونوں کا پورا ڈھیر خرید لے۔ اس نے بے شمار کھلونے خریدے تھے عیسیٰ کچھ حیران تھا۔ اس کی کھلونوں سے دلچسپی عیسیٰ کو متحیر کر رہی تھی۔ جب وہ شاپنگ بیگز لے کر کاؤف ہاؤس سے نکل رہے تھے تب عیسیٰ نے حیرت بھرے لہجے میں مالا سے پوچھا تھا۔

''کیا پاکستان میں تمہارے بھائی کے بچے ہیں؟ میرا مطلب ہے، یہ کھلونے......؟'' وہ خاصا حیران تھا، گویا اس کے خیال میں مالا یہ کھلونوں کی شاپنگ اپنے بھتیجے، بھتیجیوں کے لیے کر رہی ہے مگر مالا نے اس کا خیال غلط ثابت کر دیا تھا۔

''میرے تو کسی بھائی کی شادی نہیں ہوئی۔'' اس نے فوراً عیسیٰ کی حیرانی دور کی تھی۔ وہ کھلونوں کے ڈھیر کو اب بھی محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ تب علی عیسیٰ نے حیرت سے کہا تھا۔

''تو پھر یہ سب......؟'' یقیناً اس کی الجھن دور نہیں ہو رہی تھی۔ اگرچہ مالا خاصی کم عمر تھی مگر پھر بھی کھلونے اکٹھے کرنے اور گڑیا کھیلنے کی عمر سے تو نکل چکی تھی پھر اس ڈھیر کو خریدنے کا نہ جانے کیا مقصد تھا۔

''یہ تو میں نے اپنے لیے......'' مالا کچھ بولتے ہوئے دانتوں تلے زبان کو داب چکی تھی۔ یقیناً وہ کچھ انہونی بولنے والی تھی مگر بروقت احساس ہو جانے پر یک دم چپ کر گئی تھی مگر علی عیسیٰ اس کی ادھوری بات کا مفہوم بھی سمجھ چکا تھا۔ تبھی ایک معنی خیز تبسم اس کے چہرے کو انتہائی روشن کر گیا تھا پھر وہ جانے کتنی دیر تک ہنستا رہا۔ اپنی لاڈلی benz میں بیٹھ کر بہت پیار سے ڈرائیونگ کرتا ہوا اب بھی وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ بہت کھلی، کھلی، تروتازہ اور چمکیلی سی تھی۔ وہ پیار بھری نظروں سے مالا کو دیکھ رہا تھا۔ گویا

اس کے کہے گئے الفاظ کو انجوائے کر رہا تھا۔ اس کے لہجے کے معصومانہ پن سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اس کی بے ساختگی اور سادگی سے حظ اٹھا رہا تھا۔ اس کی برجستگی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسے مسلسل اپنی طرف دیکھتا پا کر مالا بہت کنفیوز ہو گئی تھی۔ وہ اس کی ... بے باکانہ نظروں سے گھبرا جاتی تھی۔ عیسیٰ کو یک ٹک اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے بہت بونگی سی دلیل دی تھی۔

''مجھے کھلونے اچھے لگتے ہیں، اسی لیے خریدے ہیں۔'' مالا جانتی تھی اس کا جواز بوگس ہے...... اس کی دلیل ہلکی ہے اور الفاظ ایسے نہیں جو علی عیسیٰ کو قائل کر لیں۔ وہ ابھی تک مسکرا رہا تھا مگر اس کی وضاحت ملاحظہ کر کے کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔

''میں نے تم سے وضاحت تو نہیں مانگی۔'' عیسیٰ نے بہ مشکل مسکراہٹ سمیٹ کر کہا تھا۔ وہ اب بھی معنی خیز نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا تب وہ کچھ جھنجلا گئی تھی۔

''تو پھر......؟'' اس کا اشارہ اس کی معنی خیز مسکراہٹ کی طرف تھا۔ وہ بہت جھنجلاہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ بہت کنفیوز ہو رہی تھی۔ تب عیسیٰ نے سابقہ کھلکھلاتے لہجے میں اسے ایک مرتبہ پھر چھیڑا تھا۔

''تم تو پاپا اور مجھ سے بھی زیادہ فیوچر پلاننگ کے لیے اتاولی ہو...... اتنی تیز رفتاری...... ایسی عجلت پسندی...... اتنی دور اندیشی...... ویسے یہ کھلونے ایک دو سال تک مہنگے نہیں ہونے والے تھے۔'' اب وہ اس کے جملوں کو پکڑ کر کتنا ستائے گا، یہ بات مالا پہلے سے سوچ نہیں پائی تھی اور اسے یہ بھی خبر نہیں تھی۔ عیسیٰ نہ صرف اسے تنگ کرے گا بلکہ چاچو کو بھی اس کی دور اندیشانہ شاپنگ کی تفصیل سنا دے گا۔ مالا تو اتنے پیارے، پیارے کھلونے لا کر پچھتائی تھی۔ اِدھر چاچو بھی گویا عیسیٰ کی تفصیل سن کر بہت پُرجوش ہو گئے تھے۔

''آخر میری بھتیجی ہے، نہایت سمجھدار اور...... دور اندیش...... میں تمہارے لیے رشتہ مانگنے جانے سے پہلے کارڈ تک چھپوانے کی بات کر گیا تھا پھر وہ میری عقلمندی سے متاثر کیوں نہیں ہوتی۔'' چاچو اور عیسیٰ کے درمیان نوک جھوک چلتی رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت بے تکلف تھے جبکہ مالا کچھ جھینپ کر وہاں سے اٹھ گئی تھی مگر عیسیٰ نے اس کی اگلے بہت سارے دن تک بھی گت بنائے رکھی تھی۔ کبھی وہ اتنی سنجیدہ گفتگو کے درمیان اچانک کہتا۔

''یار مالا! تم نے بے بی ڈریسز تو لیے ہی نہیں۔ بس کھلونے اٹھا لائیں...... کسی دن پھر چکر لگاتے ہیں۔'' اس قسم کے جملے ہمہ وقت عیسیٰ کی زبان پر رہتے...... وہ اسے تنگ کرنے، زچ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا...... اکثر بہت اہم دفتری فائل کا مطالعہ کرتے ہوئے چونک کر اسے مخاطب کرتا، وہ جو سمجھتی تھی شاید اسے کوئی ضروری بات یاد آ گئی ہے مگر عیسیٰ کی ضروری بات سن کر بھنا اٹھتی تھی۔ وہ بہت معصومیت بھرے لہجے میں اسے جتاتا۔

''اب کے کچھ فیڈر اور چوسنیاں بھی لے آنا۔'' عیسیٰ کی معصومیت بھری شرارت محسوس کر کے وہ زچ ہو اٹھتی تھی پھر خود ہی بھنا بھنا کر کھلکھلا کے ہنس پڑتی۔ عیسیٰ کی ہمراہی میں ایک دن بھی اس کی پلکیں شبنمی قطروں سے بھیگی نہیں تھیں۔ وہ اپنے بھائی، بہن کو یاد کرنے کے بہانے بھی روئی نہیں تھی۔ دراصل عیسیٰ اسے اتنا مصروف رکھتا تھا کہ مالا کو اپنے گھر والوں کو یاد کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔

☆☆☆

ایک دن عیسیٰ اسے ہوہن موس کا جنگلاتی میلا دکھانے لے آیا تھا۔ جنگل میں سے کئی راستے گزرتے تھے جو ایک چھوٹی سی آبادی کی طرف لے جاتے تھے۔ جنگل میں سے گزر کر اس آبادی تک جانا مالا کو خاصا خوفناک لگ رہا تھا۔ مگر عیسیٰ کی تسلیاں، دلاسے اسے بہادر بنائے ہوئے تھے۔ عیسیٰ نے بتایا

تھا کہ آبادی کی طرف جانے والے رستے شہری سڑکوں کی طرح ہر قسم کے نشانات اور اشاروں سے مزین ہیں۔ رات کو بھی سفر دشوار نہیں تھا۔ سڑکوں پر گہرے رنگوں کے تیر بنے ہوئے تھے جو رات کو لشکارے مارتے تھے۔ یعنی سفر کٹھن نہیں آرام دہ تھا۔ اور دیہی علاقوں میں ایسی سہولیات مالا کے لیے حیران کن تھیں۔

وہ لنچ کے بعد گھر سے نکلے تھے پھر طویل جنگل کی سرنگ سے نکل کر کھلے آسمان تلے آئے گویا مالا کی جان میں جان آئی تھی۔ اسے پورے رستے یہی خوف لاحق رہا تھا کہ جنگلی جانور کہیں سے نکل کر ضرور بدمزگی پھیلائیں گے اگر زیادہ غصیلے ہوتے تو انہیں چیر پھاڑ بھی سکتے تھے مگر یہ محض مالا کے اندیشے تھے۔ سارے سفر میں ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ آبادی کے قریب ہی ہوہن موس کے گرجا گھر کی گھنٹیاں سنائی دینے لگی تھیں۔ جانے یہ کس قسم کا میلا تھا۔ مالا کے ذہن میں تو پاکستان میں مختلف علاقہ جات میں ہونے والے میلے گھوم رہے تھے مگر یہاں ویسا کچھ بھی نہیں تھا۔ پان والوں کے اسٹال تھے نہ قلفی والوں کی پکار، نہ جھولے، نہ جانوروں کے کرتب...... یہاں بہت رش ضرور تھا۔

''اتنے لوگ قطار در قطار کہاں جا رہے ہیں؟'' مالا نے حیرانی سے عیسیٰ کو مخاطب کیا۔ اس کی حیرت بجا تھی۔ وہ مختلف ٹولیوں میں موجود لوگوں کو ڈھلوان سے اترتے دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ جانے یہ لوگ کہاں جا رہے تھے؟

''آج گوٹس ڈینٹ ہے ناں......'' عیسیٰ کے بتانے پر وہ ہکا بکا سی اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ پھر اس کی آنکھوں میں ڈھیروں ناگواری اتر آئی تھی۔ اس کی سفید پیشانی بل دار ہو گئی...... ہونٹ ایک دوسرے میں بھینچ گئے۔

''مگر ہمارا یہاں کیا کام......'' وہ بہت چاہ کر

بھی اپنے غصے اور کرخت تاثرات پر قابو نہیں پا سکی تھی۔ عیسیٰ اس کا غصہ، کرختگی اور ناراضی کی وجہ گویا لمحوں میں سمجھ گیا تھا۔ تب اس نے بڑے پیار سے سمجھایا۔

''ہم تو ہو، ہن موس کی ہریالی دیکھنے آئے ہیں مگر یہاں کا گرجا گھر بہت مشہور ہے۔ لوگ کرنخ تک جا رہے ہیں۔ تمہیں گرجا گھر کی عمارت بھی دکھاؤں گا...... ارے، تم کیا سمجھ رہی ہو۔ پاگل ہو تم بھی۔ یار......! میں پکا مسلمان ہوں۔ تم کچھ غلط گمان میں نہ پڑو۔'' عیسیٰ کی تسلی نے مالا کو لمحوں میں پُرسکون کر دیا تھا۔ اس کے ذہن میں کیسے غلط، غلط خیال آ رہے تھے۔ بھلا عیسیٰ کا کسی چرچ میں کیا کام تھا؟ وہ بھی جانے کس وہم میں پڑ گئی تھی حالانکہ اپنی آنکھوں کے سامنے کئی مرتبہ عیسیٰ کو نماز پڑھتے دیکھ چکی تھی۔ عیسیٰ اس کا غصہ دیکھ کر وضاحت دینے کے بعد اب بڑے لطف لینے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔

''تم غصے میں بہت اچھی لگتی ہو۔'' وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔ وہ ہو، ہن موس شالی کی جانب پہاڑی جنگل کے کنارے پر بہت بھیگی اور سیلی ہوئی آبادی کو دیکھ رہی تھی۔ جنگل کا فسوں ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ حالانکہ ان کی گاڑی کھلے آسمانوں تلے آ چکی تھی۔ نیلگوں آسمان کا حسن کھلا پڑ رہا تھا۔ ہر طرف سبزے سے گندھے کھیت تھے۔ بیچ میں شرے جیسی سڑک بل کھاتی تھی۔ بھیگے بھیگے ملائم فطری منظر میں مقناطیسی کشش تھی۔ سورج کی کرنیں پہاڑیوں پر پگھل رہی تھیں۔ خوش خرام ندی کہیں دور میگھ ملہار کا کوئی گیت گا رہی تھی۔ یہ روح کو شاد کر دینے والے، آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے مناظر تھے۔

کچھ دور ایک پہاڑ کی چوٹی پر اسے سرخ مکان کی چھت نظر آئی تھی۔ یہ مکان آبادی کے دوسرے گھروں کی طرح بہت خوب صورت تھا۔ اتنا خوب صورت کہ مالا مبہوت رہ گئی تھی۔ من ہائیم سے لے کر یہاں تک ان بے شمار خوب صورت گھروں میں ایک مماثلت ضرور تھی۔ ان تمام گھروں کی ونڈوز ایک ہی طرز کی تھی۔ عیسیٰ کے گھر سے اس دیہی علاقے کے ان گھروں تک ایک ہی طرز کی کھڑکیاں اور ان کے سامنے نائیلون کی جالی والے پردے...... اور سب سے متاثر کُن پھولوں سے لدی ٹوکریاں تھیں جو کھڑکیوں سے لے کر دروازوں تک ایک ہی انداز میں لٹکائی گئی تھیں۔ تقریباً جالی والے پردوں سے لے کر پھولوں کی ان ٹوکریوں تک کچھ بھی بدلاؤ نظر نہیں آیا تھا۔ جانے یہ ان لوگوں کے کلچر کا کوئی حصہ تھا...... پھولوں کی ٹوکریوں سے سجے اس سرخ چھت والے گھر کی طرف اشارہ کر کے مالا نے علی عیسیٰ کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

''وہ گھر کتنی حسین لوکیشن پر ہے...... ایک طرف پہاڑ سے پھوٹتا چشمہ، ایک طرف پھولوں کے وسیع کھیت اور اس بالکونی میں کھلتا بیڈ روم کا دروازہ...... نہ جانے یہ کمرا کس خوش نصیب کا ہے؟'' مالا کے لہجے میں کتنی حسرت سمو گئی تھی۔ وہ اس گھر کو قریب سے دیکھنے کے لیے مچل اٹھی تھی۔ تب عیسیٰ نے بہت ٹھہرے رواں لہجے میں اسے بتایا تھا۔

''یہ کمرا مون کا ہے...... اور یہ گھر نانی اور نانتے کا ہے...... میں تمہیں اپنی ماں کے آبائی علاقے میں لے کر آیا ہوں۔'' عیسیٰ کے لہجے میں اپنی ماں اور نانی کے لیے ڈھیروں محبت تھی جبکہ مالا اس انکشاف پر دم بخود رہ گئی۔

''کیا سچ......؟'' وہ متحیر رہ گئی تھی پھر اس نے بہت مچلتی نگاہ سرخ چھت والے مکان پر اچھالی تھی گویا وہ اس مکان کو قریب سے دیکھ سکتی تھی۔ کچھ دیر فطری حسن کی دلکشی محسوس کرنے کے بعد علی عیسیٰ اسے ایک مسیحی عبادت کدے میں لے آیا تھا۔ صدر دروازے سے گزر کر وہ ایک وسیع ہال میں چلے آئے تھے۔ عیسیٰ اسے گرجے کی قدامت اور اس کی تاریخ کے متعلق بتا رہا تھا۔ وہ اس کے فنِ تعمیر کی چیدہ، چیدہ

باتیں مالا کو بتا رہا تھا۔ یقیناً مالا کو تاریخ جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو اردگرد کے ماحول کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ کوئی چرچ دیکھا تھا۔ ہال میں داخل ہونے کے بعد ایک بوجھل سی کثیف خوشبو نتھنوں سے ٹکرائی تھی۔ بہت ہی قدامت لیے تاریخی پُررونق پس منظر تھا۔ قدرے پُرجلال اور نیارا سا تھا۔ ہال تقریباً بھرا ہوا تھا۔ یہاں ہر طرح کے لوگ موجود تھے، تہذیب یافتہ، تعلیم یافتہ، مہذب، باوقار اور بن مانس ٹائپ کے بھی...... وہ چھت کی کڑیاں گنتی پُرہجوم منظر میں خود کو عجیب محسوس کر رہی تھی۔ یقیناً یہی کیفیات علی عیسیٰ کی بھی تھیں چونکہ وہ لوگ ہال میں داخل ہو چکے تھے سو اٹھ کر جانا مناسب نہیں تھا۔ مالا بھی علی عیسیٰ کی پیروی میں ایک الگ تھلگ کونے میں ذرا سا ٹک گئی تھی۔

وہ پادری کے وعظ سننے کے بجائے علی عیسیٰ کے بتانے پر سامنے دیوار پر عیسائی ولیوں کی بڑی، بڑی تصویریں دیکھ رہی تھی۔ علی عیسیٰ نے اسے کچھ دوسری دیواروں کی طرف بھی متوجہ کیا تھا جن پر سفید کتبوں کا کوئی شمار نہیں تھا۔ جانے ان کی تعداد کتنی تھی۔ مالا اس گنتی میں نہیں پڑی تھی۔ وہ تو عقب میں موجود مقدس مریم اور یسوع مسیح کی شبیہیں دیکھ رہی تھی۔

وہ اس گرجے میں بیٹھے تھے جو ہزاروں سال پرانا تھا۔ جس کے مینار کا نوکدار کلس، سونے کی آبشار میں نہایا ہوا تھا۔ اب سروس بھی شروع ہو چکی تھی۔ جانے یہ پروگرام کتنا طویل تھا۔ مالا کے اندر تو ہول اٹھنے لگے تھے۔ اس نے سوچا وہ علی عیسیٰ کو ٹہوکا دے کر اٹھاتی ہے مگر وہ کسی اور کونے میں موجود ہجوم کی طرف متوجہ تھا۔

اہلِ بواریا کی مذہبی رگ پھڑک اٹھی تھی۔ یقیناً یہ لوگ نہایت عقیدت مند اور مذہبی تھے۔ بہتی آنکھوں کے ساتھ وعظ سن رہے تھے۔

روسٹر پر ایک کیتھولک پادری مقدس عبا اور چوگوشیہ ٹوپی پہنے ڈچ زبان میں کتابِ مقدس سے کچھ پڑھ کر سنا رہے تھے۔ وہ کیا پڑھ رہے تھے؟ مالا کو ذرا سمجھ نہیں آ رہی تھی اور جسے سمجھ آ رہی تھی وہ ایک دوسرے کونے میں موجود ہجوم میں سے نہ جانے کس چہرے کو کھوج رہا تھا۔ اسے علی عیسیٰ کے چہرے پر بے انتہا ناگواری نظر آ رہی تھی۔ جانے وہ کسے دیکھ رہا تھا؛ مالا نے نگاہیں موڑ کر ایک مرتبہ پھر پورے ہال کی خواتین کو کھوجنا شروع کر دیا تھا۔ اسے تمام مرد اور عورتیں بہت رقیق القلب نظر آ رہی تھیں۔ لکڑی کے جنگلوں میں بنی ہوئی جُھریوں میں گھٹنے نیچے کیے، سر جھکائے بہتی آنکھوں کے ساتھ وعظ سننے والے لوگوں میں مالا کو ایک کم عمر دوشیزہ نے بری طرح سے چونکا دیا تھا۔ وہ لڑکی اسی کی ہم عمر ہو گی، اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ رنگت سپید تھی۔ بال اسکارف میں چھپے تھے۔ بالوں کا رنگ وہ دیکھ نہیں سکی تھی۔ یقیناً سنہرا یا بھورا تھا۔ اس کے گال کچھ ابھرے ہوئے سرخ تھے اور پھولے پھولے سرخ گالوں پر موٹے موٹے آنسو پھسل رہے تھے، مالا گویا دم بخود رہ گئی تھی۔ اس لڑکی کو مالا نے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔ یقیناً اپنے ابھرے سرخ گالوں کی وجہ سے وہ مالا کی یادداشت میں زندہ رہ گئی تھی۔ مالا نے اسے کہاں دیکھا تھا؟ بہت سوچنے کے باوجود وہ یاد نہیں کر پائی تھی۔ تاہم اس کے پھولے گال مالا کو ابھی تک نہیں بھولے تھے اور یقیناً اس کے سر کا رومال بھی، جس میں اس نے اپنے بالوں کو باندھ کر چھپا رکھا تھا۔ اس کے ابھرے گال اور سر کا رومال مالا کی یادداشت کا حصہ بن چکا تھا مگر اس وقت مالا کے ٹھٹکنے کی وجہ اس لڑکی کے موتیوں کی طرح پھسلتے آنسو تھے۔ جو جاڑے کی مینہ کے مانند لگاتار گر رہے تھے، برس رہے تھے۔

اتنی کم عمری میں، ایسی بالی عمریا میں ایک مغربی لڑکی کا اتنا خشوع سے عبادت میں رونا اسے ٹھٹکا گیا تھا۔ سیفور سے ڈھکے رومال کو اس نے سر کے پچھلی

طرف موڑ کر باندھا ہوا تھا۔ سیفور کو باندھنے کا اسٹائل بھی بڑا منفرد سا تھا۔ مالا نے اس اسٹائل میں تو کبھی اسکارف نہیں لیا تھا۔ حالانکہ اس نے آج تک سر بھی ننگا نہیں کیا تھا۔ تاہم اس لڑکی کے سیفور لینے کا اسٹائل مالا کو بہت اچھا لگا تھا۔ پھر اس کے دونوں کان بھی سیفور میں چھپے نہیں تھے۔ اس نے دونوں کانوں میں سفید گول، گول اور ہرینگے (بالیاں) پہن رکھی تھیں جس کے نیچے موٹا سا سنہری موتی لٹک رہا تھا۔

وہ اس لڑکی سے نگاہ تب ہٹا پائی تھی جب علی عیسیٰ اسے اٹھا کر ایک ہجوم کی طرف لے آیا تھا۔ یہاں شیشے کے بڑے، بڑے صندوقچے نصب تھے۔ کیمیائی پانی سے بھرے ہوئے...... اس کیمیائی واٹر میں انسانی ڈھانچے کھڑے تھے۔ قدیم زمانے کے کچھ بڑے بڑے عظیم پادریوں کی ہڈیاں اور ڈھانچے تھے۔ اتنا ہیبت ناک منظر دیکھ کر وہ عیسیٰ کے روکنے، بلانے اور آوازیں دینے پر بھی رکی نہیں تھی جبکہ اسے الٹے قدموں باہر نکلتے دیکھ کر علی عیسیٰ بھی اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔ تب مالا کو ایک جگہ ہال میں رکتے دیکھ کر وہ خود بھی رک گیا تھا۔ اس نے مالا کی نظروں کا ارتکاز محسوس کر لیا تھا۔ وہ ایک روتی ہوئی سیفورڈ جھکے سر کو جھکتی لڑکی کو دیکھ رہی تھی۔ علی عیسیٰ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے قریب آ گیا تھا پھر اس نے مالا کے چہرے پر پھیلتے تاسف کو دیکھ کر کہا۔

''یقیناً تم اب اس لڑکی سے رونے کا سبب پوچھنا چاہتی ہو؟'' وہ مالا کی رقیق القلبی اور نرم دلی سے اتنی کم مدت میں ہی واقف ہو گیا تھا۔ وہ بہت نرم دل تھی۔ بہت سادہ فطرت رکھتی تھی۔ بہت نرم مزاج رکھتی تھی۔ بہت حلیم الطبع تھی۔ وہ کسی کو بھی تکلیف میں دیکھ کر آگے بڑھ جانے والوں میں سے نہیں تھی۔

''یہ لڑکی......'' مالا کو اس لڑکی کے رونے نے تکلیف دی تھی۔ جانے وہ کب سے یہاں بیٹھی رو رہی تھی۔ دورانِ سروس بھی روتی رہی تھی۔ اب پورا ہال خالی ہو جانے کے بعد بھی تنہا بیٹھی رو رہی تھی تب اس کی نگاہوں کا ارتکاز محسوس کر کے عیسیٰ نے بتایا تھا۔

''یہ لڑکی سوزن ہے، تانتے کی بیٹی...... ہماری شادی میں بھی آئی تھی۔ شاید تمہیں یاد نہیں۔'' گہرا سانس کھینچ کر اسے متحیر کرتا وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ تعارف کے بعد سوزن کی طرف بڑھا تھا نہ ہی احوال دریافت کرنے کی اس نے ضرورت محسوس کی تھی۔ اسے عیسیٰ کا رویہ عجیب لگا تھا۔ بھلا ایسی بھی کیا بے مروتی......؟ بندہ رشتے داری کا تقاضا ہی نباہ لیتا ہے۔ اب جبکہ وہ اس کی کزن کو دیکھ چکی تھی سو یوں آگے بڑھ جانا کچھ مناسب نہیں تھا مگر جب علی عیسیٰ نے سلام دعا کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی تو پھر بھلا مالا کیسے رک جاتی۔ حالانکہ سوتی روک میں ملبوس اس لڑکی کے آنسوؤں نے مالا کو قدرے بے چین ضرور کیا تھا مگر وہ رک کر اس لڑکی سے رونے کا سبب نہیں پوچھ سکتی تھی پھر اس لڑکی کی زبان اس کے پلے پڑنے والی نہیں تھی۔ سو ہمدردی کا جذبہ اس نے دل میں ہی دبا لیا تھا۔

''سوزن رو کیوں رہی تھی......؟'' علی عیسیٰ کے برابر چلتی مالا کا دل تاریخی تہ خانے نما گرجے کے ہال میں روتی ہوئی سوزن میں اٹکا ہوا تھا...... اس کے بے تکے سوال نے علی عیسیٰ کو خاصا بیزار کر دیا تھا۔ شادی کے بعد اتنی کم مدت میں پہلی مرتبہ مالا کے کسی سوال پر علی عیسیٰ بیزار ہوا تھا۔

''مجھے اس کے من کی کیا خبر......؟ اللہ جانے کیوں رو رہی تھی۔ شاید عبادت کے دوران آخرت کے خوف سے روئی ہوگی۔'' اس کا انداز سراسر ٹالنے والا تھا اور وہ سوزن پر مزید بحث نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی سوزن کے رونے پر روشنی ڈالنا چاہتا تھا۔ اسے بیزار دیکھ کر مالا چپ کر گئی تھی۔ یعنی وہ اس کا بدلتا موڈ دیکھ کر اچھی بیویوں کی طرح سمجھ گئی تھی کہ اسے اس

ٹاپک پر مزید نہیں بولنا۔ کچھ دیر کی معنی خیز خاموشی کے بعد علی عیسیٰ نے خود ہی بتانا شروع کر دیا۔

''سوزن کے ساتھ مون بھی آئی تھی۔ شاید تم نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ کر فوراً یہاں سے چلی گئی تھی۔'' اس کے ایک دوسرے انکشاف نے مالا کو ہکا بکا کر دیا تھا۔

''مون کا یہاں کیا کام تھا؟'' اس نے بہت تیز لہجے میں بے ساختہ پوچھا تھا۔ اسے مون کا چرچ آنا بہت عجیب لگا تھا۔ وہ مسلمان تھی اور ایک مسلمان کی بیٹی تھی پھر گرجے میں کیا کر رہی تھی؟ یہ بھی نہیں تھا کہ وہ ان لوگوں کی طرح محض چرچ دیکھنے آئی تھی۔ وہ اس علاقے میں رہتی تھی یہ عمارت تو اس نے سیکڑوں مرتبہ دیکھ رکھی ہوگی پھر یہاں کیا لینے آئی تھی؟ اس کا چبھتا سوال سن کر علی عیسیٰ نے بہت تکلیف دہ لہجے میں کہا۔

''وہ سوزن کے ہمراہ ہر اس جگہ پہنچ جاتی ہے جہاں اس کا جانا مناسب نہیں ہوتا۔ اسے سوزن سے محبت جو بہت ہے۔'' مالا کو علی عیسیٰ کے لہجے میں دبا، دبا غصہ اور عجیب سی ناگواری محسوس ہوئی تھی۔

''مون اتنے دنوں سے گھر بھی نہیں آئی؟'' اس نے قدرے حیرانی سے کہا تھا۔ یہ سوال تو جانے کب سے اس کی نوکِ زبان پر مچل رہا تھا۔ آج موقع پا کر اس نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔ اندر سے وہ کچھ ڈری بھی تھی شاید علی عیسیٰ کو اس کے سوال پر غصہ آ جائے مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ علی عیسیٰ کو اس کے سوال پر غصہ نہیں آیا تھا۔

''مون کچھ عرصے پہلے پاپا اور مجھ سے لڑ جھگڑ کر گھر چھوڑ گئی ہے...... اب وہ کم، کم ہی واپس آتی ہے، میں ہی اسے مجبور کر کے واپس لاتا ہوں۔ وہ ٹھہرنے کے لیے نہیں بس گھڑی دو گھڑی کے لیے آتی ہے۔'' اس کے انکشاف پر مالا ایک مرتبہ پھر دم بخود رہ گئی تھی تو گویا مون گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ مگر کیوں......؟ آخر وجہ کیا تھی؟ بہت چاہنے کے باوجود بھی مالا اس سے یہ سوال نہیں پوچھ پائی تھی پھر کچھ دیر بعد علی عیسیٰ نے موضوع بدل دیا تھا۔

''ہم کچھ دیر تک گروس موتر کی طرف چلتے ہیں۔'' وہ سنجیدہ سا اپنی لاڈلی benz کی طرف بڑھ گیا تھا۔ یقیناً اسے کھانے پینے کا سامان ڈگی میں سے نکالنا تھا۔ مالا بھی سر جھٹک کر علی عیسیٰ کے پیچھے چلی آئی تھی۔

☆☆☆

سورج اپنے پگھلے سونے کو دوبارہ سمیٹ رہا تھا۔ آلپس کے پہاڑوں پر مرغابیاں اب کہیں نہیں تھیں۔ یقیناً جنگل کی طرف رواں دواں ہو چکی تھی۔ گرجے کا سنہرا کلس اب رات کے جھٹپٹے کی زد میں تھا۔ ماحول کچھ کچھ ہیبت ناک ہو رہا تھا۔ مالا کا ننھا سا دل سہم رہا تھا۔ حالانکہ ڈرنے یا خوف زدہ ہونے کی کیا بات تھی؟ علی عیسیٰ اس کے ہمراہ تھا مگر وہ رات کو واپسی کے سفر کی وجہ سے کچھ پریشان تھی۔ پھر اس کی پریشانی محسوس کر کے علی عیسیٰ نے مالا کو بتایا تھا۔

''ہم آج کی رات یہیں رکیں گے۔ واپسی کل سویرے ہوگی۔'' عیسیٰ کے بتانے پر مالا کچھ ہونق پن سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

''ہم کیا اس جنگل میں رات بسر کریں گے؟'' جنگلی جانوروں کے خوف سے اس نے ایک بے تکا سوال کیا تھا تب علی عیسیٰ کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ یقیناً مالا کے سوال کو اس نے بہت انجوائے کیا تھا۔ پھر وہ اسے ہوہن موس کے جنگلاتی میلے کے متعلق بتانے لگا تھا پھر اس کے واپس جانے کی رٹ سن کر ملائمت سے بولا۔

''تو کیا تم میلا دیکھے بغیر چلی جاؤ گی؟ میں تمہیں یہاں لایا کس لیے ہوں۔'' اس کے نرمی سے ڈپٹنے پر وہ ایک مرتبہ پھر ہونق ہو گئی۔

"میلا دیکھنا ابھی باقی ہے؟ مگر یہ میلا لگا کہاں ہے؟" مالا کے برجستہ ہونق پن کے مظاہرے کو دیکھ کر علی عیسیٰ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ اسے مالا کی... بے ساختگی بہت بھائی تھی۔ وہ اس کی باتوں کو بہت انجوائے کرتا تھا۔

"ابھی میلا آپ نے دیکھا کہاں ہے محترمہ؟" کھانے کے برتن سمیٹ کر وہ مالا کو لیے ایک ایسی کھلی جگہ پر آیا تھا جہاں رات جگمگا رہی تھی۔ یقیناً وہ پہلے بھی یہاں آتا رہتا تھا کیونکہ اسے دیکھ کر بہت سے جرمن نوجوان ملنے کے لیے آئے تھے۔ یہ درختوں کے جھنڈ میں کوئی وسیع جگہ تھی۔ ایک اونچا لکڑی کا اسٹیج بنایا گیا تھا۔ جس کے چہار اطراف میزیں اور کرسیاں لگی تھیں۔ پیچھے ایک مکان نما عمارت تھی جس کی بالکونی میں بینڈ گروپ، انتہائی نفیس یونیفارم میں ملبوس چاق و چوبند بیٹھا تھا۔ تانبے کے بگل اور ٹرامبون کے ساتھ نفیریاں، ہر قسم کے ڈرم وغیرہ بھی نظر آرہے تھے۔ مالا کو سب سے زیادہ پُرکشش اس تمام منظر میں بینڈ والوں کے نیلے، پیلے، ربن اور سبز رنگ کے ہیٹ لگے تھے۔ ان لوگوں نے وائٹ شرٹس پہن رکھی تھیں نیچے نیلے رنگ کی شنیل کی برجیس تھیں۔ اس رنگیلے بینڈ کا لباس اتنا کلرفل، یونیک اور جھالروں سے مزین تھا کہ نظر ان سے ہٹ نہیں رہی تھی۔ تو یہ ہوہن موس کا جگمگاتی میلا تھا۔ پاکستان کے تقریباً ہر میلے سے ہٹ کر......

یہاں قلفی والوں کی پکار نہیں تھی نہ کوئی اسٹال تھا نہ ٹھیلا...... بڑا سحر انگیز خوابناک ماحول تھا۔ کہیں کہیں موسیقی کی ہلکی گونج سناٹے کو چیر دیتی تھی۔ خصوصاً اسٹیج کو مصنوعی روشنیوں نے اجالا بخش رکھا تھا۔ طلسماتی روشنیوں میں نیلی لہریں عکس چھوڑ رہی تھیں۔ لوگ جوق در جوق میلے میں شرکت کرتے آرہے تھے اور انہی لوگوں میں مالا نے تقریباً دو ہفتے بعد ایک مرتبہ پھر اس جھکی آنکھوں والی لڑکی کو دیکھا تھا۔ اس نے نیلی روک پر موتیوں سے بھری شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کی اونچی پونی سے بالوں کی سرخ آبشار و... ہوتی نظر آرہی تھی۔ اس کے سر پر آج بھی یاقوت ا... ہیرے سے سجا کراؤن تھا۔ انتہائی روشنیوں میں ا... کے کراؤن سے چمکدار لہریں نکل رہی تھیں۔ ا... کے سرخ بال روشنی میں بے انتہا چمکیلے نظر آرہے تھے۔ آج وہ سرخ بالوں والی لڑکی اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ہمراہ تاریخ کے تہ خانے میں دبے اس ... کے فرش پر بیٹھ کے زار زار روتی لڑکی بھی سج... چلی آرہی تھی۔ ویسا ہی سیفور اس کے سر پر بندھا ... وہ سوتی فراک میں ملبوس تھی اور اس کے فراک ... فرل زمین کو چھو رہی تھی۔ آج بھی اس کے کانوں میں وہی ائیر رنگ جھول رہے تھے۔

وہ دونوں مالا کے قریب سے گزر کر ایک دوسری ٹیبل پر بیٹھ گئی تھیں۔ تب علی عیسیٰ کی نگاہ ... ان دونوں کو فوراً کھوج لیا تھا۔ یقیناً وہ دونوں بھی اس ورلڈ فیسٹ کو دیکھنے آئی تھیں۔ کچھ دیر بعد علی عیسیٰ ان دونوں کی طرف مڑ گیا تھا۔ یقیناً وہ اپنی بہن سے ملنے گیا تھا۔ اسے دیکھ کر ان دونوں لڑکیوں کے چہروں پر جگمگاہٹ آگئی تھی کچھ غور کرنے پر مالا کو ... تھا جگمگاہٹ صرف سوزن کے چہرے پر تھی۔ مون پہلے کی طرح بے نیازی پلکیں جھکائے بغیر زمین کو دیکھتی، علی عیسیٰ سے محو کلام تھی۔ یقیناً اس کی گفتگو کا اسٹائل ہی یہی تھا۔ وہ مقابل کو دیکھے بغیر گفتگو کرتی تھی۔ اسے مون کا طرز کلام کچھ عجیب نہیں بے انتہا عجیب لگا تھا۔ یقیناً وہ لڑکی بہت ہی عجیب تھی۔

ایک مرتبہ پھر وہ مالا کو نظر انداز کر چکی تھی۔ وہ مالا کو نظر انداز کیوں کرتی تھی؟ اس کا مالا کے ساتھ تو کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ سفید گلاب اور سوسن کے پھولوں سے گندھی مالا کی آنکھوں میں شبنمی قطرے امڈ آئے تھے۔ اسے اپنی اکلوتی نند کے کٹھور رویے نے ٹھیس پہنچائی تھی۔ اس کا ننھا سا دل بجھ گیا تھا۔ آخر وہ اس

کے ساتھ اتنی اکھڑی اکھڑی کیوں تھی؟ جب بواریا کی مٹیارنیں ایک جیسے لباس میں اپنے حسن کے جلوے بکھیرتی تمام مہمانوں کو شراب کے بلوریں جام پیش کررہی تھیں تب مالا چپکے، چپکے اپنے دوپٹے کے کونے سے آنسو پونچھ رہی تھی۔

دیہات کے صحت مند ماحول میں پروان چڑھی یہ لڑکیاں بہت تروتازہ اور دلفریب تھیں۔ وہ مالا کے پاس بھی وہسکی کے گلاس لے کر آئیں۔ اس نے فوراً بدک کرانکار کردیا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک گوری دوشیزہ علی عیسیٰ کو بھی مشروب دینے پہنچ گئی تھی۔ علی عیسیٰ نے بھی شکریہ کے ساتھ انکار کردیا تھا۔ کچھ ایسا ہی انکار مون اور سوزن کے چہروں پر بھی لکھا تھا۔ ان کے چہروں پر وہسکی کی طلب یا چاہ نہیں تھی۔ کچھ فاصلے پر موجود مالا کے دل کو جانے کیوں اطمینان محسوس ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد بوارین مردوں نے باقاعدہ ڈانس کر کے محفل کا آغاز کیا تھا پھر لوگوں کے ہجوم پر سکتہ طاری ہوگیا۔ یہ لوگ ہر کام بڑے نظم وضبط سے کرتے تھے۔ چاہے عبادت تھی یا رقص وسرود کی محفل...... اب بھی ماحول پر سناٹا طاری ہوچکا تھا۔ وہ لوگ اپنے محبوب رقص، شوہ پلاتر کو انجوائے کررہے تھے۔ بینڈ کے سُر بھی گونج رہے تھے۔ یقیناً ان لوگوں کے لیے یہ محفل بہت معنی رکھتی تھی مگر مالا کا جی اچاٹ ہوچکا تھا۔ کچھ دیر بعد علی عیسیٰ واپس آگیا تھا۔ اس نے بتایا تھا مون اور سوزن واپس چلی گئی ہیں اگرچہ وہ کوئی بہانہ کر کے گئی تھیں تاہم مالا جانتی تھی وہ محض اس کی موجودگی اور علی عیسیٰ کو دیکھ کر محفل ادھوری چھوڑ کر چلی گئی تھیں مگر یہ بات وہ علی عیسیٰ سے کہہ نہیں سکتی تھی۔ اس نے ان دو مختصر ملاقاتوں میں ہی مون کے رونے کی وجہ کھوج لی تھی۔ یقیناً وہ علی عیسیٰ کی مالا کے ساتھ شادی پر ناخوش تھی۔

بواریا مردوں کے بعد دوشیزاؤں کا رقص جاری تھا۔ علی عیسیٰ خاصی دلچسپی لیے زمین تک چھوتے فراک پہنے لڑکیوں کے رقص کو دیکھ رہا تھا۔ جو قابل اعتراض حد تک کھلے گلے پہنے ہوئے تھیں۔ مالا کو علی عیسیٰ کی یہ دلچسپی کچھ بھائی نہیں تھی مگر وہ اس کی آنکھوں پر پٹی نہیں باندھ سکتی تھی۔ کچھ دیر بعد اسٹیج سے کسی نے اعلان کیا...... مالا کے پلے کچھ نہیں پڑا تھا تاہم اس کا ترجمان قریب ہی بیٹھا تھا سو فوراً اسے رقص کے کسی اگلے آئٹم کے متعلق بتانے لگا تھا۔ علی عیسیٰ یہاں آکر بہت انجوائے کررہا تھا۔ کم ازکم مالا نے تو یہی محسوس کیا تھا۔ یہ علاقائی رقص ان لوگوں کے محبوب ترین ڈانس میں شمار ہوتا تھا۔

کچھ دیر بعد جب محفل کا رنگ کچھ اور بدلا تو مالا نے علی عیسیٰ کو اٹھنے کے لیے اصرار کرنا شروع کردیا تھا پھر جب وہ روشنیوں سے اٹھ کر ایک دم اندھیرے میں آئے تب مالا کچھ سہم گئی تھی۔

"اگر کسی جنگلی درندے کے ہتھے چڑھ گئے ہم تو ہمارا کفن دفن بھی کوئی نہیں کرے گا۔" مالا کی خوفناک بات سن کر علی عیسیٰ نے مصنوعی خوف بھرے لہجے میں کہا۔

"اللہ کی بندی......! ڈراؤ مت، ویسے میں ہوں ناں تمہارے ساتھ...... کسی درندے کی جرأت نہیں اِدھر نگاہ ڈالے۔" وہ اس کی طرف جھک کر شرارتی لہجے میں بولا تھا۔ تب اس کا رومینٹک موڈ ملاحظہ کر کے مالا نے قدرے مسکرا کر کہا۔

"آپ مجھے یوہنے پر ناچتی فرولائن تو نہیں سمجھ رہے......؟" اس کی نوک جھوک اور ہلکی پھلکی گفتگو علی عیسیٰ کا موڈ کچھ اور خوشگوار کرگئی تھی۔ وہ باتوں کے دوران ہی سرخ چھت والے اس خوب صورت مکان تک پہنچ گئے تھے جس کے دروازوں اور کھڑکیوں کے سامنے پھولوں سے لدی ٹوکریاں آویزاں تھیں۔ ایک طرف پہاڑ کے قعر سے آبشار پھوٹ رہی تھی اور دوسری طرف سفید گلابوں کے

وسیع باغ تھے۔

''تم بھلا بیوٹی پہ ناچتی کوئی فرو لائن ہو سکتی ہو؟ تم تو علی عیسیٰ کی محبت ہو اور علی عیسیٰ کی محبت بیوٹی پر ناچے یہ اسے تصور میں بھی گوارا نہیں ہوسکتا۔'' ڈور بیل پر ہاتھ رکھنے سے پہلے علی عیسیٰ نے کسی قدر سنجیدگی سے کہا تھا۔ یوں کہ مالا اس خوب صورت اظہار پر اندر تک سرشاری ہوگئی تھی۔ ایک دن علی عیسیٰ نے اسے بتایا تھا کہ وہ بہت عرصے پہلے سے مالا کے تصور اور اس کے ان دیکھے وجود سے محبت کرنے لگا تھا۔ پاپا نے اس کے ذہن میں مالا کا جو تصور قائم کیا تھا وہ ہو بہو ویسی تھی۔ علی عیسیٰ کو مالا جیسی لڑکیاں متاثر کرتی تھیں اور اس نے مالا سے محبت اسے بغیر دیکھے کی تھی۔ وہ اظہار میں جھجکتا نہیں تھا۔ نہ فضول سی انا کا شکار ہوتا تھا۔ وہ اسے اپنے فطری اور دلی جذبات کے متعلق سچ بتا دیتا تھا۔ علی عیسیٰ کی محبت میں مالا نے بہت شدت پائی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ کچھ شدت پسند ہے۔ وہ ٹوٹ کر چاہنے والا بیٹا، بھائی اور شوہر تھا۔ مالا کو لگتا تھا اگر اس نے ذرا سی بھی علی عیسیٰ کو ٹھیس پہنچائی تو وہ ٹوٹ جائے گا۔

اپنی گروس موتر کے گھر آکر وہ بہت خوش تھا۔ اس نے مالا کو بتایا تھا کہ وہ ہر چھٹیاں یہیں گزارتا تھا۔ اسے اپنے گروسی کے گھر سے والہانہ محبت تھی۔ اس گھر میں علی عیسیٰ کی ماں کا بچپن گزرا تھا۔ اسے اپنی ماں اور نانی دونوں سے بہت محبت تھی اور پاپا سے تو عشق تھا۔

گروسی، مالا سے بہت محبت اور والہانہ انداز میں ملی تھیں۔ البتہ تانتے کا رویہ مون جیسا سرد تھا جبکہ سوزن تو سامنے آئی ہی نہیں تھی۔ گروسی نے بتایا تھا۔ سوزن عبادت کر رہی ہے۔ یہ ایک مذہبی گھرانا تھا۔ گروسی خود بہت مذہبی خاتون تھیں۔ گروسی کے بتانے پر اسے خبر ہوئی تھی۔ سوزن کسی سنڈیکیٹ کی کارکن بھی تھی اور تبلیغ کے لیے شہر، شہر گھومتی تھی۔

گروسی کے بتانے پر ہی اسے سوزن کچھ اچھی مون حد سے زیادہ بری لگی تھی۔

وہ لوگ چونکہ کھانا کھا چکے تھے سو صرف چا[ئے] پی کر سونے چل دیے۔ دن بھر کی آوارہ گردی [نے] انہیں خاصا تھکا دیا تھا۔ گروسی ان کی تھکاوٹ [کے] پیش نظر انہیں آرام کرنے کا مشورہ دے رہی تھی[ں] حالانکہ علی عیسیٰ کو ابھی اپنی نظروں سے دور کرنے [کی] انہیں خواہش نہیں تھی۔ وہ اس سے بہت ساری با[تیں] کرنا چاہتی تھیں مگر اس کی تھکن کا خیال غالب آ[گیا] تھا۔ علی عیسیٰ، گروسی کو بہت پیار سے گوتے نا[ئٹ] بول کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ وہ اس گھر [کے] چپے، چپے سے واقف تھا سو کسی کی رہنمائی اور [گھر] دکھانے کے لیے کسی گائیڈ کی اسے ضرورت نہیں تھی۔

وہ اس کے ہمراہی میں بیڈ روم میں آگئی تھی۔ ایک دوپیل سیر تھا۔ کسی گاؤں کا کمرا تو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اعلیٰ ترین فرنیچر سے مزین، انتہائی نفیس اور صاف ستھرا...... کھڑکی کے سامنے وہی جالی دار نائیلون کا پردہ تھا جس کے گنڈے پر پھولوں کی ٹوکری ٹنگی تھی۔

عیسیٰ تو لباس تبدیل کیے بغیر اسے لاڈ بھ[ری] رات کا سلام دے کر نیند میں گم ہوگیا تھا۔ یقیناً وہ بہت تھک چکا تھا تاہم مالا کو اس اجنبی گھر میں ہرگز بھی نیند آنے والی نہیں تھی۔ حالانکہ تھکن سے انگ انگ ٹوٹ رہا تھا مگر نیند کروٹیں بدلنے پر بھی نہیں آنے والی تھی۔ یہاں پاکستان سے ہزاروں میل دور، ایک اجنبی گاؤں کے پرتعیش بیڈ روم میں لیٹ کر وہ اپنی گزشتہ زندگی کو سوچ رہی تھی۔ اسے اپنی ممی اور ڈیڈی یاد آنے لگے تھے۔ اپنے پیارے بھائی ذیشان، ذی شاہ اور زرشام یاد آرہے تھے۔ لاڈلی سی نٹ کھٹ بہن بندیا کی یاد پلکوں کو بھگونے لگی تھی۔ حالانکہ یہ لوگ کبھی بھولتے تو نہیں تھے مگر مشرقی بنی ہونے کی وجہ سے اپنی سسرال آکر اسے پچھلوں کو

بھلانا ہی تھا۔ اسی بات کا درس دے کر ماں نے اسے سمندر پار بھیجا تھا۔ اسے ماں کے لفظوں کی لاج رکھنا تھی۔ اسے سسرال کو آباد کر کے میکے کو بھلانا ہی تھا۔

چپکے چپکے ڈھیر سارا رو لینے کے بعد من کو ہلکا کر کے وہ بستر سے اٹھ گئی تھی۔ نیند تو چونکہ آنے والی نہیں تھی۔ سو وہ کمرے میں موجود ایک دوسرا دروازہ کھول کر باہر آگئی تھی۔ یقیناً یہ بالکونی میں کھلتا تھا۔ رات کو بواریا کا حسن کالی چادر کی بغل میں چھپ گیا تھا۔ پہاڑ کے قعر سے پھوٹنے والا چشمہ بھی نظر نہیں آتا تھا اور گلابوں کے کھیت بھی خاموش اور اندھیرے میں گم تھے۔ بس پھولوں کی دلفریب خوشبو فضا میں رچی تھی۔ مالا کو لگ رہا تھا وہ خوشبو کے کسی دیس میں بھول کر آگئی ہے۔ اتنی سحر انگیز گلابوں کی مہک تھی جی چاہ رہا تھا کہ بالکونی سے چھلانگ مار کر پھولوں کے کھیت میں گھس کر چادر تانے وہیں آنکھیں موند کر لیٹ جائے وہ گویا تصور میں گلابوں کی پرنم پتیوں پر ٹہل رہی تھی جب اچانک اس کے پیچھے کوئی چپکے سے آکھڑا ہوا تھا۔ مالا نے گردن موڑ کر دیکھا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا...... اس کے بیڈ روم کا بند دروازہ کھول کر وہ کمرے میں سے گزرتی ہوئی بالکونی تک آنے والی مون کو دیکھ رہی تھی۔ بھلا مون نے لاکڈ دروازہ کیسے کھول لیا تھا اور ہلکے سے کھٹکے کی آواز بھی نہیں آئی تھی پھر مون کی اس قدر غیر اخلاقی حرکت پر مالا کو بہت غصہ بھی آیا تھا۔ وہ اپنے بھائی کے کمرے میں بنا اجازت رات کی تاریکی میں گھس آئی تھی یا تو اس کمرے کی ایکسٹرا چابی اس کے پاس تھی یا پھر دروازے کے لاک کھولنے کا فن اسے آتا تھا۔ جو بھی تھا، یہ قطعاً غیر اخلاقی حرکت تھی۔ مالا کا دل چاہا، وہ اسے اتنی گھٹیا حرکت پر باتیں سنائے...... مگر اسے ڈچ آتی نہیں تھی۔ دوسرے وہ مالا کی بات شاید اردو میں سمجھ نہ پاتی مگر یہ بھی مالا کی سراسر بھول تھی۔ سارے ماحول پر چھائی سامنے کھڑی یہ لڑکی کوئی فنکارہ تھی یا

یادیں

تم نے مجھ سے مجھے جدا کر کے
شیشۂ دل کو آئینہ کر کے
عکس اس میں اتار کر اپنا
رکھ دیا بھولی بسری چیزوں میں
وقت کی ادھ کھلی درازوں میں
کسی بے نام سے گماں کے پاس
اِک ادھوری داستان کے پاس
جس جگہ
گمشدہ خطوں میں چھپے
آنسوؤں کی طرح چمکتے ہوئے
یاد کے بے شمار جگنو ہیں
درد کے بے حساب پہلو ہیں
خشک پھولوں کی پتیوں میں کہیں
کسی برسات کی نمی ہے جہاں
زندگی کی بہت کمی ہے جہاں
ٹوٹی چوڑی کے ساتھ رکھی ہوئی
اِک دسمبر کی شام کے ہمراہ
کچھ خزاں کے بھی دن پڑے ہیں کہیں
خواب کی دھجیوں سے لپٹے ہوئے
چاندراتوں کے سلسلے ہیں کہیں
اور کچھ عہد وفا نہ ہوئے
قرض سانسوں کے
جو ادا نہ ہوئے
اتنی چیزوں کے بیچ رکھا ہوا
آئینہ ٹوٹ بھی تو سکتا ہے
بچ بھی جائے تو آئینے پہ پڑی
سیکڑوں غم زدہ خراشوں میں
کوئی صورت کہاں ابھرتی ہے
سانس کا کیا ہے چلتی رہتی ہے

شاعرہ: ناہید قمر
مرسلہ: مہرین کنول، لیہ

جادو گرنی......؟ مالا سمجھ نہیں پائی تھی تاہم اس کے الفاظ نے مالا کے پیروں تلے سے زمین کھسکا دی تھی۔

’’تم بہت جلد علی عیسیٰ کی زندگی سے جانے والی ہو اور میرا بھائی عنقریب تمہیں طلاق دے گا یہ مت بھولنا، مون کے کہے گئے لفظ کبھی غلط نہیں ہوتے۔‘‘ وہ بہت شُستہ اور رواں اردو میں مالا کے پورے وجود کو پتھر کر رہی تھی۔

☆☆☆

مون حبیب اس کی زندگی میں انتہائی پُراذیت موڑ لے کر آئی تھی۔ وہ عجیب لڑکی تھی، عجیب باتیں کرتی تھی۔ عجیب باتیں منواتی تھی اگر غور کیا جاتا تو اس عجیب لڑکی کی زندگی ایک لفظ عجیب سے گندھی تھی۔ اس کی چال ڈھال، بول چال، دیکھنے، تکنے، تاڑنے کا ہر طریقہ ’’عجیب‘‘ تھا اور خصوصی طور پر مالا سے گفتگو کرتے ہوئے وہ اور بھی عجیب لگتی تھی۔ وہ اس کی زندگی میں اچانک آئی تھی اور اس کی ہر ملاقات اچنبھے کا باعث تھی۔ وہ اچانک آتی تھی، یعنی جہاں اس کے آنے کا کوئی گمان بھی نہیں ہوتا وہ وہاں کسی جنّ زادی کی طرح ٹپک پڑتی تھی۔

مون کی آمد اسے ہمیشہ خوف کے عذاب میں دھکیل دیتی تھی۔ یہ ایسا خوف تھا جسے بہت چاہ کر بھی وہ علی عیسیٰ سے شیئر نہیں کر سکتی تھی حالانکہ گروسی کے گھر اس گہری شب بلی کی چال چلتی مون چپکے سے لاکڈ دروازہ کھول کر اس کے پیچھے ٹیرس پر آ کھڑی ہوئی تھی تب بھی ایک بھیانک خوف اس کے معصوم دل کو پنجوں میں جکڑ چکا تھا اور اس خوف کے جڑ پکڑنے سے لے کر مون کی انتہائی غیر اخلاقی حرکت پر برہمی محسوس کرنے کے باوجود اس کی ہمت نہیں پڑی تھی وہ مون کی شر انگیز بکواس کا ایک لفظ بھی علی عیسیٰ کو بتا سکے۔ کیا وہ اس کی بات کا یقین کرے گا؟ کیا وہ مان لے گا کہ رات کے دوسرے پہر اس کی بہن بے دھڑک اس کے کمرے میں گھس آئی تھی تو

پھر مالا کو اپنی بات کہہ کر گنوانی ہی تھی۔ ابھی ان کی شادی کو دو ہفتے ہوئے تھے اور یہ اتنی کم مدت تھی کہ علی عیسیٰ کیا اس پر اعتبار کر سکتا تھا؟ مون کے کہے الفاظ پر یقین کر سکتا تھا؟ وہ الفاظ جو نیزے کی انی تھے یا ہتھوڑے کی ضرب تھے۔ ان الفاظ کی تکلیف محض وہ محسوس کر سکتی تھی۔ سمندر پار سے آئی دو ہفتوں کی بیاہی چھوٹی سی لڑکی جسے اس کی ہم عمر ایک لڑکی بڑے کرّوفر سے دھمکا رہی تھی۔

’’تم بہت جلد علی عیسیٰ کی زندگی سے جانے والی ہو......‘‘ ان الفاظ کی بازگشت نے پوری رات مالا کو ہراساں رکھا تھا۔ رات بھر ایک گھڑی کے لیے بھی پلکیں آپس میں نہیں جڑی تھیں...ایک لمحے کے لیے بھی نیند مہربان نہیں ہوئی تھی۔ ساعت بھر کے لیے بھی چین نے دل کو نہ چھوا تھا۔ ان دو ہفتوں میں پہلی مرتبہ اسے شدید خوف اور تنہائی کا احساس ہوا تھا۔ یہ خوف مون کے الفاظ کا مرہونِ منت تھا۔ بھلا وہ علی عیسیٰ کی زندگی سے نکل کر کہاں جائے گی؟ بھلا وہ علی عیسیٰ کے بِنا کیسے رہ پائے گی؟

صرف دو ہفتوں میں کوئی اتنا رگِ جان کے قریب ہو جاتا ہے؟ کوئی اتنا عزیز ہو جاتا ہے؟ کیا محبت اس کو کہتے ہیں؟ کسی سے کبھی نہ جدا ہونے کا احساس، کسی کو بِن دیکھے چاہے چلے جانے کا احساس...... اگر محبت یہی تھی تو پھر مالا ذوالفقار کو علی عیسیٰ سے شدید ترین محبت ہو گئی تھی۔ جانے کب سے؟ جانے کس وقت سے، جانے کس گھڑی، کس ساعت وہ پھولوں سے گندھی مالا کے دل کی سلطنت پر ہمیشہ کے لیے قابض ہو گیا تھا اور اب اسی علی عیسیٰ کی بہن اسے دھمکا رہی تھی کہ عنقریب اسے علی عیسیٰ کی زندگی سے نکلنا ہوگا مگر کیوں......؟ کس لیے......؟ آخر اس کا قصور کیا تھا؟ اس کی غلطی کیا تھی؟ اس کا جرم کیا تھا؟ اسے کون سے گناہ کی پاداش میں وہ کٹھور، پتھر دل فرعون کا عکس لیے متکبر لڑکی دھمکا رہی تھی۔

یہ اس کا چپکے چپکے بہنے والا ورد تھا...... یا بے آواز سسکاریوں کی جھنکار جس نے علی عیسیٰ کی نیند ختم کر دی تھی۔ وہ سر اٹھائے بغیر آنکھیں کھولے کمرے کے خاموش ماحول میں کسی کی سانسوں کا شور محسوس کر رہا تھا۔ پھر کئی منٹ دبے پاؤں گزر گئے، علی عیسیٰ نے مالا کو آواز نہیں دی تھی مگر وہ جان چکی تھی عیسیٰ جاگ رہا ہے تبھی اس نے اپنی سانس تک روک لی تھی...... حالانکہ علی عیسیٰ کے سونے سے لے کر مالا کے اٹھ کر ٹیرس تک جانے اور پھر واپس آنے تک اس نے بہت احتیاط برتی تھی۔ یقیناً یہی احتیاط مون نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اور پھر اس کے حواسوں پر بجلی گرانے کے بعد چپکے سے واپس جاتے ہوئے بھی برتی تھی اور تب کا سویا علی عیسیٰ اس کی ہلکی سی سسکاری کو سن کر اٹھ گیا تھا۔ یقیناً تھکن نے اس پر نیند طاری کر دی تھی اور اب اس کی نیند پوری ہو چکی تھی تبھی وہ اٹھ گیا تھا۔ حالانکہ اٹھا تو وہ مالا کی آواز سن کر تھا۔ جانے کب ضبط کا دامن چھوٹ گیا تھا اور تمام احتیاطیں بکھر گئیں...... ورنہ وہ کبھی عیسیٰ کی نیند خراب نہ کرتی...... اور عیسیٰ نہ صرف اٹھا تھا بلکہ اس نے لائٹس بھی آن کر دی تھیں...... تب مالا کا دل دھک سے رہ گیا۔ یقیناً اب وہ روشنی میں اس کا چہرہ دیکھ لے گا...... اس کا بھیگا چہرہ اور روئی آنکھیں...... وہ اپنے رونے کا کیا جواز پیش کرے گی؟ کون سی دلیل دے گی؟ کون سا جواب گڑھے گی؟ اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی تھی جبکہ عیسیٰ نے اٹھنے اور لائٹس آن کرنے کے بعد بھی اسے مخاطب نہیں کیا تھا جانے وہ کیا کر رہا تھا؟ مالا نے عیسیٰ کے اٹھتے ہی درمیان میں سجاوٹ کے لیے رکھا انتہائی نرم، ملائم سفید فر والا کشن اٹھا کر اپنے منہ پر رکھ لیا تھا۔ یہ قطعاً بے اختیارانہ قسم کی حرکت تھی۔ وہ کسی بھی طریقے سے اپنے تاثرات علی عیسیٰ سے چھپا لینا چاہتی تھی مگر کیا وہ اس میں کامیاب ہو گئی تھی ہم

کمرے میں رنگ، رنگ کی روشنیاں عکس چھوڑ رہی تھیں...... اس نے کشن ہٹا کر پلکوں کی جھری میں سے دیکھا۔ علی عیسیٰ چھت پر لگے فانوس اور لیمپ کو بھی آن کر رہا تھا۔ جب پورا کمرا روشنی سے بھر گیا تب اس نے ساکت لیٹی مالا کو مخاطب کیا تھا۔ وہ یقیناً اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس کی آواز ہمیشہ کی طرح نرم تھی۔ نیند ٹوٹنے پر اس کا مزاج برہم نہیں تھا۔

’’رونا ہر مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔‘‘ اسے علی عیسیٰ کی آواز اب کچھ ہی فاصلے پر سے سنائی دی تھی۔ یقیناً وہ اس کے قریب آ کھڑا ہوا تھا پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر نرم فر والا سفید کشن اس کے چہرے سے ہٹا دیا۔ غیر واضح چیزیں واضح ہونے لگی تھیں۔ سرخ چہرہ، بھیگی پلکیں، کپکپاتے ہونٹ...... وہ ابھی ضبط اور صبر کی منزل سے کوسوں دور تھی۔ اسے ضبط کے مرحلے سے گزرنا آسان نہیں لگ رہا تھا۔ یقیناً اسے ضبط کی رمزیں سمجھنا ابھی نہیں آتا تھا پھر بھی وہ خود پر جبر کرتے ہوئے ضبط کر رہی تھی۔ اس کی یہ کیفیت علی عیسیٰ کے لیے نئی تھی تاہم اسے خود پر جبر کرتے دیکھ کر وہ گہری سانس کھینچ کر بولا تھا۔

’’پھر بھی اگر دل بہت بھر آئے تو کھل کر رو لینا چاہیے...... تم میرے سامنے بہ آسانی اور بخوشی رو سکتی ہو...... میں تمہیں روکوں گا نہیں...... مگر اتنا ضبط نہ کرو...... خود پر جبر نہ کرو......‘‘ کشن کی نرم فر کو چھوتا وہ حلیم لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اس نے مالا سے رونے کی وجہ نہیں پوچھی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اس بات پر اللہ کا شکر ادا کر رہی تھی اگر وہ وجہ پوچھ لیتا تو مالا بھلا کیا بتاتی؟ عائلی زندگی کی شروعات میں ہی بدگمانیاں، نجی جھگڑے اور گھریلو سیاست پر مبنی باتیں...... پھر اس کے رونے کی ہر کڑی تو مون کی گفتگو سے جا ملتی تھی جبکہ مون کی باتیں اس کے بھائی کے سامنے دُہرانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

وہ بھلا مالا کے بارے میں کیا سوچتا؟ اس کی کوئی چالاکی، عیاری، مکاری یا کوئی چال......؟ کم از کم ایک بات تو طے تھی اس نے موُن کے بارے میں کچھ بھی سن کر مالا پر اعتبار ہرگز نہیں کرنا تھا۔ گویا پہلے روز ہی مالا نے یہ خود سے فرض کرلیا تھا سو وہ دل کو سمجھا رہی تھی کہ اسے موُن کی ہر بات کو چپکے سے سہہ جانا ہوگا بنا چاچو اور علی عیسٰی کو بتائے...... اور کیا اس کا یہ فیصلہ ٹھیک تھا؟

''رونے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوجاتا ہے۔'' وہ اپنی قمیص کے کف فولڈ کررہا تھا۔ اس کے سفید بازوؤں کا رُواں واضح تھا۔ اس کی بات کا مفہوم بھی واضح تھا۔ وہ دھک سے رہ گئی تھی۔ کیا وہ جانتا تھا کہ اس کے دل پر کوئی بوجھ ہے؟

''دل پر بوجھ ہو تو رونا آتا ہے، بلاوجہ تو کوئی نہیں روتا۔'' علی عیسٰی گویا اس کے چہرے کا ایک، ایک تاثر بہت غور سے پڑھ رہا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر دھک سے رہ گئی تھی۔ تو کیا وہ اس سے بدگمان ہوگا؟ رات کے آخری پہر ...... شوہر کے پہلو میں لیٹ کر چپکے، چپکے رونے والی بیوی...... اسے اپنی فاش غلطی کا فوراً احساس ہوگیا تھا کم از کم اسے رونا نہیں چاہیے تھا۔ رات کے اس پہر بالکل نہیں...... اور وہ رونے کے لیے باتھ روم میں بھی تو جاسکتی تھی۔ اس نے پہلے کیوں نہ اس پہلو پر غور کیا؟ وہ خود کو ملامت کرنے لگی تھی اور وہ جانے کب تک خود کو ملامت کرتی رہتی۔ علی عیسٰی کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔

''رونا کوئی بڑی غلطی یا نادانی نہیں...... جس پر پچھتایا جائے...... ویسے میرے پاپا کہتے ہیں، نرم دل والوں کی ہی آنکھیں بہتی ہیں۔'' علی عیسٰی کے الفاظ اس کی سماعتوں کو پھر سے منجمد کرگئے تھے تو گویا وہ اس کا چہرہ پڑھ رہا تھا یا پھر یہ دونوں، بہن بھائی جادوگر تھے؟ بھلا کوئی کسی کی سوچ میں کیسے اتر سکتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے؟ اس نے تو آج تک کسی کے تاثرات جانچ کر کچھ بھی ٹھیک سے اندازہ نہیں لگایا تھا مگر یہ دونوں بہن بھائی اس کے ذہن میں بلا اجازت گھس آتے تھے۔ اسے ماننا ہی پڑا...... یہ دونوں بلا کے ساحر تھے اور وہ دھیرے دھیرے ہی سہی ان دونوں بہن بھائی کے سحر میں گرفتار ہونے لگی تھی۔

''تم محبت کو جادو سمجھتی ہو؟'' اس کے کان اس کی آنکھیں اور حتیٰ کہ اس کا منہ بھی کھل گیا تھا... وہ ہڑبڑا کر اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی۔ اسے لگا، وہ دوسری سانس بھی نہیں لے سکے گی۔ تو کیا اس کی سوچیں کتاب کے لفظ تھے جو چہرے پر آنسوؤں کی صورت بکھرے تھے جسے کوئی بھی پڑھ سکتا تھا یا پھر یہ خاص ہنر محض علی عیسٰی کے پاس تھا؟ اور اس کی بہن کے بھی تو پاس تھا؟ وہ ساکت رہ گئی تھی اور ٹھوڑی پر اترے آنسو بھی پونچھ نہیں پائی تھی۔ اسے اپنی طرف ایک ہیجان آمیز حیرانی میں مبتلا دیکھتے پاکر علی عیسٰی اب کے ذرا سا مسکرا دیا تھا۔

''تم...... تم اتنا حیران کیوں ہوتی ہو...... موتیوں کی سفید مالا......!'' وہ اب ہنستا ہنستا پائنتی کی طرف بیٹھ گیا تھا۔ سفید فر والا کشن اس نے اپنے بازوؤں میں دبوچ رکھا تھا اور وہ اسی طرح سہولت سے ٹانگیں نیچے لٹکائے بیڈ پر نیم دراز ہوگیا...... مگر اس نے ہنسنا ترک نہیں کیا تھا...... اور ہنستے ہنستے اس کی خوب صورت آنکھوں کے کنارے شفاف پانی سے بھر آئے تھے...... وہ اس لمحے مالا کو اتنا حسین لگا کہ اس کی نگاہ ہٹ نہ پائی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے دل کے چھوٹے سے ٹکڑے میں علی عیسٰی کی ساری محبت کو پور پور بھر لے۔

> مالا اور علی عیسیٰ کے بیچ کیا ہوا......؟ کیا ذی شاہ جلد از جلد اس کی کھوج لگانے میں کلمیاب ہو جائے گا؟ ترکِ وفا کا سبب کون بنا......؟ یہ سب جاننے کے لیے پڑھیے اگلا حصہ

میرے ہو کے رہو

سعدیہ مریم سعدی



آج اس کی سالگرہ تھی۔ صبح ہی کوریئر کے ذریعے اسے خوب صورت سا سرخ پھولوں کا بوکے اور پنک کلر کا خوب صورت سا برتھ ڈے کارڈ موصول ہوا تھا۔ انٹرنیٹ جیسی سہولت کے باوجود پچھلے تیرہ سال سے اس کی برتھ ڈے پر کارڈ وصول ہونا معمول تھا۔ اس نے کارڈ کھولا جو خوشبو میں معطر تھا مگر اس سے زیادہ مہک اس پر لکھے گئے الفاظ سے محسوس ہوتی تھی اسے۔

''احساسِ محبت کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے
اس کے بِنا بھی اس کے ساتھ رہتا ہوں میں
فقط تمہارا این شاہ!''

اس نے حسبِ سابق کارڈ کو سنبھال کر اپنی

دراز میں رکھا۔ سرخ پھولوں کو سونگھ کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ یہ پھول جب تک سوکھ نہ جاتے اس کے سرہانے رہتے اور جب سوکھ جاتے تو وہ انہیں کسی خزانے کی طرح الماری میں سنبھال لیتی۔ اسے ایشل شادیان کی سالگرہ پر لکھی ہوئی نظم یاد آرہی تھی۔

اسے کہنا اب کی بار، میری سالگرہ پر
کوئی تحفہ نہ بھیجنا
کہ میری زندگی میں اب
کسی چیز کی کمی نہیں
تمہاری دی ہوئی
شالیں، ڈائریاں، پرفیوم، جیولری، ڈریس
سب کچھ تو ہے پاس میرے سوائے اِک چیز کے
جو اہم ہے جو نایاب ہے
جس کی میں نے ہر سالگرہ پہ امید رکھی
مگر سالگرہ پہ آنے والا اِک خوب صورت باکس
میری امیدوں کو راکھ کر دیتا
اور یہ راکھ پلکوں کو نم کر دیتی
مگر پھر بھی مجھے تمہاری بھیجی ہوئی ہر چیز
عزیز تھی لیکن اب بس اور کچھ نہیں
ہاں مجھے اور کچھ نہیں چاہیے
بس اب کی سالگرہ پر
میری امیدوں کو راکھ نہ کرنا
میری آنکھوں کے انتظار کو برباد نہ کرنا

ایک آنسو اس کی آنکھ سے ٹپکا جسے اس نے بے دردی سے رگڑ کر صاف کیا، ایک آئی اسپیشلسٹ پر آنسو سوٹ جو نہیں کرتے۔ ایک اداس مسکراہٹ کے ساتھ وہ کھڑکی میں آکھڑی ہوئی جہاں جاتی سردیوں کا اداس چاند اسے ہی تک رہا تھا۔

☆☆☆

اس نے گاڑی روک کر ایک گفٹ شاپ سے ایک خوب صورت سی لیڈیز گھڑی خریدی اور پھر گاڑی اسپتال کی طرف بڑھادی۔ پانچ منٹ کے بعد ہی وہ صائمہ شاہ کے آفس میں تھا۔ یہ خوب صورت اور ہر سہولت سے آراستہ اسپتال صائمہ شاہ اور ارباب ملک کی کاوش تھا۔ ارباب ملک کڈنی اسپیشلسٹ تھا۔ صائمہ شاہ نے یہ اسپتال پلان کیا تھا۔ ارباب اس کا معاون تھا۔ دونوں کی پارٹنر شپ پر قائم کیا گیا یہ اسپتال چند ہی مہینوں میں اچھی شہرت پا گیا تھا۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو سوبر لیڈی!" ارباب نے گفٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا جسے صائمہ نے مسکراتے ہوئے لے لیا۔ خوب صورت سی گھڑی تھینکس کہہ کر کلائی میں سجالی۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا میرے گفٹ کی اتنی پزیرائی ہوگی۔" ارباب نے صاف گوئی سے کہا۔

"غلط فہمی جناب کی، میں ہر گفٹ کی دل سے قدر کرتی ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ اسے صرف دیکھ کر رہ گیا۔ پنک سوٹ پر سفید اوورآل پہنے کاسنی اسٹولر اوڑھے یہ خوب صورت سی ڈاکٹر اسے ہمیشہ کی طرح خاص لگی تھی۔ لگتی بھی کیوں نہ برسوں سے وہ اسے دل کی مسند پر بٹھائے آرہا تھا۔

"کہاں کھوگئے؟" صائمہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

"سوچ رہا تھا صائمہ شاہ! تم گھر کیوں نہیں بسالیتی ہو۔ تمہاری عمر کی لڑکیاں کتنے خواب رکھتی ہیں لیکن تم بڑی بورنگ ہو۔" اس نے منہ بنایا۔

"میں نے جو ڈگری حاصل کی ہے ناں یہی میرا سب سے بڑا اور اہم خواب تھا۔" صائمہ نے کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے جواب دیا۔

"ہوں، جانتا ہوں مگر تمہیں گھر تو بسانا ہی تھا ناں کبھی نہ کبھی تو اب سہی......" وہ پھر سے گویا ہوا۔

"تم کیوں پڑگئے میرے پیچھے، مجھے نہیں بسانا گھر ور چلو کوئی اور بات کرو۔" وہ چڑ گئی۔

"اور کوئی بات......؟ نہیں ہے۔" ارباب نے نفی میں سر ہلایا۔

"اچھا تم گھر کیوں نہیں بسالیتے؟" وہ پچھلے گیارہ سال سے ایک ساتھ تھے۔ پہلے تعلیم پھر اب ایک ساتھ کام۔ وہ دونوں ہر بات کہہ ڈالتے تھے ایک دوسرے سے مگر یہ ٹاپک پہلی بار کھلا تھا۔

"میں گھر بسالوں مگر تم مانو تو!" ارباب کی زبان سے پھسلا۔

"کیا مطلب؟" صائمہ شاہ نے چونک کر پوچھا۔

"بہت احمق ہو تم اس معاملے میں صائمہ شاہ...... یا پھر مجھے سمجھتی ہو۔ اتنے برسوں سے چپ رہا سوچتا تھا تم سمجھ جاؤ گی مگر لگتا ہے تم دل کی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھتی ہو۔" ارباب نے بڑی روانی سے کہا۔

"ارباب!" چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد وہ اس سے مخاطب تھی۔ "جو کچھ تم کہہ رہے ہو میرے خیال میں آج کے بعد یہ بات دوبارہ نہیں ہونی چاہیے۔ ہم نے یہ اسپتال لوگوں کی خدمت کے لیے قائم کیا تھا ناکہ کاروبار کے لیے سو اگر تمہارے دل میں ایسا کوئی خیال ہے کہ اس طرح یہ اسپتال تمہارے حصے میں آجائے گا تو میں آج ہی خود کو اس سے الگ کر لیتی ہوں۔ میرا خیال تھا کہ تم میں کوئی لالچ نہیں مگر یہ خیال غلط نکلا۔" وہ رکھائی سے بولی۔

"صائمہ......" ارباب کی آواز کانپ کر رہ گئی۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ وہاں رکا نہیں۔

☆☆☆

ارباب آج پھر اس کے آفس میں تھا۔ وہ اس سے معافی مانگنے آیا تھا۔ اسے یقین دلانے آیا تھا کہ وہ کسی بھی لالچ کے بغیر اس سے محبت کرتا ہے۔ وہ بھی جانتی تھی ارباب ملک جو اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا اور ایک ہی بہن کا بھائی ہے، والد کا جما جمایا لاکھوں کروڑوں کا گارمنٹس کا کاروبار، وہ کوئی لالچ نہیں کرسکتا مگر وہ جو کہہ رہا تھا اس کے لیے یہ ہی کافی تھا۔ صائمہ اس پر شک کرتی ہے۔

صائمہ راؤنڈ پر تھی۔ ارباب اپنا موبائل اس کی ٹیبل پر رکھے اسے الٹ پلٹ رہا تھا۔ تبھی اس کی نظر ٹیبل پر رکھی ہوئی وصی شاہ کی کتاب آنکھیں بھیگ جاتی ہیں پر پڑی۔ جس کے اندر ایک قلم رکھا تھا۔ شاید صائمہ نے پڑھتے، پڑھتے نشانی رکھی تھی۔ اس نے کتاب کھولی مشہور زمانہ غزل اس کے سامنے تھی۔

اپنے احساس سے چھو کر مجھے صندل کردو
میں کہ صدیوں سے ادھورا ہوں مکمل کردو
اپنی ہتھیلی کو میرے نام کی حنا سے رنگو
اپنی آنکھوں میں میرے نام کا کاجل کردو

ارباب نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آگے صفحے پلٹے۔

آخری صفحے پر "کک" پر وہ ٹھٹک کر رکا۔ جہاں اشعار انڈر لائن تھے اور کسی نے کچھ لکھا ہوا تھا۔

وہ اکثر مجھ سے کہتی تھی
جاناں! کچھ اس طرح پہچانی جاؤں
تیرے نام سے جانی جاؤں

"تم بھی یہی چاہتی تھی جاناں اور میں بھی پھر کیا ہوا، ہم کیوں بچھڑ گئے۔ سوچتا ہوں جانے کب تک تم میرا انتظار کرو گی۔ کبھی تھک کر میرا انتظار چھوڑ دیا تو میں مر جاؤں گا۔ بس مجھے زندہ رکھنا۔"

"یہ کس نے صائمہ کو لکھا تھا۔" اس سے آگے وہ کچھ سوچ نہ سکا۔ ارباب کو اپنی سانسیں اٹکتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھیں۔ وہ تیزی سے آفس سے نکلا، راؤنڈ سے واپس آتی صائمہ اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

"ذرا آرام سے ڈاکٹر صاحب۔" صائمہ نے مسکرا کر کہا۔ وہ بس اسے دیکھ کر رہ گیا اور پھر جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ صائمہ نے اس کے بدلتے رنگ دیکھے اور آفس کی جانب بڑھی اور وصی شاہ کی کھلی کتاب اور ٹیبل پر پڑا قلم اسے سب کچھ سمجھا گیا تھا۔

☆☆☆

"تم نے مجھ پر شک کر کے مجھے اپنی ہی نظروں میں گرا دیا تھا صائمہ شاہ۔ میں اپنی محبت کی توہین نہیں سہہ پا رہا تھا پھر......" وہ جاتی سردیوں کی اداس سی شام تھی۔ اس وقت کوئی مریض نہیں آتا تھا۔ صائمہ نے آج تین مریضوں کے آئی آپریشنز کیے تھے اور سات مزید مریض داخل کیے جن کے صبح آپریشن کرنے تھے۔ وہ تھک چکی تھی اور آرام کرنا چاہ رہی تھی جب ارباب نے اسے کال کی۔ وہ بھی فارغ تھا سو اسے سی سائڈ آنے کا کہا۔

"کیا تم نبیل شاہ سے محبت کرتی ہو؟" وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ وہ اس سے نہیں سننا چاہتا تھا۔ اس کا دل بہت سی امیدیں لگائے بیٹھا تھا۔

"کیا یہ بتانا لازم ہے ارباب؟" اس نے ٹھہر کر جواب دیا۔ وہ خاموش رہا۔ "اگر میں نبیل شاہ سے محبت نہ کرتی تو میں ڈاکٹر نہ ہوتی۔"

"کیا مطلب؟" وہ ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگا۔

"خاندان کے رواج کے مطابق جب نبیل سوا پانچ سال کا تھا اور میں صرف چھ دن کی۔ مجھے اس سے منسوب کر دیا گیا تھا۔ اب میں نبیل شاہ کے علاوہ کسی اور کی نہیں ہو سکتی تھی۔ ہوش سنبھالا، نبیل کو ہی سب کچھ سمجھا۔ وہ بھی بڑوں کے اس فیصلے پر سو فی صد راضی تھا کیونکہ وہ بھی دل کے معاملے میں میری طرح تھا۔ میں نے ایف ایس سی کا امتحان دیا اور وہ ہارٹ اسپیشلسٹ بننے کے لیے یو ایس چلا گیا۔ وہاں اس کا دوسرا سال تھا۔ جب اس کی گاڑی سے وہاں کے باشندے جیکب اور فیری کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ ڈرائیونگ فیری کر رہی تھی جس نے بہت زیادہ ڈرنک کر رکھی تھی مگر انگریزوں کے ملک میں اس بات کو جھٹلا دیا گیا صاف قصور نبیل کا بنا دیا گیا۔ اس پر مقدمہ چلا، کورٹ نے اسے بے قصور قرار دیا مگر جیکب اور فیری کی بیٹی ڈیزی اس کے سر ہو گئی۔ وہ اسے غلط کیس میں پھنسانا چاہتی تھی جس میں نہ صرف نبیل کا فیوچر خراب ہو جاتا بلکہ وہ ساری زندگی سلاخوں کے پیچھے زندگی بسر کرتا، ڈیزی کا ایک ہی اصرار تھا وہ ڈیزی سے شادی کر لے اور اس کے چھوٹے بہن بھائیوں کی کفالت کا ذمہ اٹھائے بالآخر نبیل کو اس کی بات ماننی پڑی۔ اس کا کورس مکمل ہو چکا تھا اور وہ ملک لوٹنا چاہتا تھا۔ وہاں مقیم ایک رشتے دار سے اس کی اس سمجھوتے کی شادی کا خاندان والوں کو پتا چل گیا۔ اس کی کوئی بھی وضاحت سنے بغیر اس کا بائیکاٹ کر دیا گیا۔ اس نے گھر والوں کو حقیقت بتانے کی بہت کوشش کی مگر کسی نے ایک نہ سنی۔ شاہوں کے سپوت نے ایک غیر مسلم سے شادی کی تھی۔ اس کی یہی سزا تھی کہ اس سے کوئی تعلق نہ رکھا جائے اور رہی صائمہ شاہ یعنی میں تو، میں اسی کی منگ تھی، ہوں اور رہوں گی۔ بڑی پھپو جنہیں ان کے بچپن میں ہی ان کے تایا زاد سے منسوب کر دیا گیا، وہ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں مر گئے مگر بے چاری بڑی پھپو ساری زندگی ان ہی سے منسوب رہیں۔ ان کی امانت کے طور پر...... انہوں نے مرتے وقت آخری خواہش ظاہر کی تھی۔

"صائمہ شاہ کو اس کے خواب پورے کرنے دینا۔ وہ دن اور آج کا دن کسی نے بھی میری تعلیم پر اعتراض نہیں کیا ورنہ مجھ پر تعلیم کے دروازے بھی بند ہو جاتے۔ پھپو سے یہ خواہش کروانے والا بھی نبیل شاہ ہی تھا۔ ہمارے درمیان لاکھ دوریاں، لاکھ فاصلے ہوں مگر ہم اب بھی ایک دوسرے سے منسوب ہیں۔" صائمہ نے گیلی ریت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک تلخ حقیقت اس کے گوش گزار کی تھی۔

"تم اس کی جھوٹی، سچی کہانی پر یقین رکھتی ہو؟ تمہیں معلوم ہے لوگوں کی اکثریت یو ایس اے، یو کے وغیرہ جا کر خود ان لڑکیوں کے چکر میں پھنس جاتی ہے اور کچھ کو خود وہاں کے لوگ پھنسا لیتے ہیں اپنے مفادات کی خاطر اور پھر پچھلوں کی ہمدردیاں

سمیٹنے کے لیے ایسی ہی جھوٹی رام کہانیاں سناتے ہیں۔" ارباب نے اس کی باتوں پر یقین نہ کرتے ہوئے طنزیہ کہا۔

"ٹھیک ہے، میں نبیل شاہ سے محبت نہ بھی کرتی، میں اپنے خاندان کی عزت کی خاطر، اپنے آباؤ اجداد کی روایات کے پاس کی خاطر کبھی تمہاری بات نہ مانتی۔" وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔

"دقیانوسی باتیں چھوڑو صائمہ، زمانہ بدل گیا ہے۔" ارباب نے گیلی ریت پر اپنا نام لکھا۔

"زمانے کی بھی خوب کہی۔ میں شاہانہ کے نکاح کی تقریب میں تمہارے گھر گئی تھی اور وہاں تمہاری کزن صوفیہ ملک سے بھی ملی جس کے کزن منگیتر کو پچھلے سال قتل کر دیا گیا تھا مجھے پتا چلا اب وہ کبھی کسی اور سے منسوب نہیں ہو سکتی کیونکہ یہی تمہاری بھی روایات ہیں۔" اب طنز کی باری اس کی تھی۔

"انہیں چھوڑو، میں اپنی بات کرتا ہوں کم از کم میں اس طرح کے کسی بھی فیصلے کے حق میں نہیں ہوں۔" وہ صفائی دینے لگا۔

"پہلے میری پوری بات تو سن لو۔" اس نے ارباب کو چپ کروایا۔

"ہاں سناؤ۔" وہ پھر متوجہ ہوا۔

"میں نے تمہاری والدہ سے پوچھا تھا آخر اب صوفیہ کا گھر کیوں نہیں بسے گا تو پتا ہے انہوں نے کیا کہا......"

"ہاں بولو کیا کہا؟"

"اس طرح فیروز ملک کی روح کو تکلیف ہوگی اور ہم کبھی اپنی خاندانی اقدار کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتے۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ وقت بدل چکا ہے مگر ان کا ایک ہی جواب تھا۔ جو عرصے سے ہماری برادری، ہمارے گھرانے میں چل رہا ہے ہم اسے بدل نہیں سکتے پھر کہاں اور کیسے بدل گیا زمانہ اور کس کی سوچ تبدیل ہوئی؟" وہ اس سے پوچھ رہی تھی مگر وہ

مجھ سے ملیے

میرا نام عروسہ انجم خان ہے۔ میں نواب شاہ میں پیدا ہوئی۔ وہیں سے تعلیم حاصل کی اور دوران تعلیم ہی شادی ہو گئی۔ ماشاء اللہ گیارہ بہن بھائیوں میں میرا نمبر دسواں ہے۔ میں بچپن سے ہی نمازی ہوں لہٰذا اب بھی پانچ وقت کی نماز اور قرآن پاک پابندی سے پڑھتی ہوں۔ میں لوگوں سے بہت کم ملتی ملاتی ہوں۔ کم تعلقات رکھتی ہوں اس کا غم لوگوں کو بہت زیادہ رہتا ہے۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ پہلے کبھی ٹی وی دیکھنے اور گانے سننے کا شوق تھا لیکن اب ٹائم نہیں ملتا۔ مجھے کوکنگ کا بہت شوق ہے۔ اچھے کپڑے پہننے کا شوق ہے۔ میں زیادہ تر اپنے ڈریسز خود ہی ڈیزائن کرتی ہوں۔ مجھے برتنوں سے بہت دلچسپی ہے۔ میرے پاس برتنوں کی بہت شاندار ورائٹی ہے۔ بہت سے لوگوں کی طرح مجھے لکھنے کا شوق بچپن سے نہیں تھا شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ میرا بچپن بہت معصوم تھا اس قدر عقلمند اور ہوشیار نہیں تھا۔ میں نے شادی کے بعد لکھنا شروع کیا۔ میں شادی ہو کر کراچی آ گئی۔ میرے شوہر سپریم کورٹ کے وکیل ہیں۔ ماشاء اللہ میرے دو بیٹے ہیں۔ بڑے بیٹے نے اے لیول کے بعد لندن سے تعلیم حاصل کی کچھ عرصہ لندن میں بینک میں جاب کی اب نیویارک میں بینک میں جاب کر رہے ہیں۔ اس کے ماشاء اللہ او لیول میں 14 اے اور اے لیول میں 10 اے آئے تھے۔ چھوٹے نے بھی اے لیول اسی طرح بہت اچھے طریقے سے کیا اور وہ بھی لندن کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ میں اور میرے میاں بہت مہمان نواز ہیں۔ ہم دونوں لوگوں سے تکلیف اٹھانے کے باوجود بھی انہیں کبھی تکلیف نہیں پہنچاتے ہیں۔ کم ملنے ملانے کی عادت کی وجہ سے لوگ ہمیں کافی پریشان کرتے ہیں لیکن ہم سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ باتیں تو اور بھی بہت ساری ہیں لیکن پھر کبھی سہی۔



خاموش تھا۔

''عنیزہ کون ہے یہ تم بہت اچھی طرح جانتے ہو۔ تمہیں صائمہ شاہ سے ہمدردی ہو سکتی ہے مگر تم نے سوچا صائمہ شاہ تمہاری بات مان بھی لے تو ایک اور صائمہ شاہ جو عنیزہ کی صورت تمہارے خاندان میں رہ جائے گی وہ کیا سوچے گی۔ وہ بھی تو وہی کچھ سوچتی ہوگی جو صائمہ شاہ سوچتی ہے۔ اس کے ساتھ کتنی بڑی ناانصافی ہوگی۔ چلو مان لیا تمہاری سوچ تبدیل ہوگئی مگر عنیزہ سے جڑے باقی لوگ اب بھی وہی سوچ رکھتے ہیں۔'' وہ کچھ اور بھی کہتی مگر وہ بڑی تیزی سے اٹھ کر گاڑی کی طرف بڑھا اور پھر گاڑی زن سے صائمہ کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

☆☆☆

وہ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا جب بالائی پورشن کے لاؤنج میں رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا تب تک نچلے پورشن سے کال پک کرلی گئی تھی۔ عنیزہ کا نمبر دیکھ کر اس نے بھی ریسیور اٹھالیا۔ کیوں، یہ اس کی سمجھ میں بھی نہیں آیا۔

''ہیلو! شانی کیسی ہو یار؟'' عنیزہ نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں، تم نے سیل پر کال کیوں نہیں کی؟'' شاہانہ پوچھ رہی تھی۔

''آج جب سیل فون کا کریڈٹ ختم ہوگیا تو سوچا گورنمنٹ کی عطا کردہ اس سہولت سے بھی فائدہ اٹھایا جائے۔ اچھا یہ بتاؤ پھپو کدھر ہیں؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔

''مما شاپنگ کرنے نکلی ہیں میری رخصتی کی اور ہو سکتا ہے تمہاری رخصتی کی بھی۔'' شاہانہ نے ہنستے ہوئے بتایا۔

''رہنے دو یار! اپنی ہی کرو فی الحال۔'' عنیزہ نے منمنا کر کہا۔

''کیوں، کیوں تیری کیوں نہیں؟'' وہ چہک کر بولی۔ ارباب ان کی پرسنل باتیں سن کر فون بند کرنے ہی والا تھا جب وہ اپنے نام پر رک گیا۔

''ارباب صاحب مانیں گے تو تب ہے ناں۔'' بڑے شکستہ لہجے میں جواب آیا۔

''کیوں بھلا وہ کیوں نہیں مانیں گے؟'' شاہانہ کے سوال پر عنیزہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''مجھے لگتا ہے۔'' عنیزہ نے مختصر سا جواب دیا۔

''غلط بھی ہو سکتا ہے تمہارا خیال۔'' شاہانہ انکاری تھی۔

''سو فی صد درست بھی تو ہو سکتا ہے تم اس لیے فیور کر رہی ہو کہ وہ تمہارا بھائی ہے۔'' عنیزہ نے آہستہ آواز میں کہا۔

''فرض کرو اگر وہ نہ مانے تو تم کیا کرو گی؟'' خبریں سن سن کر شاہانہ نے کافی صحافیانہ انداز میں پوچھا۔

''جو کیا جا سکتا ہے یعنی انتظار اور خاموشی اختیار۔'' عنیزہ نے جواب دیا۔

''یعنی پڑھ لکھ کر بغاوت کرنے کا جذبہ ابھی عام نہیں ہوا، اپنا حق نہیں منوایا جائے گا؟'' شاہانہ نے پوچھا۔

''ہماری روایات، اقدار یہی ہیں کہ ہم لڑکیاں جتنی بھی بولڈ ہوجائیں۔ ہم فیصلہ وہی مانتی ہیں جو بڑے کرتے ہیں۔''

''یہ سب غلط نہیں ہوگا؟'' شاہانہ نے اگلا سوال داغا۔

''غلط اس وقت ہوگیا تھا جب بڑوں کے کیے گئے اس فیصلے پر میں نے آنکھیں بند کر کے چلنا شروع کردیا تھا۔ خوابوں کی انگلی تھامے میں بہت آگے نکل گئی ہوں شاہانہ بی بی، اب واپسی کے سب راستے بھول چکی ہوں۔'' وہ کیا کہہ رہی تھی ارباب نے سمجھے بغیر فون رکھ دیا۔

☆☆☆

14 فروری کو لوگ محبت کرنے والوں کا دن کہتے ہیں۔ اسی دن وہ ڈارک فیروزی اور سی گرین شرارے میں دلہن بنی بے حد حسین نظر آرہی تھی اور اُدھر دولھا بنا ارباب ملک بھی مطمئن تھا۔ جب اس کی نظر ایک خوب صورت سے کپل پر پڑی۔ بلیک اور مجینٹا کنٹراسٹ کے خوب صورت سے فراک میں ملبوس وہ لڑکی بلاشبہ صائمہ شاہ ہی تھی اور اس کے ساتھ تھری پیس سوٹ میں وہ ہینڈسم سا جوان...... ارباب کو سمجھنے میں دیر نہ لگی۔

''ہیلو ڈاکٹر ارباب، دیکھو تو کیسا لگ رہا ہے ہمارا ساتھ؟'' صائمہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ویری سیڈ! کم از کم تم آج تو عنیزہ ارباب سے کم ہی لگ رہی ہو۔'' ارباب نے نبیل شاہ سے ملتے ہوئے شرارت سے کہا۔

''ویری فنی، تم دو دن صبر کرو پھر دیکھنا عنیزہ سے بھی زیادہ اچھی لگوں گی میں۔'' صائمہ نے عنیزہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے شرارت سے کہا۔

''دیکھیں گے وہ دن بھی! پہلے ذرا یہ اطلاع تو فراہم کرو نبیل شاہ دوبارہ ان کیسے ہوئے تمہاری اسٹوری میں؟'' ارباب نے بے چینی سے پوچھا۔ وہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔

''یار کیا بتاؤں پانچ فروری کو تمہاری کولیگ نے ایک نظم بھیجی تھی۔ اسے کہنا اب کی بار میری آنکھوں کے انتظار کو برباد نہ کرنا بھر میں تو بس پہلی فلائٹ سے آن پہنچا۔'' نبیل شاہ نے شرارت سے کہا۔

''بس ذرا جھوٹ کم بولیں۔'' صائمہ نے آنکھیں دکھائیں۔

''ہاں دراصل وہ جو وائٹ وچ تھی ناں ڈیزی جیکب وہ کہاں چھوڑنے والی تھی مجھ جیسے ہینڈسم کو۔ وہ تو اللہ تعالیٰ نے میری جلد جان چھڑائی۔ ڈیزی اپنی فیملی کو لے کر ایک جھیل پر گئی تھی پکنک منانے جہاں ان کی فیری الٹ گئی اور یوں میری جان چھوٹ گئی۔'' نبیل نے مختصر کہانی سنائی۔

ان کے کافی فوٹو سیشن ہو چکے تھے۔ نبیل اٹھ کھڑا ہوا۔

''مسز! اٹھیے کسی اور کو بھی تصویریں بنوانے کا موقع دیجیے۔'' نبیل نے اشارے سے کہا۔

''کیا مسز؟'' ارباب چلّایا۔

''ہاں جی، پرسوں ولیمہ ہے آجانا۔'' وہ تیزی سے نبیل کا ہاتھ تھامے اسٹیج سے اتری۔ ارباب کے چہرے پر بڑی جاندار مسکراہٹ تھی۔

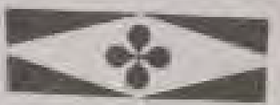
''اللہ تیرا شکر ہے۔'' اس نے دل میں شکر ادا کیا اور عنیزہ کا ہاتھ پکڑے بہت سی تصویروں کے پوز دینے لگا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اگر وہ صائمہ شاہ کے خوابوں کی انگلی تھامے آگے ہی بڑھتا رہتا تو آج کوئی بھی مطمئن نہ ہوتا۔ خوشی کسی کے بھی قدم نہ چومتی۔ صائمہ اور نبیل دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے پھر بھی وہ چپ رہے اور صائمہ کی بہادری میں ارباب کا بھی بھرپور کردار تھا اگر وہ عنیزہ سے انکار کر دیتا تو بہت بڑا گناہ گار ہوتا۔ عنیزہ سے بہت ناانصافی ہوجاتی۔ تقدیر نے ٹھیک فیصلہ کیا تھا۔ عنیزہ نے سر اٹھا کر ارباب کی جانب دیکھا۔

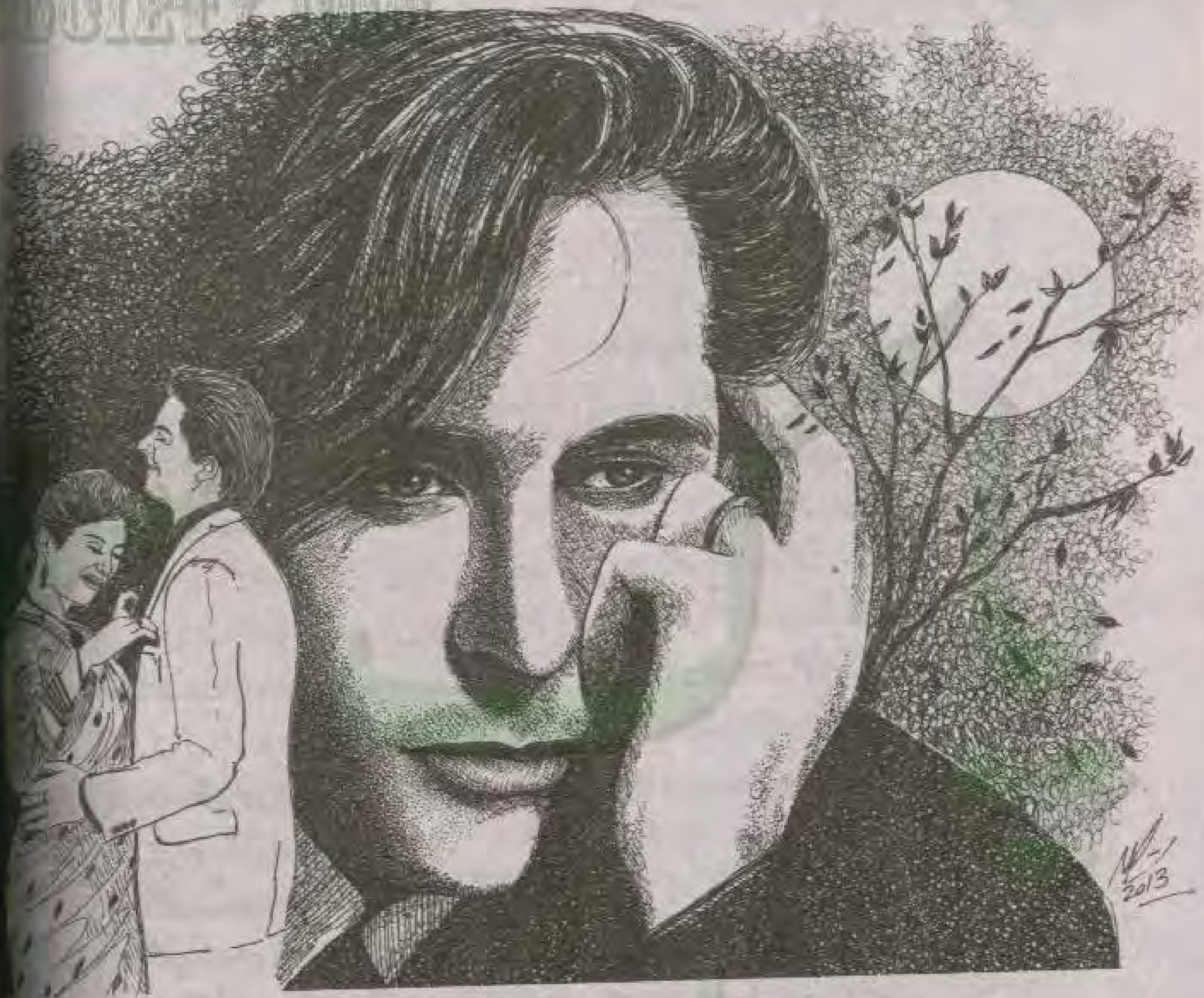
''بہت برس رہ چکے ہو تم اپنے لیے
اب صرف میرے اور میرے ہو کے رہو''

ارباب نے آہستہ سے اس کے کان کے نزدیک آکر یہ خوب صورت شعر گنگنایا۔

''لگتا نہیں تم کڈنی ڈاکٹر ہو۔'' عنیزہ نے چوٹ کی۔

''پر تمہارا ہارٹ اسپیشلسٹ تو ہوں ناں!'' بڑی روانی سے جواب دیا گیا۔ عنیزہ صرف سر جھکا کر رہ گئی۔ خوشی کے بہت سے تارے اس کے قدموں میں ناچ رہے تھے۔ چاند بھی اُن کی چوکھٹ پر خوشیاں منانے آیا تھا۔





شامِ شہرِ یاراں

عنیزہ سیّد

قسط 12

زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے... خیر وشر، نیکی اور بدی... زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت... ہر برائی پر حاوی ہوجاتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سیّد نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اگائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

محمود درانی اور مہرین کی تیسری اولاد حمزہ، مہرین کی زچگی میں پیچیدگی کے باعث نانی کے پاس ان کے آبائی گھر سیالکوٹ میں پروان چڑھتا ہے۔ جہاں نگین اس کے ماموں کی بیٹی سے اس کی خوب گاڑھی چھنتی ہے۔ بڑے ہونے پر حمزہ کے والدین اسے واپس لانا چاہتے ہیں مگر وہ راضی نہیں ہوتا۔ علینہ کے والدین، نادیہ اور سعید کیانی نے کورٹ میرج کی تھی مگر شادی کے تین سال بعد سعید کیانی بیوی کو داغِ مفارقت دے گئے۔ آکسفورڈ کا پروردہ سردار مہرزاد خان اپنے باپ کے سیاسی قتل کے بعد حادثاتی طور پر سیاست میں شامل ہوا تھا اور زرنگار کے حسن وذہانت کا شکار ہو چلا تھا...... بینش دو بھائیوں کی اکلوتی بہن، اپنی ضد اور صرف بھائیوں کے تعاون سے نیشنل کالج آف آرٹس میں تعلیم حاصل کر رہی تھی جہاں اس کا سینئر ساتھی دانیال اس سے ہر ممکن تعاون کرتا تھا۔ ایک پاکستانی مسلمان مرد اور بدھ مذہب کی پیروکار چینی عورت کی بیٹی زوئی حسین چین سے آکر پاکستان میں فارمیسی کی تعلیم حاصل کرتی ہے۔ دانیال آرٹ کا عشق رکھنے کے ساتھ فلائنگ میں بھی مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے اور ایک دن طیارے کے دھوئیں سے نقش ونگار بنانے کی کوشش میں حادثے کا شکار ہو کر اسپتال میں پٹیوں میں جکڑا (عافیہ) ماں کی ممتا کا شدید امتحان بن جاتا ہے۔ فہد کو اپنے ایک نیوز ریڈر دوست کے ذریعے سے میرال کی گمشدگی کی خبر ملتی ہے۔ زرنگار، مہرزاد کو اپنے ماضی کے بارے میں بتاتی ہے، زوئی، نادر کے گھر جاتی ہے تو نادر کی ماں کہتی ہیں کہ اسے بتا کر آنا چاہیے تھا۔ نادر، حمزہ سے ملتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ اگر زوئی قصوروار ہوئی تو وہ خود اسے لے کر آئے گا۔ حمزہ کہتا ہے کہ اسے اب تنگ نہیں کیا جائے گا۔ عافیہ، دانیال سے کہتی ہیں کہ جو طریقہ اس نے میرال کو ڈھونڈنے کا نکالا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ علینہ اچانک فہد کی آمد سے بہت خوش ہوتی ہے لیکن جب وہ یہ سنتی ہے کہ وہ میرال کی تلاش میں آیا ہے تو یہ اسے اچھا نہیں لگتا۔ چوہدری رزاق، امراؤ بیگم کو خبردار کرتا ہے کہ زرنگار کی وجہ سے وہ اب کسی آفت میں پھنس سکتی ہے۔ مہرزاد کی ماں اس سے کہتی ہے کہ انہوں نے اس کا رشتہ خان اکبر کے گھر ڈالنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ نادر اپنے گھر میں زوئی کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ ثمرین، دانیال سے کہتی ہے کہ بینش اس کی دوستی کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔ زرنگار، مہرزاد کو میسج کرتی ہے کیونکہ وہ تقریباً پندرہ دن سے رابطے میں نہیں تھا۔ بینش، مہرزاد کو سنبھل کر چلنے کا مشورہ دیتی ہے۔ دانیال، بینش کو اپنے ایکسیڈنٹ اور صحت یابی کے بارے میں بتاتا ہے تو وہ حیران رہ جاتی ہے۔ زوئی، نادر کو بتاتی ہے کہ اس نے نادر سے غلط بیانی کی تھی کہ وہ زلزلہ زدگان کے مددگاروں میں شامل نہیں تھی۔ وہ بتاتی ہے کہ کس طرح وہ میرال کو ان لوگوں سے بچاتی رہی لیکن وہ لوگ اسلحے کے زور پر اسے زبردستی اپنے ساتھ لے گئے۔ مہرزاد حلف اٹھانے کے بعد سوچ رہا تھا کہ حلف اٹھانے والوں کو حلف کے الفاظ یاد بھی رہتے ہوں گے کہ وہ ان پر عمل کرسکیں۔ مہرین، حمزہ پر شادی کے لیے زور ڈالتی ہے لیکن وہ پس وپیش سے کام لیتا ہے تو محمود درانی کہتے ہیں کہ وہ کوشش کریں گے کہ وہ اس کی چوائس کو اپروول دلا دیں۔ امراؤ بیگم چھوٹے صاحب کے ساتھ زرنگار کو بھیجنے پر تیار ہو جاتی ہیں۔ زرنگار کو اس خصوصی نمبر سے دبئی روانگی کا پیغام ملتا ہے اور پھر امراؤ بیگم کہتی ہے کہ سردار صاحب نے ٹکٹ بھیجا ہے۔ گڈی، مہرزاد سے کہتی ہے کہ اسے وزارت کا عہدہ ملنے کی خوشی میں بپا کی گئی تقریب میں زرنگار کو بلانا چاہیے تھا۔ علینہ، فہد کو بتاتی ہے کہ ایک سوشل ویب سائٹ پر میرال صلاح الدین کے نام کا صفحہ موجود ہے۔ فہد اس کی بات سن کر حیران رہ جاتا ہے۔ بینش، نگین کو فون کرتی ہے تو اسے بتاتی ہے کہ اس کا بھائی حمزہ کب سے اسے ڈھونڈ رہا ہے۔ بینش اسے ایک نمبر دیتی ہے اور کہتی ہے کہ وہ فوراً اس پر رابطہ کرے۔ زوئی ائرپورٹ اپنی دوست چی آن کو لینے جاتی ہے تو اس شخصیت کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے جو ایک گاڑی سے باہر نکلی تھی۔ زوئی، میرال کو پہچان لیتی ہے وہ نادر کو بتاتی ہے۔ میرال کو بتایا جاتا ہے کہ اس کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل ہے اس لیے وہ دبئی نہیں جاسکتی۔ میرال حیران ہوتی ہے کہ وہ لوگ اسے کہاں لے کر جارہے ہیں۔ مہرزاد کے آدمی اسے بتاتے ہیں کہ میرال کو بڑے گھر لایا گیا ہے۔ مہرزاد فون کرنا چاہتا ہے لیکن میرال سے رابطہ ممکن نہیں ہوتا۔ زوئی ٹیکسی کر کے میرال کی گاڑی کا پیچھا کرتی ہے۔ نادر، حمزہ محمود کو میرال کے بارے میں بتاتا ہے...... عافیہ ویب سائٹ پر فہد کا میسج پڑھ کر اس سے رابطہ کرنے کا سوچتی ہیں۔ مہرزاد خان اپنی برادری کے لوگوں پر میرال کے سلسلے میں دباؤ ڈالتا ہے۔ نیشل، مہرزاد خان کی نیوز اینکر کے ساتھ منعقد کی گئی میٹنگ دیکھتی ہے تو اسے کچھ غیر معمولی محسوس ہوتا ہے۔ فہد اور حمزہ، دانیال اور عافیہ سے ملنے آتے ہیں۔

اب آگے پڑھیں

علینہ نے برآمدے میں رکھی کرسی پر ہی بیٹھے، بیٹھے سامنے کے منظر کو دیکھا۔ وہ سہ پہر سے اس جگہ پر بیٹھی تھی اور اب شام کے سائے اترنا شروع ہو چکے تھے۔ اس نے وہیں بیٹھے اپنی کمزور روشنی پھیلاتے، بادلوں سے نبرد آزما سورج کو دیکھا تھا اور پھر وہ بادلوں سے ہار کر اپنے وقت سے پہلے ہی غروب ہو چلا تھا۔ اس کے غروب ہونے کے دوران آسمان پر ایک ہلکی سی شفق کا رنگ نمایاں ہوا اور پھر وادی میں اچانک سردی کی ایک واضح لہر پھیل جانے کا احساس ہونے لگا۔ اس شہر کی شامیں ہمیشہ سے ہر موسم میں اپنا رنگ بدل جاتی تھیں۔ سرما کی اس پھیلتی شام نے علینہ کے دل کو پہلے سے زیادہ اداس کر دیا تھا۔ نادیہ اسپتال سے فارغ ہو کر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد کلینک جاچکی تھیں اور سرما کی طویل چھٹیوں میں گھر بیٹھ کر بور ہوتی علینہ ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد پھر گھر میں اکیلی رہ گئی تھی۔

”جتنے دن فہد یہاں رہا، زندگی میں ایک الگ سی گہما گہمی اور چہل پہل کا احساس پیدا ہونے لگا تھا۔ وہ اکیلا ہی بہت سارے لوگوں سے زیادہ مجلسی ہے، اس کے یہاں ہونے نے زندگی کا کتنا خوشگوار احساس پیدا کر دیا۔ کتنے لوگ اس کی ہمارے گھر آمد ورفت کا سن کر ہمارے گھر آئے۔ کیسی لمبی، لمبی نشستیں ہوتی رہیں...... وہ گفتگو کا فن جانتا ہے۔ باتوں، باتوں میں کھانے پکانے کی ترکیبیں بتاتا، لنچ اور ڈنر ٹیبل سیٹ کرنے کے طریقے بتاتا، مختلف ملکوں کے لوگوں کی کھانا کھانے کی عادات کے قصے سناتا وہ اپنے مخاطبین کو اپنی گفتگو میں کتنا محو رکھ سکتا ہے، دل کرتا ہے بس اس کی باتیں سنتے چلے جاؤ، اس کے تجربوں کی پٹاری اتنی بڑی اور اتنی گہری ہے کہ وہ اس میں ہاتھ ڈال کر جتنے چاہے قصے نکال کر سناتا چلا جائے پٹاری کبھی خالی نہیں ہوگی...... مگر......“ سوچتے سوچتے اسے اپنے دل میں ایک تکلیف دہ چبھن کا احساس ہوا...... ”مجھ سے اور ماما سے گفتگو کے دوران وہ کم از کم چار پانچ مرتبہ میرال کا ذکر کرنا نہیں بھولتا تھا۔“ اس نے اس تکلیف دہ چبھن کے احساس سے گھبرا کر پہلو بدلا۔ ”ایسا لگتا ہے جیسے اس شہر کے ماحول، موسم، ہر موڈ، ہر رنگ، ہر عکس میں اسے میرال سے وابستہ کوئی یاد نظر آنے لگتی اور وہ اس کا ذکر کرنا نہیں بھولتا تھا۔ اُف میرے خدا!“ علینہ نے اس تکلیف دہ چبھن کے احساس سے نکلنے کے لیے لاشعوری طور پر سر جھٹکا۔ ”کچھ لوگ کیسے خوش قسمت ہوتے ہیں، بنا خواہش کیے اچھے، اچھے احساسات پا جاتے ہیں جیسے میرال اور اس کے لیے فہد کی فیلنگز۔“ تکلیف دہ چبھن اپنی پوری شدت کے ساتھ دل میں ایک بار پھر ابھری۔ ”خود تو وہ نہ جانے کہاں اور کس حال میں ہے لیکن فہد اس کے لیے کتنا بے چین اور اسے ڈھونڈ نکالنے کو کیسا بے تاب نظر آتا ہے۔ یوں تو شاید کوئی اپنے سامنے موجود انسان کے لیے بھی بے چین اور بے تاب نہ ہو۔ اس کے بارے میں خبر لانے کی خاطر وہ کتنی بار بالاکوٹ گیا اور یہاں شہر میں اس نے کتنے ہی ایسے لوگ تلاش کر مارے جو میرال اور آنٹی کلثوم کے بارے میں کچھ جانتے تھے۔ بھلا ایسی تلاش کا کیا فائدہ جس کے بے سود رہ جانے کے چانسز سامنے نظر آرہے ہوں۔“ اس نے خفگی کے ساتھ سر جھٹکا۔

”اور میں......“ پھر اسے یاد آیا۔ ”میں کتنی احمق ہوں جو اس سے اس صفحے کا ذکر کر بیٹھی جو مقبول ترین... سوشل ویب سائٹ پر میرال صلاح الدین کے نام سے بنایا گیا ہے۔ مجھ سے اس کا تذکرہ سننے کے بعد تو جیسے اس کی ساری تلاش کا رخ ہی مڑ گیا اور پھر جیسے سال کے باقی دن ختم ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گئے اور وہ آناً فاناً لاہور چلا گیا...... کیا ہے یار......“ اس نے فہد کے چلے جانے کا خیال آتے ہی اکتا کر سوچا۔ ”ہم بھی تو انسان

ہیں اور ہم میں کیا کمی ہے جو لوگ ہمارے لیے اس طرح نہیں سوچتے۔'' اس نے اپنے لیے جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے سوچا تھا اور لوگ سے اس کی مراد یقیناً فہد تھا۔ فہد عین اترتی شام کے ان لمحوں میں سیکڑوں کلو میٹر دور لاہور میں دانیال جہانگیر کے گھر اس سے ملاقات کرنے پہنچ چکا تھا۔

☆☆☆

''لڑکی جس بھی حال میں ہے، ہے اُسی منسٹر کے پاس قید......'' عافیہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑی فیکٹس اور فگرز کی فائل سے وہ تفصیل فہد اور حمزہ کو سنانے کے بعد کہا جو انہوں نے اپنی یادداشت کے لیے بنا رکھی تھی۔

''اور منسٹر اتنا پاور فل ہے کہ کسی طرح پکڑائی نہیں دیتا۔'' حمزہ کے لہجے میں تلخی تھی۔ ''میں نے اسے ڈھونڈ نکالنے کی جتنی بھی کوششیں کیں، وہ آپ لوگوں کی کوششوں سے تو کم اور کمزور ہی ہوں گی۔'' اس نے عافیہ اور دانیال پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''مگر میری ہر کوشش بھی کسی ہائی آفس کے دروازے پر جا کر دم توڑ دیتی رہی اور یقیناً اس کی وجہ یہ منسٹر ہی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔'' فہد نے کچھ سوچتے ہوئے حمزہ کی طرف دیکھا۔ ''لیکن ابھی جس ڈویلپمنٹ کا ذکر تم نے کیا۔'' اس نے سوالیہ نظروں سے حمزہ کو دیکھنے کے بعد عافیہ اور دانیال کی طرف دیکھا۔ ''اس چائنیز لڑکی اور اس کے شوہر نے میرال کو جس عمارت کے اندر جاتے دیکھا اس کا آفس تو اس منسٹر کے پاس نہیں ہے ناں۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' دانیال نے کہا...... ''وہ بلڈنگ وفاق کے نمائندے کی سرکاری رہائش گاہ ہے اور وفاق کا یہ نمائندہ اسی پارٹی کا ایک لیڈر ہے، جس کے یہ صاحب منسٹر ہیں، یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں لڑکی کو اس عمارت میں رکھنا تو اسے اور بھی نظروں سے دور رکھنے کے مترادف ہے، اپنے پیج اور بلاگز کے ذریعے جو ڈوری ہم آہستہ، آہستہ وقتاً فوقتاً ہلا رہے ہیں، اس کی کچھ خبر تو اس منسٹر کے بچے کو پہنچ ہی چکی ہوگی، چیف منسٹر کی بیوی سے میری بھابی کی ملاقات بھی مانیٹر ہو چکی ہوگی، یہ لوگ اپنے مخالفوں کی ہر، ہر موومنٹ پر گہری نظر رکھتے ہیں، یقیناً اسے ایک ایسی گڑبڑ کا اندازہ ہو چکا ہے جو چند ہی دنوں میں اس کے خلاف سامنے آنے والی ہے، اس نے خود کو مزید محفوظ کرلیا ہوگا۔''

''افوہ!'' عافیہ نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ ان کا تصور انہیں میرال کی کئی ممکنہ تکلیف دہ صورتِ احوال دکھاتا رہتا تھا۔ ''ہمیں اب بغیر کسی تاخیر کے اپنی آواز اور احتجاج بلند کرلینا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ وہ خود کو مزید محفوظ کرنے کے لیے لڑکی کو سرے سے ہی غائب کردے۔''

''ہم......'' فہد نے اپنا فون نکالتے ہوئے پُرسوچ انداز میں سر ہلایا۔ ''مجھے مکمل صورتِ حال کا اندازہ تو آج ہوا ہے، مجھے بھی اپنے کچھ کانٹیکٹس آزما لینے دیں، شاید کچھ فائدہ ہو جائے۔'' اس نے اپنے فون میں محفوظ ایک نمبر ملاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

''مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ نے کل کے پیدا ہوئے ایک لڑکے کو خوب ہی سر پر چڑھا رکھا ہے۔ یعنی کہ وہ کسی اور سے رابطہ کیے بغیر سیدھا آپ تک ہی پہنچ گیا۔ کمال ہے بھئی کمال ہے، مجھے کال کرنے سے پہلے ذرا اس جرأت پر غور تو کیا ہوتا صاحب۔''

''باتیں بنانے کے لیے تو نہیں بلایا تمہیں سائیں، بات کرنے کے لیے بلایا ہے، بھلا اب غور کرنے کی ہی بات ہے تو تم نے بھی تو غور کیا ہوتا کہ باتیں کرنے کا دل چاہے تو فون کال کر کے بھی کی جاسکتی ہیں ناں بابا، ایک نمبر ہاٹ لائن سے جڑا ہے، بٹن دباؤ بات کرلو، تمہیں سفر کر کے صاحبزادے سمیت یہاں چلے آنے کو کیوں کہا، باتیں بنانے کے لیے تو ہرگز نہیں کہا ہوگا بابا!''

''میں سب سمجھتا ہوں صاحب، یہاں بلانے کا مقصد اس کو یقین دلانا ہے کہ اس کی بات سن بھی لی گئی اور اس پر غور کرنے کے بعد ایکشن لینے کا موڈ بھی ہے، کمال ہے صاحب کمال ہے، ہماری عمریں گل سڑ گئیں پارٹی کے کاز کو آگے بڑھانے میں، وہ ابھی کل ممبر بنتا ہے، الیکٹ ہوتا ہے، اسے سب سے اہم وزارت بھی دے دی جاتی ہے اور پھر اس کی چاند سے کھیلنے کی ضدیں بھی پوری کرنے چل پڑتے ہیں آپ، کیا آپ کو خبر ہے کہ جس سے زبردستی استعفیٰ لے کر اس کی منسٹری اس کے حوالے کی ہے آپ نے، اس کے کیمپ میں کیا چل رہا ہے۔''

''بابا...... بابا...... تم کیا سمجھتے ہو، ہماری آنکھیں بند اور کانوں میں سیسہ ڈلا ہوا ہے کیا......! ارے سائیں، مردِ درویش ضرور ہوں مگر نظر ہر موومنٹ پر ہے، چاہے وہ موومنٹ اپنوں کی ہو یا مخالفوں کی۔''

''سب جانتا ہوں صاحب، ایک عمر سے آپ کے ساتھ ہوں۔''

''نہ بھئی نہ...... یہ ساتھ ہونے کے دعوے مت کرو، اِدھر ہم ایک جیل سے دوسری جیل کی سیر کر رہے تھے اُدھر تم لندن اور نیویارک کے نائٹ کلبز کے مزے لُوٹتے پھر رہے تھے، یہ تو ہماری وضع داری کا کرم سمجھو جو آج تم ہمارے نمائندے کی حیثیت سے اس چھوٹے صاحب کے گلے کی ہڈی بنے بیٹھے ہو۔''

''وضع داری کا کرم نہیں صاحب گٹس کی کمائی ہے یہ نمائندگی، آپ کی پارٹی میں ہے کوئی ایسا دوسرا جی دار جو اس کی دہاڑ پر ہاتھ رکھ سکے، یہ گٹس تو صرف اسی ناچیز میں تھے اور آپ جانتے بھی تھے جب ہی قرعۂ فال اس مسکین کے نام نکلا۔''

''مسکین مت بولو خود کو بابا، تمہارے لیے یہ لفظ سن کر تو مجھ کو بھی شرم آتی ہے۔''

''کیا بات کرتے ہیں صاحب، آپ نہیں جانتے کیا کہ اہلِ علم کے خاندان کا چشم و چراغ ہوں، ہماری تو نسلوں کی کتابیں پڑھنے اور کتابیں پڑھانے میں عمریں گزر گئیں، والد محترم کی استادی کا زمانہ قائل ہے، یہ حقیر پُرتقصیر بھی کتابیں پڑھ پڑھ کر ہی یہاں تک پہنچا ہے۔ اہلِ علم، آغازِ کاروبارِ دنیا سے ہی مسکین ٹھہرے صاحب، جب ہی تو آج اُس کل کے لونڈے کی ایک پکار پر آپ نے میرے ہی کان دابنے کا فیصلہ کرلیا۔ نہ میری عمر کا خیال کیا گیا، نہ علم کا نہ ہی پارٹی سے وابستگی اور اس کے لیے انجام دی گئیں خدمات کا۔''

''ارے بابا، ہمیں کتابی علم سے کیا واسطہ، ہم تو صوفیا کی دھرتی سے اٹھ کر آئے ہیں، ہمیں کتاب کے علم کی نظر عطا ہی نہیں ہوئی ہم تو جو دیکھتے ہیں دل کی نظر سے دیکھتے ہیں اور دل کی نظر کہتی ہے اس معاملے میں تم (culprit) قصوروار ہو بابا، تمہارا بیٹا بھی قصوروار ہے۔ مان لو سائیں دل کی نظر ٹھیک کہتی ہے۔''

''اب میں کیا کہہ سکتا ہوں، گھونٹ پانی کے پیوں یا خون کے، سمجھ نہیں آرہا۔''

''یہ بھی کوئی سوچنے کی بات ہے بابا، اسی شے کے گھونٹ پیو جس کے پینے کے تم عادی ہو، اسی کے دو گھونٹ تمہارے دماغ کو سوچنے کی صلاحیت بھی عطا کردے گا اور سمجھنے کی بھی۔''

''ایک معمولی سے معاملے کو پکڑ کر آپ مجھے بے نقط سنا رہے ہیں صاحب، یہ یاد رکھنے کی بات ہوگی۔''

”معاملے، معمولی یا غیر معمولی نہیں ہوتے سائیں، ٹائمنگ معمولی یا غیر معمولی ہوتی ہے۔ تمہارا لڑکا ابھی عمر میں چھوٹا اور ناتجربے کار ہے۔ اس نے معاملہ چھیڑنے کے لیے غلط ٹائمنگ کا انتخاب کیا...... ارے بابا، وہ جو ڈور ہلا رہا ہے اس کی عمر پر نہ جاؤ اس کے وژن پر غور کرو، اس کی پرسنیلٹی کا جائزہ لو اس کی ٹائمنگ پر نظر رکھو۔ وہ ان میں سے ہے جو پہلے جان ہتھیلی پر رکھتے ہیں پھر آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہیں۔ ایسے لوگ کھیلنے کو چاند مانگیں تو معمولی بات ہے، ایسے لوگ تو کھیلنے کو سورج بھی مانگ لیتے ہیں کیونکہ انہیں ہتھیلیاں جل جانے کا کوئی خوف نہیں ہوتا، وہ تو بس ضد پر آجاتے ہیں اور اُڑ جاتے ہیں۔“

”یہ تو سراسر بلیک میلنگ ہے۔“

”تم مت بولو بیچ میں چھوٹا سائیں، جب میں اور تمہارا باپ آپس میں بات کر رہے ہوں تو بیچ میں بولنے کی ضرورت نہیں، بس سنتے جایا کرو جو ہم بات کرتے ہیں۔“

”گویا میں سمجھوں آپ مجھے حکم دے رہے ہیں؟“

”حکم سمجھو، درخواست سمجھو، التجا سمجھو، جو سمجھ رہے ہو اس پر عمل کر ڈالو، لڑکی کو اُدھر سے نکالو بابا۔“

”واہ صاحب، ایک وہ چھوکرا اور اس کا قبیلہ آپ کو بلیک میل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔“

”اس کا قبیلہ اور وہ نہیں ”وقت“ بلیک میل کرنے میں کامیاب ہو گیا سمجھو، ابھی پارٹی کے سمندر میں طوفان اٹھانے کی گنجائش نہیں ہے بابا، جو الزامات پہلے سے لگ رہے ہیں وہ تمہارے سامنے ہیں، پارٹی کی پوزیشن کمزور پڑ رہی ہے۔ ایسے میں اسے یوں چیلنج دے کر کھلا چھوڑ دیا گیا تو بڑا مسئلہ ہو سکتا ہے، میں نے کہا ناں وہ جان کو ہتھیلی پر پہلے رکھتا ہے، آنکھوں میں آنکھیں بعد میں ڈالتا ہے۔“

”آپ تو دراڑیں پیدا کرنے کے ماسٹر ہیں صاحب، اس کے قبیلے میں اس کی برادری میں ڈالیں ناں شگاف چند عدد۔“

”تم کیا سمجھتے ہو...... ہمارا دماغ نہیں سوچتا یا کام کرنا چھوڑ گیا ہے، اس برادری، اس خاندان کی تاریخ پر غور کیا ہے کبھی...... کہاں، کہاں تک گرہوں پر گرہیں ڈال رکھی ہیں۔ رشتوں ناتوں کی اس خاندان کے گرگوں نے، کیا اسٹیٹ، کیا بیورو کریسی، کیا ٹیکنو کریسی ہر جگہ ان کے بندے بیٹھے ہیں اور آپس میں کمال کا اتحاد ہے ان کا۔ جب ہی تو بولتا ہوں ان پر ہاتھ مت ڈالو، ٹائمنگ غلط ہے، ابھی تو اِدھر سے بھی ہاٹ لائن پر پریشر پڑنے لگا ہے اس کے واسطے بابا، مجھے اپنے قدم اس دلدل میں ڈالنے پر مت مجبور کرو۔“

”وہ ہر جگہ حاوی ہیں اور ہم جیسے کتے تو شاید کہیں موجود ہی نہیں ہیں جیسے، پارٹی کی خاطر کہاں، کہاں اور کیسے، پنگے نہیں لے رکھے ہیں میں نے، ابھی تو مولویوں کے فتوے ختم ہونے میں نہیں آرہے، جان ہتھیلی پر تو میں بھی لیے پھرتا ہوں اس کی قدر نہیں آپ کو۔“

”وہ تو خیر تمہاری اپنی غلطی ہے بابا تمہیں اپنا big mouth کھولتے ہوئے آگے پیچھے کی فکر رکھنی چاہیے تھی کہاں کھڑے ہو کر بڑے، بڑے بول رہے ہو، اس سے تو خیر تمہیں خود نمٹنا ہوگا لیکن لڑکی کے معاملے میں retreat (واپس اپنی جگہ پر آنا) کر جاؤ بابا، ان کی ڈیڈ لائن ختم ہونے والی ہے۔“

”ایسا ہے تو پھر لڑکی رہے گی نہ اس کا نام و نشان۔ پھر کہاں سے برآمد کرے گا اور کیسے، لڑکی ایک گھنٹے کے اندر ختم ہو کر ایک ایسی مٹی میں دفن ہو جائے گی جس کا نشان بھی نہیں ملے گا، چیلنج ہے تو پھر چیلنج ہے۔“

”واہ ڈیڈی، کیا کمال کا خیال ہے۔“

”شٹ اپ بابا، شٹ اپ یو تھ آف یو۔“ غراہٹ کی آواز ابھری۔

”ابھی تک تو میں پیار محبت کی زبان میں بات کر رہا تھا۔ بات کرتے ہیں چیلنج کی، ٹیڑھی کھیر کو سیدھے ہاتھوں سے نکالنے کا فن ہم سے زیادہ کون جانتا ہوگا، تم تو ابھی اس عمارت کے صدر دروازے تک بھی نہیں پہنچو گے اور لڑکی دارالخلافہ کی طرف روانہ بھی ہو چکی ہوگی، اس عمارت کی بھول بھلیوں سے تو تم بھی اتنے واقف نہ ہو گے جتنا یہاں بیٹھے ہم...... بات کرتے ہیں چیلنج فیس کرنے کی۔“

”آپ ساری کی ساری چڑھائی ہم باپ بیٹوں ہی پر کیے جا رہے ہیں صاحب۔“

”ہم چڑھائی نہیں کر رہے صرف تم کو سمجھا رہے ہیں، وقت کے تقاضے کو سمجھو، ابھی وقت نہیں ہے لیکن وقت آئے گا ضرور، تم کیا سمجھتے ہو ہم یوں بلیک میلنگ کو ٹھنڈے پیٹ ہضم کر جائیں گے، نہیں ایسا نہیں ہوگا لیکن ابھی وقت نہیں ہے، وقت آنے دو پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔“

”لڑکی کو یوں چھوڑ دینے سے بہت سے بکس کھل جائیں گے صاحب۔“

”بیٹا تمہارا دیکھو، کیسے تلملا کر پہلو بدل رہا ہے، اس کا بس نہیں چل رہا تم کو بھی گولی مار دے اور ہم کو بھی...... ارے بابا اس کو سمجھاؤ وقت کے تقاضوں کو سمجھنا سیکھے۔ ابھی اگر وقت مہرزاد خان کے ہاتھ میں ہے تو کبھی اِس کے ہاتھ میں بھی ہوگا، کبھی طاقت صرف سفید فاموں کے اپنی بیک پر ہونے میں نہیں چلتی، لوکل حقائق بھی کاؤنٹ کرتے ہیں مائی ڈارلنگ بھتیجے، جاؤ شاباش میرا بچہ، اپنے بندوں سے بولو لڑکی کو ان بھول بھلیوں سے نکال کر اسی جگہ پہنچا دیں جو بتائی گئی ہے، آگے مہرزاد خان جانے اور اس کا کام۔“

”this is extremely unfair انکل، ہم تو آپ کے بھروسے پر رسک لینے والے لوگ ہیں۔“

”شوق سے لیا کرو بابا، منع کس نے کیا ہے رسک لینے سے مگر اپنے ہی بندوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے سے بچو، یہ جو پارٹی کے اندر کھاتے کی کشمکشیں ہیں ناں، یہ surface پر آنے میں ذرا بھی وقت نہیں لگتا۔ آج کل میڈیا کو جو چھوٹ دے گئے ہیں ناں ہم سے پچھلے، اس چھوٹ کو لگام ڈالنا ہمارے لیے سب سے زیادہ چیلنجنگ ثابت ہو رہا ہے۔“

”اوپر سے اسی میڈیا کی پوری لگام آپ نے اسی مہرزاد خان کے ہاتھ میں پکڑا دی۔“

”ارے بابا، اپنے تئیں بہترین فیصلہ کیا تھا ہم نے، وہ اس منسٹری کے لیے سب سے زیادہ موزوں امیدوار تھا اور اس نے یہ کوہِ عظیم سر کر بھی جانا ہے مگر ہمیں کیا پتا تھا اُدھر وہ حلف لیتا ہے اِدھر تم اسی کے ساتھ کیٹری کاڑا کھیلنے لگ جاتے ہو۔ ہمیں تو خود تم نے الجھن میں ڈال دیا۔ اُدھر تم نے اس کی عورت اٹھائی، اِدھر وہ ہم سے پوچھنے پہنچ گیا کہ بول میری مچھلی کتنا پانی!“

”انکل اسی کے باپ نے یہ لڑکی اٹھوائی تھی پہلی بار۔“

”اس قصے کو گول کرو بابا، باپ نے اٹھوائی تھی یا چاچا نے، ابھی تو وہ باپ بنا ہمارے سر پر بیٹھا ہے، تم ویسا کرو جیسا تم کو بولا ہے اور تم بڑا صاحب مولویوں کے فتوے نمٹا لو جلدی سے، کل تک تمہارا کوئی واضح بیان پریس میں آجانا چاہیے نہ اتنے محاذ اکٹھے کھولا کرو بابا کہ ہمیں فیس کرنے مشکل ہو جائیں۔“ وہ اپنے تئیں بات مکمل کر چکے تھے۔

”چلو شاباش، ابھی ایک سفیر صاحب سے ملاقات کا وقت ہو رہا ہے پھر ملتے ہیں کسی دن جب ہم آتے

ہیں صوبائی دارالحکومت، وہاں اس بار ذرا ڈنر زیادہ شاندار ہونا چاہیے۔"

"ارے بابا، منہ لٹکا کر مت جاؤ، شاباش منہ سنبھال کر نکلو، اسٹاف کے بندے تو سیکنڈوں میں منہ کے زاویوں سے اندر کی بات سمجھ جاتے ہیں...... ہاں یوں بہتر ہے، شاباش، شاباش......"

☆☆☆

مہر زاد خان کے انداز میں ایک غیر معمولی تبدیلی یشل کے لیے حیران کُن تھی اگرچہ یہ غیر معمولی تبدیلی اتنی نامحسوس سی تھی کہ مہر زاد کے پرسنل اسٹاف میں سے کسی اور نے اس کا ذکر نہیں کیا تھا، گویا کسی اور کو وہ محسوس بھی نہیں ہوئی تھی مگر وہ یشل رئیس تھی جو اپنی پیشہ ورانہ خدمات بجالانے اور اس کے عوض بھاری معاوضہ بطور تنخواہ حاصل کرنے کے علاوہ بھی ایک خاص دلچسپی کی وجہ سے مہر زاد خان کے پرسنل اسٹاف کا حصہ تھی۔ یقیناً یہ خاص دلچسپی مہر زاد کی شخصیت کی اس کشش کی وجہ سے ہی تھی جس بنا پر نیوز چینلو پر صبح سے رات گئے تک جتنے بھی نیوز بلیٹن نشر ہوتے تھے ان میں ایک آدھ خبر مہر زاد خان کے بارے میں ضرور ہوتی تھی۔ اپنی وزارت کے حوالے سے خبروں میں رہنا بھی اگرچہ معمول کا حصہ تھا لیکن یقیناً اس کی شخصیت میں کچھ ایسا سحر بھی تھا جو وہ خبروں کا حصہ بنا رہتا تھا۔

"آپ پریشان ہیں، آپ کو کوئی نہ کوئی بات ضرور ہانٹ کر رہی ہے۔" اس دوپہر لنچ کے دوران اسی شام کو ہونے والی پریس کانفرنس کے نوٹس پر بات کرنے کے بعد یشل نے اپنا قلم ڈائری کے ایک صفحے پر اٹکا کر ڈائری بند کرتے ہوئے اچانک پوچھا۔

"اور تمہیں یہ سوچ ہانٹ کر رہی ہے کہ مجھے کیا بات ہانٹ کر رہی ہے؟" مہر زاد نے ہاتھ میں پکڑا کانٹا پلیٹ میں رکھتے ہوئے اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"میں نے سنا ہے کہ آپ کا رابطہ حال ہی میں اُن سے ہوا ہے جن سے رابطہ ہونے کی خبر نشر ہونا آپ کی شامت لا سکتی ہے۔" یشل کے لہجے میں اعتماد تھا اور یقین بھی۔

"اچھا......!" اس نے متاثر ہو جانے کے سے انداز میں سر ہلایا۔ "پھر تو تم خوب باخبر ہو۔"

"اگرچہ مجھے ایسا کہنے کا کوئی حق نہیں لیکن میری دلی خواہش ہے کہ ان رابطوں کا اور آپ کے ہانٹ ہونے کا تعلق زرنگار سے نہ ہو۔" یشل اسی پُراعتماد انداز میں بولی اور پھر اس نے لمحے بھر کا توقف کرتے ہوئے اپنی بات پر مہر زاد کے ردِعمل کا اندازہ کرنے کے لیے اس کی طرف دیکھا۔ "زرنگار جو دراصل میرال صلاح الدین ہے۔"

یشل کی بات کے ردِعمل میں مہر زاد خان نے چند ثانیوں کے لیے آنکھیں بند کر لیں اور پھر آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"اور اگر حقیقت تمہاری دلی خواہش کے برعکس ہو تو؟......" اس نے سوال کیا۔

"تو......" یشل نے ٹیبل کی سطح پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا...... "تو......" پھر اس نے مہر زاد کی طرف دیکھا۔ "تو مجھے یقیناً بہت افسوس ہوگا۔"

"وہ کیوں......؟" وہ بدستور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"وہ اس لیے کہ معاف کیجیے گا اتنی قد آور شخصیت پر ایسا چھوٹا اور گھٹیا سا الزام لگا اچھا نہیں لگتا۔" یشل نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "آپ سماجی ویب سائٹس پر ہونے والے کمنٹس اور ٹوئیٹس کو فالو نہیں

کر رہے غالباً، زرنگار یا میرال جو کوئی بھی وہ ہے اس کے حوالے سے آپ پر الزام لگائے جا رہے ہیں۔ کیچڑ اچھالی جا رہی ہے کہا جا رہا ہے کہ آپ نے اسے اغوا کر رکھا ہے، آپ نے اسے اپنی داشتہ بنا رکھا ہے۔ وہ دن قریب نظر آ رہا ہے جب مخالفین اسی بات کو لے کر آپ کے خلاف تقریریں کریں گے اور نعرے لگائیں گے۔" تیزی سے اپنی بات مکمل کرنے کے بعد یشل کو محسوس ہوا اس کی سانس معمول سے زیادہ تیزی سے چل رہی تھی۔ مہر زاد خان کے سامنے اتنے بڑے سچ کو بغیر کسی ڈھکے چھپے رنگ میں کہنے کے بجائے صاف، صاف کہہ دینا بہت ہمت کی بات تھی اور یہ جرأت وہ کر چکی تھی۔

"اور اگر میں یہ کہوں یہ الزام مجھے اعزاز محسوس ہوتے ہیں، یہ کیچڑ پھولوں کی طرح اچھلتی اور مجھ پر برس جاتی ہے تو تمہیں کیسا لگے گا؟" وہ نیپکن سے منہ صاف کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے یقین نہیں آئے گا۔" یشل نے سر ہلایا۔

"اور مجھے تمہاری بے یقینی پر افسوس ہوگا۔" وہ ہلکا سا مسکرایا اور نیپکن واپس پلیٹ میں رکھتے ہوئے بولا۔ "کسی بات کے کھل جانے اور اس پر ہونے والی چہ مگوئیوں سے اسی وقت تک ڈر لگتا ہے جب تک وہ ڈھکی چھپی ہوں، ایک زبان زدِ عام راز پر سرگوشیاں کرتے ہوئے لوگ کن انکھیوں سے آپ کی طرف دیکھیں اور ان کی لرزتی انگلیاں وقفے، وقفے سے آپ کی طرف اشارہ کریں تو آپ کو بے اختیار ہنس دینا چاہیے کیونکہ اس کے سوا آپ فوری طور پر کچھ کر ہی نہیں سکتے۔"

"آپ......!" یشل نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "آپ کو معلوم ہے یہ صرف الزام ہی نہیں اسکینڈل ہے، اسکینڈل...... اسکینڈل جو بڑے، بڑے بادشاہوں کے تخت تک الٹا دیتے ہیں۔"

''اوّل تو میں کسی تخت کا نشین ہوں ہی نہیں، اگر ہوتا تو کیا تم سمجھتی ہو کہ اس کے الٹ جانے کا خوف مجھے حقیقت سے منہ موڑنے پر مجبور کرسکتا تھا؟'' مہرزاد نے یشل سے سوال کیا۔

''پتا نہیں......'' یشل نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس معاملے کے ifs اور buts سے کیا غرض ہوسکتی ہے لیکن جو میری دلی خواہش ہے اس کا ذکر میں نے اس گفتگو کے آغاز ہی میں کر دیا تھا۔''

مہرزاد خان کچھ دیر تک دلچسپی سے یشل کی طرف دیکھتا رہا اور پھر مسکرا دیا۔

''تم فکر مت کرو کیونکہ تم سے زیادہ کسے معلوم ہوگا کہ میں جانتا ہوں اپنے غلط کو صحیح کیسے کیا جاتا ہے۔''

''میری دعا ہے کہ آپ وقت پر ہی ایسا کرلیں۔'' یشل نے بھی اس کی طرف دیکھا۔

''تم فکر مت کرو۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر کہا اور یشل کے بنائے نوٹس پڑھنے لگا۔

☆☆☆

''ابھی تک تو میں نے تیری بہنوں کو اِدھر آنے سے روک رکھا تھا نادر...... لیکن اگلے دن وہ... جو بچاپچا گئی آئی تھی ناں شمع، اس نے جا کر مہناز سے جڑ دیا ہے کہ تو چینی چپٹی کو گھر لے آیا ہے، ابھی مہناز نے مجھے فون کر کے پوچھا ہے، میں ہوں یاہاں کر کے ٹالتی تو رہی ہوں پر دیکھ لینا ابھی فوجیں پوری تیاری کے ساتھ اِدھر حملہ کرنے آدھمکیں گی۔'' نادر کی اماں نے ٹرے میں بکھری خشخاش صاف کرتے ہوئے نادر کو خبر دی۔

''میں لے آیا ہوں اسے گھر؟'' نادر اس صاف الزام پر حیرت سے بولا۔ ''آپ بھول گئیں؟ اسے آپ نے گھر میں آنے اور رہنے کی اجازت دی تھی، اپنی خوشی اور اپنی مرضی سے۔''

''ہاں، ہاں......!'' اماں نے سر ہلاتے ہوئے اقرار کیا۔ ''مگر تو مجھے بیچ میں نہ ڈالنا، مجھے رہنے دینا، وہ ساری پوچھیں گی تو کہہ دینا تو خود لے آیا تھا، ماں بے چاری کیا کہتی...... چپ ہوگئی۔'' وہ صاف پہلو بچانے کے چکر میں تھیں۔

''نہیں، نہیں، یہ نہیں ہوسکتا، آپ مجھے پھنسا کر خود کو نہیں بچاسکتیں۔'' نادر نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ اسے اپنی بہنوں کے مزاج اور واویلے کی خوب خبر تھی اور اس تصور ہی سے وہ کانپ اٹھا تھا کہ وہ ساری اکٹھی ہو کر اِدھر آرہی تھیں۔

''میں تو گھر واپس آیا تھا اس روز تو آپ کو اس سے شیر و شکر ہوئے دیکھ کر خود بھی حیران رہ گیا تھا، مجھ پر الزام کیوں دھر رہی ہیں۔'' اس نے احتجاج کیا۔

''یہ بتا جب سے یہ آئی ہے گھر میں تجھے گھر، گھر نہیں لگنے لگا؟'' اماں نے خشخاش چھوڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''لگنے لگا ہے......'' نادر نے ان کے سوال کی وجہ جاننے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

''وقت پر کھانا، کپڑے، جوتے، سب تیار نہیں ملتا؟'' انہوں نے دوسرا سوال کیا۔

''ملتا ہے۔'' نادر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔

''تو پھر کیا ہے جو اس سکھ چین کے لیے ہی تو تھوڑی دیر بہنوں کی چیں چیں سن لے گا۔'' ماں نے سر پر دوپٹا رکھتے ہوئے کہا اور اس کا کنارہ منہ میں دبا کر ہنسنے لگیں۔ ''مجھے ایک طرف ہی رہنے دینا، انہیں خوش کرنے کے لیے میں بھی ان کے ساتھ دو گھڑی ہوں، ہوں، ہاں، ہاں کرلوں گی اپنی ہنسی روکتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ''ان بے چاریوں نے کر کیا لینا ہے، بول بال کر اپنے، اپنے گھروں کو واپس چلی جائیں گی پھر ہم

تینوں ہوں گے اور ہمارا سکھ چین۔'' وہ ایک بار پھر ہنسنے لگیں۔

''خدا کا واسطہ ہے اماں، مجھے ان کے سامنے یوں تنہا مت چھوڑیے گا، میں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔'' نادر نے بوکھلا کر کہا۔

''ہائے...... گھڑی دو گھڑی کی ہی تو بات ہوگی، انہوں نے تجھے کوئی گولی تو نہیں مار دینی۔'' ان کے نزدیک یہ معمولی کام تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' نادر ماں کی بے نیازی اور خود کو... بہنوں کی گولا باری سے محفوظ رکھنے کے منصوبے پر ناراض ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں ایسا کرتا ہوں زوئی سے کہتا ہوں وہ یہاں سے چلی جائے کیونکہ آپ جنہوں نے اسے گھر میں داخل کیا تھا آپ ہی اس سے لاتعلقی کا اعلان کر رہی ہیں۔''

''ہائے، ہائے، میں نے یہ کب کہا؟'' وہ گھبرا گئیں۔

''نہیں ایسا ہی ہوگا اب......'' نادر نے سر ہلایا۔ ''بہنوں کے آنے سے پہلے، پہلے زوئی کو بھیجتا ہوں میں یہاں سے۔'' وہ اپنے کمرے کی طرف جانے کے لیے اٹھا۔

''ہاہائے نادر تو، تو سیریس ہی ہوگیا۔'' اماں ٹرے چھوڑ اس کے پیچھے آگئیں۔

''میں نے کوئی سچ مچ تھوڑی ایسا کرنا تھا، میں تو مذاق کر رہی تھی۔'' وہ اس کا بازو پکڑ کر اسے پیچھے کھینچتی ہوئی بولیں۔

''چھوڑیں اماں۔'' نادر نے اپنا بازو چھڑوانے کی ہلکی سی کوشش کی۔ ''ایسے سکھ چین کا کیا فائدہ جس کے بدلے بہنیں ناراض ہوجائیں اور ماں بے نیاز۔''

''نہیں ہوتی ماں بے نیاز۔'' وہ اس کا بازو پکڑے واپس وہیں لے آئیں جہاں سے وہ اٹھا تھا۔ ''میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ یہ دیکھ کر کہ تیری، میری دونوں کی صلاح سے وہ گھر میں داخل ہوئی ہے کہیں اِدھر آنا ہی نہ چھوڑ جائیں وہ ساری کی ساری تو ہم دونوں کچھ عقل کرتے ہیں تھوڑی دیر کے لیے اپنا، اپنا گروپ بنا لیتے ہیں۔'' نادر نے...... ان کی بات سن کر ایک مرتبہ پھر ناراضی سے سر جھٹکا۔

''اس بے چاری کو کاہے کو پریشان کرنے چلا تھا تو۔'' انہوں نے لہجہ بدلا۔ ''وہ تو دیس سے پردیسی ہوئی بیٹھی ہے پہلے ہی، کیا پاکستان کی بہوئیں ہوں گی جو وہ ہے، پیار، محبت، خدمت والی۔'' ان کے لہجے میں زوئی کے لیے پیار اُمڈا۔ ''بس ناک اس کی بڑی پھینی ہے، کبھی کبھی مجھے تیرے بچوں کا خیال آجاتا ہے تو وہم کرنے لگتی ہوں، محلے کے بچوں کے ساتھ کھیلنے جائیں گے تو وہ بھی کہیں گے، وہ دیکھو پھینے آئے ہیں کھیلنے...... بے چارے کیا محسوس کریں گے۔'' وہ اداس ہوتے ہوئے بولیں۔ نادر کو اماں کی یہ اداس شکل دیکھ کر بے اختیار ہنسی آگئی۔ اسے دیکھ کر اماں بھی ہنس دیں۔

''اس کو کہہ اپنی زبان میں کوئی کوفتے، پلاؤ پکالے تیری بہنوں کے لیے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولیں۔ ''اس کے ہاتھ کا پکا کھانا کھا کر ہی شاید تیری بہنوں کی زبانوں کا تیل ختم ہوجائے، ان کے دلوں میں ٹھنڈ پڑ جائے۔'' انہوں نے نادر کے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں زوئی بیٹھی تھی۔

''وہ پہلے ہی کسی مسئلے کی وجہ سے پریشان ہے اماں۔'' نادر، زوئی کی طرف دھیان جانے پر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''دعا کریں اس کا مسئلہ حل ہوجائے۔ پھر چاہے آپ اور آپا لوگ اسے کوئی بھی کام کہیں وہ منع نہیں کرے گی نہ ہی برا منائے گی۔''

"پتا ہے مجھے یہ پاکستانی اسے اِدھر پاکستان میں رہنے نہیں دے رہے، اجازت نہیں مل رہی ہے اس لیے پہلے وہ تفتیشوں والے آتے تھے ناں۔" اماں سنجیدہ ہوتے ہوئے بولیں۔

"بس جو بھی ہے آپ دعا کریں اس کے لیے۔" نادر ان کی غلط فہمی کو درست کیے بغیر بولا۔

"تو نے بھی چوروں کی طرح اس سے نکاح کر کے غلط کیا، جو کرنا ہی تھا نکاح تو سینہ تان کر کرتا، ڈرنے والی کیا بات تھی۔" وہ اپنی دُھن میں اسے ڈانٹنے لگیں۔ "اب کوئی آیا ناں اس سے تفتیش کرنے تو میں نے ڈنڈا لے کر کھڑے ہو جانا ہے کہ کیا ہے نکاح میرے بیٹے نے، پکا کاغذ ہے نکاح کا ہمارے پاس، دیکھتی ہوں کیسے کوئی نکالتا ہے اسے پاکستان سے۔"

"پاکستان کی چھوڑیں، امی فی الحال تو اس گھر کی بات کریں، جہاں سے اسے آپ کی بیٹیاں نکالنے آ رہی ہیں۔"

"واہ جی واہ...... کیسے نکالنے آ رہی ہیں۔" اماں کے جذبات ایک دم زوئی کی محبت میں ڈوب چکے تھے۔ "آنے دے، تو بس خاموش رہنا، میں خود ہی نمٹ لوں گی ان سے؟" انہوں نے چیلنج قبول کرنے کے سے انداز میں کہا۔ نادر بے اختیار مسکرا دیا۔ سادہ لوح اماں باتوں ہی باتوں میں یوٹرن لے گئی تھیں۔

☆☆☆

"میں آپ کو بتا رہا ہوں ڈیڈی، یہ میں نہیں ہونے دوں گا۔"

"آرام سے، آرام سے مائی ڈیر سن، جہاں اتنی باتیں سمجھ لی ہیں وہاں یہ بھی سمجھ لو کہ کبھی، کبھی بھری میز سے خالی پیٹ بھی اٹھ جانا پڑتا ہے۔"

"جی نہیں، میں ایسی باتیں سیکھنے کے موڈ میں ہرگز نہیں ہوں۔"

"پیٹ بھر لینے کے بعد چاہے پیچھے سے آئی بندوق کی گولی بھی کیوں نہ کھانی پڑ جائے۔"

"نہ کریں ڈیڈی، ایسی باتیں نہ کیا کریں۔ کیا میں نہیں جانتا کہ آپ تو خالی میز سے بھی پیٹ بھر کے اٹھنے والوں میں سے ہیں۔"

"ڈونٹ بی سو لاؤڈ مائی سن، ٹھنڈی کر کے کھانے کی عادت ڈالو، ٹھنڈی کر کے۔"

"مجھے یہ سب نہیں سننا ڈیڈی، میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ میں اس الو کے...... کے لیے لڑکی کو نہیں چھوڑوں گا۔"

"اس طرح کرو گے تو میرے لیے سوائے مشکلات کھڑی ہونے کے اور کچھ نہیں ہونے والا، لڑکی بھی ہاتھ سے دینی پڑے گی اور یہ عہدہ بھی جائے گا۔"

"میں جیسے جانتا نہیں کہ آپ کو اپنا نیچے والا ہاتھ اوپر کرنے کا فن کیا خوب آتا ہے۔ بسنت والا ایشو بھولا تو نہیں میں، تب بھی سب دھمکیوں کے باوجود بڑے صاحب نے آپ کو ہی بیک کیا تھا۔"

"تم ابھی کچھ بھی نہیں جانتے مائنڈ یو؟"

"مجھے تو وہ وقت بھی نہیں بھولا جب آپ کی ضد پر پورے صوبے کی کمان آپ کے ہاتھ میں دے دی گئی تھی۔ چھوٹا صاحب کو خلاص کر کے، میں کیا نہیں جانتا ڈیڈی...... بڑا صاحب تو خود آپ کا مرید ہے، آپ جو دانہ اسے ڈالتے ہیں اس کے پیچھے دم ہلاتا آتا ہے۔"

"تم نے اس کی بات نہیں سنی تھی، ٹائمنگ کی بات کر رہا تھا وہ، ٹائمنگ مائی سن، ٹائمنگ غلط ہو جائے تو

سارا کھیل بگڑ جاتا ہے۔"

"آپ اسے وہی دانہ ڈالیں ایک بار پھر، اس کو غلط ٹائمنگ بھی صحیح نظر آنے لگے گی اور اس سردار زادے کے بچے کی دم پر بھی پیر پڑ جائے گا۔"

"نہ نہ...... مائی ڈیئر سن، اس بار دانہ کام آئے گا نہ ڈنکا، اس بار تو بھری میز سے خالی پیٹ اٹھنا ہی پڑے گا، مجید سے بولو، لڑکی کو وہاں پہنچا دے جہاں کہا گیا ہے۔"

"ڈیڈی پلیز، my prestige is at stake"

"this time you will have to sacrifice your prestige"

"نیور...... نیور ایور۔"

"مجید جو کام تمہیں ٹیکسٹ کروایا تھا ہوا یا نہیں؟"

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ، ڈیڈی، آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔"

"go ahead Majeed، تم پہلے ہی لیٹ ہو چکے ہو۔"

"رکیں ڈیڈی، فون مجھے......"

"go to hell you along with your mother"

"میری مدر کی بات مت کریں ڈیڈی، وہ جہنم میں چلی گئیں تو آپ کا دانہ بھی ختم ہو جائے گا اور ڈنکا بھی، رہا میں تو یس آئی ایم گوئنگ، اس بار مجھے آپ کو بائی پاس کرنا ہی پڑے گا۔"

"go to hell, I said go to the hell"

☆☆☆

"اس لڑکی کے سلسلے میں مزید کچھ پتا چلا؟" بینش نے دوپہر میں ہونے والی پروجیکٹ کرٹ (crit) کے لیے تیاری کی غرض سے اپنے پروجیکٹ سے متعلق دانیال کے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے اچانک پوچھا۔

"ایکسٹرنل تم سے یہ سوال تو کبھی نہیں پوچھے گا۔" دانیال مسکرایا۔

"یہ سوال تو میں تم سے کر رہی ہوں۔" بینش نے جواب دیا۔

"ایکسٹرنل سے سوال نہیں کرتے، بس اس کے سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔" دانیال نے نرمی سے کہا۔

"میں نے اسی سوشل ویب سائٹ پر سردار زادہ مہر زاد خان کے خلاف ایک پیج بنا دیکھا ہے، جس میں اسے گالیاں دی جاتی ہیں، اس کے کارٹونز بنا کر لگائے جاتے ہیں، اسی پیج پر اس کے زرنگار سے تعلق کا بھی ذکر کیا جاتا ہے، اس لیے پوچھا۔" بینش نے سادگی سے کہا۔

"یہ تو ایک ٹرینڈ ہے۔" دانیال نے ہاتھ میں پکڑے کاغذ میز پر پھینکتے ہوئے کہا۔ "جو بھی بندہ لائم لائٹ میں آ جاتا ہے، اس کے ساتھ یہ ہی سلوک کیا جاتا ہے۔"

"لیکن سردار زادہ تو اس سلوک کا مستحق ہے۔" بینش نے جوش سے کہا۔

"وہ تو ہے لیکن میں اس طرح کی کردار کشی کے خلاف ہوں۔" دانیال آہستہ قدموں سے چلتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

''جب عوام کو اپنا غصہ نکالنے کا کہیں اور مناسب موقع نہیں ملے گا تو وہ یہی کچھ کریں گے ناں۔'' بینش اس کے پیچھے آئی۔

''غصہ نکالنے کا موقع؟'' دانیال نے مڑ کر بینش کی طرف دیکھا۔ ''تم جانتی ہو میں نے مہر زاد خان کی شخصیت کے بارے میں خاصی ریسرچ کی ہے اور مجھے ایسا محسوس ہوا ہے کہ وہ آج کل کے باقی سیاست دانوں سے بہتر شخص ہے۔''

''وہ کیسے؟'' بینش کو حیرت ہوئی۔

''پتا نہیں...... '' دانیال نے شانے اچکاتے ہوئے کہا اور گردن سیدھی کرتے ہوئے سامنے دیکھنے لگا۔ ''میں اس کی شخصیت میں ابھی تک کوئی بڑا فالٹ پکڑ نہیں پایا ہوں، وہ ذہین ہے اور واقعی کچھ کر گزرنا چاہتا ہے۔''

''ہوسکتا ہے۔'' بینش نے بھی اسی سمت دیکھتے ہوئے کہا جدھر دانیال دیکھ رہا تھا...... ''مجھے ان چیزوں کی زیادہ سمجھ نہیں، میں نہیں جانتی کہ ایسی ریسرچ کیسے کی جاتی ہے جس سے کسی شخصیت کے اچھے یا برے ہونے کا پتا چل سکے۔''

''اچھی بات ہے کہ تم نہیں جانتیں۔'' دانیال نے کہا۔ ''نہ جاننا بھی ایک نعمت ہے۔''

''تم اب میرا مذاق اڑا رہے ہو۔'' بینش نے بے اختیار کہا۔

''ہرگز نہیں...... '' دانیال نے سر ہلایا۔ ''مجھے تمہاری یہ کوالٹی ہی سب سے زیادہ پسند ہے، تم خواہ مخواہ بہت کچھ جان لینے کے پیچھے نہیں پڑ جاتیں۔''

''یہ کوالٹی ہے؟'' بینش نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''بہت بڑی کوالٹی ہے۔'' وہ مسکرایا۔ ''اچھا یہ بتاؤ، کیا تم نے سوچا ہے کہ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد تم نے کیا کرنا ہے؟''

''نہیں...... '' بینش نے فوراً سر ہلایا۔

''کیوں......؟''

''یہاں آنے سے پہلے بھی میں نے نہیں سوچا تھا کہ میں یہاں کیا کرنے آئی ہوں، میں اپنے تئیں یہاں پوٹری سیکھنے آئی تھی۔ مجھے اگر میری ایک دوست کورس لائن کے متعلق گائڈ نہ کرتی تو شاید میں ایک آدھ مہینے کے بعد ہی ڈیپارٹمنٹ چھوڑ چکی ہوتی۔''

''کیوں تمہارے گھر میں، تمہارے اردگرد تمہیں گائڈ کرنے والا کوئی نہیں تھا کیا؟''

''نہیں...... '' بینش نے سر ہلایا۔ ''میرے گھر میں میری اماں ہیں جنہوں نے اسکول کی شاید صرف چند جماعتیں ہی پڑھ رکھی ہیں، میرے دو بھائی ہیں جو ایف اے سے آگے پڑھ نہیں سکے اور میرے اردگرد...... جیسے لوگ رہتے ہوں گے ان کا اندازہ تمہیں وہ علاقہ دیکھ کر ہو ہی چکا ہوگا جہاں میں رہتی ہوں۔'' اتنے عرصے میں پہلی بار بینش میں دانیال کے سامنے اپنے پس منظر کے بارے میں سب کچھ درست کہہ دینے کا اعتماد پیدا ہوا تھا۔

''میں جانتا ہوں...... '' دانیال کے جواب نے اسے حیران کردیا۔ ''اور تمہاری اسی سادگی اور purity کی وجہ سے ہی تو تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔'' بینش نے حیرت سے دانیال کی طرف دیکھا۔ ''اور اسی وجہ سے آج کل میں جس اینگل سے تمہارے بارے میں سوچنے لگا ہوں وہ میں تمہیں بتادوں تو شاید تمہیں یقین نہ آئے۔''

اس نے ایک ایسی بات اتنی آسانی اور سہولت سے کہہ دی جو بینش کے لیے بہت بڑی تھی۔

''کس اینگل سے؟'' بینش نے اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے معلوم نہیں کہ تمہارے گھر والے مجھے accept کریں گے یا نہیں...... میرے اور تمہارے لائف اسٹائل میں بہت فرق ہے اس لیے مجھے یقین نہیں کہ وہ ایسا کرسکیں لیکن میں ایک بار ضرور تمہارے گھر جا کر، تمہارے گھر والوں سے تمہیں اپنے لیے مانگنا چاہتا ہوں۔''

بینش کی نظروں کے سامنے ڈیپارٹمنٹ کے اندر داخل ہونے کا راستہ تھا، طالب علموں کے چھوٹے بڑے گروپ تھے جو اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے یا جہاں جگہ ملی بیٹھے ہوئے تھے، پیڑ، درخت اور پودے تھے، کچھ دیر پہلے یہ منظر اسے صاف اور واضح نظر آرہا تھا لیکن دانیال کی بات سن کر اس کی نظروں کے سامنے کا یہ منظر گڈمڈ ہونے لگا تھا۔ سب رنگ آپس میں مل کر غیر واضح ہونے لگے تھے۔

''میں معذرت خواہ ہوں بینش، شاید میری بات نے تمہیں پریشان کردیا لیکن حقیقت میں، میں جو چاہتا ہوں وہ تم سے کہہ دیا، اگر تمہیں برا لگا تو میں شرمندہ ہوں۔'' دانیال نے اس کے چہرے پر صاف نظر آتی بے یقینی دیکھ کر کہا...... بینش کے الفاظ اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے وہ چاہنے کے باوجود کچھ کہہ نہیں پارہی تھی۔

''اوہ تمہاری کرٹ (crit) کا وقت ہوا چاہتا ہے۔'' پھر دانیال کو خیال آیا۔ ''جاؤ دیر نہ ہوجائے ہمت اور اعتماد سے جواب دینا اللہ کرے سب اچھا ہوجائے۔''

بینش کچھ کہے بغیر اندر کی طرف مڑ گئی۔ ''اور سنو!'' عقب سے دانیال نے کہا۔ ''میری خواہش کو ریجیکٹ کردینے کا تمہیں پورا اختیار حاصل ہے، اس سے ہماری دوستی پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

اس روز بینش نے اس وقت تک کی بہترین کرٹ (crit) دی تھی۔

☆☆☆

''چلیں بی بی آپ کو یہاں سے لے کر جانا ہے۔'' اس کے سامنے کھڑا شخص اس سے مخاطب تھا۔

''کہاں لے کر جانا ہے؟'' اس نے اٹکتے ہوئے سوال کیا تھا۔

''جہاں لے جانے کا حکم آیا ہے۔'' وہ پہلا شخص تھا جو اسے نہ گھور کر دیکھ رہا تھا اور نہ اس کی نظریں اس کے سراپے کو ٹٹول رہی تھیں۔

''نہ جانے کتنے عرصے سے لے جانے کے حکم ہی آرہے ہیں، کب تک اور کہاں، کہاں لے جائی جاؤں گی میں؟'' دو دن کی مسلسل قیدِ تنہائی اور اپنے کہیں موجود ہونے کا کوئی سرا ہاتھ نہ آنے نے اس کے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ ان دو دنوں میں وہ سب سے زیادہ مہر زاد خان سے بدگمان ہوئی تھی اور شاید اب زندگی میں اس کا نام بھی سننا نہیں چاہتی تھی۔

''یہ تو میں نہیں جانتا کہ آپ کو آگے کہاں لے جانے کا حکم آئے گا اور پیچھے کیا حکم آتے رہے ہیں، میں تو صرف ابھی موصول ہونے والے حکم کو بجالانے کا پابند ہوں بی بی!'' اس شخص نے بغیر اس کی طرف دیکھے کہا۔

''جب تک مجھے بتایا نہیں جائے گا، میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی، بہتر ہے کہ مجھے بتادو یا پھر مجھے گولی ماردو۔'' زرنگار نے اپنی آواز کو مضبوط رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اس کے اس جواب پر اس شخص نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دو دن سے سوئی تھی، نہ ہی اس نے کچھ کھایا تھا، اس نے کپڑے تبدیل کیے تھے نہ ہی بالوں میں برش کیا تھا۔ شکنوں سے بھرپور لباس، بکھرے بالوں اور چہرے پر شدید اضطراب کا

تاثر لیے وہ لڑکی ان حالات اور اس حلیے میں بھی کتنی حسین لگ رہی تھی۔ وہ کوئی اچھا انسان نہیں تھا، نہ ہی ...یت تھا لیکن اس حسن کو دیکھ کر نہ جانے کیوں اس کے دل میں کوئی برا خیال نہ آیا تھا نہ ہی بدنیتی نے سر ا...ا۔ بغیر کسی وجہ کے اس نے احتراماً اس کے سامنے سر جھکا لیا اور ہاتھ باندھ کر بولا۔

"میں ایسا کوئی کام نہیں کرسکتا بی بی، جس کا مجھے حکم نہ ملا ہو، بہتر تو یہ ہی ہے کہ آپ مجھے حکم بجالا... موقع دیں کیونکہ اس کے سوا میرے پاس کوئی اور چارہ نہیں۔"

"دیکھو میں یوں نہیں جاؤں گی، پہلے بتاؤ کہ مجھے کہاں اور کس کے کہنے پر لے جارہے ہو؟" وہ تختی... بولی اب وہ اس کھیل سے بری طرح تنگ آچکی تھی۔ اب مصیبت کو آجانا تھا یا ہمیشہ کے لیے ٹل جانا تھا، دونو... صورتوں میں موت یقینی تھی، ایک میں روح کی موت دوسری میں جسم کی موت...... مگر اسے اس کھیل سے نجا... حاصل کرنا ہی تھی۔

"مجھے آپ مجبور نہ کریں کہ میں زبردستی کروں کیونکہ یہ مجھے اچھا نہیں لگے گا۔" وہ شخص سر جھکا... ہی بولا۔

"تمہیں یہ تو پتا ہوگا کہ کس نے تمہیں یہ حکم بھجوایا ہے؟" وہ وحشت زدہ نظروں سے اسے دیکھ... ہوئے بولی۔

"آپ بڑے لوگوں کا "گیم" ہیں بی بی اور میں ایک ادنیٰ سا آدمی ہوں، حکم کہاں سے آتے ہیں اور کون جاری کرتا ہے یہ تو وہی جانیں جو جاری کرتا ہے۔"

"میں، "گیم" ہوں؟" زرنگار نے زیر لب دُہرایا۔

"گیم ہوں یا ایم (aim) ہوں بی بی، بات تو ایک ہی ہے، میں بہت زیادہ باتیں تو نہیں جانتا لیکن ا... ضرور جانتا ہوں کہ جو ایک بار ان کے گیمز اور aims میں پھنس جاتا ہے اس کا اس سے نکلنا مشکل ہی ہو... ہے۔"

"ناممکن تو نہیں ہوتا ناں......" زرنگار جیسے ٹرانس کی کیفیت میں بولی۔ "تم مجھے اس زندگی سے نجات نہیں دلا سکتے؟ زندگی سے تو نجات دلا سکتے ہو ناں، زندگی سے نجات کا مطلب جانتے ہو ناں......؟" اس نے اس شخص کی طرف دیکھا۔

"بہت اچھی طرح......" وہ سر ہلا کر بولا۔ "لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ زندگی سے نجات اپنی مرضی سے نہیں ملا کرتی...... اگر آپ اس زندگی سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہوتیں تو کر چکی ہوتیں، موت ویسے تو بس ایک قدم کے فاصلے پر کھڑی رہتی ہے مگر قدم اس کی طرف بڑھے تو ناں......"

"دیکھو تم مجھے بہت سوں سے مختلف اور اچھے انسان لگ رہے ہو۔" زرنگار نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ "خدا کے واسطے مجھے اس چکر سے نجات دلا دو۔" اس نے منت بھرے انداز میں کہا۔ "میں جانتی ہوں تمہارا اختیار کسی اور کے ہاتھ میں ہے مگر اس وقت میں تمہارے اختیار میں، تمہارے رحم و کرم پر ہوں، تم مجھے نجات دلا دو، ان سے جو تمہیں حکم دیتے ہیں کہہ دینا کہ میں نے خود کو خود ہی ختم کرلیا۔" زرنگار کو خود بھی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ان اعصاب شکن حالات میں وہ کیا کہہ رہی تھی اور کیا کر رہی تھی۔

"مجھے کیوں گناہ گار کرنا چاہ رہی ہیں بی بی؟" وہ شخص گھبرا کر بولا۔ "اور میں آپ کی خاطر اگر یہ گناہ کر بھی ڈالوں تو بھی ان کے عتاب سے کیسے بچوں گا جن کا آپ "گیم" ہیں...... میرے تو گھر کا بچہ بچہ کو لہو میں پلوا...

جائے گا۔"

"نہیں ہوں میں اتنی اہم...... میرا یقین کرو، میں بالکل غیر اہم اور عام سی انسان ہوں، کوئی بھی مجھے مارنے پر تمہاری اتنی سی بھی سرزنش نہیں کرے گا جتنی کسی مکھی کو مار دینے پر بھی کبھی، کبھی کردی جاتی ہے۔" زرنگار بے بس تھی اور بدحواس بھی۔

"کیا بات کر رہی ہیں بی بی، آپ غیر اہم اور عام سی انسان ہوتیں تو یوں اس عمارت کی مہمان کیسے بنتیں اور اگر ایسا ہوتا تو مجھے جو حکم ملا ہے وہ کیسے ملتا، آپ کو جہاں پہنچانے کا حکم مجھے ملا وہاں عام انسان تو پر بھی نہیں مار سکتا۔"

"ہائے میں کیا کروں، کیسے تمہیں سمجھاؤں؟" زرنگار نے دونوں ہاتھوں میں سر پکڑتے ہوئے کہا۔ اسی دم اس شخص کے فون کی اسکرین روشن ہونے لگی، اس نے فون سائیلنٹ پر رکھا ہوا تھا جب ہی وہ بجا نہیں۔

"جی صاحب، وہی کر رہا ہوں، بس حکم صاحب!" وہ کال کرنے والے سے کہہ رہا تھا۔

"نہیں صاحب انہوں نے مجھے کوئی حکم نہیں دیا مگر میں الرٹ ہوں۔" اس نے دوسری طرف سے کوئی بات سن کر جواب دیا تھا۔

"فکر مت کریں صاحب، مجید خان خوب جانتا ہے کہ اسے کب، کیا اور کیسے کرنا ہے۔"

"حکم صاحب، حکم......" وہ سر ہلا کر بولا اور فون بند کر کے زرنگار کی طرف دیکھنے لگا۔

"چلیں بی بی، میری پہلی کھنچائی ہوچکی ہے، میں اپنے کام میں وقت کی پابندی کرنے والوں میں شمار کیا جاتا ہوں۔"

"بات سنو......" زرنگار نے ایک اور کوشش کرنے کی خاطر کہا۔ جواب میں اس نے اسے ہاتھ کے اشارے سے خاموش کرا دیا۔

"مزید بات مت سنائیں بی بی...... کوئی فائدہ نہیں، جانا تو ہے ہی۔"

"میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ، بس تم اتنا کرنا کہ مجھے چلتی گاڑی سے دھکا دے دینا۔"

"بچوں والی مووی ہے بی بی۔" وہ اس ساری گفتگو میں پہلی بار ہنسا۔ "جس گاڑی میں آپ لے جائی جائیں گی اس میں بیٹھ کر ایسی کوئی حرکت نہیں کی جاسکتی، لگتا ہے آپ فلمیں شوق سے دیکھتی ہیں۔" وہ ایک بار پھر ہنسا۔ "فلمیں دیکھنے کا شوق رکھنے والی لڑکیاں ہی اکثر اس حال کو پہنچتی ہیں۔" اب اس کے لہجے میں تمسخر اپنی جھلک دکھانے لگا تھا۔

زرنگار بے بسی اور حسرت سے اسے دیکھتی رہ گئی، وہ اسے بتاتا...... چاہتی تھی کہ وہ فلمیں دیکھنے کی نہیں کتابیں پڑھنے کی شوقین تھی اور جن دنوں وہ کتابیں پڑھا کرتی تھی اور جس قسم کی کتابیں پڑھتی تھی ان کے کرداروں کو اپنے بڑے بولوں کی ایسی فصل نہیں کاٹنی پڑتی تھی۔ جب ہی تو وہ مصیبتوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے چلتی گاڑیوں سے چھلانگیں لگا کر موت سے بھی بچ جاتے تھے اور اپنی بے ضرر مصیبتوں سے بھی...... لیکن وہ یہ بات چاہنے کے باوجود اس شخص کو نہیں بتا سکتی تھی جس نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنی جگہ سے اٹھانے کے بجائے نظروں کے اشارے سے اٹھ جانے کو کہا تھا اور وہ ایک روبوٹ کی طرح اٹھ کر اس کے پیچھے چل بھی دی تھی۔

☆☆☆

''میرا خیال ہے کہ تمہیں ابھی تک اطلاع مل چکی ہوگی کہ وہ گاڑی فیڈرل کیپٹل کی حدود میں داخل ہو
ہے اور اسے یہاں تک پہنچنے میں صرف ڈیڑھ گھنٹا لگا ہے، یہ ایک وی آئی پی موومنٹ تھی۔''

''جی نانا جان......!'' مہرزاد نے احترام بھرے لہجے میں جواب دیا۔''میں اس فیور پر ہر اس شخص کا م
ہوں جس نے مجھے یہ فیور دیا۔''

''تمہیں ہونا بھی چاہیے۔'' بلغم زدہ کھوکھلی آواز فون کے ائرپیس پر ابھری۔'' میرا خیال ہے کہ اب تم
زینت فاطمہ کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میرا خیال کیا بلکہ مجھے امید ہے۔''

''میں اس موضوع پر آپ سے پھر بات کروں گا نانا جان، بالمشافہ گفتگو کے دوران۔'' مہرزاد کے
میں تحمل تھا۔

''ہمیں بہلاتے ہو۔'' دوسری طرف سے جواب آیا۔''تمہاری ناپسندیدگی اس جملے میں ہی ظاہر ہو
ہے۔ لیکن یاد رکھنا اب بھی تمہیں اس تجویز سے اتفاق نہ ہوا تو حمایتیں، مخالفتوں میں بدلتے گھڑی بھی نہیں
گی۔ تمہاری ماں خاندانی بہو لانا چاہتی ہے تو اس کی خواہش کا احترام کرنا تمہارا فرض ہے، یہ لڑکی خاندانی
ہے اور دیکھی بھالی بھی۔''

''میری ماں خاندانی ماں، باپ کی جائز اولاد کو بہو بنانا چاہتی ہے نانا جان اور دونوں صورتوں میں بڑ
فرق ہے، خاندانی اور جائز...... آپ سمجھتے ہیں ناں......؟'' مہرزاد کے لہجے میں ضد ظاہر ہونے لگی۔

''سمجھتا ہوں برخوردار خوب سمجھتا ہوں، جب ہی تو تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اپنے را
میں رکھی بھس کی ہر ڈھیری میں آگ لگانے کی کوشش مت کرو، گاڑی فیڈرل کیپٹل تو پہنچ چکی ہے لیکن اپنی منز
تک ابھی نہیں پہنچی۔''

''گویا اب مجھے اپنوں کی طرف سے وارن کیا جا رہا ہے؟''

''اپنوں، غیروں کی تمیز میں مت پڑو خاناں، سب تعلق مفاد سے جڑے ہیں یہ جس، جس کا مفاد جب تک
تم سے جڑا ہے، وہ تمہارا اپنا ہے، جس دن مفاد ختم ہوا اپنا، غیر بن گیا، یونہی تو بڑے گھر سے تم سرخرو نہیں لو
تھے، وہ تم، تمہارا arrogance، تمہارا چارم نہیں ان سب سے جڑا مفاد تھا جس نے تمہیں گلے لگایا
وفاق کے اس نمائندے کو اس کے بیٹے سمیت گلے سے جھٹک دیا۔ تم سے جڑا مفاد اتنا اسٹرونگ تھا کہ وفا
کے نمائندے کے گھر میں رکھا تعویذ بھی اس بار اس کے کام نہیں آسکا۔ پارٹی اور وزارت میں تمہاری موجود
حکومت کو تین سال مزید گھسیٹ سکتی ہے اور تمہیں اپنا pillar (ستون) بڑے صاحب نے نہیں گردانا۔ تمہار
طرف اشارہ ''گوری انگلی'' نے کیا ہے کہ مہرہ مضبوط ہے، اسے اپنی چالیں چلنے کے لیے استعمال کرو، مد
پوری ہو جائے گی۔'' کھڑکھڑاتی آواز مہرزاد کے کانوں سے ٹکرائی۔

''ہیل ود۔'' وہ تلملا کر بولا۔''آپ جانتے ہیں کہ مجھے توقعات کا خون کرنے میں کمال حاصل ہے۔''

''ان کی توقعات کا خون...... خود تمہارے اپنے وجود کو خون میں نہلا دینے کے مترادف ہوگا۔ میرے
بیٹے...... حالات کا وہ رخ دیکھتے ہوئے نہ کوئی اپنا فیور کرنے آگے بڑھے گا نہ کوئی غیر...... قبیلے کو اپنا اور پارٹ
اپنا نیا شہید حاصل ہو جائے گا، بات ختم۔''

''پروا نہیں۔'' وہ غرایا۔''آپ یاد رکھیے گا نانا جان، میں مر جاؤں گا مگر خود کو استعمال نہیں ہو
دوں گا۔''

''جانے دو خاناں، ایسے دعوے مت کرو، ابھی تو تم ہماری جان ہو، آنکھوں کی ٹھنڈک، دل کا سرور ہو، اسی لیے سب تمہارے ناز اٹھا رہے ہیں، تم چاند کی تمنا کرتے ہو..... تو چاند کے ساتھ ستارے بھی حاضر کر دیے جاتے ہیں لیکن اگر تم یوں ہی ضد اور انا کے جال میں خود کو لپیٹتے چلے گئے تو نخرے اٹھانے والے ہاتھ ہی بندوقیں پکڑ لیں گے۔''

''شوق سے پکڑیں، گولی تو وہ ایک ہی ہوگی جس کو مجھے موت کی نیند سلانا ہے، ان سب کو اپنے شوق پورے کر لینے دیں، مجھے کسی سے نہ ہی ڈرائیں۔''

''میری نصیحت ہے خاناں اپنی ٹون بدلو، اپنے باپ کا طرزِ عمل یاد کرو، جہاں اکڑتا تھا خوب اکڑتا تھا مگر جہاں جھکنا پڑتا پیروں تک جھک جاتا تھا۔''

''میرا باپ......!'' مہرزاد کے لہجے میں طنز ابھرا۔ ''اس کی بوئی ہوئی فصل کاٹنے کو تو مجھے اپنا وہ وقت اور انرجی ایسے کاموں میں استعمال کرنا پڑ رہی ہے جو مجھے اپنے کاز اور نعرے کو ثابت کرنے میں لگانی تھی۔''

''چلو فی الحال تو موج کرو، تمہارے باپ کی اٹھائی تمہارے اشارے اور فرمائش پر منزل تک پہنچ چکی ہے، جاؤ میرے چکورا اپنے چاند کی آب و تاب جانچ کر تسلی کر لو روشنی اب بھی پوری دیتا ہے کہیں کسی نے ذرا سی روشنی چرا تو نہیں لی راستے میں، تم اپنے دل کی خوشی پوری کر لو۔ چند دن...... پھر تم سے اور زینت فاطمہ سے بات ہوگی......اسی طرح اسی جگہ جہاں تم نے خاندان اکٹھا کیا تھا۔'' بلغمی آواز نے کہا اور فون بند کر دیا۔

''گویا ایک محاذ کے بعد اگلا بھی تیار ہے......'' مہرزاد نے کان سے فون ہٹا کر اسے نظروں کے سامنے لا کے دیکھتے ہوئے سوچا۔ ''اور میں نے حلف لیا تھا کہ میں اپنے ذاتی مفاد کو اپنے فرائضِ منصبی پر کبھی حاوی

نہیں ہونے دوں گا......" اس کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑیں۔

"جس روز سے حلف لیا ہے فرائضِ منصبی صرف بھگت رہے ہیں اور ذاتی مفاد انجام دیے جا رہے ہیں۔" اسے خیال آیا۔ "میں ہجوم کا حصہ بن رہا ہوں، مجھے ہجوم کا حصہ بنایا جا رہا ہے۔" اس نے اپنی ریوالونگ چیئر کا رخ موڑا۔ "مجھ سے پہلے نہ جانے کتنے ہی ایسے ہوں گے جو ہجوم کا حصہ بنے ہوں گے، جنہیں ہجوم کا حصہ بنا دیا گیا ہوگا اور اب تاریخ انہیں ہجوم کی قطار میں کھڑا کر کے ان کے پول کھول رہی ہے، کالمز، کتابیں، بحث مباحثے، فلاں سن میں فلاں ابنِ فلاں نے استحصال کی روایت رقم کی اور میں......" وہ کرسی کی بیک چھوڑ کر میز پر کہنیاں ٹکاتے ہوئے آگے کو جھکا۔

"میں بھی اسی راستے کی طرف لے جایا جا رہا ہوں، اسی راستے کی طرف چلایا جا رہا ہوں۔" اس نے اپنی آنکھوں کو انگلیوں کی پوروں سے دبایا۔

"oh Allah please help me and guide me" اس نے حلف کی آخری لائن کو تھوڑے سے ردّوبدل کے ساتھ دل میں دُہرایا۔

"may Allah help me and guide me" اس کے دل نے دعا کی۔

☆☆☆

"ہماری صوبائی حکومت تک بھی کسی نہ کسی طرح میری رسائی ہو چکی ہے۔" فہد نے عافیہ کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے انہیں بتایا۔ "میری اطلاع کے مطابق، جس عمارت میں اس رات میرال کو لے جایا گیا، جس کے بارے میں اس چائنیز لڑکی کے شوہر نے حمزہ کو اطلاع دی تھی اس مومنٹ کا محرک مہرزاد خان نہیں تھا۔"

"کیا مطلب......؟" عافیہ اور حمزہ کے منہ سے بیک وقت ایک سے الفاظ نکلے...... فہد اسی شام کراچی سے لاہور پہنچا تھا اور اسی نے حمزہ کو بھی عافیہ کے گھر پہنچنے کو کہا تھا۔

"جی ہاں، ہمارے صوبے کی انٹیریر منسٹری کے مطابق میرال اس وقت مہرزاد خان کے قبضے میں نہیں بلکہ اسی سرکاری عمارت کے رہائشی کے قبضے میں ہے، ہمیں اپنی سرگرمیوں کا رخ موڑنے کی ضرورت ہے۔"

"عجیب سی بات ہے۔" حمزہ نے کہا۔ "یہ سب لوگ تو ایک سے نقشے ایک سے جال پھیلائے ہوئے ہیں، ہم کتنی بھی کوشش کر لیں، کتنی بھی چھلانگیں ماریں، ان شاطروں کی بساط تک رسائی کیسے ممکن ہے۔"

"وہ بھی یوں کہ ہمیں لڑکی کی پرائیویسی بھی چاہیے۔" عافیہ نے کہا۔ "پہلے ہی میں اس سوشل میڈیا کی خبروں، ریمارکس اور کمنٹس پر پریشان ہوں، بے چاری کیسی نظروں میں آ رہی ہے۔"

"اگر اس کو وہاں سے نکالنا ہے تو پرائیویسی کے خبط سے تو نکلنا ہی ہوگا ممی......" دانیال نے ماں کی طرف دیکھا...... "اس بے چاری پر تو اب تک نہ جانے کیا، کیا قیامتیں ڈھے چکی ہوں گی۔" اس نے فہد اور حمزہ پر نظر دوڑائی۔ حمزہ کو اس کے الفاظ برچھی کی طرح اپنے دل میں اترتے محسوس ہوئے وہ جس حقیقت کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا، وہ اتنی مضبوط اور تلخ تھی کہ اس کا ذکر کیے بغیر میرال کے معاملے پر بات ہونا ناممکن تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ اس معاملے کے اس تلخ اور اٹل پہلو سے نظریں بچائے رکھنا چاہتا تھا اس حقیقت کے تذکرے پر اس کی نظروں کے سامنے بی اماں اور ان کی سہیلی بلقیس کلثوم کا چہرہ گھومنے لگتا تھا اس لڑکی میرال کے ساتھ ہونے والے سانحے پر ان دونوں کی روحیں کیسے تڑپتی ہوں گی، وہ تصور کر سکتا تھا...... دانیال نے حمزہ کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثر کو غور سے دیکھا اور پھر شانے اچکاتے ہوئے بولا۔

"اس حقیقت کو تو ہمیں بہرحال فیس کرنا ہی ہوگا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اگر وقت نے ہمیں یہ موقع دیا ہے کہ یہ جو اوپر بیٹھے ہم پر حکومت کر رہے ہیں ان کے چہروں کو بے نقاب کر سکیں تو کیوں نہ کریں۔ شاید ہماری اس کوشش سے آئندہ اقتدار کے ایوان ان لوگوں کی رسائی سے دور ہو جائیں۔"

"یہ نہ ہوں گے ان جیسا کوئی اور ہوگا۔" فہد نے بے اختیار کہا۔

"ضروری تو نہیں۔" دانیال کے لہجے میں جوش بڑھا...... "ابھی گزشتہ چند سالوں کے اندر ہی کئی ایسے ملکوں کی تاریخیں ایسے ہی واقعات کی وجہ سے بدلی ہیں جو پہلے ایسے ہی حکمرانوں کے تسلط میں تھے جیسے حکمران ہمارے سر پر مسلط ہیں۔" اس نے اپنے سامنے بیٹھے تینوں افراد کی طرف باری باری دیکھا۔

"یہ تو ہمارا ذاتی المیہ ہے دانیال، ہم اس ذاتی المیے کو بنیاد بنا کر انقلاب لانے نکلیں گے کیا؟" عافیہ نے ایک مرتبہ پھر اسے روکنا چاہا۔

"ہر جگہ انقلاب کی وجہ کسی نہ کسی کا ذاتی المیہ ہی ہوتی ہے ممی، کسی ایک کا ذاتی المیہ بعض اوقات قوموں کی تقدیر بدل کر رکھ دیتا ہے، آپ اس پرائیویسی کے چکر سے نکل آئیں، اب ایسے بات نہیں بننے والی، حمزہ بھائی آپ اور فہد، میں اور ممی، ڈیڈی اور عاصم بھائی ہم سب اپنے، اپنے سورسز استعمال کر کے اپنے، اپنے حصے کی چھلانگیں ضرور لگائیں گے نتیجہ چاہے کچھ بھی ہو۔" اس نے پورے عزم کے ساتھ کہا۔

"یقیناً......" فہد اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے ساتھ آ کھڑا ہوا۔

حمزہ اور عافیہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، دانیال کی بات میں منطق تھی اور استدلال تھا...... دانیال کی باتوں سے منہ موڑنا اور اس کی تجویز سے انکار دونوں کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

"ہماری برادری میں، خاندان میں چار چفیرے (چاروں اطراف) کوئی لڑکی اتنی زیادہ جماعتیں نہیں پڑھی بینش، میری مان لے اب بس کر دے پڑھائی، میں تیرے لیے، تیری شادی کے لیے بڑی ہی فکر مند ہو گئی ہوں، جہاں پتا کرواتی ہوں یا تو کم پڑھا لکھا ہوتا ہے یا پھر شکل صورت سے کسی طرح بھی کشمیری نہیں لگتا۔" بینش نے ناگواری سے اپنی اماں کی بات سنی اور جھنجلا کر بولی۔

"اماں کیا اس موضوع کے علاوہ کوئی دوسری بات نہیں رہ گئی آپس میں کرنے کو؟"

"دیکھ لے، تعلیم اولاد کو خودسر اور گستاخ بنا دیتی ہے، میں کبھی، کبھی تجھے یوں بولتے دیکھتی ہوں تو میری فکر اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ تُو، تو میرے بھی منہ کو آنے لگتی ہے، اگلے گھر جا کر ان کے ساتھ کیا سلوک کرے گی......" اماں نے معصومیت سے کہا۔ بینش ایک دم شرمندہ ہو گئی۔ اسے ماں کی عظمت اور حیثیت سے متعلق دانیال کی گفتگو یاد آ گئی۔ اس نے اماں کے دونوں ہاتھ نرمی سے اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بالکل ہی مختلف لہجے میں کہا۔

"اگر آپ کی دعائیں میرے ساتھ ہیں اماں تو میرے لیے سب اچھا ہی ہوگا، آپ کے تصور سے بھی زیادہ اچھا۔"

بینش کے اس انداز پر اماں لمحے بھر کے لیے حق دق بیٹھی رہیں۔

"میری دعاؤں کی کیا بات کرتی ہے، میں تو دعاؤں میں نہ جانے کس کس ملک کا شہزادہ تیرے لیے خدا سے مانگتی ہوں۔"

”شہزادے کا برادری اور خاندان سے تعلق ہونا ضروری ہے کیا......؟“ ہمیشہ نے ڈرتے، ڈرتے سوال کیا۔ اماں نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

”آخر سب ہی ملکوں پر کشمیری بادشاہوں کی تو حکومت نہیں ہوگی ناں اماں، تو شہزادہ تو کسی بھی برادری اور خاندان سے ہوسکتا ہے۔“ ہمیشہ نے کہا۔

”لے پھر میں دعا ہی بدل لیتی ہوں، کشمیری نہ ہوا اور شہزادہ بھی نہ ہوا تو کیا فائدہ......؟“ اماں نے گھبرا کر کہا۔

”اماں سچ تو یہ ہے کہ مجھے شہزادہ ہی چاہیے، چاہے وہ کسی بھی ملک کے بادشاہ کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔“ ہمیشہ نے اپنے دل کی بات کو مبہم سے الفاظ میں ڈھالا۔

”حق تو تیرا یہی ہے کہ کوئی انوکھا، دنیا بھر کے انسانوں سے مختلف شہزادہ تجھے بیاہنے آئے مگر ہمارے ایسے مقدر کہاں۔“ اماں اس کی خواہش پر نثار بھی ہوئیں اور اپنی قسمت سے شکوہ کناں بھی۔

”تھوڑے دن انتظار کرلیں اماں پھر میں آپ کو ایک کہانی سناؤں گی، انوکھے اور دنیا کے انسانوں سے مختلف شہزادے کی کہانی۔“ ہمیشہ نے کہا۔ ”مگر کہانی سننے کی شرط یہ ہے کہ آپ کو نہ اس کے ملک پر اعتراض ہوگا نہ ہی اس بات پر کہ وہ کس بادشاہ کی اولاد ہے؟“

”تو کہانی سنا بس...... مجھے کہانیاں سننے کا بہت شوق ہے، میں کوئی اعتراض نہیں کروں گی۔“ اماں نے بھولپن سے کہا۔

”چند دن انتظار کرلیں، ابھی شہزادہ اپنی کہانی خود سنا رہا ہے، مکمل ہوجانے دیں اس کی کہانی پھر وہی کہانی میں آپ کو سناؤں گی۔“ ہمیشہ نے مسکرا کر کہا۔

☆☆☆

”میں نے اس شخص سے بہت مرتبہ پوچھا تھا، وہ مجھے کس کے حکم پر یہاں لا رہا ہے، محکوم انسان تھا ناں اس کی زبان نے ساتھ نہیں دیا، اسی لیے وہ میرے سامنے آپ کا نام نہ لے سکا۔ بتا دیتا تو یقیناً میں اس وقت آپ کے سامنے موجود نہ ہوتی......“

مہرزاد نے اسے کتنے دنوں بعد دیکھا تھا، وہ دن تھے، مہینے تھے یا سال، اسے یہ درمیانی وقت اتنا ہی بھاری اور طویل محسوس ہو رہا تھا جیسے سالوں گزر چکے ہوں...... وہ اسے خاموشی سے دیکھتے رہنا چاہتا تھا، حالانکہ اس کا پُرشکن لباس، بے ترتیب بال اور مضطرب چہرہ اسے الجھا اور چونکا گیا تھا۔

”میرے سامنے موجود نہ ہوتیں تو کیا کرتیں؟“ وہ اس کے لہجے کی تلخی کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

”زہر کھا لیتی، اُس کمرے کی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر خود کو ختم کرلیتی، جس میں آپ کے کہنے پر مجھے محبوس رکھا گیا تھا۔“ وہ پھنکاری۔

”اتنی نفرت ہوگئی تمہیں مجھ سے؟“

”اس سے بھی زیادہ، اتنی زیادہ کہ میں آپ کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی...... سردارزادہ صاحب......“ اس نے اپنے لہجے کا زہر مہرزاد کے دل میں اتارتے ہوئے کہا تھا۔

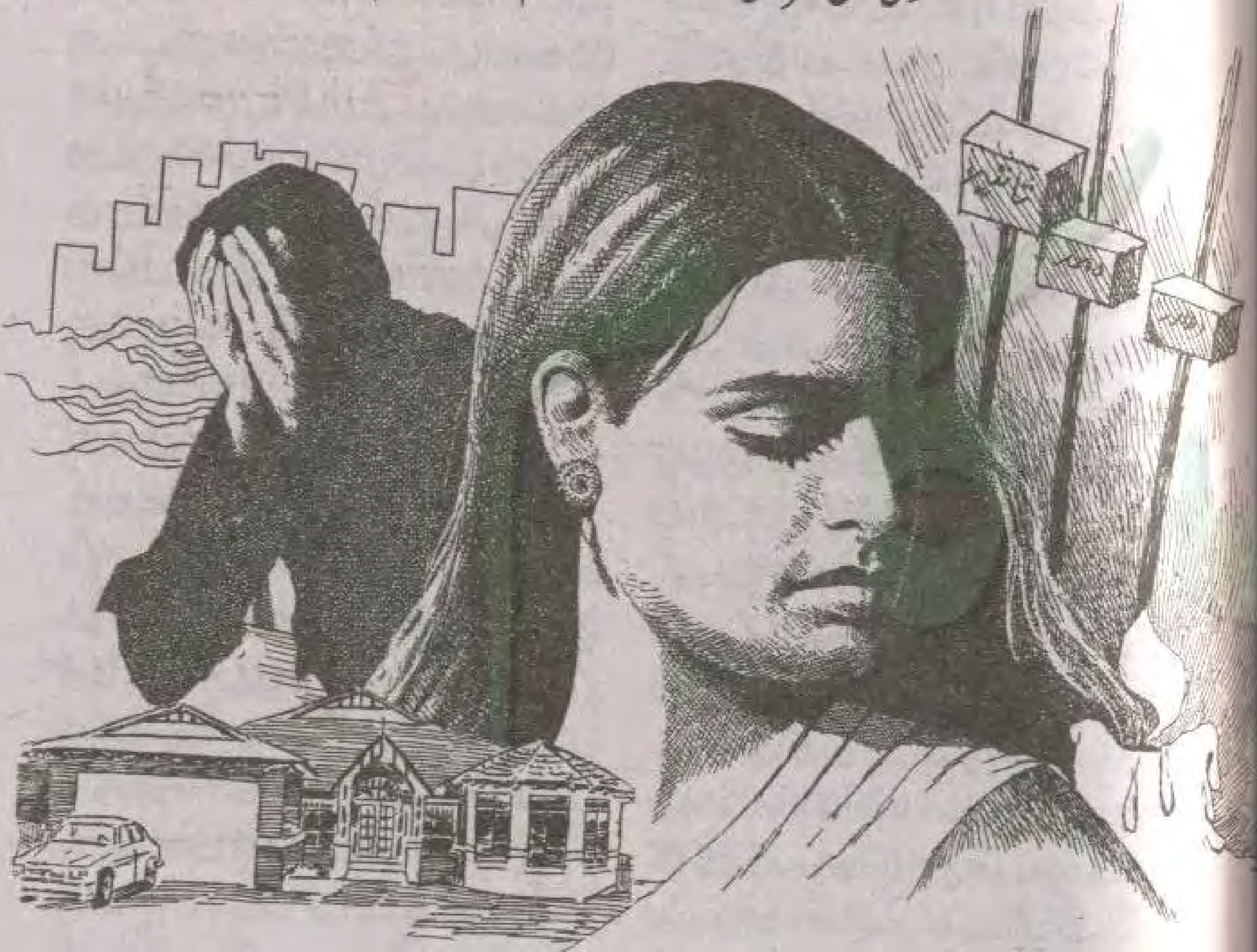
جاری ہے

اک معصوم خواہش

ایک معصوم سی خواہش کا حصول کیا اتنا مشکل تھا کہ وہ......

ایک دلگداز تحریر اُم طیفور کے قلم سے

وہ بڑی دیر سے کچی سڑک پر اندھا دھند بھاگ رہی تھی۔ پیروں میں چپل نہیں تھی اور سارے جسم پر یک رنگی لباس تھا۔ جس نے اسے سر سے لے کر پاؤں تک چھپا رکھا تھا۔ اسے وقت کا کچھ اندازہ نہ تھا کہ وہ کتنی دیر سے اس ویرانے میں خوار ہو رہی ہے۔ ایک جگہ سانس لینے کو وہ پل کے پل ٹھہری بھی تو پیچھے گھپ اندھیرا دیکھ کر مزید گھبرا گئی۔ دور دور تک کوئی ذی نفس نظر نہیں آتا تھا...... نا معلوم کون سا مقام



تھا...... سناٹا تو قبرستان کا سا تھا۔

''تو کیا...... میں بھٹک کر کسی قبرستان میں تو نہیں آ گئی؟'' یہ سوچ ہی اسے ٹھنڈے پسینے میں نہلا گئی۔ وہ ایک دفعہ پھر بھاگنے لگی، مسلسل تاریکی میں رہنے سے اس کی آنکھیں اب سامنے کے راستے سے مانوس ہونے لگی تھیں۔ کچی سڑک کے اطراف میں پانچ، پانچ فٹ کے فاصلے سے لیمپ پوسٹ گڑے تھے، جن کے پولز کے ساتھ بالکل درمیان میں چھوٹے چھوٹے چوکور ڈبے لگے تھے ان کے اوپر مختلف نام اور نمبرز لکھے تھے۔ ایک دم اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ وہ غلط نہیں بلکہ بالکل صحیح جگہ پہنچی تھی۔ وہ جانتی تھی انہی میں سے ایک ڈبے پر اس کا نام بھی درج ہے اور وہ اسے ڈھونڈنا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ایک کے بعد ایک ڈبا غور سے دیکھتی آگے بڑھنے لگی۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد وہ اپنے نام کا ڈبا ڈھونڈنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔ یہ اس کی بہت بڑی کامیابی تھی، اس نے اندازے سے زیادہ جلدی اپنی منزل ڈھونڈ نکالی۔ اسے لگا اس کے بے جان ہوتے پیروں میں پھر سے طاقت آ گئی ہے۔ اس نے اپنے نام کے ڈبے کو آگے بڑھ کر کھولا اور اس میں سے ایک پرچہ نکالا...... پھر بے چینی کے احساس سے مغلوب ہو کر وہ پرچہ کھولنا شروع کیا جو بے شمار تہوں پہ مشتمل تھا۔ جوں جوں وہ کھولتی جا رہی تھی، اس کے خوف اور گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ فضا میں عجیب سی سوگواریت تھی۔ جو اس کے حواسوں کو مختل کیے دے رہی تھی۔ اس نے وہ پرچہ کھول لیا تھا اور اب اس پر جلدی جلدی نظریں دوڑا رہی تھی۔ وہ اس کی توقع سے کہیں زیادہ لمبا چوڑا تھا، جس پر عجیب سی زبان میں اتنا کچھ لکھا تھا کہ وہ اسے کبھی سمجھ نہیں آ سکتا تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پولز کے پیچھے نظر دوڑائی، وہاں دور دور تک مٹی سے بنے ان گنت مکانات دکھ رہے تھے۔

''اوہ خدایا! یہی تو میری منزل ہے، شکر ہے میں پہنچ گئی۔'' بے اختیار اس کے منہ سے شکر کا کلمہ ادا ہوا تھا۔ اس نے ایک نظر ہاتھ میں پکڑے پرچے کو دیکھا۔ اب اسے اس پرچے کا مقصد سمجھ آ گیا تھا۔ یہ دراصل پرمٹ تھا جسے لے کر اسے اپنے حصے کے مکان میں داخل ہونا تھا۔ وہ خوش تھی...... بہت خوش، ایک عرصہ لگا تھا اسے یہ چھت حاصل کرنے میں اور آج اس کے نام کا مکان اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ بے اختیار اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ پرچہ ہاتھ میں لیے تیز تیز قدم اٹھاتی اس طرف بڑھ گئی جہاں اس کی دیرینہ خواہش، اس کا اپنا گھر موجود تھا۔ جہاں اسے پاؤں پسار کر اپنی روح کی تھکن اتارنی تھی۔ اس کے قدموں کی تیزی میں اور اضافہ ہوا تھا کہ یک دم اس کے لباس کو کسی نے زوردار جھٹکا دیا۔ اسے شدید کوفت نے آ گھیرا۔ اس نے زور سے آنکھیں میچ لیں۔ اب اس کے کانوں میں کسی بچے کے پکارنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اس آواز سے مانوس تھی پر آنکھیں کھولنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر بچے نے اور شدت سے قریب ہو کر اسے پکارا۔

''ماما...... ماما جان اٹھیں، دودو بنا دیں۔ اٹھیں ناں۔'' اور اس نے انتہائی بیزاری کے عالم میں آنکھیں کھول دیں۔ پاس ہی اس کا ڈھائی سالہ بیٹا ریان اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کا چہرہ پکڑے بیٹھا تھا۔ اسے جتنی کوفت اپنی نیند کے ٹوٹنے سے ہوئی تھی۔ بیٹے کا معصوم اور خوب صورت چہرہ دیکھ کر دور ہو گئی اور پھر اس کے اٹھانے کا من موہنا سا انداز......

''اوہ...... تو میں خواب دیکھ رہی تھی۔'' اس نے زوردار انگڑائی لیتے ہوئے آزردگی سے سوچا۔ سرہانے دھرا دوپٹا اوڑھا اور بیٹے کو گود میں لیے کچن میں چلی آئی۔ ریان کو کاؤنٹر پر بٹھا کے دودھ بنایا اور اسے دوبارہ ساتھ لیے کمرے میں چلی آئی۔ ابھی صبح کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ گھنٹا پہلے اس کا بڑا بیٹا

آیان اسکول اور اس کا شوہر آفس کے لیے نکلے تھے۔ کام والی ماسی بھی گیارہ سے پہلے نہیں آتی تھی۔ اس لیے ابھی وہ دو ڈھائی گھنٹے کی مزید نیند لے سکتی تھی۔ ناشتے کے برتن وہ شوہر اور بچے کے گھر سے جانے کے فوراً بعد ہی سمیٹ لیتی تھی اور پھر بے فکر ہو کر سوتی تھی۔ اب بھی ریان صرف بھوک کی وجہ سے بے چین ہو کر جاگا تھا اور اب دوبارہ فیڈ رمنہ میں لیے غنودگی میں جا چکا تھا۔ وہ پھر سے ریان کے ساتھ لیٹی سونے کی کوشش کرنے لگی لیکن دھیان بھٹک کر ایک دم اپنے خواب کی طرف چلا گیا۔

''یہ بھلا کیا خواب دیکھا ہے میں نے؟ لگتا تو اچھا ہی ہے، میرا خیال ہے اس خواب کے ذریعے اللہ نے مجھے میرے گھر کی خوش خبری دی ہے کہ عنقریب ہمارے سر پر بھی اپنی چھت ہوگی۔'' اس نے فوراً اپنے خواب کی خوش فہم سی تعبیر گھڑ لی تھی اور وہ سوچتی بھی کیا؟ آج کل دن رات اسے اپنی چھت کی ہی تو سوچیں تھیں کہ کب اور کیسے وہ بھی کرائے دار سے مالک مکان بن جائے۔ اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو آج کل کی چیختی، چلاتی مہنگائی میں.... روزمرہ کے ڈھیروں اخراجات پورے کرنے کے علاوہ کرائے کی مد میں اپنے محدود بجٹ سے وافر حصہ نکالتے ہیں اور دن رات اس سوچ میں غلطاں رہتے ہیں کہ دن نہ چڑھے اور وہ اپنے مکان کے مالک بن جائیں سو وہ بھی یہ ہی کرتی تھی۔ طرح طرح کے طریقے سوچتی رہتی تھی کہ یوں کچھ رقم جوڑ لوں تو کہیں کمیٹی ڈال لوں...... پر کرایہ ادا کرنے کے بعد دوسرے اخراجات پورے کرنے ہوتے تھے، گھر کا راشن، بجلی، گیس، پانی کا بل۔ بڑے بیٹے کی فیس، ٹرانسپورٹ کا خرچہ، دوا دارو کے مسائل، خاندان کی غمی، خوشی۔ بچوں کے لیے کپڑے وغیرہ تو لازمی لینے پڑ جاتے تھے کہ دونوں چھوٹے تھے، جلدی خراب بھی کرتے تھے اور پھٹ بھی جاتے تھے۔ ظاہر ہے چھوٹی دکانوں سے سستے داموں لیتی تھی کیونکہ اونچی جگہوں پر جانے کی وہ متحمل نہیں تھی۔ ابھی تو وہ اپنے کپڑے جوڑے احتیاط سے ہی بناتی تھی...... سب کچھ ٹھیک تھا، روحیل کی تنخواہ معقول تھی۔ ایک اچھی حالت کی بائیک بھی تھی۔ تمام اخراجات احسن طریقے سے پورے ہو جاتے تھے۔ اضافی خرچہ صرف ایک صفائی والی ماسی کی صورت میں وہ کرتی تھی، باقی کپڑے، برتن وہ خود ہی دھوتی تھی۔ اللہ کا شکر تھا کمی کوئی نہیں تھی نہ ہی کسی چیز کے لیے ترسنا پڑتا تھا۔ بس روحیل کی اس معقول تنخواہ میں کچھ نہیں بن سکتا تھا تو وہ تھا مکان، سب کچھ کر کرا کے اس کے پاس مہینے کے آخر میں اتنے پیسے بچتے ہی نہیں تھے کہ وہ انہیں جمع کرتی یا کہیں کوئی بڑی کمیٹی ڈال لیتی اور مہینہ تھا کہ یوں چڑھتا اور یوں ختم...... کرائے کی مد میں دیے جانے والے سات، آٹھ ہزار روپے ہر مہینے کی دوسری تاریخ کو سانپ بن کر اس کی الماری کے سب سے اوپر والے خانے میں بیٹھ جاتے۔ جس کا زہر اس کی بہت سی حسرتوں اور خواہشوں کو نیلا کر دیتا تھا۔ کس کس کام میں استعمال نہ ہو سکتے تھے بھلا یہ نوٹ......؟ اس کے بچوں کی سو ضرورتیں، اس کی سو ضرورتیں، اس کے گھر کی سو ضرورتیں...... پر ٹھیک پانچ تاریخ کو مکان مالک کی بیگم وہ نوٹ وصولنے آ جاتی تھیں...... اور وہ ہرے، نیلے نوٹ ان کو پکڑاتے کس طرح اس کی رگیں کھنچتی تھیں۔ کیسے اس کا دل خون ہوتا تھا، یہ وہ ہی جانتی تھی یا اس کا رب...... اور بے اختیار اس کے دل سے یہ دعا نکلتی۔

''یا اللہ کوئی دشمن بھی کرائے کے گھروں میں نہ رُلے، یا اللہ کسی کی بہو بیٹی یہ دکھ نہ دیکھے۔'' پر ہر دعا فوراً قبول ہونے کے لیے تھوڑی ہوتی ہے۔ نتیجتاً وہ بس ہر دوسرے دن خواب میں اپنی چھت کا ارمان پورا ہوتے دیکھتی۔ شروع شروع وہ اپنے خواب روحیل کو بھی سناتی تھی پھر جب ان کی دلچسپی کم ہوتی

محسوس کی تو خود بخود سنانے چھوڑ دیے۔ اس لیے اب وہ خواب دیکھتی، خود ہی تعبیر گھڑتی اور خود ہی خوب صورت مستقبل کی دعائیں مانگتی۔

ابھی وہ نہ جانے اور کتنی دیر اپنے دماغ کی سوچیں کھنگالنے...... میں لگی رہتی کہ گیٹ پہ ہونے والی بیل نے اسے چونکا دیا۔

''ہیں...... اتنا ٹائم ہوگیا اور مجھے پتا نہیں چلا، جمعدار کوڑا لینے آیا ہوگا۔ اور اس کے پیچھے، پیچھے ماسی بھی بس آئی ہی سمجھو۔'' وہ خود کلامی کرتی ریان کو چادر اوڑھاتی بیڈ سے اتر آئی۔ ٹائم دیکھا تو سوا دس ہوگئے تھے۔ فٹافٹ چپل پہن کے گیٹ تک گئی۔ جمعدار کو کوڑا دیا اور گیٹ نیم وا چھوڑ کر کچن میں چلی آئی کیونکہ صفائی والی ماسی کو گلی کے نکڑ پر دیکھ لیا تھا اور اب اسے اِدھر ہی آنا تھا لہٰذا گیٹ کھلا رہنے دیا۔

''السلام علیکم باجی! کیا حال ہیں؟'' وہ فریج میں منہ دیے سوچ رہی تھی کہ آج چکن پکالے یا سبزی کہ اسے پیچھے ماسی کی آواز سنائی دی۔

''وعلیکم السلام روبینہ، کیسی ہو؟ گھر میں سب خیریت ہے؟''

''جی باجی، اللہ کا شکر ہے، پہلے صحن دھولوں کہ اندر کی صفائی شروع کروں؟''

''نہیں، تم پہلے باہر نبٹا لو پھر زیادہ گرمی ہوجائے گی تو صحن میں نکلا بھی نہیں جائے گا۔ تب تک میں ہانڈی چڑھالوں۔'' روبینہ مڑ کر صحن میں چلی گئی تو وہ مسکرادی کیونکہ بلاناغہ یہ چار فقرے ان دونوں کے درمیان معمول تھے۔ روبینہ روز سلام کے بعد یہی پوچھتی کہ آج پہلے صحن دھوؤں یا اندر سے صفائی کروں اور اس کا بھی روز وہی جواب ہوتا۔ جو بھی تھا، اچھی اور ایماندار ماسی تھی۔ کہہ سن کر کافی اچھی صفائی کرلیتی تھی اور آج کل کے دور میں یہ بھی غنیمت تھا۔ اس نے جلدی سے فریج سے مطلوبہ سامان نکالا اور سر جھٹک کر کھانا بنانے کی تیاری میں مشغول ہوگئی۔

☆☆☆

''ثانیہ، اے ثانیہ کدھر ہو؟ نکل بھی آؤ کمرے سے باہر اب؟'' وہ عصر کی نماز پڑھ کر جاء نماز لپیٹ رہی تھی جب روحیل اسے آوازیں دیتے اندر چلے آئے۔

''ہش...... آہستہ بولیں... بلکہ باہر چلیں۔'' اس نے دھیمی سی سرگوشی کی...... دونوں بچے بیڈ پر سورہے تھے اور مغرب کی اذانوں سے ذرا پہلے ہی وہ انہیں اٹھاتی تھی اور ان کے سونے کے دوران وہ بیسیوں کام سمیٹ لیتی تھی۔ سو اب بھی روحیل کو لیے ٹی وی لاؤنج میں چلی آئی۔ جہاں صوفے پر ایک طرف دھلے کپڑوں کا ڈھیر تہ کرنے کے لیے پڑا تھا۔

''ہاں اب بولیں...... کیا بات ہے؟ پتا بھی ہے کہ ذرا سا کھٹکا ہو تو دونوں اٹھنے میں دیر نہیں لگاتے پھر بھی اتنی اونچی آوازیں دیتے اندر آرہے تھے۔'' وہ خفا خفا سی کپڑے تہ کرتے ہوئے بولی بچوں کی نیند کے معاملے میں وہ کوئی سمجھوتا نہیں کرتی تھی۔

''اصل میں یار ابھی علی کا فون آیا تھا، وہ بتا رہا تھا کہ پرسوں کیس کی لاسٹ ہیئرنگ ہے۔ امید ہے کہ اس کے بعد کوئی تاریخ نہیں پڑے گی۔'' روحیل نے صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے تفصیل بتائی۔

''تو اس کا مطلب جائداد کی نیلامی...... یعنی کہ کیس ختم، سیاپا ختم اور پھر انشاء اللہ میرا اپنا مکان تیار...... اُف میرے خدایا...... ! یہ تو بڑی خوشی کی خبر ہے۔''

''یہ تو بڑی خوشی کی خبر ہے......'' روحیل نے اس کی نقل اتارتے ہوئے اس کی جانب صوفہ کشن اچھال دیا۔

''میڈم! تم کو کیا لگتا ہے نیلامی میں پچاس، پچاس لاکھ ملنا ہے کیا؟ مشکل سے دس، بارہ تک بات پہنچے گی۔ جس میں بڑی بھی چھلانگ مارو تو ایک پلاٹ آسکتا ہے اور وہ علاقے میں لیکن

چھت نہیں بن سکتی۔'' روحیل نے دو منٹ میں اس کا خواب توڑ کر اس کا سر حقیقت کی تلخ دیوار سے ٹکرادیا اور اب اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے بات کرنی مشکل ہورہی تھی۔

''مگر روحیل، کوشش تو کی جاسکتی ہے ناں، بندہ قرض لے کر......'' مگر روحیل نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی۔

''پلیز ثانیہ...... ! قرض ورض کی بات مت کرو، حالات دیکھ رہی ہو ملک کے، کاروبار، نوکریاں سب کا برا حال ہے، قرض اترے گا کیسے......؟''

''تو ہم لیں گے ہی ایسے بندے سے جو ہم سے جلدی تقاضا نہ کرے۔'' وہ جلدی سے بولی۔ مبادا روحیل لیکچر پہ آجائیں۔

''اور ایسا بندہ سوائے تمہارے ماں، باپ کے کون ہوسکتا ہے، ہے ناں......؟ تو منہ دھو رکھو ثانیہ، میں ایسا نہیں کروں گا۔ نہیں بنتی اپنی چھت تو نہ بنے...... دنیا رہتی نہیں کرایوں پر، ہم کوئی نرالے نہیں ہیں...... اور ویسے بھی میں کاروبار کرنے کی سوچ رہا ہوں۔''

لو جی قصہ ہی ختم! ہر بار ایسا ہوتا تھا جب بھی مکان کا کوئی سبب بننے لگتا...... اسی طرح نامکمل رہ جاتا اور وہ جو ذرا سی دیر میں پورے گھر کی سیٹنگ تک کر ڈالتی تھی، صبر کا کسیلا گھونٹ بھر کر کلیجا ٹھنڈا کرتی رہ جاتی۔

☆☆☆

روحیل، ثانیہ کے تایازاد تھے۔ تایا کا روحیل کی شادی سے پہلے اور تائی کا اس کی شادی کے دس ماہ بعد کینسر کے باعث انتقال ہوگیا تھا۔ اکلوتے تھے، نہ کوئی بہن نہ بھائی...... تایا کی وفات کے بعد ابھی جبکہ ان کی صرف بات ہی طے تھی...... دوسرے نمبر والے چچا جو روحیل کے والد سے چھوٹے اور ثانیہ کے ابو سے بڑے تھے، انہوں نے روحیل کو ورثے میں ملی ساری جائداد پہ قبضہ کرلیا۔ گھر، گاڑی، دکان ہر چیز پہ خود کو بیٹوں سمیت مالک بنا کر بٹھا دیا۔

روحیل جاب کے سلسلے میں زیادہ تر شہر سے باہر ہوتا تھا اور پھر اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ جن کے سر پر سب کچھ چھوڑ رکھا تھا انہوں نے کیسے اس کے بھروسے کا خون کر کے جڑیں ہی کاٹ ڈالیں۔ بڑا وقت لگا تائی اور روحیل کو سنبھلنے میں اور تب سے ہی روحیل کرایوں پہ دھکے کھاتا پھرتا تھا۔ ان دونوں کی شادی بھی اسی رولے غولے میں ہوئی۔ تمام دوھیال نے ثانیہ کے والدین سے بھی قطع تعلق کرلیا...... سب پھوپیاں اور دونوں چھوٹے چاچو ناحق کے ساتھ لگ کر حق کو چھوڑ بیٹھے۔ ثانیہ کے والد شروع سے ہی دوسرے شہر میں رہتے تھے اور اپنی ذاتی حیثیت میں ٹھیک ٹھاک تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے یتیم بھتیجے کو پیٹھ نہ دکھائی اور اپنی نازوں پلی بیٹی کا بیاہ روحیل سے کردیا۔ جس کا انہیں کبھی ملال نہ ہوا کیونکہ ثانیہ کے والدین نے اپنی دونوں بیٹیوں کی تربیت اس نہج پر کی تھی کہ جو بھی پاؤ گی نصیبوں کا پاؤ گی...... ہنستے ہوئے لوگی تو دل شاد رہے گا ورنہ چیخ وپکار سے تقدیر تو نہیں بدلے گی پر ساری عمر بے سکون ضرور رہوگی۔ سو تب سے ثانیہ تھی، روحیل تھے، دو بچے تھے، خوشیاں تھیں، دکھ بھی تھے اور کرایے کے بدلتے مکانات تھے۔ وہ روحیل کے ساتھ بہت خوش تھی۔ انہیں اپنی ماں باپ کی کسی نیکی کا ثمر مانتی تھی مگر جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کے اندر اپنی چھت کی آرزو خودرو بیل کے مانند نس نس کو جکڑ چکی تھی۔ چار سال پہلے بڑے بیٹے آیان کی پیدائش کے بعد روحیل نے کیس دائر کیا تھا مگر قابض چچا نے ایسا پکا بندوبست کیا کہ خود کو جھوٹے کاغذات کے ذریعے اس ساری پراپرٹی کا شراکت دار ثابت کیا، جسے عدالت میں کبھی چیلنج نہ کیا جاسکا، نتیجتاً اس ساری پراپرٹی کے دو حصے دار بن گئے۔ اس کے باوجود ہر پیشی پر چچا کی غیر حاضری نے مقدمے کو اس حد تک طول دیا کہ عدالت کو نیلامی کے آرڈر دینے پڑے

اور نیلامی تو اچھی بھلی جائداد کی دھجیاں اُڑا دیتی ہے یہاں تو پھر کتنا کچھ چچا اور ان کے بیٹوں کے ہاتھوں پار لگ چکا تھا۔ جس کے بعد جو رقم ہاتھ آتی اس سے کاروبار کیا جاسکتا تھا۔ گاڑی خریدی جاسکتی تھی۔ دور افتادہ علاقے میں پلاٹ لیا جاسکتا تھا، پر نہیں تانی جاسکتی تھی تو صرف ''اپنی چھت''۔

☆☆☆

آج صبح سے اس کا موڈ خراب تھا...... منہ پُھلائے سارے کام نبٹاتی رہی...... ناشتا کرتے ایک دو دفعہ جو روحیل نے بلانے کی کوشش کی بھی تو نظر انداز کرگئی۔ روحیل کو خود کو بھی جلدی تھی سو چپ کرکے آیان کو ساتھ لیا اور نکل گئے، یہ سوچ کر کہ دن بھر کے کام کاج نبٹاتے خود ہی نارمل ہوجائے گی...... مگر یہ ان کی خام خیالی ٹھہری، واپسی پر بھی ہنوز منہ سوجا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ کھانا بھی خاموشی سے کھایا گیا اور کھانے کے بعد فٹافٹ کچن سمیٹ کے دونوں بچوں کو سلانے ان کے بیڈ روم میں لے گئی۔ روحیل بھی جھنجلا کر لاؤنج میں لیپ ٹاپ لے کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر گزری تو ثانیہ بھی ہاتھ میں کوئی ڈائجسٹ لیے قریب ہی دوسرے صوفے پر آکر لیٹ گئی۔

''سو گئے بچے؟'' محض بات کرنے کی غرض سے پوچھا گیا۔

''ہوں...... ہاں سو گئے۔'' اس نے ذرا سا رخ موڑ کر جواب دیا۔ روحیل اٹھ کر اس کے قریب چلے آئے۔

''ثانیہ، یار کیا مسئلہ ہے؟ اب بس بھی کرو؟ تم سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی مسئلے کو طول کیوں دیے جاتی ہو؟ دیکھو میری بات سنو۔'' روحیل نے ہاتھ پکڑ کر اسے لیٹے سے بٹھا دیا۔

''دیکھو، میں جو کاروبار کرنے کی سوچ رہا ہوں، انشاء اللہ اس میں بہت فائدہ ہوگا۔ ہوسکتا ہے اگلے چند سالوں تک ہمیں اتنا نفع پہنچے کہ ہم بچت کرکے ایک چھت بنا ہی لیں۔ تم کیوں بیکار کی سوچوں میں اپنا دماغ الجھائے رکھتی ہو۔ اللہ نے چاہا تو ایک دن ہمارے سر پر بھی اپنی چھت ہوگی، انشاء اللہ...... چلو اب منہ سیدھا کرو......'' انہوں نے اسے ہنسانے کی غرض سے ذرا سا گدگدایا مگر بجائے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ روحیل کو یک دم تاسف نے گھیر لیا۔ دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھاما اور پھر کندھے سے لگالیا۔

''اچھا چلو جیسا تم کہو، کوشش کرتا ہوں کہیں پلاٹ کے لیے۔ کسی کولیگ سے قرض کے لیے بھی کہتا ہوں۔ تمہاری خوشی کے لیے اپنی گردن پھنسالوں گا میں...... بس روؤ مت تم۔'' انہیں لگا شاید اسی بات پر ثانیہ اس قدر افسردہ ہے۔

''روحیل، وہ روبینہ......'' آنسوؤں نے پھر یلغار کردی۔

''کون روبینہ......؟'' انہیں بات سمجھنے میں دقت ہوئی۔ ''اوہ...... اچھا! تمہاری ماسی...... ہاں کیا ہوا اسے؟'' روحیل ایک دم گھبرا گئے بے چارے۔

''مرگئی کمبخت۔'' اسے ان کی فکرمندی زہر لگی۔

ہیں...... کم بخت بھی اور بے چاری مر بھی گئی۔''

''اُف اللہ روحیل پلیز! مری نہیں وہ کام چھوڑ رہی ہے میرا اگلے ماہ کی پہلی سے۔'' اس کی آواز میں دکھ تھا۔

''کیوں بھئی......؟ اسے بھلا کیا تکلیف ہے، اچھا بھلا لگا لگایا گھر کیوں چھوڑ رہی ہے؟''

''منحوس کہتی ہے پچھلی سڑک پر ایک نیا گھر بنا ہے، گھر والے یکم تک شفٹ ہوجائیں گے۔ ڈبل اسٹوری مکان ہے، بدتمیز نے پتا نہیں کب سے تُوہ رکھی ہوئی تھی۔ اس گھر کی مالکن سے مل کر ابھی سے اپنی نوکری پکی کروالی۔ کہتی ہے سب کام پکڑلوں گی، جھاڑو، برتن، کپڑے تو اتنا بن ہی جایا کرے گا جتنا

تین، تین گھروں میں کام کرکے کماتی ہوں۔ میں نے پوچھا کہ روبینہ میرا لگا لگایا کام کیوں چھوڑتی ہو؟ تو پتا ہے روحیل اس نے کیا کہا؟''

اور روحیل کو جو کرب اس وقت اس کی آنکھوں میں دکھ رہا تھا وہ پہلے کبھی نہیں دکھا۔

''مجھے کہتی ہے کہ باجی آپ کا کیا ہے؟ آپ کا حال بھی تو ہمارے والا ہے۔ جس طرح ہم بہتر گھر دیکھ کر پرانی نوکری چھوڑ دیتے ہیں اسی طرح آپ بھی تو اچھا گھر دیکھ کر پرانا بدل لوگی۔ کون جانے کدھر کو منہ کرو، بنجاروں کی طرح...... اب آپ کی وجہ سے میں پکا ٹھکانا گنوانا نہیں چاہتی۔ کم از کم ان کا مکان تو اپنا ہے ناں......'' وہ چپ ہوئی تو روحیل کو بھی کتنی دیر تک سُوجھ نہیں سکا کہ کیا کہیں بس وہ ثانیہ کی شکل دیکھے جارہے تھے۔

''روحیل اس نے مجھے اتنا گیا گزرا سمجھ لیا کہ اپنے جیسا بنالیا۔ اب میں کیا ہر ایک کو اپنا بیک گراؤنڈ دکھاؤں کہ دیکھو...... میں بھی لاڈو پلی ہوں۔ میرے باپ نے بھی مجھے دنیا کی ہر آسائش کے ساتھ پالا ہے۔ آج مجھے اس نے بہت دکھی کیا۔ روحیل بہت زیادہ......!'' اور زیادہ شدت سے آنسو بہاتے وہ کہیں سے بھی شادی شدہ، سمجھدار نہیں لگ رہی تھی۔

''اچھا اب بس کرو، سر میں درد ہوجائے گا۔ ایسے لوگوں کے منہ لگنے کا کیا فائدہ کہ بعد میں سارا دن اپنا ہی منہ دُکھتا رہے۔'' انہوں نے اس کا دل ہلکا کرنے کے لیے اسے ہنسانے کی کوشش کی۔

''روحیل! بس ایک کمرا ہی سہی مگر میرا اپنا...... میں...... میں خود کے لیے نہیں، اپنے بچوں کے لیے مانگتی ہوں کہ انہیں اپنے گھر کا سکون اور آرام ملے۔ ہر دوسرے دن وہ اپنی کتابیں اور کھلونے سمیٹ کے کارٹن میں نہ ڈالیں۔ بس ایک کمرے کی چھت۔''

''اچھا...... اچھا، انشاء اللہ، اللہ سبب بنائے گا۔ دیکھو ناک سُڑک، سُڑک کے میرا کندھا چپچپا کردیا۔'' انہوں نے اس کا دھیان بٹانے کی غرض سے کہا اور اس میں کامیاب بھی ہوگئے۔

''توبہ روحیل! کتنی گندی باتیں کرنے لگے ہیں آپ بھی، علی کی طرح۔'' اس نے ہنستے ہوئے اپنے چھوٹے بھائی کا ذکر کیا جو اس طرح کی جی متلانے والی باتیں کرنے میں ماہر تھا اور اس وقت روحیل کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ ہنس دی تھی۔

☆☆☆

فجر کی اذانیں ہورہی تھیں جس وقت وہ ہڑبڑا کر جاگی تھی آج پھر اس نے وہی خواب دیکھا تھا۔ ویسی ہی سنسان سڑک، وہی یک رنگی لباس، لیمپ پوسٹ اور ان کے ساتھ جڑے چوکور ڈبے عجیب و غریب لکھائی والا پرچہ اور مٹی سے بنا گھر۔ فرق صرف یہ تھا کہ آج اس نے مٹی کے اس گھر میں قدم رکھا تھا اور اسے خواب میں ہی عجیب وحشت محسوس ہوئی تھی اور ویسی ہی کیفیت اب بھی اس پر طاری تھی۔ یہاں تک کہ جسم میں کپکپاہٹ سی تھی۔

''شاید موسم بدل رہا ہے، آج کل رات کو فضا میں خنکی سی رہتی ہے، اس لیے......'' اس نے خود کو دلاسا دیا۔ پہلو میں سوئے روحیل کو ایک نظر دیکھا اور پھر بازو پکڑ کے دھیر سے ہلایا۔

''اٹھیں نماز پڑھیں، ٹائم ہوگیا ہے، اٹھیں جلدی کریں۔'' انہیں اٹھانے کے بعد خود بھی جلدی سے وضو کرنے واش روم میں چلی گئی۔

☆☆☆

''یا اللہ، یا رزاق، یا رحیم تو نے مجھے میری اوقات سے بڑھ کر نواز رکھا ہے۔ مجھے ہر وہ چیز دی جس کی میں نے خواہش کی۔ اچھا نیک اور چاہنے والا شوہر، خوب صورت اور صحت مند بچے۔ میں کس منہ سے مزید کچھ بھی مانگوں پھر بھی میرے مالک، میں تیری گناہ گار بندی تجھ سے تیری رحمت کی طلبگار ہوں، مجھے اپنی چھت دے، دے میرے مولا۔ تجھے

تیری کبریائی کا واسطہ، تجھے تیرے محبوب محمد مصطفیٰ ﷺ کا واسطہ، مجھے نواز دے۔ میری خطائیں در گزر کر کے مجھے نواز دے۔" وہ سجدے میں سر رکھے زارو قطار روتے ہوئے دعا مانگ رہی تھی۔

"یا اللہ، میں تجھ سے نہ مانگوں تو کس سے مانگوں؟ تو رب العالمین ہے، تیرے خزانے بھرے ہیں میرے مولا۔ تو نوازنے پر آئے تو زمانے جھولی میں ڈال دیتا ہے۔ تو کریم جو ٹھہرا تو تیرے کرم کے کیا ٹھکانے؟ میں تیری دی ہوئی ان گنت نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکتی مگر صرف ایک چھت کا سوال ڈال رہی ہوں تیرے آگے ...... مجھے نواز دے۔"

روحیل جو ابھی ابھی نماز پڑھ کر لوٹے تھے، بیڈروم کے دروازے پر کھڑے یک ٹک اسے دیکھے جا رہے تھے۔ ان کا چہرہ کسی بھی قسم کے تاثرات سے پاک تھا۔ پر دماغ میں سوچوں کا ڈھیر تھا۔

☆☆☆

اور پھر ایک دن اسے لگا شاید اس کی دعائیں قبول ہو گئیں ہیں جب روحیل نے ایک فلیٹ کی بکنگ کی خوشخبری اس کے گوش گزار کی اور فائل لا کر اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ اس وقت اسے پتا چلا آخری سانسوں پہ زندگی مل جانا کیسا لگتا ہے۔ یہ فلیٹ اس کے لیے زندگی ہی کی طرح تھا۔ اس سے اس کے بچوں کا مستقبل وابستہ تھا۔ وہ اتنی خوش تھی کہ خوشی کے مارے شوخیاں کرتی پھر رہی تھی اور اس خوشی میں دیوانی ہوتی اسے محسوس بھی نہ ہوا کہ روحیل کچھ دن سے چپ چپ ہیں۔ وہ تو بس کبھی دن میں دس دفعہ امی کو فون کرتی اور کہتی کہ مجھے یقین دلائیں اللہ نے مجھے اپنی چھت دے دی ہے۔ کبھی بڑی بہن کو زچ کرتی، اُدھر سے فارغ ہوتی تو اوروں کو بتا کر مبارک بادیں وصول کرتی۔ اب بس انتظار تھا تو شفٹنگ کا۔ جس میں ابھی کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر دو ڈھائی ماہ لگ جانا تھے۔ اس نے تو چھوٹی موٹی چیزیں پیک کرنا شروع بھی کر دی تھیں۔ اس دونوں بچے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اپنی ماں کا ساتھ دیتے تو وہ خوشی سے مزید نہال ہو جاتی۔ ہاں مگر گئے روحیل تو ان کے موڈ کا اندازہ اسے آج صبح ناشتے پر ہوا تھا جب وہ ناشتے کے دوران بھی شوخیوں پر آمادہ بار بار روحیل کو چھیڑ رہی تھی، بچے بھی ماں کی خوشی میں خوش بلاوجہ کھلکھلا رہے تھے۔ آج ویسے بھی چھٹی کا دن تھا سو سب خوب ریلیکس تھے سوائے روحیل کے۔ وہ عجیب چڑچڑے سے ہو رہے تھے مگر برداشت سے کام لے رہے تھے لیکن کب تک......؟

ایسے ہی وقت جب ثانیہ نے پراٹھے کا نوالہ چھوٹے بیٹے کے منہ میں ڈالا اور ساتھ ہی بائیں ہاتھ سے ناشتا کرتے روحیل کے بال بکھیر دیے تو وہ ایک جھٹکے سے نوالہ پلیٹ میں پٹختے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میز کو جھٹکا لگنے کی وجہ سے چائے بھی چھلک گئی۔ ثانیہ اور بچے سراسیمہ سے ہوئے جاتے روحیل کو دیکھتے رہے جنہوں نے دھاڑ سے دروازہ بند کیا تھا۔ ٹیبل پر بیٹھی ثانیہ کا سکتہ ٹوٹا تو سب سے پہلے اس نے جلدی، جلدی بچوں کو ناشتا ختم کروا کے ٹی وی پر کارٹون چینل سیٹ کر کے دیا اور خود فٹافٹ برتن سمیٹتی کچن میں چلی آئی۔ اس کے ہاتھ پھرتی سے برتن دھونے میں مشغول تھے جبکہ ذہن روحیل کی برہمی میں اٹکا ہوا تھا۔ آخر ایسا کیا ہوا ہے جو اتنا غصہ دکھایا۔ روحیل اور غصہ...... وہ تو بہت نرم خو ہیں، اس کی چھ سالہ ازدواجی زندگی میں چھوٹی موٹی کھٹ پٹ تو بہت دفعہ ہوئی پر بند کمرے میں...... بچوں کے سامنے روحیل بہت محتاط رہتے تھے۔ سوچ سوچ کے بھی کوئی سرا ہاتھ نہ آیا تو کچن سمیٹنے کے بعد چائے کا پانی چڑھایا اور دو کپ بنا کر بیڈروم میں آئی۔ اندر روحیل کارنر ٹیبل پر لیپ ٹاپ لیے بیٹھے تھے پر وہ جانتی تھی کہ اس وقت لیپ ٹاپ پہ کام نہیں ہو رہا بلکہ دماغ میں چلتی سوچوں کے ساتھ کھپائی ہو رہی ہے۔

اس نے چائے کے کپ سائڈ ٹیبل پر رکھے اور آہستہ قدموں سے چلتی ان کے پیچھے آن کھڑی ہوئی۔ اپنا ہاتھ محبت سے ان کے شانے پر رکھا مگر روحیل نے قدرے روکھائی کے ساتھ جھٹک دیا۔

"کیا مسئلہ ہے......؟ کوئی پریشانی ہے تو بتائیں، اس طرح کے رویے کا کیا مطلب ہے؟"

اس نے ہمت نہیں ہاری بلکہ مزید سوال کیے۔

"بتائیں ناں پلیز...... مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو بتائیں اور اگر کوئی اور مسئلہ ہے تو شیئر کریں۔" وہ خود گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے پوچھ رہی تھی۔

"کچھ بھی نہیں اور اگر کچھ ہے بھی تو تمہیں کیا؟"

"کیوں...... مجھے نہیں تو کیا ہمسائی کو ہوگا؟" وہ تنک کر بولی... روحیل کی جانب سے اتنی غیریت اس کی برداشت سے باہر تھی۔

"چلو...... ہمسائی کو ہی سہی، کسی کو کسی کا احساس تو ہو، سب تمہاری طرح خود غرض ہو جائیں تو دنیا تو دو دن میں فنا ہو گئی ناں......" روحیل کی باتیں اس کا خون جلا رہی تھیں۔ اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ آج کل اتنی خوش تھی کہ اب رونا نہیں چاہتی تھی، پر اسے رونا آ رہا تھا اور وہ رو پڑی تھی۔

"اللہ کا واسطہ ہے ثانیہ، بند بھی کرو اس کرتب کو اب...... بڑا رام کیا ہے تم نے مجھے ان آنسوؤں کے ہاتھوں کہ ناک تک قرضہ چڑھا لیا ہے میں نے تمہاری "اپنی چھت" "اپنی چھت" کے رونے، رونے سے۔ اب اور کیا منوانا ہے؟ کہو تو اب کوئی فارم ہاؤس بھی خرید دوں تمہیں؟ ظاہر ہے خواہشوں کو لگام نہیں ہوتی، ہو سکتا ہے مکان کے بعد اب تمہیں مزید کسی چیز کا ہڑکا لگے۔ پلیز بتا دینا مجھے ہاں......!" وہ اس کے دائیں گال کو تھپتھپاتے ہوئے بولے۔

"میں پھر سے کسی سے قرض لے لوں گا، جھجک اتر گئی ہے میری۔" اسے ندامت، دکھ، افسوس کے گہرے پاتال میں اتار کر خود اپنا والٹ اٹھایا اور بائیک کی چابی پکڑے وہاں سے چلے گئے، موبائل بھی ساتھ لے کر نہیں گئے تاکہ جب تک گھر سے باہر خود سے لڑتے رہیں، رابطے میں نہ آئیں۔ پیچھے جسے چھوڑ کے گئے تھے، وہ کرایے کی دیواروں سے لڑنے کو تنہا رہ گئی۔ وہ ابھی تک اسی پوزیشن میں گھٹنے موڑے کرسی کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کے آنسو تھم گئے تھے اب اسے رونا نہیں آ رہا تھا۔ دماغ سن تھا تو دل جذبات سے عاری۔ اس نے وحشت زدہ ہوتے ہوئے کمرے کی دیواروں کو تکا تو یوں لگا جیسے سب کی سب اسے منہ پھاڑے خود میں سمونے کو تیار کھڑی ہیں، بالکل قبر کی طرح اور قبر کا خیال آتے ہی پتا نہیں کیوں اسے اپنا خواب یاد آ گیا۔ یک دم اس کے دل میں شدید خوف جاگا۔ ایسا پہلے نہیں ہوا تھا۔ وہ اس خواب کو اپنے لیے مبارک سمجھتی تھی۔ ایک نیک تعبیر، روزانہ دسیوں مرتبہ ذہن میں دہراتی رہی تھی کہیں اسے مبادا بھول جائے پر اب ایسا نہیں تھا، وہ ڈر رہی تھی۔ اس نے اس خواب کو ذہن سے جھٹکنے کی شعوری کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئی۔ پھر اسے بچوں کا خیال آیا کہ ان کے پاس بیٹھے جا کر تو شاید اس کیفیت سے نکل آئے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور پہلے قدم پہ ہی لڑکھڑا کر دھم سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ شدید ٹیس، شدید ترین ٹیس تھی جو اس کے دماغ میں گرم لاوے کی طرح گھومی تھی۔ کتنے منٹ وہ سر ہاتھوں میں جکڑے بیٹھی رہی اور نامعلوم ابھی اور کتنا وقت ساکت رہتی کہ یک دم اسے لگا کہ اس پر ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار سی برسی ہے، اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ دونوں بیٹے اس کے پہلو میں کھڑے تھے اس کا بڑا بیٹا آیان اپنے خوب صورت ننھے ہاتھوں سے اس کا سر دبا رہا تھا جب کہ ریان کو اس نے پانی کا گلاس پکڑا رکھا تھا جو کھڑے کھڑے کتنا سارا چھلکا چکا تھا اور وہ پورے گلاس کے بجائے آدھا

رہ گیا تھا اُسے بے اختیار بڑی شدت سے ان پر پیار آ گیا۔ ریان کے ہاتھ سے گلاس پکڑ کر اس نے دو گھونٹ پی کر ٹیبل پر رکھ دیا اور دونوں کو بھینچ کر گلے لگا لیا...... والہانہ ان کے چہروں کو چوما، بچے بھی اپنی ماما کو دیکھ کر نارمل اور مطمئن ہو گئے اتنے میں ہی کال بیل کی آواز آئی وہ تیزی سے بچوں کے ہاتھ پکڑے کمرے سے باہر آئی، اس شک میں کہ شاید روحیل واپس آ گئے ہوں مگر دروازے پر نئی ماسی تھی، روبینہ کے جانے کے بعد بڑی مشکل سے اسے ثریا نامی یہ نئی عورت ملی تھی۔ اسے صفائی شروع کرنے کا کہہ کر خود وہ کچن میں دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنے کے لیے چلی آئی۔ دل و دماغ اس قدر بوجھل تھے کہ کچھ بھی بنانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کچھ سر میں مسلسل درد تھا، شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے صاف ستھرے کچن پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور بیزاری باہر نکل گئی، یہ سوچ کر کہ ابھی کچھ دیر میں بچوں کے لیے لنچ میں چکن سینڈوچ بنا دے گی۔ لاؤنج میں سینٹرل ٹیبل کے گرد بیٹھے اس کے دونوں بچے کلر پینسلو کے ساتھ ڈارئنگ پیپرز پر مختلف نقش و نگار بنانے میں مصروف تھے۔ ثریا جھاڑو لگانے کے بعد ڈسٹنگ میں مصروف مگر کن انکھیوں سے اسے بھی تک رہی تھی۔ جس کے چہرے پر تکلیف کے آثار بڑے واضح تھے اور یہ تکلیف اسے روحیل کے رویّے سے پہنچی تھی۔ وہ چپ چاپ صوفے پر بیٹھ کر بچوں کو دیکھنے لگی۔ بظاہر وہ ایسا کر رہی تھی پر درحقیقت اس کا سارا دھیان روحیل کی بائیک کی آواز پر لگا تھا۔ اسی غیر حاضر دماغی میں کب ثریا صفائی کر کے واپس گئی اور کب بچے بور ہو کر اٹھ بیٹھے اسے بالکل محسوس نہ ہوا اور پھر بچوں کے بھوک، بھوک کے شور نے اس کے حواس مجتمع کیے، بے چاروں کے چہرے سُتے ہوئے تھے۔ وہ ماں کی پریشانی محسوس کر رہے تھے لہٰذا سارا وقت جس قدر ہو سکتا تھا ایک دوسرے کو بہلاتے رہے۔

اس لمحے ثانیہ کو خود پہ اور بچوں پر ٹوٹ کر ترس آیا۔ شل ہوتے وجود کو بہ مشکل گھسیٹتی، سر میں اٹھتی ٹیسیں برداشت کرتی کچن میں جا کر سینڈوچ بنانے گی۔ ابھی اسے ظہر کی نماز بھی پڑھنا تھی۔ اس نے حتی المقدور پھرتی سے بچوں کو کھانا کھلایا اور دونوں کے فیڈر انہیں ہاتھ میں تھمائی کمرے میں لے آئی۔ بیڈ پر سلانے کے لیے لٹا کر خود وضو کر کے نماز ادا کی اور پھر دعا مانگتے ہوئے اس کے ضبط کے تمام بند ایک جھٹکے سے ٹوٹ گئے، وہ گھٹی گھٹی چیخوں کے ساتھ اس شدت سے روئی کہ اگر روحیل بھی اسے اس طرح روتے دیکھتے تو آنسو بہانے لگتے۔

"یا اللہ مجھے معاف کر دے، مجھ پر رحم کر شاید میں ضرورت سے زیادہ اپنی خواہش کے پیچھے پاگل ہو گئی تھی کہ اپنے اتنے چاہنے والے شوہر کو ناراض کر بیٹھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ اپنی چھت کی چاہ میں ان کی خودداری اور بھرم کی چادر تار تار کر رہی ہوں۔ انہیں میری وجہ سے قرض جیسی عفریت کو گلے ڈالنا پڑا۔ یا اللہ معاف کر دے مجھے، ٹھیک ہے نہ دے تو چھت، میں نہیں مانگتی، میں اپنے لیے نہیں مانگتی، میری چھت تو روحیل ہیں تو اُن کی خیر کرنا۔ پر یا اللہ... یا اللہ......" اس نے نہایت بے بسی کے ساتھ اللہ کو پکارا جیسے کوئی مجرم پکارتا ہے۔ "یا اللہ مجھے نہ دے... پر... پر میرے بچوں کے لیے۔" دوبارہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس نے چادر کے پلو کا گولا بنا کر منہ میں ٹھسیڑ لیا کہ کہیں اس کے رونے کی آواز سے بچے پریشان ہو کر اٹھ نہ جائیں، وہ ابھی کچی نیند میں تھے۔ تھوڑی سانس بحال ہوئی تو وہ پھر اپنے رب کے حضور التجا کا تھال لیے کھڑی ہو گئی۔

"اے میرے مولا! تو میری مشکل جانتا ہے میں کرایے کے گھروں سے اپنے بچوں کو کیوں بچانا چاہتی ہوں، تو میرے دل کا حال جانتا ہے، میری نیت سے واقف ہے، میں نہیں چاہتی، میں نہیں چاہتی کہ کرایہ ادا کرنے کا وبال ان کی جانوں کو یونہی چمٹا رہے۔ ان نوٹوں میں ان کی خواہشیں اور حسرتیں قتل نہ ہوں۔ مجھے میرے لیے نہ سہی میرے اللہ، میرے بچوں کے لیے سہی، بس دے دے، کوئی سبب بنا دے، ایک چھت اپنی ہو تو بندہ سوکھی روٹی پانی کے ساتھ بھی نگل لے تو کسی کو خبر نہیں ہوتی پر یہ کرایے کی دیواریں......" اس نے روتے ہوئے اپنے اطراف نظر دوڑائی، وہ اس وقت اللہ سے اپنا تمام دکھ من و عن بیان کر دینا چاہتی تھی۔

"یہ کرایے کی دیواریں تو اونچا رونے بھی نہیں دیتیں...... یہ بھیدی ہوتی ہیں، دُکھ بٹور لیتی ہیں اور دکھ نہیں سنبھال پاتیں، نشر کر دیتی ہیں، سب کو خبر دے دیتی ہیں۔ جیسے اس وقت مجھے رونے نہیں دے رہیں۔ میرا دل پھٹ رہا ہے، میں اونچا رونا چاہتی ہوں، پر مجھے ان دیواروں کا خوف ہے، یا اللہ میرے روحیل...... آ جائیں بس۔" وہ بے ربط ہو رہی تھی۔

"روحیل ناراض مت ہونا کبھی، آپ میرا سائبان ہیں، آپ کے بغیر جنت بھی نہیں چاہیے۔ آ جائیں، اپنی چھت تو بس...... میرے بچے...... بس۔" اس کی آنکھوں میں یک دم بے تحاشا نیند بھر گئی تھی۔ اس نے مصلے پر ہی سر رکھ کر ٹانگیں پھیلا لیں۔

"روحیل آپ مجھ سے پیار کرتے ہیں، بس یہی میری پونجی ہے، میں آپ کی وفادار ہوں، بس یہی میرا آپ کا سرمایہ، چھت تو صرف...... بچے نہ رُلیں۔" اس نے بے تحاشا دُکھتے سر کو پتھر ہوتے محسوس کیا یا شاید اسے آرام آ رہا تھا۔

نہیں...... شاید اسے نیند آ رہی تھی اور گہری نیند میں جاتے جو چند ٹوٹے پھوٹے جملے اس کی زبان نے ادا کیے، انہیں چاروں اور کھڑی کرایے کی دیواروں نے سنا اور خود میں جذب کر لیا۔

"روحیل، آ جائیں اب...... بچے اکیلے ہیں ڈر جائیں گے...... انہیں چھت دینا...... مجھے نہیں چاہیے...... بس آپ آ جائیں...... آ جائیں...... آ جائیں...... روحیل...... یا اللہ میرا سر...... امی...... بچے...... یا اللہ......" اسے لگا اس کے سارے دکھ، تمام درد گرم گرم سیال کی صورت اس کے ناک کے راستے بہے جا رہے ہیں۔

☆☆☆

"ثانیہ، ثانیہ...... اے ہیلو...... اب اٹھو بھی...... کب سے آوازیں دے رہا ہوں، اٹھ بھی جاؤ، خواہ مخواہ کے نخرے مت دکھاؤ، ابھی منا رہا ہوں ناں تو آرام سے مان جاؤ نہیں تو پھر میں ناراض ہو جاؤں گا۔" روحیل اب زچ ہو چکے تھے اسے مناتے، مناتے پر ثانیہ نے بھی ٹھان لی تھی کہ آج وہ نہیں مانے گی۔

"اٹھو ناں...... اتنی دیر سے ناراض ہو کر لیٹی ہو، تھکی نہیں؟ تم سے تو اتنی دیر لیٹا نہیں جاتا...... ہاں...... دیکھو بچے بھی پریشان ہو رہے ہیں، رونا شروع کر دیں گے تو تم سے بھی چپ نہ ہوں گے۔ ہاں، مانتا ہوں تھوڑا غصے میں آ کر اول فول بک گیا تھا پر میں تم سے خفا رہ سکتا ہوں؟ اٹھ بھی جاؤ بھئی اب، مجھے تمہیں خوش خبری سنانی ہے۔" روحیل نے اپنا منہ دھیرے سے اس کے کان کے پاس کیا اور سرگوشی میں بولے۔

"تمہیں اپنی چھت چاہیے تھی ناں؟ اب ان شاءاللہ جلدی ہم فلیٹ میں شفٹ ہو جائیں گے۔ میرا قرض اترنے کی فوری سبیل بن گئی ہے۔ آج میں جب تم سے ناراض ہو کر نکلا تھا تو گھر کے باہر ہی مجھے ابو کے ایک پرانے دوست کا فون آیا، انہوں نے مجھے فوری طور پر اپنے گھر بلوایا تھا کہ ضروری کام ہے۔ میں یہ سمجھ کر صرف ٹائم پاس کرنے کی غرض سے ان کے گھر گیا تھا مگر مجھے نہیں پتا تھا کہ وہاں جا کر مجھے تمہاری دعاؤں کی قبولیت کی سند ملے گی۔ انکل نے سب سے پہلے تو مجھ سے اتنا عرصہ رابطہ نہ کرنے پر معذرت کی پھر مجھے الماری میں سے تیرہ

لاکھ روپے کا چیک نکال کر دیا اور کہنے لگے کہ بیٹا یہ وہ رقم ہے جو آٹھ سال پہلے میں نے اپنے یار اور تمہارے باپ سے قرض لی تھی پر اس کی زندگی میں چُکا نہ سکا۔ اسی شرمندگی میں تم سے رابطہ بھی نہ رہا کہ اگر تم نے تقاضا کر دیا تو کیا منہ دکھاؤں گا۔ اب جو اللہ نے اس بوجھ کو اتارنے کی توفیق دی تو سب سے پہلے تم سے رابطہ کیا، لو اپنی امانت اور اتنی تاخیر کے لیے مجھے معاف کر دینا۔ اُف ثانیہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں کتنی دیر تو میں ان کا چہرہ دیکھتا رہا اور تمہارے بارے میں سوچتا رہا کہ اتنی بڑی خوش خبری تمہیں کیسے سنا پاؤں گا...... کیسے اپنی ثانیہ سے کہوں گا کہ اب اپنی چھت تلے جانے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی...... سو اب ناراضی ختم اور دائمی صلح کا پیریڈ شروع......" روحیل کی اتنی لمبی تفصیل سنانے پہ بھی ثانیہ ٹس سے مس نہ ہوئی تو اسے غصہ آنے لگا۔ اب تو بچے بھی بلکنا شروع ہو گئے تھے۔

"کیا مذاق ہے یار یہ...... کتنی بار سوری کروں...... اٹھو ناں تمہیں پتا تو ہے کہ تم مجھ سے زیادہ دیر ناراض رہو تو مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا...... اٹھو، پلیز اٹھو ثانیہ، ثانیہ اٹھو......" روحیل نے زور سے اسے جھنجوڑا تھا کہ یک دم ان کے کندھے پر کسی کے ہاتھ کا لمس ٹھہر گیا۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا تو ثانیہ کا چھوٹا بھائی علی کھڑا تھا۔

"روحیل بھائی ..... اٹھیے اب، جنازے کا وقت ہو گیا ہے۔"

"جنازہ؟ کیسا جنازہ؟ کس کا؟ میری ثانیہ کا؟ تم پاگل تو نہیں ہو علی...... جاؤ اِدھر سے، مجھے اس سے بات کرنے دو، اس کی نیند توڑنے دو۔" روحیل، علی کو ڈپٹ کر دوبارہ ثانیہ کی طرف متوجہ ہوئے مگر انہیں محسوس ہوا جیسے ارد گرد شور ہی شور ہے بے تحاشا آوازیں...... بین کرتی آوازیں، کُرلاتی، سسکتی آوازیں، شکوے شکایتیں کرتی آوازیں اور ان کے بچوں کی رونے کی آوازیں، ایک جھٹکے سے ٹرانس سے نکل آئے، جس میں وہ ثانیہ کو مُردہ [illegible] آ گئے تھے۔ انہوں نے آوازوں کی سمت نظر [illegible] ثانیہ کی والدہ، بہن، بھابیاں بلک بلک کر رو [illegible] تھیں۔ کون نہیں تھا جو اس کی جواں مرگی پہ آنسو بہا رہا تھا۔ ثانیہ کی سہیلیاں ایک سائڈ پہ بیٹھی ان [illegible] اشکوں کے ساتھ مسلسل کلمے کا ورد کر رہی تھیں [illegible] کی مغفرت کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔ آخر [illegible] روحیل کی نظریں سب پہ سے ہوتی ہوئی اپنے معصوم بچوں پہ آ کے ٹھہر گئیں۔ اُف خدایا! کیسے بلک بلک کے رو رہے تھے ماں کے لیے، انہیں کیسے پتا کہ ان کی ماں مر گئی ہے؟ کیا اتنے چھوٹے بچے بھی ممتا کا خزانہ چھن جانے کا شعور رکھتے ہیں؟ بچے تو عام طور پر بکھر جاتے ہیں یا پھر اتنے لوگوں کو روتے دیکھ کر ٹکر ٹکر شکلیں دیکھنے لگتے ہیں۔ آیان تو پھر سمجھ دار تھا، اپنی ماں کے وجود کا بھرپور احساس تھا اسے مگر ریان......

"لو ثانیہ......! دیکھو ذرا...... ان معصوموں کا بلکنا دیکھ کر ہی اٹھ جاؤ۔ یہ کیسے رہیں گے تمہارے بغیر......؟ میں کیسے رہوں گا؟ ہم کیسے رہیں گے؟ ثانیہ نیا فلیٹ بہت پیارا ہے یار......! جہاں تم جا رہی ہو اس چھت سے اچھا ہے ثانیہ۔"

"روحیل بھائی بس کریں۔" علی کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور آنکھوں میں بے تحاشا پانی تھا۔ اسے اپنی بہن اور بہنوئی سے بے تحاشا محبت تھی۔ یہ دکھ سب کے لیے اتنا بڑا تھا کہ اب ساری عمر رونا تھا۔ روحیل بھائی کا یوں ثانیہ کو پکارنا ان کے غم کو سوا کر رہا تھا۔ علی نے ماں کی طرف دیکھا جو شدتِ غم سے نڈھال نیم بے ہوشی میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ روحیل جیسے اونچے پورے مرد کا یوں کُرلانا بھی کے دل چیر رہا تھا۔ روحیل اب سر چارپائی کی پٹی سے لگائے جھٹکے کھا رہے تھے وہ رو رہے تھے پوری شدت سے، اونچی آواز سے، چند لمحوں کے بعد انہوں نے اپنا سر اٹھانے کے بعد علی کو دیکھا اور اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر سینے پر رکھ لیے۔

"علی دیکھو! محسوس کرو...... خالی ہے ناں...... میں واقعی خالی ہو گیا ہوں۔" علی نے اپنے دونوں ہاتھ ان کے سینے سے ہٹا کر روحیل کو اپنے گلے سے لگا لیا تو وہ دوبارہ بلک اٹھے۔

"علی! ثانیہ سے کہو آ جائے واپس، میں نہیں رہ سکتا۔ میرے بچے کیسے رہیں گے؟ ہم تینوں رُل جائیں گے۔ اسے کہو جس طرح گئی ہے ویسے ہی آ جائے، کہیں سے زندگی واپس اپنی رگوں میں کھینچ لائے۔"

"روحیل بیٹا اٹھو۔" ثانیہ کے والد نے انہیں بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اٹھایا جنہیں خود غم نے جیسے نچوڑ ڈالا تھا۔ "چلو بیٹا...... میری بچی کو اس کے گھر لے چلو۔"

"بڑھاپے کی دہلیز پہ کھڑے اس مجبور باپ کی آواز میں اتنا کرب تھا کہ روحیل اور علی بے ساختہ ان سے لپٹ گئے۔ عورتوں کے کلیجے غم سے پھٹنے لگے۔ بین کی آوازوں میں شدت آ گئی۔ دونوں روتے بلکتے بچے گھبرا کر باپ کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ ثانیہ کی بہن کو غش پہ غش آ رہے تھے۔ ماں الگ نڈھال اور بھابی دونوں کو سنبھالنے میں ہلکان ہوتی بے تحاشا رو رہی تھیں کہ ایک دم کلمۂ شہادت کی صدا بلند ہوئی اور سب کی چیخیں نکل گئیں۔ ثانیہ کی بھابی نے چھوٹے بیٹے ریان کو اپنے سینے میں بھینچ لیا اور بڑے کو روحیل نے ساتھ لگا لیا۔ اِک حشر برپا تھا کتنے لوگ تھے جو دلوں میں اس کی محبت لیے اس کی اپنی چھت تلے پہنچانے یہاں موجود تھے۔ وہ اکثر اپنی اس خواہش کا اظہار کرتی تھی کہ جب اللہ اس کو اپنی چھت نصیب کرے تو تمام دوست، احباب اور رشتے دار اس کے ہاں اکٹھے ہوں۔ اللہ نے اس کی حسرت ضرور پوری کی کہ سبھی تو موجود تھے اس کو اس کی دائمی چھت تلے پہنچانے کی خاطر [illegible]

صرف ثانیہ کو جانا تھا۔ اکیلے، بالکل اکیلے۔

ماری سرسری نظر جہان اندر
تے زندگی ورق اتھلیا میں
دامن ملیا نہ کوئی رفیق مینوں
ماری کفن دی بُکل تے چلیا میں

☆☆☆

کتنی اداس، زرد اور تھکی ہوئی شام تھی اور کتنا وحشت ناک اور کرب انگیز دن تھا آج ایک طویل، ڈراؤنے بدصورت خواب جیسا دن۔ فضا میں اگربتی...... پھولوں اور نم مٹی کی ملی جلی خوشبو تھی۔ گہری ہوتی شام اس ویرانے میں اپنے ہمراہ ڈھیروں وحشتیں لیے اتری تھی، ایسا اجاڑ اور مہیب سناٹا تھا کہ پرندہ بھی پر مارتا تو ساعتوں پہ کوڑے سے برس جاتے تھے۔ دل مٹھی میں آ جاتا تھا۔

"تو ثانیہ، بس اِدھر تک آنے کے لیے ہی اتنی بے چین تھیں تم؟ یہ تھی تمہاری خواہش؟ اس مٹی کی چھت تلے تمہیں کن آسودگیوں کی کشش لے گئی۔ سات گھنٹے محض سات گھنٹے لیے تم نے یہ دو گز کا پلاٹ گھیرنے میں۔ صبح گیارہ بجے میں تمہیں زندہ چھوڑ کر گیا تھا اور اب شام کے ساڑھے چھ بج چکے ہیں، اتنی جلدی، اتنی جلدی سب درہم برہم ہو گیا، ایک تمہارے مر جانے سے۔" روحیل نے نگاہ اٹھا کر اطراف میں دیکھا۔ چار سو خاموشی اور تھکن کا ڈیرا تھا یوں جیسے کتنے ہی مسافر زندگی کی مسافتوں کو طے کرنے کے بعد تھک ہار کے زمین پر جا چھپے ہیں اور ان کی روحوں کی تھکن کو کائنات نے اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔

"ثانیہ تم کیوں اتنی جلدی تھک گئیں؟ ابھی ہمیں ساتھ چلتے اتنا وقت تو نہ بیتا تھا، ابھی تو چند کوس چلے تھے، ہم اور تم نے تھک کر زمین اوڑھ لی۔ بڑا ہی ظلم کمایا تم نے ثانیہ۔" روحیل نے نرمی سے ثانیہ کی قبر پر پڑی تازہ پھولوں کی پتیوں کو مٹھی میں بھرا۔ قبر کی گیلی مٹی کی ٹھنڈک انہیں اپنی رگوں میں اترتی محسوس

ہوئی۔ انہیں جھرجھری سی آگئی۔ آنکھوں کے سامنے گھنٹا پہلے کا منظر واضح ہونے لگا۔ جس وقت انہوں نے ثانیہ کو قبر میں اتارا تھا۔ وہ خود بھی تو اندر اترے تھے کتنی خوف ناک ٹھنڈک تھی اندر اور اسی میں ثانیہ کو رکھ... چھوڑا تھا انہوں نے کتنے ناقابلِ یقین سے لمحات تھے وہ کیسے؟ کیسے ان کے ہاتھوں نے ثانیہ کے خوب صورت وجود پہ مٹی ڈال دی تھی۔ ثانیہ ہمیشہ کے لیے ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ یہ سب ہو چکا تھا پر انہیں کسی طور... یقین نہیں آرہا تھا۔ یہی یقین پانے کے لیے وہ اکیلے اس کی قبر پر ٹھہر گئے تھے۔ آیان کو زبردستی اس کے نانا کے ساتھ گھر بھیجا تھا انہوں نے تو علی کو بھی کہا تھا کہ وہ گھر جائے، میں کچھ دیر میں آجاؤں گا۔ پر وہ جانتے تھے کہ وہ کبھی نہیں جائے گا۔ جس وقت وہ قبرستان سے باہر نکلیں گے، علی انہیں قبرستان کے پھاٹک پہ ہی ملے گا اور انہیں علم تھا کہ وہ بے تحاشا رویا ہوگا۔ وہ کچھ دیر تنہا ثانیہ کے پاس بیٹھنا چاہتے تھے۔ اسے اس کی نئی چھت سے مانوس کرنا چاہتے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ وہ اکیلے میں گھبرائے گی۔ نئی چھت، نیا گھر اور قبر، ان میں پہلی رات بڑی مشکل گزرتی ہے۔

"ثانیہ، تم گھبرانا نہیں، میں روز تمہارے پاس آؤں گا۔ تمہارے لیے بخشش اور مغفرت کے تحفے لاؤں گا۔ ظاہر ہے تمہیں اپنے نئے گھر کو سجانا بھی تو ہے ناں.... اور اس مٹی کے گھر کی آرائش تمہارے اعمال ہیں۔" آنکھیں ایک بار پھر بے تحاشا پانیوں سے بھر گئیں۔ آنسوؤں نے قبر کی مٹی میں جذب ہونا شروع کردیا۔ "میں اپنی ثانیہ کو جانتا ہوں۔ انشاء اللہ تمہارے اعمال کی آرائش سے تمہارا گھر چمکے گا۔ تم نے زندگی میں مجھے بہت سکھ دیا۔ ہمیشہ میری وفادار رہیں، میرے مال میں خیانت نہیں کی۔ میرے بچوں کو بھرپور توجہ دی۔ میرے گھر کی چار دیواری کے تقدس کو قائم رکھا۔ میں تم سے راضی ہوں ثانیہ، میرا اللہ بھی تم سے راضی ہو۔" روحیل نے روتے ہوئے منہ اونچا کر کے ثانیہ سے خود کے راضی ہونے کی [گواہی] دی۔ فضا میں رچی ہوئی سوگوارایت نے بھی خود کو [محسوس] کیا اور دھیرے سے ثانیہ کی قبر کی گیلی مٹی سے لپٹ گئی۔ روحیل ٹوٹے بکھرے اعصاب کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔ فضا میں دونوں ہاتھ بلند کیے ا[ور] فاتحہ ادا کی۔ کچھ دیر بند آنکھوں کے ساتھ کھڑے نامعلوم کیا کچھ اپنے رب سے اس نئی چھت کی نئی مکین کے لیے دعا مانگتے رہے پھر دھیرے سے آنسو پونچھے اور مُردہ قدموں سے چلتے اس ویران اور خاموش شہر سے باہر نکلتے چلے گئے۔ ڈھلتی، سسکتی اور کرلاتی شام نے دکھ اور حسرتوں سے اس نئی اور تازہ قبر کو... دیکھا اور اپنے پیر پھیلاتی رات کے سناٹے میں تبدیل ہوگئی۔ ہولے ہولے چلتی ہوا میں تیزی آگئی جیسے کوئی مدھم سُر سے لوری سناتا یک دم نوحہ کرنے لگے۔

وہ کہ جن کے دم سے تھیں
خواہشیں جواں
جن کے دلوں میں آباد تھا
حسرتوں کا اِک جہاں
چہچہاتی تھیں جن کی آنکھوں میں
امنگوں کی سنہری چڑیاں
ان کی دھڑکنیں رہتی تھیں
آس کی موجوں پر رواں
پھریوں کہ جنہوں نے
آنسو پلکوں میں سمو لیے
خواب، خواہشیں، حسرتیں
ریشہ ریشہ کفن میں پرو لیے
وہ جو تشنگی لیے
عدم کو ہولیے
وہ جو چھت کی آس میں
زمین اوڑھ کر سولیے





حسب نسب

ہالہ احمد

آج صبح سے گھر میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ یوں تو صبح کا آغاز عموماً فجر کی نماز کے کچھ دیر بعد ہو ہی جایا کرتا تھا کہ ابا نے ناشتا کرتے ہی دکان کا رخ کرنا ہوتا تھا گو گھر سے تھوڑے فاصلے پر ابا کا بک ڈپو تھا مگر وہ ناشتا کرنے کے بعد گھر میں فارغ بیٹھ کر وقت گزارنے کو سخت معیوب گردانتے تھے سو اِدھر ناشتے کا آخری نوالہ منہ میں گیا اور اُدھر ابا نے بجیلہ کو... بہ آواز بلند اپنا بٹوا کمرے میں سے لانے کا حکم بھی

دے دیا۔ اماں نے پراٹھا توے پر ہی چھوڑ کر فٹ سے ابا کے جوتے لا کر ان کے سامنے رکھے۔ اس طرح ابا کی سواری بادِ بہاری گھر سے دکان کے لیے روانہ ہوئی تو اماں نے دوبارہ ناشتے کی خبر لی اور بجیلہ نے ایک بھی لمحے کی تاخیر کیے بِنا ٹی وی آن کر لیا۔ اب بھلے اماں سے جھاڑ پڑے یا گالیاں...... بجیلہ بیگم کو کسی بات کی کوئی پروا نہیں...... اماں ابا کی اکلوتی اولاد ہونے کا فائدہ اٹھانا وہ کبھی نہیں بھولتی تھی۔ ابا کی تو خیر وہ نورِ نظر تھی ہی مگر اماں ٹھہریں ماں...... وہی روایتی سی ماؤں والی سوچ، آگے کی فکریں اور بجیلہ کا لاابالی انداز انہیں ہولائے دیتا...... اور وہ اپنے ماں ہونے کا ثبوت وقتاً فوقتاً بجیلہ کو تھوڑی بہت ڈانٹ ڈپٹ کر کے دیا کرتی تھیں جسے بجیلہ اپنے گھر کی رونق گردانتی تھی کہ اماں کی ڈانٹ کے بغیر دن ادھورا سا لگتا ہے۔ مگر آج ماحول ذرا مختلف تھا۔ ابا دکان پر جا چکے تھے اس اطلاع کے ساتھ کہ وہ سہ پہر میں گھر لوٹ آئیں گے۔ اماں ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد مسلسل کام میں لگی تھیں۔ پہلے برتن دھوئے، باورچی خانہ سمیٹا اور ساتھ ہی دوپہر کی ہنڈیا بھی چڑھا دی۔ ساتھ ساتھ بجیلہ کو آوازیں لگانے کا عمل بھی زوروں پر رہا کہ گھر کی صفائی بجیلہ ہی کرتی تھی مگر آج بجیلہ کا انداز صاف طور پر بتا رہا تھا کہ وہ کچھ کرنے کے موڈ میں نہیں ہے۔ تبھی ٹی وی کے آگے جم کر بیٹھی رہی۔ آخر اماں تھک ہار کر اندر کمرے میں آئیں اور اسے یوں بیٹھا دیکھ کر ان کا پارہ ساتویں آسمان کو چھونے لگا۔ ابھی وہ کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ بجیلہ نے نظریں اٹھا کر ماں کی طرف دیکھا...... انہوں نے کچھ بولنے کے بجائے اس بات کا انتظار کرنا مناسب سمجھا کہ وہ خود ہی کچھ بول دے۔ ہوا بھی یہی... بجیلہ نے ہاتھ پکڑ کر اماں کو اپنے پاس بٹھایا اور نرم لہجے میں بولی۔

"اماں! پیاری اماں! آپ خود ہی بتا دیجیے یہ اتنی صفائی ستھرائی، شام کی چائے کے لیے ڈھیر انتظامات اور گھر کو ایک نئی ترتیب سے سیٹ کر... آخر فائدہ ہی کیا ہے؟ ہونا تو وہی ہے ناں جو ... سے ہوتا آیا ہے...... ابا کا پتا تو ہے آپ کو پھر..."

اماں نے گہری سانس لی اور بجیلہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔

"میری بیٹی! اللہ نصیب جوڑنے والا ہے جہاں تیرا نصیب کھلنا ہے وہاں تیرے ابا کی ایک نہیں چلنی۔ اب تک جو رشتے تیرے ابا نے ٹھکرائے ... ہوسکتا ہے وہ تیرے لیے بہتر نہ ہوں۔ امید کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے بیٹی۔ وہ ہے ناں اوپر...... بس اسی پر بھروسا کر۔"

"مگر اماں! ہر رشتے میں عیب، ہر رشتے میں خرابی...... یہ ٹھیک نہیں ہے اماں...... اللہ کو یہ بھی پسند نہیں ہے۔" بجیلہ جذباتی ہو کر بولی تو اماں نے بجیلہ کو سمیٹتے ہوئے بس اتنا کہا۔

"چل بیٹی اللہ مالک ہے سب اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اب اٹھ جا شاباش اور صفائی کا کام جلدی ختم کر لے پھر شام کی چائے کے لیے تھوڑا بہت بندوبست کرنا ہے۔ ویسے تو تیرے ابا کہہ گئے تھے کہ آتے ہوئے کافی سامان وہ بازار سے لیتے آئیں گے مگر ایک دو چیزیں تو گھر میں ہی بنانا ہوں گی ناں۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئیں اور بجیلہ بے دلی سے اٹھ کر کمرے میں بکھری چیزیں سمیٹنے لگی۔

بجیلہ کے ابا اپنی اکلوتی بیٹی پر جان نچھاور کرتے تھے۔ ساری زندگی اماں کو بھی حتی المقدور کوئی تکلیف نہ ہونے دی۔ پانچ وقت کے نمازی، خوش گفتار اور نہایت ایمان دار...... کاروبار میں بھی کبھی ایک پائی کی اونچ نیچ برداشت نہیں کرتے تھے۔ بس ایک خامی جو اُن میں بجیلہ کے شادی کی عمر کو پہنچنے پر ظاہر ہوئی تھی وہ یہ تھی کہ وہ خاندان کے معاملے میں بہت حساس تھے۔ لڑکا بے شک کتنا ہی کماؤ ہوتا یا گھر والے کتنے ہی رکھ رکھاؤ والے ہوتے مگر بعد میں تفتیش و تحقیق کروانے پر ان کے خاندان کی ذرا سی بات بھی سامنے آجاتی تو ایک پل میں وہ رشتہ ٹھکرا دیا جاتا۔ بجیلہ عمر کے چھبیسویں برس میں تھی اور اب تک ان گنت رشتے ابا کے معیار پر پورا نہ اترنے کے باعث آکر واپس بھی جا چکے تھے۔ اب تو بجیلہ چڑنے لگی تھی کہ آنے والوں کی خاطر مدارات میں ہلکان ہونے کے بعد نتیجہ وہی...... ڈھاک کے تین پات ابا کو کوئی نہ کوئی عیب نظر آہی جاتا اور یوں وہ رشتہ واپس ہو جاتا۔

جھاڑو لگاتے ہوئے بجیلہ کو یاد آیا۔ کوئی مہینہ بھر پہلے ایسا ہی ایک دن تھا۔ اسے دیکھنے کچھ لوگ آنے والے تھے۔ تیاریاں عروج پر تھیں۔ مہمان آئے، چائے پانی کا دور چلا، خوشگوار ماحول میں ایک دوسرے کا تعارف حاصل کیا گیا۔ لڑکے کی ماں نے نہایت سادگی سے انہیں بتایا کہ لڑکا درزی ہے اور اس کے باپ دادا بھی برسا برس سے یہ کام کرتے چلے آرہے ہیں۔ ابھی وہ لڑکے اور اس کے آباؤاجداد کے اس ہنر میں مزید ستارے ٹانکنے ہی والی تھیں کہ ابا بھڑک اٹھے۔ درزی کے نام پر ہی ابا کے ماتھے کی رگیں تن گئیں۔ لڑکے کے گھر والے ایک دم گھبرا گئے۔ اماں نے بڑی مشکلوں سے ابا کو کمرے سے باہر بھیجا اور لڑکے کے گھر والوں سے معذرت کی۔ رشتہ ہو نہ ہو مگر گھر آئے مہمان کی عزت بہرحال فرض ہے۔ ابا کے سارے اصول بس اس ایک نقطے پر آکر ختم ہو جاتے تھے۔ پھر تو کہاں کا اخلاق اور کہاں کی خاطر تواضع۔ کچرا سمیٹتے ہوئے بجیلہ کو ایک اور دن یاد آیا۔ وہ رشتہ ساتھ والی خالہ زبیدہ کے توسط سے آیا تھا۔ اس دن بارش ہوئی تھی۔ جب مہمان گھر پہنچے تو لڑکے کی بڑی بہن کا جوتا گلی میں کھڑے پانی میں بھیگنے کی وجہ سے اکھڑ گیا تھا۔

"بارش کو بھی آج ہی ہونا تھا۔ آپ کا جوتا......" اماں نے ازراہِ ہمدردی ان سے کہا۔ لڑکے کی بہن نے ان کی بات بھی پوری نہیں ہونے دی اور قہقہہ لگا کر بولی۔

"ارے خالہ جوتے کا کوئی غم نہیں...... ذرا سا اکھڑ ہی تو گیا ہے۔ شکیل دو سلائیاں لگا دے گا تو جوتا پھر سے نیا کا نیا۔" شکیل اس لڑکے کا نام تھا جس کا رشتہ بجیلہ کے لیے آیا تھا۔ ابا کے کان فوراً کھڑے ہوئے۔

"جی، کیا مطلب؟"

"جی خالو جان! شکیل میرا بھائی...... وہ جوتے مرمت کرتا ہے ناں...... اب تو اس نے دکان بھی بڑی لے لی ہے...... وہ چوک کے دائیں طرف......" لڑکے کی بہن ذرا گڑبڑا کر بولی۔ بس پھر تو ابا کے ضبط کی انتہا نہ رہی۔ وہیں شروع ہو گئے۔

"یہ زبیدہ سے تو ہم بعد میں نمٹیں گے...... سمجھا کیا ہے مجھے اور میری بیٹی کو؟ ہر ایرا غیرا منہ اٹھائے رشتہ لے کر چلا آتا ہے...... چوک میں موچی کی دکان...... لاحول ولا...... یہی رہ گیا تھا میری بیٹی کے لیے؟" ابا کے تیور دیکھ کر مہمان تو رفو چکر ہو گئے اور اماں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ اندر بیٹھی بجیلہ کو اس وقت ہنسی آگئی تھی اور ہنستے ہنستے ہی اس کے دل میں ایک لمحے کو خیال آیا۔

"کوئی بھی پیشہ گھٹیا نہیں ہوتا۔ رشتہ کرنے نہ کرنے کا اختیار تو اپنے پاس ہے لیکن کسی کے کام کو اس طرح گھٹیا کہنا اور اس بنیاد پر اسے بے عزت کرنا...... اللہ معاف کرے۔ کہیں اللہ کو یہ بات ناگوار نہ گزرے، اللہ نہ کرے۔" بجیلہ کو جھرجھری سی آگئی تھی اس دن کی بات کو اب بھی سوچ کر وہ کانپ سی گئی۔

تین بجے کے قریب ابا لدے پھندے گھر میں داخل ہوئے۔ بجیلہ نے دوڑ کر لفافے ان کے ہاتھ سے لیے اور کچن میں لا کر رکھ دیے۔ پہلے ابا کو کھانا

گرم کر کے دیا اور پھر سے اندر آ کر لفافے کھول کر دیکھنے لگی۔ اتنے میں ابا کی آواز آئی۔

”بیٹا! تین بج چکے ہیں۔ بس وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔ حاجی صاحب کا فون آیا تھا میرے پاس کہ وقت کے بہت پابند ہیں وہ لوگ...... دیے گئے وقت سے تاخیر نہیں کریں گے۔ اماں کو بتا دو۔“ بجیلہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اماں تو غسل خانے میں تھیں اس نے چیزیں دیکھنا شروع کیں۔ گرما گرم پیزا، پیٹیز، کیک، دہی بھلے اور چکن رول......

”بھئی واہ مزہ آ گیا ابا۔“ بجیلہ بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔ گھر میں اماں نے پکوڑے اور ٹرائفل بنایا تھا۔ سب چیزوں کو سیٹ کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ کپڑے استری ہوئے رکھے تھے۔ بس نہا کر تبدیل کرنے تھے۔ میک اپ وغیرہ کے چکر میں وہ کبھی نہیں پڑی تھی۔ یوں بھی اسے میک اپ کی بہت زیادہ ضرورت بھی نہیں تھی۔ سو تیاری مکمل ہی تھی۔

کچھ ہی دیر میں دروازے پر بیل ہوئی تھی۔ ابا خود استقبال کے لیے گئے تھے۔ وہ جس گرم جوشی کے ساتھ مہمانوں کو اندر لا رہے تھے۔ وہ بجیلہ کو بے چین کر رہی تھی۔

”لگتا ہے حاجی صاحب نے پہلے ہی ٹھیک ٹھاک معلومات فراہم کر دی ہیں ابا کو...... کافی تسلی میں لگ رہے ہیں ابا۔“ بجیلہ نے سوچا۔ حاجی صاحب، ابا کے پرانے جاننے والے تھے۔ یہ رشتہ انہوں نے ہی تجویز کیا تھا۔ خیر ابا انہیں لے کر اندر آئے۔ بڑے تپاک سے بٹھایا۔ اماں بھی بھاگم بھاگ اندر پہنچ چکی تھیں۔ اندر سے آنے والی آوازیں بتا رہی تھیں کہ رشتہ کسی ”درزی“، ”موچی“ یا ”کمہار“ کا نہیں تھا۔ بجیلہ کو عجیب سی بے چینی ہونے لگی تھی۔ نہ جانے کیوں اور یہ بے چینی اس وقت بڑھ گئی جب وہ چائے لے کر اندر گئی۔ بظاہر

سب کچھ بہترین تھا۔ آنے والوں میں دو خواتین غالباً لڑکے کی ماں اور بھابی تھیں اور ایک صاحب لڑکے کے والد تھے۔ بجیلہ سلام کرنے کے بعد چائے سرو کرنے لگی۔ شاید وہ زیادہ دیر یہاں نہیں چاہتی تھی۔ خواتین نے اس سے ایک دو باتیں پوچھیں۔ ان کی نگاہوں میں اس کے لیے طور پر پسندیدگی تھی۔ بجیلہ چائے سرو کر کے فوراً آ گئی۔

”میں اتنا کیوں گھبرا رہی ہوں، ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا...... شاید ان کے قیمتی لباس، بیش قیمت زیورات اور رکھ رکھاؤ مجھے کنفیوز کر رہا ہے۔“ وہ سوچتی چلی گئی مگر کوئی ٹھوس وجہ ڈھونڈنے میں ناکام رہی۔

کچھ دیر بیٹھ کر وہ لوگ چلے گئے تھے اور جانے سے پہلے بجیلہ کو پسند کرنے کی خوش خبری بھی دے گئے تھے۔ پسند تو پہلے والے لوگ بھی کر چکے ہوتے تھے مگر ابا کی خاندانی ہونے کی گردان رشتے نہ کرنے کا سبب بن جاتی۔ بلکہ اماں ابا کو اب اپنے ہاں آنے کی دعوت بھی دے گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد ابا دروازہ بند کر کے اندر آئے تو بجیلہ ان کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔ اتنی خوشی، اتنا سکون تھا ان کے چہرے پر...... اماں بھی بے حد خوش نظر آ رہی تھیں۔

”بھئی یہ ہوئی ناں بات۔ کیسے نفیس لوگ ہیں ماشاء اللہ...... ان کے بولنے کا انداز، بیٹھنے کا طریقہ سب کس قدر متاثر کن تھا۔ دل خوش ہو گیا۔ بس میں اپنی بیٹی کے لیے ایسا ہی رشتہ چاہتا تھا۔ دیکھ لو بجیلہ کی اماں! تم مجھے ٹوکتی تھیں ناں، بھئی میں اپنی بیٹی کا برا تو نہیں چاہتا تھا ناں بس اتنی سی خواہش تھی کہ لوگ خاندانی ہوں۔ لڑکا اچھے کام سے لگا ہو۔ کم از کم کسی سے متعارف کرواتے وقت شرمندگی تو نہ ہو...... بس اللہ کا کرم ہوا ہے سب...... ورنہ تو وہی دو، دو ٹکے کے کام کرنے والے۔“ ابا کی سوئی پھر سے وہیں جا

اٹکی تھی۔ بجیلہ کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

اماں ابا کے لڑکے والوں کے گھر سے ہو آنے کے بعد باقاعدہ طور پر ہاں کر دی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی شادی کی تیاریوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ کپڑے، زیور، جوتے، برتن اور دوسری چھوٹی چھوٹی سیکڑوں چیزیں۔

”لڑکا ایک فرم میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ اپنا الگ گھر، ذاتی گاڑی وغیرہ وغیرہ۔“ ابا ہر آئے گئے کے سامنے وہی رٹے رٹائے جملے خوش ہو کر دہراتے۔ کوئی دل سے مبارک باد دیتا تو کوئی حیرانی سے تبصرہ کرتا۔

”شکر ہے جناب آپ کا دل بھی کسی رشتے پر راضی ہوا ورنہ بجیلہ کی عمر تو نکلی جا رہی تھی۔“

”ارے بھئی ”حسب نسب“ بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اب میں کیا اپنی بیٹی کا ہاتھ کسی للو پنجو کے ہاتھ میں تھما دیتا؟ بہت دیکھ بھال کر میں نے یہ رشتہ کیا ہے۔ لڑکے کے بارے میں تو بتا دیا ہے آپ کو لڑکے کے والد صاحب بھی ریٹائرڈ سرکاری افسر ہیں خیر ہے......“ ابا بھی تیار شدہ جواب منہ پر مارتے۔

☆☆☆

ہوتے ہوتے بالآخر بجیلہ کی شادی کا دن بھی آن پہنچا۔ میرون لہنگے میں سجی سنوری سی بجیلہ پر...... بے حد روپ آیا تھا۔ وہ عجیب سی بے چینی آج بھی بجیلہ کے دل میں تھی۔ جسے اس نے بالآخر گھر اور ماں باپ کو چھوڑنے سے منسوب کر دیا تھا۔ خواتین قریب آ آ کر بجیلہ کو دیکھ رہی تھیں۔ بچوں کا شور و غل، ہر طرف گہما گہمی...... دوسری طرف مردانے حصے میں بھی خوب ہجوم تھا۔ ابا کے تعلقات کافی وسیع تھے۔ اکلوتی بیٹی کی شادی، من چاہا رشتہ۔ ابا کافی مطمئن دکھائی دیتے تھے۔ بارات آ چکی تھی۔ اسٹیج پر دولہا اپنے دوستوں، بھائیوں اور کزنز کے ساتھ براجمان تھا۔ ابا دولہا کے والد کے ساتھ نشست جمائے بیٹھے

توبہ سے رزق کی حفاظت کرو

ارشاد رب العزت ہے اور ہم نے انہیں جو رزق عطا فرمایا ہے وہ اس میں سے راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ نے علم عطا کیا تو وہ بھی رزق ہے، اسے بھی خرچ کیا جائے یعنی دوسروں کو سکھایا جائے۔ اسی طرح صحت بھی رزق ہے تو کمزوروں کی مدد کر کے صحت سے صدقہ ادا کیا جائے۔ اولاد بھی رزق ہے، حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ بھیجتا ہے۔ وہ پیدا ہونے والے بچے کا رزق اس کی عمر اور اس کا کام لکھ دیتا ہے اور وہ سب بھی لکھ دیا جاتا ہے جو اسے اس دنیا میں ملنے والا ہے۔ آنکھ، کان اور عقل بھی رزق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آنکھ اور کان کو عقل کی کھڑکی کہا ہے اور قرآن مجید میں بار بار اسے استعمال کر کے غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ شکر کرنے سے رزق بڑھتا ہے، اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے رزق کو اس کی مرضی کے مطابق استعمال کرنا دراصل شکر کہلاتا ہے اور رزق کی ناشکری کرنے سے نعمت چھن جاتی ہے۔ قرآن مجید میں بہت سی ایسی قوموں کا ذکر ہے جنہیں خدا نے بے پناہ رزق اور جاہ و جلال سے نوازا۔ نعمتوں بھری زندگی دی جیسے فرعون، قوم عاد، قوم ثمود اور قوم صبا مگر ان قوموں نے نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے بجائے سرکشی کی تو ان کا انجام تباہی اور بربادی کی صورت میں ہوا۔

مرسلہ: انجم طاہر، کراچی

تھے۔ خوب چٹکلے چھوڑے جا رہے تھے۔ دولھا کے والد خاصے خوش مزاج بلکہ جگت باز تھے۔ ساری محفل کو انہوں نے اپنی طرف متوجہ کر رکھا تھا۔ ابا کو اپنے ایک پرانے دوست برکت صاحب کا انتظار تھا جو ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ کھانا کھلوا دیا گیا تھا۔ اس کے بعد رخصتی کا سوال اٹھا۔ برکت صاحب کا اب بھی کچھ پتا نہ تھا۔ کھانے کے بعد باہر کے لوگ تو تقریباً سب ہی جا چکے تھے اب سب اپنے رشتے دار اور دولھا والے موجود تھے۔ مردانے، زنانے کی قید ختم ہو چکی تھی۔ جمیلہ کی رخصتی سے چند ہی منٹ قبل برکت صاحب اچانک تشریف لے آئے۔ ابا انہیں دیکھ کر کھل سے گئے تھے۔ دیر سے آنے کی وجہ، برکت صاحب کی معذرت...... ان سب رسمی باتوں کے بعد ابا ان کا ہاتھ پکڑ کر آگے لائے۔

''آؤ میں تمہیں جلیل صاحب سے ملواتا ہوں...... دولھا کے والد۔'' برکت صاحب کی نظر جونہی جلیل صاحب کے چہرے پر پڑی تو وہ چلا اٹھے۔

''ارے...... جلیل! تم؟''

''یار برکت تم! واہ بھئی کیا اتفاق ہے...... کہاں ملاقات کروائی اللہ نے۔'' جلیل صاحب بھی جواباً چلائے تھے۔ ابا حیرت سے دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

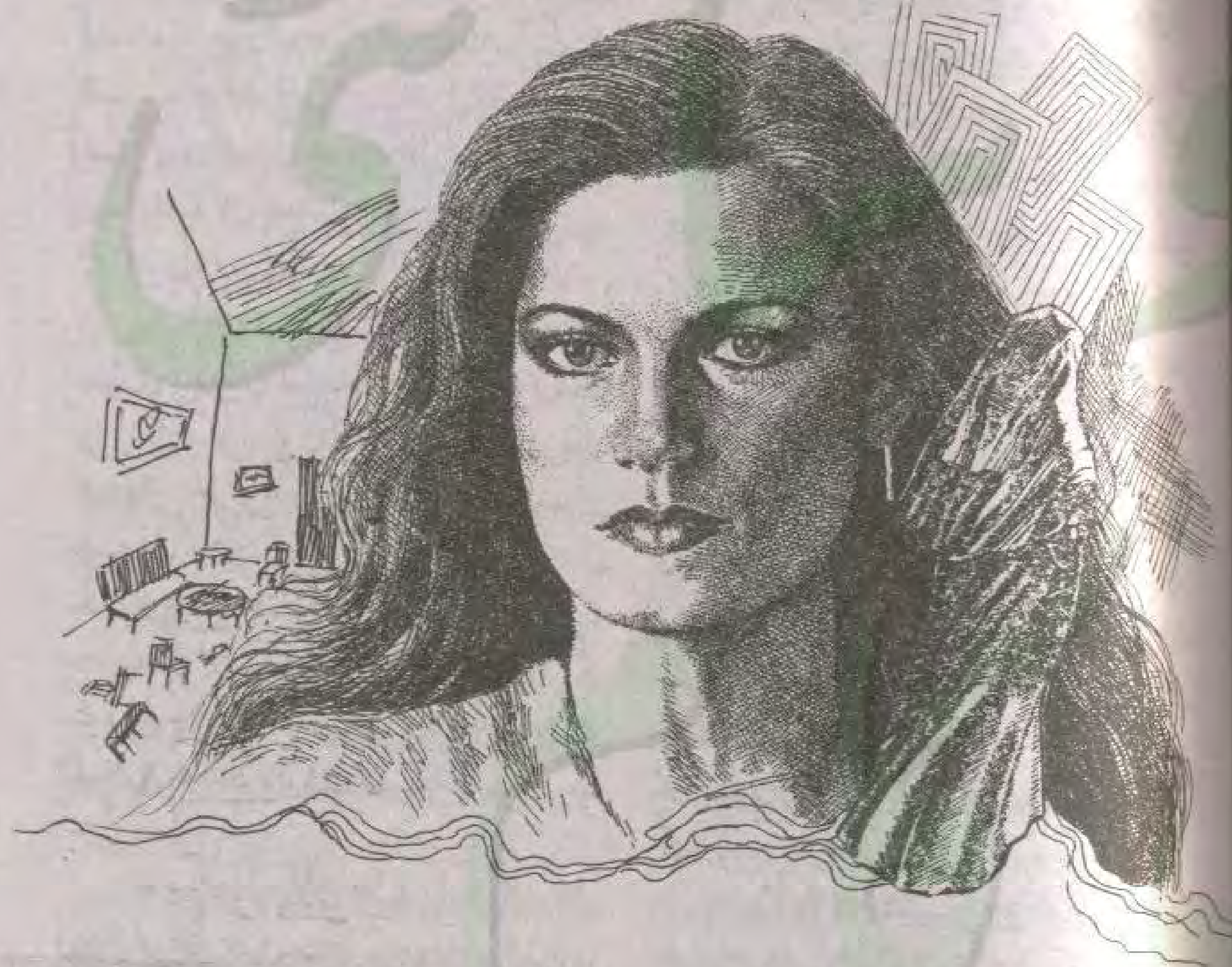
''بھئی آپ دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں...... برکت تم ذرا پہلے آجاتے تو جلیل صاحب کی اتنی مزیدار باتوں سے ضرور تم بھی لطف اندوز ہوتے...... ہنسا ہنسا کر پیٹ میں بل ڈال دیے انہوں نے تو......'' ابا اپنی ہی لے میں بولے جا رہے تھے۔ برکت صاحب پورے جوش سے بولے۔

''لو بھلا بتاؤ...... بھئی یہ جلیل محفل کو کشتِ زعفران نہیں بنائے گا تو اور کون بنائے گا...... ہاہاہا...... ارے بھانڈوں کا خون ہے...... یار...... اس کے ابا جی اور دادا جی ایسے مانے ہوئے بھانڈ تھے کہ زمانے میں ان کی مثال نہیں تھی...... ہاہاہا...... یہ تو جلیل نوکری میں الجھ گیا تو آہستہ آہستہ ان کا خاندانی پیشہ بھی اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا۔ ویسے یار جلیل! اگر آج بھی تجھ میں اتنا ٹیلنٹ ہے تو بھئی میں تو یہی کہوں گا کہ تو نے اپنا خاندانی پیشہ مٹی میں رول دیا...... ویسے رہا تو کہاں اتنا عرصہ...... یار اپنے جگری دوست کو بھی بھول گیا؟ بڑا تلاش کیا میں نے تجھے...... پتا نہیں کہاں جا بسا تھا تو؟'' برکت صاحب اپنے جوش میں ابا کے چہرے کی طرف دیکھنا بھی بھول چکے تھے۔ نظر آ رہا تھا تو بس اپنا بچھڑا ہوا دوست، خاندانی پیشہ ور بھانڈ...... جلیل صاحب جن کے بیٹے کا رشتہ ابا کی اکلوتی بیٹی جمیلہ سے طے ہوا تھا۔ وہ ابا جو ''حسب نسب'' کے نام پر گھر آئے مہمان کی تذلیل کرنے اور اسے گھر سے نکالنے میں ایک پل نہیں لگاتے تھے۔ شاید اللہ کو ان کا تکبر اور غرور پسند نہیں آیا تھا۔ ساری عمر خاندانی ہونے کو پرکھتے ہوئے آج وہ اس نام و نسب کے نام پر ہار چکے تھے۔ جمیلہ نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ابا کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ وہ خاموش تھے بالکل خاموش...... اماں بھی پتھرائی نظروں سے انہی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ جمیلہ نے اپنی نظریں دوبارہ جھکالیں۔

''بڑا بول...... تکبر...... اللہ کی ناراضی...... پکڑ...... سزا......'' اس سے آگے وہ کچھ نہیں سوچ سکی۔ آج اس کے دل میں پھیلی بے نام سی بے چینی کو عنوان مل گیا تھا۔ پنڈال میں برکت صاحب اور جلیل صاحب کے بے تکلف قہقہے اور مذاق اب بھی گونج رہے تھے...... ان کے قہقہوں میں چند رشتے داروں کی دبی، دبی سی ہنسی کی آوازیں بھی شامل ہو گئی تھیں۔

مکافاتِ عمل

اُمِ ثمامہ



لکڑی کے ٹوٹے پھوٹے دروازے پر ٹاٹ کا پھٹا ہوا پردہ لٹک رہا تھا اور اندرونی منظر کی حالت بھی کچھ ایسی ہی ناگفتہ بہ تھی...... سورج کی پیلی کرنیں منڈیروں پر چڑھ آئی تھیں مگر چارپائیوں پر ابھی تک سلوٹوں سے بھرے بستر دھرے تھے۔ باورچی خانے میں جھوٹے برتن اپنی قسمت کو رو رہے تھے۔ بچا ہوا کھانا یونہی کھلا پڑا مکھیوں کی ضیافت کا سامان مہیا کر رہا تھا...... خالہ بی بی سی سر پر دوپٹا باندھے واپڈا والوں کو کوس رہی تھیں۔ نام تو ان کا خیر النسا تھا مگر محلے بھر میں اطلاعات و نشریات کی ذمے داری ان کے ناتواں کندھوں پر ہونے کے سبب اب سب انہیں خالہ بی بی سی کے نام سے ہی پکارتے تھے۔

ناز و جلدی جلدی سرخی پاؤڈر لگا کر کالج جانے کی تیاری کر رہی تھی اور بالا آوارہ گردی مہم کے لیے روانہ ہونے لگا تھا۔

خالہ بی بی سی کے دو ہی بچے تھے نازو اور اقبال عرف بالا، دونوں نرے ماں کا ہی پرتو تھے، حامد خالو تین سال پہلے خالہ خیر النسا کے ظلم و ستم سہتے سہتے دارِ فانی سے کوچ کر گئے تھے، مکان ذاتی تھا بازار میں دو عدد دکانیں تھیں جن کا کرایہ آتا تھا اور کچھ محلے کی مدد امداد سے گزارہ ہو جاتا تھا۔ نازو اور بالے کے جانے کے بعد خالہ بی بی سی نے گھر کی ابتر حالت پر اِک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور دوپٹا کھول کر چادر کی طرح لپیٹ کر اپنے کام پر جانے کی تیاری شروع کی سب بکھیڑا جوں کا توں چھوڑا اور تالا لگا کر باہر کی راہ لی۔

خالہ بی بی سی بتول کے دروازے پر دستک دینے ہی والی تھیں کہ اندر سے بتول اور اس کے میاں ہاشم کے لڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ خالہ کان لگا کر کھڑی ہو گئیں۔ "چلو اچھا ہے ایک خبر سنانے آئی تھی ایک خبر اور مل جائے گی......" انہوں نے خوش ہوتے ہوئے سوچا، اچانک ہاشم باہر کے دروازے کی طرف آنے لگا۔ خالہ بی بی سی گھبرا کر گلی کے کونے کی طرف مڑ گئیں، ہاشم غصے میں بھرا باہر ایک طرف کو نکلا تو خالہ بی بی سی نے اس کے گھر کے اندر کی راہ لی۔

بتول چارپائی پر بیٹھی ٹسوے بہا رہی تھی۔ خالہ بی بی سی کو دیکھ کر جلدی سے دوپٹے سے منہ رگڑ ڈالا۔

"آؤ، آؤ خالہ صبح، صبح خیر تو تھی۔" وہ جھینپ مٹاتے ہوئے بولی اور چارپائی پر تھوڑا سا کھسک کر خالہ بی بی سی کے لیے جگہ بنائی۔

"ہاں، ہاں میری طرف تو سب امن چین ہے مگر یہ ہاشم میاں سویرے، سویرے تجھ سے کس بات پر لڑ رہے تھے......؟" انہوں نے ہمدردی کی آڑ میں ٹوہ لی۔

"بس خالہ کیا بتاؤں، چھ مہینے پہلے تک تو سب اچھا چل رہا تھا۔ آپ کو پتا ہے جس محکمے میں یہ کلرک ہیں وہاں اوپر کی آمدنی وافر ہوتی ہے، گھر میں ہر طرح کی خوشحالی تھی، موجیں ہی موجیں تھیں مگر جب سے مولوی عبداللہ کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگے ہیں ان کو جانے کیا ہو گیا ہے...... کہتے ہیں اب بس رزقِ حلال کماؤں گا اور توبہ کر کے اپنی اولاد کے پیٹ میں کوئی نوالہ حرام کا نہیں جانے دوں گا تاکہ وہ بڑی ہو کر نیک اور فرمانبردار بنے اور پھر مجھے بھی کہتے ہیں کہ اسی میں گزارہ کرنے کی عادت ڈالو جب آنکھ کھلے تبھی سویرا اور پھر وہ تو بہت رحمان ہے رحیم ہے...... پورے مولانا بن گئے ہیں۔ اپنے اور بچوں کے سردیوں کے کپڑوں کے پیسے مانگ رہی تھی پہلے سمجھاتے رہے، میں ضد کرنے لگی تو ڈانٹ ڈپٹ پر اتر آئے...... اللہ پوچھے مولوی عبداللہ کو میرے ہرے بھرے گھر میں قحط ڈال دیا، لوگ کسی کو کھاتا پیتا کہاں دیکھ سکتے ہیں۔" بتول نے دہائی دیتے ہوئے ماجرا کہہ سنایا۔

"ارے تو فکر مت کر کل میرے ساتھ جلالی بابا کے چلنا دو تعویذوں میں نیکی کا سارا بھوت نہ اتر جائے تو بی بی سی نام نہیں میرا...... ارے تیری باتوں میں بھول ہی گئی تجھے ایک کراری خبر سنانے آئی تھی...... وہ مسز طارق ہیں ناں کونے کے بنگلے والی سنا ہے ان کا بیٹا ولایت سے میم بیاہ کر لا رہا ہے۔ بیچاری مسز طارق اللہ جانے فرنگن اب اس عمر میں ان کا کیا حال کرے گی۔" خالہ بی بی سی نے افسوس کرتے ہوئے خبر نشر کی۔

"بس خالہ آج کل کی اولاد...... ہاں یاد آیا کل ان کے یہاں محفلِ میلاد بھی تو ہے اسی سلسلے میں دعائیں کروا رہی ہوں گی۔" دونوں نے ہنستے ہوئے مذاق اڑایا۔

"اچھا بتول اب میں چلتی ہوں...... ہاں یاد آیا

ذرا پاؤ بھر دودھ تو دینا، صبح سے چائے نہیں پی، وہ مہینے کے آخری دن چل رہے ہیں۔ ابھی تک کرایہ نہیں آیا ناں......"

"ارے خالہ آپ پہلے بول دیتیں، آپ کوئی مہمان تھوڑی ہیں میں ابھی بنا کر لاتی ہوں گرما گرم چائے...... بلکہ کھانا کھا کر جائیے گا، رات میں نے بڑے مزے کا قیمہ مٹر بنایا تھا۔" بتول جلدی جلدی کہہ کر کچن میں گھس گئی اور خالہ دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے گرما گرم چائے کا انتظار کرنے لگیں۔

"خالہ کل دوپہر میں آجانا، یہاں سے اکٹھے ہی مسز طارق کے یہاں چلیں گے اور تھوڑا انہیں اس فرنگن کے بارے میں بھی ہوشیار کر دیں گے۔ مالدار اور بوڑھی بیوہ ہے، اتنا فرض بنتا ہے ہمارا پڑوسی ہونے کے ناتے......" اگلے دن کا پروگرام بناتے، بناتے اسے اپنا مسئلہ پھر یاد آیا۔

"اور ہاں پرسوں ہاشم شہر سے باہر جائیں گے تو بابا جی کی طرف بھی چلیں گے۔" بتول بھی چائے کی قیمت وصول کرنا نہیں بھولی تھی۔ مٹر قیمہ خالہ نے ڈبے میں ڈلوا لیا تھا، دوپہر کا بھی تو کچھ انتظام کرنا تھا۔ کم بخت نازو نے کالج سے آ کر کون سا ہاتھ پیر ہلانے تھے۔

☆☆☆

"پیاری بہنو! آج کل ہم ایک قبیح اور سخت گناہ والی عادت میں اس قدر مبتلا ہو گئے ہیں کہ ہمارا کوئی دن اس کے بغیر نہیں گزرتا۔ آج کل اس گناہِ کبیرہ کو گپ شپ اور گوسپ کے رنگین ریپر میں لپیٹ کر استعمال کیا جا رہا ہے، ہمیں پتا ہی نہیں چلتا اور ہم باتوں، باتوں میں گھر اجاڑ دیتے ہیں، زندگیاں تباہ کر دیتے ہیں کسی کے بھی پاک دامن پر کیچڑ اچھالتے ہیں اور اپنے اوپر گناہوں کا بوجھ لادتے جاتے ہیں اس مہلک بیماری کا نام غیبت ہے۔ آقائے دو جہاں حضور ﷺ نے فرمایا۔ "لوگوں غیبت نہ کرو اور لوگوں کے چھپے عیبوں کے پیچھے نہ پڑو کیونکہ جو ایسا کرے گا اللہ کا معاملہ بھی اس کے ساتھ ایسا ہی ہو گا۔ اللہ تعالیٰ اسے اس کے گھر میں ذلیل و رسوا کر دے گا۔"

ملانی جی کی آواز ہال نما کمرے میں گونج رہی تھی اور ماحول پر اِک سکوت طاری تھا...... محلے کے مولوی صاحب عبداللہ کی بیوی عائشہ جنہیں سب ان کی نسبت سے ملانی جی ہی کہتے تھے۔ بڑی عالم فاضل عورت تھیں خود بھی حافظہ تھیں اور گھر پر بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم دیتی تھیں، مدرسے اور گھروں میں درس و تدریس کا سلسلہ بھی قائم کر رکھا تھا۔

مسز طارق کے یہاں ہال کمرا عورتوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا کیونکہ وہ ہمیشہ درس اور میلاد کے بعد شاندار سے کھانے کا اہتمام بھی ضرور کرتی تھیں۔

"ہر گناہ کی معافی اللہ تبارک و تعالیٰ کے پاس ہے مگر غیبت وہ قبیح گناہ ہے کہ اس کی بخشش اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب تک نہ ہو گی جب تک کہ وہ شخص معاف نہ کر دے جس کی غیبت کی گئی ہو۔" ہال کے... پُرنور ماحول میں نرم و ملائم آواز اک بار پھر سے ابھری۔

"چل بتول پچھلے محلے میں مینا بازار لگا ہے ذرا وہاں سے چکر لگا کر آتے ہیں...... کھانا کھلنے میں ابھی کافی وقت پڑا ہے۔ ملانی جی تو ایک بار شروع ہو جائے تو چپ ہی نہیں ہوتی۔" خالہ بی بی سی نے بتول کے کان میں سرگوشی کی...... اور پھر دونوں کسی ضروری کام کا کہہ کر آہستہ سے پیچھے سے ہی اٹھ گئیں۔

"ملانی جی اگر کسی شخص میں کوئی برائی ہو اور اس برائی کا ذکر کیا جائے تو کیا وہ بھی غیبت میں شمار ہوتا ہے۔" کسی نے اپنے علم میں اضافے کے لیے سوال کیا۔

"ہمارے پیارے آقا حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تمہارا اپنے کسی بھائی کا اس طرح ذکر کرنا کہ اسے ناگوار گزرے یہی غیبت ہے۔" برائی کے ہوتے ہوئے اس کا ذکر کرنا ہی غیبت ہے اور اگر وہ برائی اس شخص میں موجود ہی نہیں جس کا ذکر کیا جا رہا

ہے تو یہ تو بہتان ہوا ناں اور یہ غیبت سے بھی بڑا اور سنگین گناہ ہے۔ غیبت کرنے والے کی طرح غیبت سننے والا بھی اتنا ہی گناہ گار ہے اگر سننے والا غیبت کرنے والے کو پیار، محبت اور سختی سے روک دے تو کم از کم وہ اس کے سامنے یہ فعل نہیں دُہرائے گا...... اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کو سمجھنے اور اس پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے آمین!''

درس ختم ہو چکا تھا۔ ملانی جی بغیر کھانا کھائے ہی چلی گئی تھیں کہ انہیں ایک جگہ اور بھی درس دینا تھا اور باقی خواتین بڑے ذوق شوق سے چکن بریانی اور کھیر سے لطف اندوز ہو رہی تھیں بس چند ایک تھیں جنہوں نے خوفِ خدا سے لبریز ہو کر یہ عہد کیا تھا کہ وہ اب اس گناہ سے ہر ممکن بچنے کی کوششیں کریں گی...... بتول اور خالہ بی بی سی بھی چپ چاپ دسترخوان پر آ بیٹھی تھیں۔

ساری عورتیں ایک کے بعد ایک کر کے رخصت ہونے لگیں مگر خالہ بی بی سی رپورٹنگ کے لیے بیٹھی رہیں اور سب کو رخصت کرنے کے بعد جب مسز طارق پلٹیں تو خالہ کو ڈرائنگ روم میں لے آئیں اور ملازمہ کو اچھی سی چائے لانے کو کہا۔

''ارے بی بی، سنا ہے تمہارے ساتھ تو بڑا ظلم ہوا ہے، بیٹے نے نہ تمہاری بیوگی کا خیال کیا نہ بڑھاپے کا...... بس کیا زمانہ آ گیا ہے...... مگر میں بھی کہے دیتی ہوں بالکل منہ مت لگانا اس فرنگن کو اور بیٹے کو ماں کے واسطے دے کر دو بول کہلوا کر چلتا کرنا...... ارے تمہارے اتنے پڑھے لکھے اور خوب صورت بیٹے کے لیے رشتوں کی کیا کمی ہے۔'' خالہ بی بی سی نے اپنے اُسی انداز سے بات شروع کی۔

''ارے خالہ آپ نے جو سنا ہے وہ تو ٹھیک ہے مگر جس طرح آپ سمجھ رہی ہیں ویسا کچھ بھی نہیں ہے دراصل......'' مسز طارق نے بیچ میں بولنا چاہا مگر سامنے بھی تو خالہ بی بی سی تھیں۔

''ارے تم مجھے کہنا، ایک سے ایک حسین دکھاؤں گی کہ گوری میم کو بھول جائے گا تمہارا لونڈا...... پاکستان میں بھری پڑی ہیں ایسی لڑکیاں جو گرین کارڈ کے چکر میں تمام عمر تمہاری، چاکری کرے گی......'' خالہ بی بی سی کو اپنی خبر کے پکا ہونے کا سو فیصد یقین ہوتا تھا اس لیے دوسرے کو بولنے کا موقع دیے بغیر نان اسٹاپ بولے جا رہی تھیں۔

''ارے خالہ آپ میری بھی تو سنیے، اللہ کا لاکھ کرم ہے میرا علی بہت نیک اور سعادت مند بیٹا ہے۔ اس نے پہلے مجھ سے باقاعدہ اجازت لی تھی۔ مارگریٹ دینِ اسلام سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرنا چاہتی تھی، علی بھی اسے پسند کرتا تھا...... میں نے بہت خوشی سے انہیں اجازت دی ہے بلکہ اپنی بہو کا نام بھی میں نے ہی آمنہ علی رکھا ہے، بہت پیاری بچی ہے...... اکثر بات ہوتی رہتی ہے مجھے تو شدت سے انتظار ہے کہ وہ آئے اور اپنا گھر بار سنبھال لے......''

''ارے بی بی یہی تو اصل کہانی ہے بس دولت مند لڑکا دیکھ کر اسلام سے متاثر ہونے کا ڈراما رچایا ہو گا تم کیا جانو یہ انگریز کتنی چالاک قوم ہے اور تم ہو کہ گھر بار سب اس کے حوالے کرنے کی باتیں کر رہی ہو۔'' خالہ نے ایک بار اور انہیں سمجھانے بلکہ بہکانے کی کوششیں کی۔

''نہیں خالہ خرابی ہمیشہ بچوں میں نہیں ہوتی اگر ماں، باپ بڑے پن کا مظاہرہ کریں اور اپنی محبتوں کو قرض کی طرح وصول نہ کریں تو معاشرے میں بھی بگاڑ پیدا نہ ہو اور میں ہمیشہ اچھا ہی سوچتی ہوں بس اب تو آمنہ آئے اور میرا گھر بھی ننھی ننھی قلقاریوں سے گونج اٹھے۔'' مسز طارق نے آنے والے وقت کو سوچتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''اور ہاں خالہ جن گرین کارڈ کی دیوانوں کا آپ ذکر کر رہی ہیں وہ تو گرین کارڈ والے کو لے کر روانہ ہو جائے گی، میری چاکری کیا خاک کرے

گی...... اور پھر بہو چاکری کے لیے تھوڑی ہوتی ہے وہ تو آپ کے گھر کی رونق، آپ کے بچے کے دل کی ٹھنڈک اور گھر کی مالکن ہوتی ہے۔''

خالہ بی بی سی نے بدمزہ ہو کر ساری بات سنی اور اٹھ کھڑی ہوئیں کیونکہ اچھے لوگوں میں ان کی دال نہیں گلتی تھی۔

''بی بی تمہارا تو باوا آدم ہی نرالا ہے انوکھی ساس بننے جا رہی ہو ہمارا تو فرض تھا اونچ نیچ بتانے کا۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی گیٹ کی طرف چل دیں۔

☆☆☆

سرما کی نرم گرم دھوپ اپنے پر سمیٹ کر دیواروں سے کوچ کر رہی تھی، شام کا پنچھی پر پھیلائے منڈیروں پر بیٹھنے کو تیار تھا کہ خالہ بی بی سی اپنی اطلاعات ونشریات کی مہم پر باہر نکلیں ان کا رخ بتول کے گھر کی طرف تھا، وہ اسے کل جلالی بابا کے پاس لے کر گئی تھیں...... تھوڑی بہت خیر خبر بھی ہو جاتی اور پان چھالیا کا انتظام بھی ہو جاتا...... بابا جی کی طرف ان کا کمیشن فکس تھا وہ ایمان اور عقل کی ماری عورتوں سے ان کی داستان سنتیں اور جا کر بابا جی کو بتاتیں اور انہیں پھر لے کر پہنچ جاتیں...... بابا جی کہانی سے واقف ہونے کے پیشِ نظر بالکل صحیح حالات بتاتے اور آنے والی بے خبر عورت ان کے جال میں پھنس جاتی اور فی شکار سو دو سو خالہ بی بی سی کو بھی مل جاتے۔

''ارے ناس پیٹے تیرے پیچھے کون سی بلا لگی ہے جو یوں اندھے بیل کی طرح ٹکراتا پھر رہا ہے۔'' خالہ بی بی سی نے ابھی گلی کا نکڑ ہی پار کیا تھا کہ بالا آندھی طوفان کی طرح ان سے آ ٹکرایا...... خالہ نے دوہتڑ مار کر بیٹے کو پرے ہٹایا۔

''ارے پیاری اماں ایسی بمبار خبر لایا ہوں کہ تو سنے گی تو خوش ہو جائے گی...... ایسی خبر ہے کہ اگر تو اسے نشر کرے گی تو پورے محلے میں تیری ریٹنگ بڑھ جائے گی۔'' اقبال کے چہرے کی سرخی اور زبان

نہلے پہ دہلا

ایک کنجوس کے گھر مہمان آ گئے تو اس نے پوچھا۔ ''آپ لوگ کیا کھائیں گے؟''

مہمان نے جواب دیا۔ ''وہی جو آپ کھائیں گے۔''

میزبان نے کہا۔ ''میرا جی تو ہوا کھانے کو چاہ رہا ہے۔''

تب مہمان بولے۔ ''چلیے آپ ہوا ہی کھا لیجیے۔ ہم تو گھر کے ہیں گھر کی کوئی مرغی کاٹ کر پکا لیں۔ وہ ہمارے لیے دال برابر ہو گی۔''

مرسلہ: عذرا کنول، سمیرا کنول، ڈیرہ غازی خان

کی رفتار بتا رہی تھی کہ بات واقعی کافی تگڑی ہے۔

''اب پھوٹ بھی دے کہ ٹی وی والوں کی طرح پہلے دو گھنٹے بس بولتا ہی رہے گا۔'' خالہ بی بی سی کے لہجے میں اوپری بیزاری مگر اندر تجسس ہی تجسس تھا۔

''ارے اماں اتنی بڑی خبر ایسے کیسے سنا دوں، ذرا اپنے دوپٹے سے بندھی گرہ کو تو ہوا لگوا لو قسم سے دو دن سے گڈا گیم نہیں کھیلا۔'' وہ بھی خالہ بی بی سی کا ہی سپوت تھا۔

خالہ بی بی سی نے سختی سے بندھی گرہ کھولی اور اس میں سے دس روپے کا تڑا مڑا نوٹ نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا اور جو بات بالے نے بتائی وہ تو واقعی خالہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی بتول کے گھر کی طرف بڑھنے لگی۔

خالہ کے دروازہ بجانے پر بتول نے دروازہ کھولا اور سست قدموں سے واپس صحن میں بڑی چارپائی پر جا بیٹھی وہ کچھ پریشان اور الجھی ہوئی لگ رہی تھی۔

''ارے بتول کیا ہوا تو نے ہاشم میاں کو بابا جی کا وہ تعویذ میٹھی چیز میں ملا کر کھلایا؟''

''ہاں خالہ، اچھا ہوا تم آ گئیں ورنہ کسی بچے کو

بھیج کر میں تمہیں بلوانے ہی والی تھی تعویذ تو میں نے رات کو ہی کھیر میں ڈال کر کھلا دیا تھا...... مگر صبح اٹھتے ہی یہ کہنے لگے کہ ان کی طبیعت خراب معلوم ہو رہی ہے وہ آفس جا کر چھٹی کا کہہ آتے ہیں...... خالہ کچھ گڑبڑ نہ ہو جائے میرا دل گھبرا رہا ہے۔'' پچھتاوا لہجے میں خود بخود در آیا تھا۔

''ارے کم بخت جلالی بابا پر شک کر رہی ہے...... تو جانتی نہیں ہے ان کی کرامات اگر ہاشم میاں کی تھوڑی سی طبیعت خراب ہو گئی تو کیا ہوا...... کم عقل ذرا سوچ اگر ہاشم میاں طبیعت خرابی کی وجہ سے گھر پر رہیں گے تو مولوی عبداللہ سے دور رہیں گے تو ان کے دماغ کو تیری مرضی کے مطابق ڈھالنے میں بابا جی کو زیادہ آسانی رہے گی۔'' بتول کچھ کچھ سمجھ کر سر ہلانے لگی...... ''اور ہاں اب جلدی سے توبہ کر اور سو روپے کی کوئی میٹھی چیز بچوں میں بانٹ دینا کہیں ایسا نہ ہو بابا جی پر شک کرنے کی سزا میں عمل الٹا ہو جائے پھر روتی رہنا تمام عمر......'' انہوں نے اسے ڈرایا۔

''ارے نہیں خالہ، میری توبہ میرے باپ دادا کی توبہ...... تم ایسا کرو یہ سو روپے لو تم ہی بچوں میں شیرینی بانٹ دینا ہاشم کہاں ایسا کوئی کام کرنے دیں گے۔'' خالہ نے پلو سے خوشی، خوشی سو کا نوٹ لے کر باندھ لیا کہ اقبال اور نازو بھی تو بچے ہی تھے اور پھر بوڑھے بھی تو بچے ہی ہوتے ہیں۔

''ارے ان باتوں کو چھوڑ، کچھ خبر بھی ہے کیا غضب ہو گیا ہے محلے میں......'' انہوں نے ہمیشہ کی طرح سنسنی پھیلائی۔

''کیا ہو گیا خالہ؟'' بتول اب مطمئن تھی اور اس کا سارا دھیان ان کی بتانے والی خبر کی طرف تھا۔

''ارے قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں وہ مولوی عبداللہ اور ملانی کی بیٹی زہرہ ہے ناں...... وہ بھاگ گئی ہے، کیا زمانہ آ گیا ہے ماں باپ نمازیں پڑھنے اور لوگوں کو درس دیتے نہیں تھکتے اور اولاد کے ایسے لچھن...... کتنی نیک بی بی بنتی تھی ملانی ہمارے سر پر تو گناہوں کے ٹوکرے رکھے ہوں اب ملے تو پوچھوں گی! بی بی مسجد، مدرسے سے وقت نکال کر اولاد پر بھی توجہ دے لیتے تو آج یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔'' خالہ کو تو دل کی بھڑاس نکالنے کا اچھا موقع ملا تھا۔

''ارے خالہ تم کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی بھلا ایسے کیسے ہو سکتا ہے...... زہرہ تو کافی نیک اور شریف لڑکی تھی، آپ کو کسی نے غلط بتا دیا ہوگا۔'' بتول نے پان بنا کر انہیں دیتے ہوئے بے یقینی سے کہا۔

''ارے بی بی محلے میں کہیں بھی کچھ بھی ہو ہمیشہ پہلی خبر مجھ سے ہی ملتی ہے لوگوں کو اور آج تک ساری خبریں ایک دم پکی اور درست نکلی ہیں۔'' خالہ نے فخر سے سر اونچا کرتے ہوئے کہا...... ''ابھی ابھی مجھے بالے نے بتایا ہے، وہ ملانی جی کے گھر اپنے دوست کے ساتھ درس کا کہنے جا رہا تھا تو دروازے پر پہنچ کر اس نے خود سنا ملانی جی، مولوی صاحب سے کہہ رہی تھیں کہ زہرہ بھاگ گئی ہے اور تمہیں تو پتا ہے بالا اس معاملے میں پورا مجھ پر پڑا ہے۔ ذرا کہیں سے سن گن مل جائے تو پوری خبر لے کر آتا ہے......'' وہ اپنا کارنامہ گردن اکڑا کر بتا رہی تھیں۔

''اچھا...... اب میں چلوں تم نے تفصیل پوچھنے میں اتنی دیر کر دی اتنے وقت میں تو میں محلے کے سارے گھروں میں یہ دھماکا خیز خبر نشر کر دیتی۔'' خالہ نے ہاشم کے آنے سے پہلے ہی جانے کا قصد کیا کیونکہ اسے ان کا یہاں آنا اور اس کی بیوی سے ملنا جلنا پسند نہیں تھا۔

''اور ہاں دیکھا ایک دن میں تم نے جلالی بابا کا کمال...... اب کس منہ سے مولوی عبداللہ دوسروں کو تبلیغ کریں گے، توبہ کرنا اور سب کچھ اسی طرح سے کرنا جیسا انہوں نے سمجھایا تھا۔'' وہ جاتے جاتے جتانا نہیں بھولی تھیں۔

خالہ بی بی سی کے باہر نکلتے ہی زہرہ کے بھاگ جانے کی خبر ایک کھڑکی سے دوسرے دروازے اور دوسرے دروازے سے تیسرے آنگن تک پھیلتی چلی گئی، جس نے سنا دانتوں میں انگلی دبالی کہ ایسے نیک ماں، باپ کی ایسی اولاد......

گلی کے کونے میں آخری بنگلا مسز طارق کا تھا...... وہ انہیں بھی رپورٹ دینے چل دیں اور انہیں حقیقتاً دکھ ہوا کیونکہ وہ خود ایک دین دار اور نیک عورت تھیں مگر انہوں نے خالہ سے یہ بھی ضرور کہا۔ ''بات کو بنا تصدیق آگے نہیں پھیلانا چاہیے مجھے تو یقین نہیں آتا زہرہ بیٹی...... ایسی تو ہرگز نہ تھی میں خود جاؤں گی، ان کی طرف آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو گی۔''

''لو بھلا بی بی تمہارا تو دماغ چل گیا ہے...... اب ایسی خبر کی تصدیق کرنے بھلا کون جائے گا کہ لو بی بی مبارک ہو تمہاری بیٹی نے اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اب تم اس پر تصدیق کی مہر لگا دو، ایسی باتیں تو نہ پوچھی جاتی ہیں نہ بتائی جاتی ہیں یہ تو خود جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی ہیں...... ہاں۔'' وہ کہہ کر اپنی چادر سنبھالتے ہوئے گیٹ سے باہر نکلیں...... مسز طارق کے یہاں آ کر وہ ہمیشہ بدمزہ ہوتی تھیں مگر عادت سے مجبور چلی بھی آتی تھیں، سامنے مولوی صاحب کا گھر نظر آ رہا تھا۔ دروازہ کس کر بند تھا اور اندر خاموشی کا مکمل راج تھا۔

خالہ بی بی سی ابھی اپنے گھر کی طرف مڑنے ہی لگی تھیں کہ مولوی صاحب کے دروازے کے آگے اک چمچماتی کار آ کر رکی...... خالہ کے پُرتجسس قدم اسی طرف بڑھ گئے...... گاڑی میں سے ایک لڑکی ایک بڑی عمر کی عورت اور ایک درمیانی عمر کا مرد نمودار ہوئے، ہاتھ میں مٹھائی کے ٹوکرے اور تحفے تحائف بھی پکڑے ہوئے تھے۔ معاملہ کچھ خاص ہی تھا خالہ ٹھہرے ہوئے قدموں سے کار کے آگے سے گزرنے لگیں۔

''سنیے یہ مولوی عبداللہ کا گھر ہے ناں......؟'' بڑی بی نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سامنے سے گزرتی خالہ بی بی سی کو ہی کیا پکار لیا۔

''جی یہی گھر ہے مگر آپ لوگوں کو پہلے نہیں دیکھا...... کوئی رشتے داری وغیرہ ہے کیا؟'' خالہ بھی اپنی ٹوہ لینے کی عادت سے مجبور تھیں سو پوچھنا ضروری سمجھا۔

''ارے بہن رشتے داری ہے تو نہیں مگر بن جائے گی...... ہم اس گھر میں زہرہ بیٹی کا رشتہ لے کر آئے ہیں...... میں نے اپنی ایک عزیزہ کے گھر اس بچی کو میلاد پڑھتے دیکھا تھا، بس بچی دل میں سما گئی...... ہمارا بیٹا ڈاکٹر ہے مگر بہت دین دار بھی ہے اسے ایسے ہی شریف گھرانے کی کوئی صوم وصلوٰۃ کی پابند لڑکی چاہیے تھی۔'' بڑی بی کافی خوش اخلاق اور خوش گفتار بھی تھیں۔

اور پھر دروازے پر کھڑے، کھڑے ہی خالہ بی بی سی نے انہیں من وعن وہ ساری کہانی سنا دی جو وہ سارے محلے کو ابھی سنا کر آ رہی تھیں بلکہ تین چار باتوں کا اپنی طرف سے اضافہ بھی کر لیا تھا۔ وہ سارے لوگ اسی وقت توبہ، توبہ کرتے گاڑی میں سوار ہو کر واپس روانہ ہو گئے اور خالہ بھی سوچتی مسرور سی گھر کو روانہ ہوئیں کہ انہوں نے سچ بتا کر لڑکے والوں کو برائی سے بچا لیا۔

''بالے مجھے آلو لا دے، اماں آنے والی ہوں گی ان کے آنے سے پہلے پکا لوں ورنہ شامت آ جائے گی......'' نازو دس کا نوٹ لے کر کب سے بھائی سے کہہ رہی تھی جو مزے سے ٹی وی کے آگے بیٹھا جلیبیاں کھاتے ہوئے جلیبی بائی دیکھ رہا تھا۔

''ہاں، ہاں خود تو کب سے بج سنور کر عالیہ کے گھر گئی ہوئی تھی اس کے کزن کے چکر میں...... اب آدھا دن گزر گیا تو آلوؤں کی یاد آ گئی، آنے دے اماں کو بتاؤں گا تیرے سارے کرتوت۔''

بڑی بہن کا کچھ لحاظ تھا۔

"اچھا خود، تو جیسے حاجی ہے ناں، میں نے کل خود دیکھا تھا گلی کے پچھواڑے میں سگریٹ سلگا کر بیٹھا تھا اب بول......" دونوں اپنے، اپنے کھاتے کھول کر بیٹھ گئے اور جب اماں اپنی ڈیوٹی نپٹا کر گھر لوٹی تو لڑائی زوروں پر تھی اور ایسے، ایسے انکشافات ہو رہے تھے کہ خدا کی پناہ۔

"ارے کم بختوں کیا ہر وقت چیل کوؤں کی طرح لڑتے رہتے ہو، چپ ہو کر بیٹھو ورنہ اٹھاؤں مولا بخش۔"

بالا چپ چاپ آلو لینے چلا گیا اور نازو جلدی جلدی روٹیاں پکانے چل دی، بھوک تو اسے بھی لگ رہی تھی۔ عالیہ اور اس کا کزن دونوں ہی مہا کنجوس تھے مگر بس ٹائم پاس کرنے وہاں چل دیتی تھی۔

"ارے اماں بالا جو بتا رہا ہے وہ سچ ہے کیا۔ مجھے تو بڑی، بڑی باتیں کرتی تھی کہ پردہ کیا کرو اور خود پردے میں یہ گل کھلا رہی ہیں محترمہ...... اللہ معاف کرے دنیا میں کیسے، کیسے لوگ ہیں۔" نازو نے جلدی جلدی روٹیاں پکاتے ہوئے اظہارِ خیال کیا اور خالہ اسے گاڑی والوں کا قصہ سنانے لگیں۔

☆☆☆

شام کے سائے آنگن کے آدھے سے زیادہ حصہ پار کر چکے تھے۔ زہرہ فرش دھو کر صحن میں چارپائیاں ڈال رہی تھی۔ ناظرہ قرآن پاک پڑھنے والے بچے آنے ہی والے تھے۔ زہرہ انہماک سے چنبیلی کے اس بوٹے سے پیڑ پر بیٹھی بھیگی چڑیا کو دیکھ رہی تھی جو چنبیلی کے پیڑ کو نہلاتے ہوئے پائپ کی دھار سے بھیگ چکی تھی اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ چنبیلی کے پیڑ سے گرتے خوشبودار قطروں کو پودوں میں جذب کرتی دروازہ کھولنے چل دی۔

"السلام علیکم خالہ!" زہرہ نے دروازے کے پار کھڑی خالہ بی بی سی کو دیکھ کر سلام کیا۔ خالہ ہکا بکا ہو کر زہرہ کی طرف دیکھنے لگیں۔

"ارے یہ کب واپس آئی، رستے میں پکڑی گئی ہوگی، لے آئے ہوں گے مولوی صاحب اور سوچا ہوگا اندر ہی اندر کسی کو پتا نہیں چلے گا مگر نام بھی بی بی سی ایسے ہی تو نہیں پڑا۔" انہوں نے اپنے ہی دل میں مسکراتے ہوئے سوچا۔

ملانی جی تخت پر بیٹھی قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں تھوڑی دیر میں قرآن پاک رکھنے کے بعد خالہ کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"السلام علیکم خالہ! کیسی ہیں آپ، آج ہمارے غریب خانے کا چکر کیسے لگالیا؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"بس یونہی اِدھر سے گزر رہی تھی سوچا تمہاری خیر خبر لے لوں، دو تین دن ہوئے تم گھر سے باہر نہیں نکلیں اور کل تو مولوی صاحب نے بھی نماز نہیں پڑھائی خیر تو تھی؟" خالہ نے ذرا قریب ہوتے ہوئے پوچھا۔

"بس یونہی ایک پریشانی آن پڑی تھی مگر اب اللہ نے خیر کر دی ہے بڑا کرم ہے مولا کا۔" دوسری طرف سے تشکر بتایا گیا۔

"ملانی جی!" انہوں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "زہرہ کب واپس آئی۔ کیا مولوی صاحب خود لے کر آئے ہیں... سنا تو یقین ہی نہیں آیا تھا؟" دھیرے سے کہہ کر خالہ بی بی سی نے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔

"مگر خالہ، زہرہ کہاں گئی تھی آپ کیا پوچھ رہی ہیں، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا؟" انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اب بنو مت سب پتا ہے مجھے۔ ایسی باتیں بھلا چھپتی ہیں؟ تم اور مولوی صاحب تو سارا دن اللہ اللہ کرتے رہتے ہو اب اولاد کیا گل کھلا رہی ہے کیا پتا چلتا ہے...... مجھے تو خود بالے نے بتایا تھا تم مولوی صاحب سے کہہ رہی تھیں کہ زہرہ بھاگ گئی ہے۔" ذرا سا طنزیہ مسکراتے ہوئے انہوں نے وضاحت کی۔

"اللہ رحم کرے خالہ میری زہرہ تو بہت باحیا اور فرمانبردار بچی ہے۔ وہ تو پرسوں میں مولوی صاحب کو ان کی بہن کی بیٹی کی بابت بتا رہی تھی اس کا نام بھی زہرہ ہے اور پھر اتنا قریبی رشتہ ہے پریشانی تو فطری عمل ہے، کل مولوی جی سارا دن وہیں تھے مگر اللہ کے کرم سے بچی صحیح سلامت گھر واپس آگئی ہے۔ بس سہیلیوں کے کہنے میں پڑ گئی تھی۔ آپ بھی ناں کیا، کیا سوچ رہی ہیں ارے زہرہ بیٹی، خالہ کے لیے چائے بنا کر لاؤ۔" ملانی جی نے انہیں اصل بات بتاتے ہوئے باورچی خانے میں آٹا گوندھتی زہرہ کو آواز دی۔

"نہیں، نہیں، اب میں چلتی ہوں مجھے دیر ہو رہی ہے۔" خالہ نے چادر سنبھالی اور جلدی سے باہر نکل گئیں۔ زہرہ کا رشتہ لے کر آنے والوں کو واپس بھیجنا، سارے محلے میں بنا تصدیق بے چاری معصوم بچی کو بدنام کرنا...... گلی کا نکڑ پار کرتے کرتے خالہ بی بی سی کے ذہن میں بہت ساری باتیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

"ارے کم بخت ساری برادری میں ہماری ناک کٹوادی بڑھاپے میں منہ کالا کر دیا۔ تیرے اور تیری ماں کے پیچھے میں نے کبھی اپنی گھر والی اور بچوں کی بھی نہیں سنی اور اب ان سے نظر ملانے کے قابل نہیں رہا...... آنے دے تیری ماں کو بڑی بی بی بنی پھرتی ہے، اپنے گھر میں ڈراما چل رہا ہے اور لوگوں کی خبریں ڈھونڈتی پھرتی ہے۔"

خالہ بی بی سی جیسے ہی دروازے پر پہنچیں رمضان کی تیز تیز بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ خالہ نے ٹاٹ کا پردہ ہلکا سا سرکایا۔ صحن میں ایک چارپائی پر رمضان غصے سے لال پیلا ہو کر ہانپ رہا تھا اور دوسری طرف نازو منہ چھپائے رو رہی تھی اور سامنے والی چارپائی پر وہ سارا سامان بکھرا پڑا تھا جو رمضان نے نازو کو منگنی کے موقع پر ڈالا تھا۔ بیوہ بہن کا خیال کرتے ہوئے اس نے نازو کو اپنے بڑے بیٹے ندیم کے لیے مانگ لیا تھا۔

"آؤ، آؤ تمہیں فرصت مل گئی محلے کی پریڈ سے ...... کبھی اپنے گھر کی بھی خبر لے لیا کرو۔ دیکھو کیا چاند چڑھایا ہے تمہاری لاڈلی نے۔" رمضان نے چبا، چبا کر ایک، ایک لفظ ادا کیا اور کھا جانے والی نظروں سے بہن کو گھورنے لگا۔

"ارے ایسا کیا غضب ہو گیا بھیا جو یوں چلّا، چلّا کر تماشا لگا رہے ہو، مانا کہ عید، شب برات پوچھ لیتے ہو اور یہ سارا سامان کیوں بکھرا ہوا ہے؟" انہوں نے چادر اتار کر چارپائی پر رکھی اور بدلحاظی سے بڑے بھائی سے رعب سے پوچھا۔

"تمہاری لاڈلی کالج جانے کے بہانے اپنے یاروں کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔ مجھے پہلے ہی ڈھکے چھپے لفظوں میں ندیم نے اس بابت بتا دیا تھا مگر میری آنکھوں پر بہن اور یتیم بھانجی کی محبت کی پٹی بندھی تھی مگر آج ندیم نے خود رنگے ہاتھوں اس بدذات کو ایک مکان سے پکڑا ہے اور ساتھ ہی یہاں لایا ہے...... سنبھالو اس گناہوں کی پوٹلی کو اور میرا تو تعلق ختم ہوا بس میں تو بھر پایا اس رشتے سے۔" رمضان غصے سے چارپائی کے پاس رکھے اسٹول کو ٹھوکر مار کر باہر نکل گیا۔

خالہ بی بی سی نے روتی ہوئی نازو کو دیکھا چارپائی پر بکھرے سامان کو اور اس کے کانوں میں ملانی کی آواز گونجنے لگی۔

"لوگوں غیبت نہ کرو جو ایسا کرے گا اللہ تعالیٰ اسے اسی کے گھر میں ذلیل و رسوا کر دے گا۔"

سارے محلے کی خبر رکھنے والی خالہ بی بی سی کل خود ایک بڑی خبر بن چکی تھی یہ سوچتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں مگر اب یہ آنسو اس گناہ کبیرہ کا مداوا نہیں کر سکتے تھے جو وہ ساری عمر کرتی آئی تھیں کہ اب مکافاتِ عمل کا وقت آن پہنچا تھا۔



اک نئے موڑ پر

رضوانہ پرنس

پانچواں حصہ

کبھی منزل ، کبھی رستہ کوئی کیسے بدلتا
ہمیں معلوم ہی کب تھا کوئی کیسے بدلتا
یقیں سے بے یقینی کے سفر تک ساتھ تھا میر
بدل کر اس نے دکھلایا کوئی کیسے بدلتا

راہِ زیست کبھی پُرخار و پُرپیچ تو کبھی رواں دواں ہوتی ہے۔ اسی راہ پر سفر کرتے ہوئے اجنبی مسافروں سے آشنائی، کبھی منزل کی جانب رہنمائی کرتی ہے تو کبھی راہ گم کردیتی ہے... ایسے ہی ایک مسافر کا دلگداز احوال جو منزل پر پہنچا تو ضرور مگر کیسے...؟

شوبز کی دنیا کے اسرار سے پردے اٹھاتی، گراتی ایک دل فریب روداد



"کون سی خواہش؟" شہزادی نے اپنے دل کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے جب ان کو بتایا کہ مجھے فقیر محمد نام اچھا نہیں لگتا تو انہوں نے فوراً ہی مجھے اجازت دے دی کہ میرے نام کی مناسبت سے آج سے میں انہیں راجا کہہ کر بلا سکتی ہوں بلکہ انہوں نے درخواست کی ہی ہے کہ تم اماں اور ابا سب انہیں راجا ہی کہہ کر بلاؤ۔ شاید ابھی انہوں نے ابا اور اماں کو یہ بات بتا بھی دی ہو۔ اچھا شہزادی آج رات ہوٹل میں ولیمہ ہے، مجھے ابھی بیوٹی پارلر بھی جانا ہے۔ رات تم بھی بہت اچھی طرح سے تیار ہوکر آنا۔" امیمہ کے دوبارہ آواز دینے پر عجلت میں ایک ہی سانس میں سب کچھ بتاتے ہوئے وہ کمرے سے باہر چلی گئی جبکہ شہزادی بے یقینی کی کیفیت میں بیٹھی رانی کے جاتے ہوئے قدموں میں اپنے خوابوں کو کچلتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

تو جو بدلا بدل گئے ہم بھی
پیار کرتے تھے بندگی تو نہیں
وقت لٹ جائے گا بہر صورت
تو کوئی شرطِ زندگی تو نہیں

ٹی وی پر ایک مشہور گلوکارہ بہت جذب کے ساتھ اپنی پرُسوز آواز میں یہ غزل گا رہی تھی۔ زنیرا نے چائے کا مگ فاران کے آگے رکھتے ہوئے جیسے ان بولوں کو دل میں اتار لیا۔ اجالا جو سامنے ہی صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی اس نے بہت دزدیدہ نظروں سے فاران کی جانب دیکھا۔

وقت کٹ جائے گا بہر صورت
تو کوئی شرطِ زندگی تو نہیں

اس نے زیرِلب یہ شعر گنگنایا تھا۔ فاران نے چائے کا سپ لیتے ہوئے دوبارہ اپنی نظریں اسکرین پر جمادیں۔ اسے بھی شاید یہ غزل اچھی لگ رہی تھی۔ ایک لمحے کو اس کی نگاہیں زنیرا کے چہرے کی جانب بھی اٹھی تھیں جو بظاہر بہت بے پروائی سے گرم، گرم پکوڑوں کی پلیٹ اجالا کو آفر کررہی تھی لیکن اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ یہ اشعار اس کے دل کی مکمل عکاسی کررہے ہیں تبھی تو اس نے کچھ لمحے بعد ریموٹ اٹھا کر ٹی وی کی آواز بہت تیز کردی تھی جسے اجالا کے علاوہ فاران نے بھی نوٹ کیا تھا۔

لائٹ پنک کاٹن کے سوٹ میں اس کے چہرے کا رنگ مزید گلابی ہورہا تھا۔ اجالا کے ساتھ جب سے اس نے اپنی زندگی کے بے حد اذیت ناک لمحات شیئر کیا تھا اسے اپنا آپ بہت ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا تھا۔ خاص طور پر اپنی زندگی کا وہ ذلت آمیز لمحہ جسے وہ کبھی بھول ہی نہیں پارہی تھی اور جسے سوچ کر وہ بار بار مرتی رہی تھی اس نے جب اجالا کو بتایا تھا تو اس وقت بھی اس کے دل کا سارا درد جیسے اس کی آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔

"اجالا اس نے جس نفرت اور کراہیت سے مجھے دھکا دیا تھا وہ لمحہ میرے دل کے اتنے اندر تک اتر گیا ہے جو شاید میری زندگی کی آخری سانس تک میرے دل کے بند ہوجانے کے بعد بھی اس سے باہر نہیں نکل سکے گا۔" اس کے لہجے میں اتنا زیادہ کرب سمٹ آیا کہ اجالا بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔ الفاظ بھی جیسے گونگے ہوگئے۔ اس نے بھی کبھی فاران کو شدت سے چاہا تھا اسے کھودینے کی اذیت کو بھی سہا تھا لیکن اپنے ٹھکرائے جانے کا غم منانے کے بجائے اس نے فوراً ہی عدیل کا ہاتھ تھام کر فاران پر یہ جتا دیا تھا کہ اسے بھی فاران کی کوئی پروا نہیں...... لیکن زنیرا تو ایسا کچھ بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اجالا سے تو فاران نے کبھی اپنے کسی جذبے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود اسے فاران کا انکار اپنے لیے ایک انسلٹ کے مانند لگا تھا لیکن زنیرا کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کے بعد اسے بالکل اجنبی کردینا اجالا

کے لیے ایک ایسا انکشاف تھا جس پر وہ ششدر تھی۔

"زنیرا تم بہت بہادر لڑکی ہو...... بہت سی عورتیں اپنے بچوں کی خاطر سخت ترین حالات کا سامنا کرتے ہوئے اپنی پوری زندگی گزار دیتی ہیں لیکن تم تو پھولوں کی سیج سے ایک دم کانٹوں بھرے بستر پر آکر بھی اپنے چہرے پر خوشی کا ماسک چڑھائے اپنے پیاروں کو ہر فکر سے آزاد کیے ہو۔" اجالا نے اس کے رخساروں پر بہتے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے بہت بوجھل لہجے میں کہا۔

"اجالا اب میرا دل ہر احساس سے خالی ہوچکا ہے۔ اب کسی قسم کے کوئی بھی جذبات میرے اندر ہلچل نہیں مچاتے۔ بس اپنے بچوں میں مگن رہ کر مجھے سکون ملتا ہے۔ انہیں اپنے باپ کا پیار حاصل ہے، وہ اپنے بابا کے تحفظ کی چھاؤں میں ہیں۔ میرے لیے یہ بات سب سے اہم ہے۔" زنیرا نے یہ کہتے ہوئے جب اجالا کی طرف دیکھا تو وہ نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

"دیکھو زنیرا تم برا مت ماننا لیکن میں تمہاری بات سے ایگری نہیں کرتی...... ٹھیک ہے تمہارے دل میں فاران کے لیے کوئی جذبات نہیں جاگتے لیکن ایسا ہو نہیں سکتا کہ اس کی محبت تمہارے دل سے مکمل طور پر ختم ہوگئی ہو۔ زنیرا تم یقین کرو کہ فاران بھی کبھی نہ کبھی لوٹ کر ایک بار پھر تمہارے پاس واپس ضرور آئے گا...... پلیز تم بھی اس کی واپسی کے لیے اپنے دل کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ضرور رکھو۔" اجالا کے سمجھانے پر وہ بھڑک ہی تو اٹھی۔

"ہرگز نہیں...... اجالا پلیز مجھے اب دوبارہ یہ مشورہ مت دینا...... انہیں اپنی دنیا میں مست اور مگن رہنے دو...... دولت اور شہرت کا نشہ جب اترے گا اور تنہائی ان کو سانپ کی طرح کاٹنے کو دوڑے گی تب ہی انہیں شاید میری ضرورت محسوس ہوگی لیکن اس وقت میں بھی انہیں اسی نفرت اور کراہیت سے پیچھے ہٹاؤں گی۔ اجالا اب مجھے صرف اسی وقت کا انتظار ہے۔" اس کا ایک، ایک لفظ نفرت کے زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے زنیرا لیکن اُس وقت کے انتظار میں تم کیوں اپنی زندگی کو بے رنگ بنا کر جی رہی ہو...... اگر فاران خوشیوں اور خواہشوں سے سجے دنوں کو انجوائے کررہا ہے تو تمہیں بھی چاہیے کہ اپنی زندگی کو صرف اپنے بچوں کے لیے وقف نہ کرو...... ان کے ساتھ ساتھ اپنا بھی اتنا ہی خیال رکھو جتنا ان کا رکھتی ہو...... پیسوں کی تمہارے پاس کمی نہیں...... جم جوائن کرو، بیوٹی پارلر جایا کرو، پتا نہیں کب سے تم نے فیشل نہیں کرایا ہے، تمہارے بال کٹنگ مانگ رہے ہیں تم اتنی حسین، اتنی پیاری ہو، اپنے حسن میں جتنے چار آٹھ چاند لگا سکتی ہو لگاؤ...... فاران کو بھی تو احساس ہو کہ وہ اللہ کے بخشے ہوئے کتنے حسین تحفے کو گنوا رہا ہے۔ ایسے موقع پر مجھے ایک شعر یاد آرہا ہے جو تم پر بہت سوٹ کررہا ہے۔

روز روتے ہوئے کہتی ہے زندگی مجھ سے
صرف اِک شخص کی خاطر مجھے برباد نہ کر"

یہ لڑکی کتنے خوب صورت طریقے سے اس کے بجھے ہوئے دل میں اپنی باتوں سے ایک روشنی سی بکھیر دیتی تھی۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی اجالا وہ اپنی زندگی تو جی ہی نہیں رہی تھی۔ اپنی خوشیوں کو تو اس نے جیسے کسی کنویں میں پھینک دیا تھا۔ اب اس کی زندگی فاران کی سرد مہری اس کی بے رخی اور بچوں کی خوشیوں سے عبارت تھی۔ وہ خود تو کہیں بھی نہیں تھی...... اللہ نے جو اسے زندگی بخشی تھی اسے تو اس نے دوسروں کے حوالے کردیا تھا۔

"ہاں مجھے اپنے لیے بھی جینا ہے۔" اس نے بے اختیار اجالا کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"اجالا اگر تم نہ آتیں تو میں کیا کرتی...... سچ تم بہت اچھی ہو...... اجالا میں تمہاری موجودگی میں ہی اپنے آپ کو بدلنے کی پوری کوشش کروں گی۔" اور پھر

اس شام وہ اجالا کے ساتھ شہر کے سب سے اچھے اور مہنگے بیوٹی پارلر میں گئی...... دو تین گھنٹوں کے بعد وہ دونوں جب گھر لوٹیں تو زنیرا کا لک اتنا بدلا ہوا تھا کہ بچوں نے بھی حیران ہو کر اسے دیکھا تھا۔ بالوں کا بہت خوب صورت اسٹائل اس پر کچھ زیادہ ہی سوٹ کر رہا تھا...... مہنگے ترین فیشل نے اس کے چہرے کو ایسا نکھار اور چمک دے دی تھی کہ خود اجالا کی نگاہیں اسے بار بار دیکھنے پر مجبور ہوئی جا رہی تھیں۔

''واؤ...... مما آپ کتنی پیاری لگ رہی ہیں بالکل ایک فیری کی طرح......'' روشی نے بے اختیار اس کے رخساروں کو چوم لیا تھا۔

''اللہ نے اسے کتنے حسن سے نوازا ہے لیکن وہ اسے برتنا نہیں جانتی۔'' اجالا نے اسے دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں سوچا تھا۔ وہ جب سے یہاں آئی تھی فاران اسے خصوصی توجہ دیتا رہا تھا۔ زنیرا کو اگنور کر کے جب وہ اسے اہمیت دیتا اس کی خاطر میں بچھ بچھ جاتا تب بھی اجالا کے دل میں عام عورتوں کی طرح کوئی خوشی نہیں جاگتی تھی۔ وہ جو بھی اس کی آرزو کا مرکز رہا تھا اب اس کی نگاہِ التفات اپنے اوپر محسوس کر کے وہ کچھ الجھ سی جاتی تھی۔ زنیرا کے لیے دل کڑھنے لگتا تھا اور آج زنیرا کو بیوٹی پارلر لے جانا بھی اس کے پلان کی ایک کڑی تھی۔ وہ فاران کو زنیرا کی طرف دوبارہ مائل کرنے کے لیے جو کچھ بھی کر سکتی تھی وہ کر رہی تھی...... جانتی تھی کہ فاران آج کل بہت ٹوٹا ہوا سا ہے اور کوئی بھی بڑھا ہوا ہاتھ اسے بہ آسانی اپنی طرف کھینچ سکتا ہے۔ اجالا کو یہاں تک بھی محسوس ہوا تھا کہ جیسے فاران کی نظریں اس سے کہہ رہی ہوں کہ وہ اسے اپنی محبت کی پناہوں میں لے لے، وہ اسے ٹھکرا کر پچھتا رہا ہے...... اجالا کو اس کی آنکھوں میں چھپی ایک عجیب سی تشنگی پریشان کرنے لگی تھی۔ وہ جس فیلڈ میں تھا وہاں ہر قدم پر محبت ہاتھ پھیلائے اس کی منتظر ہوتی تھی لیکن پھر بھی نہ جانے وہ کون سی پیاس تھی جو ہمہ وقت اس کی آنکھوں میں چھپی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ آج ایک فاران کا موبائل میسج ملا تھا کہ وہ شام تک واپس آ رہا ہے۔ اجالا نے زنیرا کو اس کے آنے کی خبر بالکل نہیں دی تھی۔ اجالا کی فرمائش پر زنیرا نے اس کے لیے گرم گرم پکوڑے اور سموسے بنوائے تھے۔ رم جھم برستی بارش میں زنیرا پنک کلر کے سوٹ میں آج کچھ زیادہ ہی غضب ڈھا رہی تھی۔ اجالا کی تعریف پر اس نے سارا کریڈٹ اس بیوٹی پارلر کو دے دیا جہاں وہ صبح کئی گھنٹے گزار کر آئی تھی۔ کسی بات پر کھلکھلا کر ہنستے ہوئے اجالا کی نظریں اچانک ہی دروازے سے داخل ہوتے ہوئے فاران پر پڑی تھی جو اندر آتے ہوئے کچھ حیرت سے زنیرا کے اس گلاب جیسے چہرے کو دیکھ رہا تھا اس کی ہنسی کی جلترنگ کو ہر سو بکھرتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ اس کے بدلے ہوئے خوب صورت ہیر اسٹائل نے جیسے اسے ایک دوسرا ہی روپ دے دیا تھا۔ ایک لمحے کو دونوں کی نظریں ملیں...... اجالا نے یہ منظر بڑی دلچسپی سے دیکھا...... دوسرے ہی لمحے زنیرا نے اپنی توجہ کچن سے آتے رحیم کی جانب مبذول کر دی۔ جس کے ہاتھ میں گرم گرم پکوڑوں اور سموسوں کی ٹرے تھی۔ چائے کچھ ہی دیر قبل وہ میز پر لا کر رکھ چکا تھا۔

''السلام علیکم......'' فاران کی دلکش بھاری آواز کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ مگوں میں چائے انڈیلنے لگی جبکہ اجالا نے مسکرا کر اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔

''آج تو موسم کا صحیح لطف اٹھایا جا رہا ہے۔'' فاران نے ایک پکوڑا اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے مسکرا کر اجالا کی طرف دیکھا۔

''ہاں، آج میں اور زنیرا صبح سے ہی اس موسم کو پل، پل انجوائے کر رہے ہیں۔'' اجالا نے ہنستے ہوئے زنیرا کی طرف دیکھا تو بے ساختہ فاران کی

نظریں بھی اس کی طرف اٹھ گئیں جو بڑی بے نیازی سے اب چائے کا مگ اٹھا کر اس کے سامنے رکھ رہی تھی اور اسی لمحے وہ غزل جسے ایک مشہور گلوکارہ گا رہی تھی جیسے ایک صدا بن کر فاران کو عجیب طرح کے احساس سے دوچار کرنے لگی تھی۔ اجالا سے کچھ کہتے ہوئے زنیرا ایک بار پھر بے اختیار ہنسی تھی۔

تو جو بدلا بدل گئے ہم بھی
پیار کرتے تھے بندگی تو نہیں

فضا میں بکھرتے ان بولوں کے پس منظر میں زنیرا کا حسین سراپا اور چہرے پر چھلکتی خوشی جیسے فاران سے برداشت ہی نہیں ہوئے۔

''سوری اجالا میں کافی تھکا ہوا ہوں...... بچوں سے مل کر تھوڑا سا ریسٹ کروں گا پھر ہم رات کے کھانے پر ملتے ہیں۔'' وہ معذرت کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''لیکن اجالا رات کو تو ہم لوگ چائنیز، ڈنر پر جا رہے ہیں۔'' زنیرا نے فوراً ہی اجالا کو یاد کرایا۔

''اوہ ہاں...... فاران تم بھی چلنا...... اصل میں زنیرا نے ٹیبل ریزرو کرالی ہے ناں تو جانا ضروری ہے۔''

''نہیں تم لوگ جاؤ، میں لمبے سفر سے آیا ہوں آج ریسٹ کروں گا۔'' وہ بے دلی سے کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

''اوہ تھینکس گاڈ...... یہ نہیں جا رہے...... میرا تو سارا موڈ ہی غارت ہو گیا تھا۔'' زنیرا نے گو آہستہ سے کہا تھا لیکن فاران کے کانوں تک اس کا یہ جملہ پہنچ گیا تھا۔ فاران نے اس کا جملہ سننے کے بعد اپنی تھکن کو پسِ پشت ڈالا اور ان کے ساتھ چلا گیا۔

☆☆☆

فقیر محمد اور رانی کے ولیمے کی تقریب کم از کم ان لوگوں کے لحاظ سے تو کچھ زیادہ ہی شاندار رہی تھی...... پہلی دفعہ کسی نے اپنی شادی کا فنکشن کسی ہوٹل میں کیا تھا ورنہ اس سے پہلے خاندان میں یا تو گھر کی گلیوں میں ٹینٹ لگا دیے جاتے تھے یا پھر کسی نے زیادہ دریا دلی دکھائی تو کسی چھوٹے سے میرج ہال میں تقریب رکھ لی۔ آج فقیر محمد کا تو پورا خاندان امپریس تھا ہی لیکن اجمل صاحب کے وہ رشتے دار جنہیں اجمل صاحب اپنے ساتھ اس ولیمے میں لے کر آئے تھے وہ تو کچھ زیادہ ہی متاثر لگ رہے تھے۔ رانی بڑے شاہانہ انداز میں فقیر محمد کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھی جیسے اپنے آپ کو آسمان سے اترا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ فقیر محمد کی اماں کے ناز و انداز بھی دیکھنے والے لگ رہے تھے۔ ایک عجیب سا غرور در آیا تھا اس کی چال میں لیکن اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ اتنی شان و شوکت سے ہونے والی شادی اس کے ایک قیمتی پلاٹ کی مرہونِ منت ہے تو شاید یہ غرور اس کی آہ و بکا میں تبدیل ہو جاتا...... لیکن فقیر محمد نے تو اسے پلاٹ بیچنے کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔ شہزادی کو جلانے کلسانے کی خاطر وہ پلاٹ کیا اپنے آپ کو بھی بیچنے سے گریز نہیں کرتا...... اور اس وقت بھی شہزادی کا کملایا ہوا چہرہ اور حسرت بھری نگاہیں اس کے دل کو ایک... ٹھنڈک سی پہنچا رہی تھیں...... جب شہزادی اسٹیج پر رانی سے ملنے کے لیے آئی تو رانی کا جگمگاتا روپ اور شاہانہ لباس جیسے اس کی آنکھیں خیرہ کر گیا۔

''سالی جی میری اتنی حسین دلہن کو نظر نہ لگا دینا۔'' فقیر محمد نے اسے رانی کی طرف رشک آمیز نظروں سے تکتا پا کر فوراً ہی فقرہ کسا تو وہ جلدی سے رانی کے پاس ایک جبری مسکراہٹ کے ساتھ بیٹھ گئی۔

''سالی صاحبہ آج تو حور کے پہلو میں بیٹھا لنگور خوشی سے پاگل ہو رہا ہے کیونکہ آپ کی بدولت اسے اتنی خوب صورت دلہن جو مل گئی ہے۔'' فقیر محمد جیسے طنز کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے رہا تھا۔ شہزادی کا دل چاہا کہ اس کا منہ نوچ لے...... لیکن بس خون کے گھونٹ پی کر اسے اگنور کر کے رانی سے باتیں کرنے لگی۔

''بھئی آج تو جو بھی ہماری دلہن کے ساتھ

بیٹھتا ہے۔ بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے جگمگاتے ہوئے چاند کے پاس کوئی مدھم سا ستارہ ٹمٹمار رہا ہو۔'' فقیر محمد اپنے کسی دوست سے ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا لیکن اس کا اشارہ کس کی طرف تھا اسے شہزادی اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔

''یہ منحوس کالا آدمی کیسے کیسے جملے یاد کر کے آیا ہے۔'' اس نے کلس کر سوچا جبکہ رانی نے کہنی مار کر شاید اسے ایسی باتیں کرنے سے روکا تھا...... شہزادی کچھ دل برداشتہ ہو کر اماں کے بلانے کا بہانہ بنا کر اسٹیج سے نیچے اتر آئی...... اپنے حساب سے تو وہ بہت اچھا تیار ہو کر اس ولیمے میں آئی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل چاہ رہا تھا کہ فقیر محمد کی نظریں بار بار اس کی طرف اٹھیں...... نارسائی کا دکھ آنکھوں میں لیے جب وہ اس کی طرف دیکھے تو وہ تفاخر سے چہرہ موڑ لے...... لیکن یہاں تو فقیر محمد کی نظریں رانی کے چہرے کا طواف کرتے نہیں تھک رہی تھیں...... بات بے بات وہ اسے نیچا دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دے رہا تھا۔ اور پھر فقیر محمد کے گھر والوں کا رویہ بھی اس کے ساتھ خاصا توہین آمیز رہا تھا۔ انیسہ اور اجمل صاحب کو بے پناہ اہمیت دیتے ہوئے وہ لوگ اسے یوں نظر انداز کرتے جیسے وہ اجمل صاحب کے ساتھ آئی ہوئی کوئی معمولی خادمہ ہو...... شہزادی کو عجیب سی گھٹن کا احساس ہونے لگا۔

''اماں مجھے گھر واپس جانا ہے...... چلیں بس فوراً اٹھیں۔'' اس کی برداشت کی حد جیسے ختم ہو رہی تھی۔

''دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا...... آرام سے بیٹھو...... اتنی جلدی واپس جانے کی کیا تُک ہے بھلا......'' انیسہ نے گھور کر اسے دیکھا...... کتنا اچھا محسوس ہو رہا تھا انہیں اپنی بیٹی کو سچ مچ کی رانی بنا ہوا دیکھ کر...... فخر و انبساط سے سرشار ہوتا ہوا ان کا دل کبھی اس سے پہلے ایسی کیفیت سے دوچار نہیں ہوا تھا۔

''نہیں اماں...... میری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی...... مجھے ابھی واپس جانا ہے۔'' اس کے ہٹ دھرم لہجے پر انیسہ نے تپ کر چپکے سے اس کے چٹکی لی۔

''یہ کیوں نہیں کہتی کہ تجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا...... اب پتا چلا تجھے کہ فقیر محمد کی اصل میں حقیقت کیا ہے...... اللہ میری بچی کو نظرِ بد سے بچائے...... کتنا چاہنے والا شوہر عطا کیا اس نے میری رانی کو۔'' شہزادی کو اس وقت اپنی اماں بھی فقیر محمد کا دوسرا روپ ہی لگیں۔ اسے عجیب سا خوف محسوس ہونے لگا جیسے ہر کوئی اس پر ہنس رہا ہے...... اس پر طنز کے تیر برسا رہا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے ابا اور اماں بھی اپنے جملوں سے اس کی روح کو زخمی کر کے بے رحمی سے ہنس رہے ہوں۔ انیسہ کو احساس ہی نہیں ہوا کہ اس کی کہی ہوئی باتیں...... اس وقت شہزادی کو کتنا زیادہ توڑ گئی ہیں...... وہ سیدھی سادی عورت اپنی بیٹی کی دل کی کیفیت کو اس وقت سمجھ ہی نہیں رہی تھی۔ شہزادی کو اس جگمگاتی ہوئی ہنستی بولتی محفل میں اپنا آپ بہت اکیلا اور تنہا، تنہا سا محسوس ہو رہا تھا...... کوئی بھی تو اسے اپنا نظر نہیں آ رہا تھا...... اس کی نظر اچانک ہی اسٹیج کی جانب اٹھی...... اجمل صاحب اور انیسہ...... اس وقت دولھا اور دلہن کے ساتھ اپنا گروپ فوٹو بنوا رہے تھے...... انیسہ نے کتنے پیار سے رانی کو اپنے ساتھ لپٹایا ہوا تھا...... اجمل صاحب بھی بہت محبت اور شفقت سے فقیر محمد اور رانی کو دیکھ رہے تھے...... سب کتنا خوش نظر آ رہے تھے...... اسے ایک دم سب سے شدید نفرت کا احساس ہونے لگا۔ وہ بہت خاموشی سے اٹھی اور سب کی نظریں بچا کر ہال سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

''ویسے سچی بات ہے جو مزہ مجھے یہاں کے چائنیز کھانوں میں ملتا ہے وہ کسی اور ملک میں نہیں ملتا۔'' اجالا بڑی رغبت سے کھانا کھاتے ہوئے بولی تو فاران نے ہنس کر اسے چھیڑا۔

''تمہیں تو یہاں کے ٹھیلوں کی چاٹ بھی اتنی ہی پسند ہے، یار تم یہیں کیوں نہیں شفٹ ہو جاتیں۔ فضول میں وہاں اپنا اور عدیل کا وقت ضائع کر رہی ہو۔'' فاران کی بات پر اجالا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

''سچ پوچھو تو وہاں پر مجھے ہر پل ہر لمحہ پاکستان یاد آتا ہے۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا لیکن میں ابھی تک وہاں پر ذہنی طور پر ایڈجسٹ نہیں ہو سکی ہوں۔''

''اوہ...... سو سیڈ...... بس مجھ ہی سے غلطی ہو گئی ورنہ تم یہیں پاکستان میں رہ رہی ہوتیں۔'' پتا نہیں کیسے بے اختیار ہی یہ جملہ فاران کے منہ سے نکلا تھا۔ اجالا کے دل کی دھڑکنیں جیسے تھم سی گئیں۔ اس نے گھبرا کر زنیرا کی جانب دیکھا جو بہت بے نیازی سے چکن چلی اپنی پلیٹ میں نکال رہی تھی۔ بچے آپس میں باتیں کرتے ہوئے کھانے میں مگن تھے اور فاران کو تو جیسے اپنے اس جملے کی سنگینی کا کوئی احساس ہی نہیں تھا یا شاید وہ زنیرا کو اذیت دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ تب ہی زنیرا کی آواز پر اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

''اجالا تم بہت لکی رہیں ورنہ یہ ہی پاکستان تمہیں جہنم سے بھی بدتر لگتا۔ بس یوں سمجھ لو تمہاری کوئی نیکی کام آ گئی اور تمہیں عدیل جیسا انسان مل گیا۔'' کیسا نہلے پہ دہلا مارا تھا زنیرا نے اور وہ بھی بہت ٹھنڈے لہجے میں۔ فاران کا چہرہ توہین کے احساس سے سرخ ہو گیا۔ اس نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ زنیرا کی طرف سے یوں فی البدیہہ جواب آئے گا۔ ماحول خاصا ٹینس سا ہو گیا تھا اور اجالا کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سچویشن کو کیسے ہینڈل کرے اس وقت اسے خود اپنی پوزیشن بہت آکورڈ فیل ہو رہی تھی۔

''میرے خیال میں آپ دونوں میرے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانے کے بجائے ڈائریکٹ ہی ایک دوسرے کا نشانہ لے لیں۔'' فاران کے کچھ کہنے سے قبل ہی اجالا نے ناگواری سے دونوں کو ہی ٹوک دیا۔

تبھی کچھ لڑکیاں ان کی ٹیبل پر آ گئیں۔ وہ فاران کے ساتھ فوٹو کھنچوانے کی خواہش مند تھیں۔ روشانہ نے بہت اپ سیٹ ہو کر اپنے بابا کی جانب دیکھا جو بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ ان لڑکیوں کے درمیان کھڑا فوٹو کھنچوا رہا تھا حالانکہ اس کا موڈ اس وقت سخت آف تھا جسے اجالا اچھی طرح سے محسوس کر رہی تھی۔ خود اس کا اپنا دل بھی اس وقت کچھ عجیب سی کیفیت سے دوچار تھا۔ زنیرا نے دزدیدہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

''اجالا میں نے جو کچھ بھی کہا بالکل دل سے کہا ہے...... تم سچ مچ بہت لکی ہو...... تمہیں کسی کا سچا بے لوث پیار حاصل ہے۔'' زنیرا بہت آہستگی سے اس سے کہہ رہی تھی۔ اجالا نے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ اسی وقت فاران واپس آ کر کرسی پر بیٹھ رہا تھا۔ بچے ہنس بول رہے تھے لیکن یہ تینوں اپنے اپنے خیالوں کے حصار میں مقید بہت خاموشی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ کھانے کے بعد جب وہ لوگ واپس گھر جا رہے تھے تو بھی بہت خاموشی سی تھی ان کے درمیان، تبھی اچانک ہی فاران نے بہت تیزی سے بریک لگائے...... کار کے ٹائر ایک چرچراہٹ کے ساتھ رک گئے۔ دھچکے کی وجہ سے سب ہی تقریباً ایک دوسرے پر گر گئے تھے۔ سڑک پر جھلملاتے فیروزی کپڑوں میں ملبوس ایک بے حد حسین لڑکی اپنی سہمی ہوئی ہرنی جیسی آنکھوں سے ان لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔

''مما آئی تھنک یہ فیری ہے۔'' روشانہ نے بہت ایکسائٹڈ انداز میں سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھا تو سب ہی بچوں نے فیری، فیری کا شور مچا دیا۔

''خاموش ہو جاؤ، یہ کیا شور مچایا ہوا ہے۔'' فاران نے زور سے ان لوگوں کو ڈانٹا...... اجالا اور زنیرا ابھی بہت حیرانی سے اس حسن کے پیکر کو دیکھ رہی تھیں جو اتنی رات گئے بجی سنوری اس بیچ سڑک پر

کھڑی ہوئی تھی۔

''فاران نیچے مت اترنا، مجھے تو کچھ مشکوک معاملہ لگ رہا ہے۔'' اجالا نے گھبرا کر کار سے اترتے ہوئے فاران کو روکا۔

''آنٹی یہ ضرور فیری ہے، دیکھیے گا ابھی جادو سے غائب ہوجائے گی۔'' روشانہ ابھی تک اپنی بات پر قائم تھی۔

''روشانہ خبردار جو اَب تم بولیں۔'' زنیرا نے بھی الجھ کر روشانہ کو ٹوکا...... اسے بھی اس سچویشن سے ڈر سا محسوس ہورہا تھا۔ آج کل کے حالات سے اور لوگوں کی طرح وہ بھی خوفزدہ رہتی تھی لیکن اس وقت وہ براہِ راست فاران کو روکنے سے مجبور تھی سو اس نے اجالا کو ٹہوکا دیا لیکن اجالا کے روکنے کے باوجود فاران کار سے نیچے اتر کر اس لڑکی کے پاس پہنچ چکا تھا۔

''کون ہو تم......؟ ابھی میری کار کے نیچے آجاتیں تو کون ذمے دار ہوتا؟'' فاران کے سخت لہجے نے اس لڑکی کی آنکھوں کے کٹوروں کو لبالب بھر دیا...... اس نے خوف زدہ نظروں سے فاران کی جانب دیکھا...... بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں میں جھلملاتے آنسو جیسے ایک لمحے کو فاران کو مسمرائز کر گئے۔ وہ پلک جھپکائے بنا اسے دیکھتا رہ گیا۔

''وہ میں ہوٹل کا راستہ بھول گئی ہوں...... وہاں میری بہن کا ولیمہ ہورہا ہے۔'' وہ بہت معصومیت سے کہتی ہوئی جیسے فاران کے دل کے اندر اترتی ہی چلی گئی۔

''کیا نام ہے ہوٹل کا...... ہم تمہیں پہنچا دیتے ہیں۔'' اس نے اپنے دل کو سنبھالتے ہوئے اس بار ذرا نرم لہجے میں پوچھا۔

''مجھے نام بھی یاد نہیں آرہا......'' لڑکی نے بہت بے بسی سے فاران کو دیکھا اب آنسو اس کے سرخ رخساروں پر بہہ رہے تھے...... اجالا جو اُن کی باتیں سن رہی تھی اطمینان ہونے پر وہ بھی اتر کر ان لوگوں کے پاس چلی آئی۔

''تمہیں ولیمہ چھوڑ کر یوں اکیلے اتنی دور سڑک پر آنے کی کیا ضرورت تھی...... یہاں تو نزدیک مجھے کوئی ہوٹل نہیں نظر آرہا۔'' اجالا نے کریدنے والے انداز میں اس سے پوچھا۔

''پلیز کچھ بھی کریں لیکن مجھے واپس ہوٹل پہنچا دیں، ورنہ...... ابا مجھے جان سے مار دیں گے۔'' وہ اجالا کے سوال کو اگنور کر کے بہت ملتجی انداز میں بولی تو فاران نے کچھ سوچتے ہوئے اسے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''اچھا چلو...... اسی سڑک پر آگے ایک دو ہوٹل ہیں...... انہی میں سے کوئی ہوگا۔'' وہ اجالا کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کار کے پاس آگئی۔ زنیرا نے کھسک کر اس کے لیے جگہ بنادی...... روشانہ اور فرحان جو اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے...... انہوں نے مڑ کر اسے بیٹھتے ہوئے دیکھا۔

''فیری...... کیا تم اُڑ سکتی ہو......؟'' فرحان نے بہت معصومیت سے سوال کیا۔

''نہیں، میں بس رو سکتی ہوں اور شاید مر بھی سکتی ہوں۔'' اس نے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز میں کچھ اتنے درد سے کہا کہ کار میں ایک لمحے کو سناٹا چھا گیا۔

''تمہاری بہن کا ولیمہ وہاں ہوٹل میں ہورہا ہے اور تم یہاں سڑک پر روتی ہوئی پھر رہی ہو...... سب خیریت تو ہے ناں......؟'' زنیرا نے تجسس سے مجبور ہو کر پوچھ ہی ڈالا۔

''بس وہاں مجھے گھٹن سی محسوس ہورہی تھی...... ایسا لگتا تھا جیسے میری سانس رک جائے گی۔'' وہ مسلسل روئے جارہی تھی۔ کار دھیمی رفتار سے چل رہی تھی۔ فاران متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے ہوٹل ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''دیکھو ایسے روؤ نہیں...... ہم تمہارا ہوٹل ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں، تم بھی ذرا غور کرتی رہو کہ تم کہاں سے کس طرف سے آرہی تھیں۔'' فاران نے اس کی سسکیوں کی آواز پر ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

''کیا آپ مجھے ایدھی ہوم پہنچا سکتے ہیں۔ مجھے ہوٹل سے نکلے ہوئے کافی دیر ہوگئی ہے۔ اب میں مزید اپنے گھر والوں کا غصہ سہہ نہیں سکتی۔'' فاران کی بات کا جواب دیتے ہوئے وہ ایک بار پھر رو پڑی۔

''بری بات ایسے نہیں کہتے، تم کچھ زیادہ ہی جذباتی ہورہی ہو...... کیا نام ہے تمہارا؟'' اجالا نے اسے ہلکے سے اپنے ساتھ لگا کر تسلی دیتے ہوئے اس کا نام بھی پوچھ ڈالا۔

''شہزادی، شہزادی نام ہے میرا......'' اس نے کونین سے بھی زیادہ کڑوے لہجے میں اپنا نام بتایا۔

''اوہ شی از پرنسز......'' اس بار روشانہ کی ایکسائٹمنٹ دیکھنے والی تھی۔

''نہیں، میں صرف نام کی شہزادی ہوں۔'' اس کے لہجے میں محرومیاں چھپی ہوئی تھیں۔

''وہ دیکھو سیدھے ہاتھ پر جو ہوٹل نظر آرہا ہے۔ یہاں ہورہا ہے تمہاری بہن کا ولیمہ......؟'' فاران نے گاڑی کی رفتار مزید آہستہ کردی۔

''نہیں۔'' شہزادی نے نفی میں سر ہلایا۔

فاران نے کار آگے بڑھا دی۔ دس منٹ کی تگ و دو کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا...... شہزادی نے صحیح پتا بتا کر نہیں دیا۔ اب اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ اسے ایدھی سینٹر پہنچا دیا جائے۔ ابا کا قہر اماں کا غصہ اور نفرت اور رانی کی خوشیاں، فقیر محمد کی تمسخر بھری نگاہیں اس کے طنزیہ جملے کچھ بھی برداشت کرنے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔ ہر رشتے ناتے سے اس کا دل اچاٹ ہوچکا تھا کسی کی بھی محبت دل میں باقی نہیں رہی تھی۔ جب وہ دل برداشتہ سی ہوٹل سے باہر آئی تھی تو نسبتاً کم ٹریفک والی روڈ کی طرف مڑ کر بہتے آنسوؤں کے ساتھ نہ جانے کتنی دور نکل آئی تھی۔ یہ بھی اس کی

خوش قسمتی تھی کہ اکا دُکا گزرنے والی گاڑیوں میں فیملی والے یا پھر شرفا ہی تھے جس کی وجہ سے اسے دوسری کسی مصیبت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ ہاں البتہ ایک بنگلے کے سامنے سے گزرتے ہوئے جب گیٹ کے اندر سے ایک کتا بہت زور سے بھونکا تو وہ گھبرا کر بے اختیار بھاگ کر سڑک پر آگئی تھی اور یوں اس سے یہ اتنی اچھی فیملی آٹکرائی اور دل سے خوف کچھ کم ہوا تو اچانک ہی یہ خیال اس کے ذہن میں آیا تھا کہ وہ ان لوگوں کے ذریعے ایدھی سینٹر جاسکتی ہے۔ اس نے ٹی وی پر بھی دیکھا تھا اور لوگوں سے بھی سنا تھا کہ وہاں پر لاوارث خواتین اور لڑکیوں کو پناہ دی جاتی ہے لیکن تب اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کبھی ایسا وقت اس پر بھی آسکتا ہے...... اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی اور وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر زور زور سے رونے لگی۔ بچوں نے سہم کر ایک دم بے کسی سے روتی لڑکی کو دیکھا جبکہ اجالا اور زنیرا اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگیں۔

''پتا نہیں یہ معصوم لڑکی کن حالات سے گزر رہی ہے، کچھ بتا بھی تو نہیں رہی۔'' زنیرا کے اس جملے پر چھناک سے ایک اور خیال شہزادی کے ذہن میں آیا تھا۔

☆☆☆

''انیسہ میں نے خود اسے باہر کی جانب جاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن میں سمجھا تھا کہ شاید ہاتھ دھونے باتھ روم جا رہی ہے پھر فقیر محمد کے تایا سے باتوں میں میرا دھیان اس کی طرف سے ہٹ گیا تھا۔'' اجمل صاحب سرگوشیوں میں انیسہ کو بتا رہے تھے جو اپنے چہرے پر اڑتی ہوئی ہوائیوں کو چھپا نہیں پا رہی تھیں۔ ابھی کچھ ہی دیر قبل سمدھنوں سے گفتگو میں مشغول انیسہ کو اچانک ہی یہ احساس ہوا تھا کہ شہزادی ہال میں کہیں نظر نہیں آرہی...... پہلے تو وہ متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتی رہیں لیکن اسے کہیں نہ پا کر انہوں نے اٹھ کر پورے ہال کا چکر لگا لیا لیکن شہزادی کا کہیں پتا نہیں تھا۔ وہ بہانے سے باہر جا کر بھی دیکھ آئی تھیں کہیں بھی تو شہزادی نہیں تھی ان کا دل سوکھے پتے کی طرح لرزنے لگا۔ پاؤں میں جیسے جان ہی نہیں رہی۔

''شہزادی مجھے اتنی اذیت دیتے ہوئے تمہارے دل میں رحم کیوں نہیں جاگتا...... اگر اللہ نے تمہیں کبھی اولاد کی نعمت سے نوازا تب میں تم سے پوچھوں گی کہ ایک ماں کے دل پر اولاد کی طرف سے لگنے والی چوٹ میں کتنا درد ہوتا ہے۔'' وہ دل ہی دل میں شہزادی سے شکوہ کناں ہوتی ہوئی تھک کر ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔ انہیں شہزادی بہت رنجیدہ، اپ سیٹ اور ساتھ ساتھ کافی غصے میں بھی لگ رہی تھی لیکن یہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ انہیں یوں بنا بتائے ہال سے کہیں چلی جائے گی۔ انہوں نے چپکے سے اجمل صاحب کو کونے میں بلا کر صورتِ حال سے آگاہ کیا تو ایک لمحے کو تو وہ بالکل ہی حق دق رہ گئے پھر اچانک ہی انہیں یہ خیال آیا کہ انہوں نے شہزادی کو کچھ دیر قبل ہال سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ یقیناً کسی بات پر برا مان کر گھر واپس چلی گئی ہے۔

''لیکن اجمل، اتنی رات کو وہ اکیلے کیسے واپس جاسکتی ہے۔ اسے تو گھر کا راستہ بھی ٹھیک سے نہیں معلوم؟'' انیسہ کا دل کسی صورت قابو میں نہیں آرہا تھا۔

''دیکھو انیسہ...... تم اپنے آپ کو نارمل رکھنے کی کوشش کرو...... یہ ہماری عزت کا سوال ہے۔ رانی کا گھر اس کی خوشیوں کو اگر اجاڑنا ہے تو بے شک واویلا مچا لو ورنہ...... اس وقت اپنے ہونٹوں کو سینا ہی عقل مندی ہے...... سب کو یہ بتاؤ کہ شہزادی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی وہ ہماری پڑوسن کے ساتھ گھر واپس چلی گئی ہے۔ تم نہیں جانتیں انیسہ یہاں پر کیسی، کیسی باتیں بنانے والے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ دعا کرو شہزادی ہمیں گھر پر ہی مل جائے۔'' وہ کپکپاتے

ہوئے لہجے میں انیسہ کو سمجھا ضرور رہے تھے لیکن اندر ہی اندر ایک عجیب سا خوف ایک بے نام سی دہشت انہیں مارے ڈال رہی تھی۔ ہال میں کتنی گہما گہمی تھی...... ہر سو رونقیں بکھری ہوئی تھیں۔ ہنستے بولتے قہقہے لگاتے ہوئے سجے بنے لوگ کتنے بے فکر اور خوش باش لگ رہے تھے۔ رانی اور فقیر محمد کی مسکراہٹوں کی چاندنی سے ہال مزید روشن لگ رہا تھا۔ بس اندھیرا بکھرا ہوا تھا تو ان بد نصیب ماں، باپ کے دلوں پر جن کی جوان بیٹی اچانک ہی ان کی نظروں سے دور نہ جانے کہاں چلی گئی تھی... بدنامی کے خوف سے کسی سے کچھ کہنے کچھ پوچھنے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ جانتے تھے شہزادی اپنی مرضی سے خود ہی گئی ہے...... بس اب ایک ہی آس تھی کہ شہزادی انہیں گھر پر مل جائے اور اسی لیے اب وہ جلد از جلد واپس جانا چاہ رہے تھے۔

☆☆☆

''اجالا میرے خیال میں پہلے ہمیں پولیس اسٹیشن جا کر اس لڑکی کے بارے میں ساری تفصیل بتا دینی چاہیے۔ اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کیا جائے تو بہتر ہے۔'' فاران نے کچھ تذبذب سے اجالا کی طرف دیکھا تو شہزادی نے بے حد گھبرا کر بے اختیار اجالا کا ہاتھ تھام لیا۔

''نہیں، نہیں پلیز مجھے پولیس اسٹیشن مت لے جائیں، آپ لوگ جانتے ہیں کہ ایسی جگہوں پر لاوارث لڑکیوں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔ پلیز مجھ پر شک مت کیجیے۔ اچھا آپ بے شک مجھے اپنے گھر مت لے جائیں لیکن کم از کم ایدھی سینٹر تو پہنچا ہی دیں، میں واپس وہاں نہیں جانا چاہتی جہاں سے میں اتنی مشکل سے نکل کر آئی ہوں۔'' اس نے اتنی بے بسی سے التجا کی کہ کوئی ایک لمحے کو کچھ بول ہی نہیں پایا۔

''ٹھیک ہے اجالا میں اسے اپنی ذمے داری پر گھر لے جا رہی ہوں، مجھے یہ لڑکی بہت پریشان اور بے یار و مددگار لگ رہی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے لہجے میں چھپی سچائی گواہی دے رہی ہے کہ یہ معصوم ہے مشکوک نہیں۔'' زنیرا نے جیسے ایک دم ہی فیصلہ کرلیا...... شہزادی کے گھبرائے ہوئے دل کو اس کے جملوں نے ایک ڈھارس سی دے دی۔

''باجی میں آپ کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گی...... خدا کے لیے مجھ پر یقین کیجیے، میں کوئی چور ڈاکو نہیں...... میں بہت قابلِ رحم لڑکی ہوں مجھے اپنی پناہ میں لے لیجیے......'' وہ بے اختیار روتے ہوئے زنیرا کے گلے لگ گئی۔ اور یہ حقیقت تھی کہ اسے اس وقت اپنا آپ بہت مظلوم اور قابلِ رحم لگ رہا تھا۔ پتا نہیں کس کیفیت سے گزر رہی تھی وہ کہ اسے اپنے بالکل غیر لگ رہے تھے اور غیروں میں وہ اپنائیت ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی...... اگر وہ چاہتی تو فاران کو اپنے گھر کا ایڈریس تو سمجھا ہی سکتی تھی لیکن فاران کے پوچھنے سے قبل ہی جو پلان اس کے ذہن میں آیا تھا اس نے فوراً ہی اس پر عمل درآمد کرلیا تھا اور اس کی اس کہانی پر فاران کو پوری طرح سے اعتبار نہیں آرہا تھا حالانکہ شہزادی کی معصوم صورت اور اس کا بے پناہ حسن اور چہرے پر بکھرے حزن و ملال نے اسے اپنے سحر میں جکڑ تو ضرور ہی لیا تھا لیکن بہر حال اس وقت وہ اپنے دل سے زیادہ دماغ سے کام لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ شہزادی نے ان لوگوں کو بتایا تھا کہ وہ یتیم ہے اور اس کی خالہ نے ہی اسے پالا تھا اور اس کے صلے میں وہ اس کی شادی اپنے پاگل بیٹے سے کر رہی ہے تاکہ وہ ہمیشہ اس کے پاس ہی رہ کر اس کی اور اس کے پاگل لڑکے کی دیکھ بھال کر سکے اور یہ کہ خالہ بہت ظالم ہے اس پر ظلم کرتی ہے وغیرہ وغیرہ...... اور اچانک ذہن میں آجانے والا آئیڈیا اس نے حال ہی میں پڑھتے ہوئے ایک ناول سے لیا تھا جو آج اس کے بہت کام آرہا تھا... اور آج کا ولیمہ بھی اس نے اپنی خالہ زاد

کے نام کر دیا تھا۔

''اجالا تم انہیں بتا دو کہ اس لڑکی کو رکھنے کی تمام ذمے داری ان ہی کی ہوگی اور اگر خدانخواستہ میرے گھر یا میرے بچوں کو ذرا سا بھی کوئی نقصان پہنچا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' گھر واپس آنے کے بعد فاران نے بہت سخت لہجے میں زنیرا کو سناتے ہوئے اجالا کو مخاطب کر کے کہا تھا جو شہزادی کو گیسٹ روم میں پہنچا کر واپس لاؤنج میں آئی تھی۔

زنیرا نے ایک اچٹتی سی نظر فاران پر ڈالی اور بنا جواب دیے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

''اجالا میں تم سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں کہ اگر بچوں کا معاملہ نہ ہوتا تو میں زنیرا کو ایک منٹ بھی اپنے گھر، اپنی زندگی میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔'' فاران نے بہت تپ کر اجالا سے کہا تو وہ ایک لمحے کے لیے خاموش سی ہوگئی پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے فاران کی جانب دیکھا۔

''فاران تمہاری نفرت بھی تمہاری محبت کی طرح ایکسٹریم پر ہوتی ہے مجھے یقین ہی نہیں ہو رہا کہ کبھی تم نے زنیرا کو اتنی شدت سے چاہا تھا کہ باقی سب محبتیں اور رشتے ثانوی ہو کر رہ گئے تھے۔ پلیز ایسا مت کرو، اس کی خطا اتنی بڑی نہیں جتنی تم اسے سزا دے رہے ہو۔'' اجالا نے کچھ ناراض لہجے میں اسے سرزنش کی۔

''مجھے خود سمجھ میں نہیں آتا اجالا کہ میری روز بروز زنیرا سے نفرت کیوں بڑھتی جا رہی ہے...... اس کی ہر ادا، اس کی ہر بات مجھے زہر کیوں لگنے لگی ہے۔ آج جب میں گھر واپس آیا تو اس کا بدلا ہوا خوب صورت روپ اور اس کی بیگانگی دونوں نے ہی مجھے اٹریکٹ کیا لیکن پتا نہیں کیوں دل میں اس کے لیے وہ جذبات، وہ احساسات جاگے ہی نہیں جن کی شدت مجھے دیوانہ بنا دیتی تھی۔''

''فاران شو بز میں آنے کے بعد وہاں کی چکا چوند اور ارد گرد بکھرے ہوئے حسن نے تمہارے جذبات اور احساسات کا رخ موڑ دیا ہے۔ اب تم لاشعوری طور پر زنیرا سے پیچھا چھڑا کر اس زندگی کا ہر پل اپنی مرضی اپنی خوشی سے گزارنا چاہتے ہو، اس کے علاوہ کوئی اور وجہ نہیں۔'' اجالا کی صاف گوئی فاران کو بالکل پسند نہیں آئی۔

''نہیں، تم بالکل غلط سوچ رہی ہو...... تم کو نہیں پتا کہ زنیرا کا تلخ اور شکی رویہ ایک سلو پوائزن کی طرح آہستہ آہستہ میرے دل میں بسی اس کی محبت کو کچھ اس طرح سے ختم کرتا گیا کہ مجھے خود بھی نہیں پتا چلا۔ کچھ لمحے میری زندگی میں ایسے آئے جو مجھے اس سے ایک دم ہی بہت دور لے گئے اتنی دور کہ اگر میں چاہوں بھی تو اب اس کے پاس واپس جانے کے تصور سے ہی میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ خدا کی قسم شو بز سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔'' فاران نے بہت تفصیل سے اپنی صفائی پیش کی لیکن اجالا کا دل اس کی اس دلیل پر مطمئن نہیں ہوا تھا لیکن ابھی فی الحال مسئلہ شہزادی کا تھا جسے زنیرا اپنے ساتھ رکھنے پر مصر تھی لیکن فاران ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔

''اچھا سنو فاران ابھی میں یہاں دو دن اور ہوں...... ان دو دنوں میں مجھے اندازہ ہو جائے گا کہ شہزادی کا یہاں رہنا مناسب ہے کہ نہیں اور اگر مجھے اس کی باتیں یا وہ خود ذرا سی بھی مشکوک لگی تو میں فوراً تمہیں بتا دوں گی۔ فی الحال اسے یہیں رہنے دو، اتنی سی لڑکی بے چاری کیا کرے گی۔ باہر دو، دو گارڈز بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔'' اجالا کی بات پر فاران کو ہنسی آگئی۔

''او ہو تو اب تم شرلاک ہومز کا بھی رول نبھانے جا رہی ہو۔ ارے پھر تم بھلا کہاں اندازہ لگا پاؤ گی۔ تم نے تو مجھے بے قصور ہوتے ہوئے بھی خطاوار ٹھہرا دیا ہے تو پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے مشکوک ہوتے ہوئے بھی معصوم بنا دو۔'' فاران نے شرارت سے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ نظریں چرا گئی۔ پتا

نہیں کیوں اب وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے گھبرانے لگی تھی۔

''خیر تم لوگوں نے چیک کر لیا ہے ناں اس کے پاس موبائل یا کوئی اور ایسی چیز تو نہیں جو خطرناک ہو۔'' وہ اس کے نظریں چرانے پر زیر لب مسکراتا ہوا پوچھنے لگا۔

''افوہ فاران، ہم لوگوں نے اچھی طرح سے اطمینان کر لیا ہے۔ اس لڑکی کو تو رونے سے ہی فرصت نہیں مل رہی...... اتنا کرب ہے اس کے چہرے پر کہ سچ دل کٹ رہا تھا میرا...... اور گلیسرین بھی نہیں ہے اس کے پاس کہ وہ جھوٹ موٹ اتنے آنسو بہا رہی ہو۔'' آخری جملے میں چھپی شرارت کو محسوس کر کے فاران ہنس دیا۔ اسے اپنی یہ بچپن کی دوست اور کزن ہمیشہ سے بہت عزیز رہی تھی لیکن وہ جذبہ جسے محبت کہتے ہیں جو دل میں ایک بہت خوب صورت احساس جگاتا ہے وہ اس کے دل نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا یہ الگ بات تھی کہ وہ جب بھی پریشان ہوتا یا اسے کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تھا تو اسے سب سے پہلے اجالا ہی یاد آتی تھی۔ وہ اتنا نادان نہیں تھا کہ اجالا کی آنکھوں میں چھپی اپنی محبت کو محسوس نہ کر پاتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اجالا سے بس اس معاملے میں کوئی ہیلپ نہیں لے پایا تھا اور اسے اکیلے ہی اس محاذ پر لڑنا پڑتا تھا لیکن اب زنیرا سے نفرت کو وہ بہت آرام سے اجالا سے شیئر کر رہا تھا۔

کیا وہ بہت خود غرض ہے صرف اپنی پریشانی اور الجھنوں میں ہی وہ اجالا کو شریک کرتا ہے۔ کئی بار اس نے یہ سوال اپنے آپ سے کیا تھا اور ہر بار اس کے دل نے اسے بری الذمہ قرار دیا تھا کہ یہ اس کے بچپن کی عادت تھی جس سے فرار ممکن نہیں تھا۔ اجالا اس کی دوست، اس کی ہمدرد اس کی غم گسار سب ہی کچھ تھی اور اسی نے ہی فاران کی عادت خراب کی تھی۔ یہ الزام بھی اس نے خود ہی اجالا پر ڈال دیا تھا۔ گھر سے باہر اس کے ساتھ کام کرنے والی ہیروئنز اور دوسری کو اسٹارز، سب ہی اس کی پذیرائی اس کی دوستی کے لیے ہر دم ہاتھ آگے بڑھائے رکھتی تھیں لیکن اسے جو سکون اجالا سے باتیں کرنے میں ملتا تھا اس کا کوئی بدل نہیں تھا۔

اس وقت بھی وہ اجالا سے شہزادی کے بارے میں کافی دیر ڈسکس کرتا رہا۔ ویسے بھی وہ دو دن بعد جا رہی تھی اور فاران کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اس کا بہت اپنا اسے چھوڑ کر جا رہا ہو۔ کم از کم اس کے آجانے سے اسے اپنے گھر میں ایک رونق سی بکھری ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ کھل کر کتنے عرصے بعد ہنسا تھا۔ بچے بھی اپنے ساتھی پا کر بہت خوش نظر آنے لگے تھے اور تو اور زنیرا کا یہ بدلا ہوا روپ بھی شاید اجالا ہی کا مرہون منت تھا۔ زنیرا کے پکارنے پر اجالا اٹھ کر اس کے کمرے میں چلی گئی۔

فاران بھی کافی تھکن محسوس کر رہا تھا۔ سب بچے شاید گیسٹ روم میں شہزادی کے پاس جمع تھے۔ روشانہ جو سب بچوں کی لیڈر بنی ہوئی تھی وہ اب بھی اپنی بات پر قائم تھی کہ شہزادی اصلی پرنسز ہے۔ سبھی شہزادی سے اس کے مختلف سوالات جاری تھے۔

بچوں کے شور کی آواز پر فاران کے اپنے کمرے میں جاتے ہوئے قدم رک گئے۔ وہ پلٹ کر گیسٹ روم کی طرف چلا آیا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر وہ ایک لمحے کے لیے رکا...... نظروں میں آنسوؤں سے لبریز دو بے حد حسین آنکھیں گھوم گئیں۔ وہ جو حسینوں میں گھرا رہتا تھا اسے یہ پری جیسی لڑکی ایک دم سے پتا نہیں کیوں اپنے دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی تھی حالانکہ اس کے اپنے گھر میں رکنے پر سب سے زیادہ اعتراض خود اُسی نے ہی کیا تھا یہ الگ بات تھی کہ دل اس کا بھی ہمک، ہمک کر شہزادی کو روک لینے کی التجا کر رہا تھا۔

وہ جب کمرے میں داخل ہوا تو شہزادی

روشانہ کی کسی بات پر اسی وقت مسکرائی تھی۔ فاران ششدر سا اسے دیکھتا رہ گیا۔ کتنی حسین مسکراہٹ تھی اس کی...... فاران کو ایسا محسوس ہوا جیسے تیز بارش کے بعد اچانک جگمگاتی دھوپ نکل آئی ہو...... اُف اس لڑکی کا تو ہر روپ قیامت تھا۔ اس کی بھیگی آنکھیں اور چہرے پر بکھری اداسی جہاں اس کے حسن میں مزید اضافہ کرتے محسوس ہوتے تھے وہیں اس کی دل موہ لینے والی مسکراہٹ بھی آنکھوں کو چکاچوند کرنے پر قادر تھی۔ فاران نے سر کو جھٹک کر اپنے آپ کو اس کے سحر سے نکالنا چاہا اور بے اختیار روشانہ کو پکارتے ہوئے اسے پوری طرح سے نظر انداز کرنے کی کوشش بھی کر ڈالی۔

"روشانہ چلو تم سب فوراً یہاں سے نکلو...... انہیں آرام کرنے دو۔" اس نے ہلکے سے انہیں ڈانٹا۔

"نہیں، نہیں پلیز انہیں ابھی یہیں رہنے دیں۔ میں نے خود باجی سے ریکوئسٹ کر کے انہیں روکا ہے۔" شہزادی نے بہت ملتجی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ دل کو سنبھالتا ہی رہ گیا۔ ان خوب صورت آنکھوں میں ڈوب جانے کو دل شدت سے مچل اٹھا۔ وہ دل پھینک ہر گز نہیں تھا۔ عام مردوں کی طرح خوب صورتی اسے بھی اچھی لگتی تھی۔ شوبز کی رنگین دنیا میں بکھرے حسن سے بے شک اس نے کبھی منہ نہیں موڑا تھا لیکن دل اس انداز سے کبھی نہیں دھڑکا تھا۔ سالوں پہلے جو احساسات اس نے زنیرا کے لیے محسوس کیے تھے اب برسوں بعد وہی جذبات جیسے نیا پیراہن بدل کر دوبارہ اس کے دل کو ایک بہت خوب صورت سی کسک سے آشنا کر رہے تھے...... لوگ کہتے ہیں کہ محبت بس ایک بار ہوتی ہے لیکن اس وقت فاران کو یہ مقولہ قطعی غلط لگ رہا تھا۔ محبت دوبارہ بھی ہو سکتی ہے بھی بھی ہو سکتی ہے یہ وہاں ہو جاتی ہے جہاں نہیں ہونی چاہیے۔ ویسے ہو جاتی ہے جیسے نہیں ہونی چاہیے۔ یہ دل میں داخل ہونے کے لیے اجازت نہیں مانگتی۔ یہ تب بھی ہو جاتی ہے جب نہیں ہونی چاہیے۔ زنیرا نے اس کے دل سے نکل کر جو خالی جگہ چھوڑی تھی وہاں یہ لڑکی بڑے طمطراق سے بنا اس سے پوچھے آ کر براجمان ہو گئی تھی۔ love at first sight پر اس نے کبھی یقین نہیں کیا تھا بلکہ مذاق ہی اڑایا تھا اور آج اپنا اڑایا ہوا مذاق اسے خود پر ہنستا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

رکشا کھڑکھڑاتا ہوا جب ان کے مکان کے سامنے رکا تو دروازے پر جھولتا ہوا موٹا سا تالا اور گھر کے اندر سے جھانکتا ہوا اندھیرا بتا رہا تھا کہ یہاں کوئی بھی نہیں آیا۔ سارے راستے انیسہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ گڑگڑا کر اللہ سے شہزادی کے گھر پر مل جانے کی دعائیں مانگتی آئی تھیں لیکن یہاں پر بکھرا ہوا سناٹا جیسے ان کے دل کے اندر تک اتر گیا۔ ہاتھ پاؤں لرزنے لگے انہوں نے وحشت بھری آنکھوں سے اجمل صاحب کی طرف دیکھا جن کا اپنا چہرہ بالکل زرد ہو رہا تھا۔ انہوں نے کپکپاتے ہاتھوں سے رکشے والے کو کرایہ تھمایا اور خاموشی سے نیچے اتر آئے۔

"اجمل اب کیا ہوگا، ہم لوگ تو بے موت مر گئے...... کہاں جا کر ڈھونڈیں اسے۔" وہ جیسے بالکل حواس باختہ ہوئی جا رہی تھیں۔

"اپنے آپ کو سنبھالو انیسہ...... ہمیں بہت ہوش و حواس سے کام لینا ہے۔" وہ تالا کھولتے ہوئے بہت نڈھال ہو رہے تھے۔

"تم ایسا کرو بہانے سے پڑوس میں جاؤ شاید وہ راشدہ باجی کے گھر جا کر بیٹھ گئی ہو۔ اکثر وہ وہاں پر جایا کرتی ہے ناں......!" اندر آ کر پلنگ پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھتے ہوئے انہوں نے امید کا سرا ایک بار پھر پکڑنا چاہا۔

"اجمل اگر وہ وہاں بھی نہ ملی تو شاید میں اپنے حواس کھو بیٹھوں اور راشدہ باجی کی نظر بس تو بہت ہی

تیز ہیں۔" وہ بے اختیار رو پڑیں۔

"اچھا میں اپنے کسی عزیز کے بارے میں معلوم کرنے کے بہانے ان کے گھر جاتا ہوں۔" اجمل صاحب بہ مشکل کھڑے ہوتے ہوئے بولے...... اتنی سی دیر میں وہ اپنی عمر سے کئی گنا بڑے لگنے لگے تھے۔ لرزتے دل کے ساتھ انہوں نے راشدہ باجی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

"ارے اجمل سب خیریت تو ہے ناں...... اس وقت یہاں کیسے اور ولیمہ تو خیریت سے ہو گیا؟" ایک ہی سانس میں انہوں نے کئی سوال کر ڈالے اور ان کا ہر سوال اجمل صاحب کے دل میں جلتے امیدوں کے دیے کو بجھاتا چلا گیا۔

"ہاں، ولیمہ خیریت سے ہو گیا۔ اصل میں میرے ایک عزیز نے حیدر آباد سے آنا تھا۔ آپ کو کچھ پتا ہے ہمارے پیچھے وہ آئے تو نہیں۔" جھوٹ بولتے ہوئے ان کی زبان لڑکھڑا سی گئی۔

"نہیں اگر آئے ہوتے تو ضرور ہم لوگوں سے مل کر تمہارے بارے میں پوچھتے...... ویسے انیسہ سے ایک بار پھر معذرت کر لینا بہت افسوس ہے ولیمے پر نہ آنے کا...... بس طبیعت آج کچھ زیادہ ہی خراب تھی۔" اجمل صاحب سائیں سائیں کرتے ہوئے دماغ کے ساتھ واپس پلٹ آئے...... انیسہ نے انہیں جو یوں مایوسی سے سر جھکائے واپس لوٹتے دیکھا تو سینے پر زور سے دو ہتھڑ مارے۔

"اجمل وہ وہاں پر بھی نہیں ہے؟ ہائے میرے مولا اب کیا ہوگا۔" وہ تقریباً نیم بے ہوش سی ہونے لگیں۔ اجمل صاحب نے جلدی سے انہیں پانی پلایا حالانکہ خود ان کے اندر جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔

"دیکھو انیسہ، میں اپنی جان دے سکتا ہوں لیکن اگر میری عزت پر کسی نے بھی انگلی اٹھائی تو وہ میں برداشت نہیں کر سکوں گا۔ اسی وقت اپنے آپ کو ختم کر لوں گا۔" انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے اپنے آنسو پونچھے تو انیسہ انہیں ششدر سی دیکھتی رہ گئیں۔ انہوں نے کبھی اجمل صاحب کو روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اپنی اتنی چاہنے والی ماں کے انتقال پر بھی وہ صبر و ضبط کی انتہا پر رہے تھے لیکن آج اپنی جوان بیٹی کے یوں اچانک چلے جانے نے انہیں ایسے توڑ دیا تھا جیسے کوئی مٹی کا کھلونا زمین پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ انہوں نے ہوٹل کے ارد گرد بھی بہت دور دور جا کر شہزادی کو ڈھونڈ ڈالا تھا لیکن وہ کہیں بھی نہیں ملی تھی۔ نہ جانے اسے زمین کھا گئی تھی یا آسمان...... کتنی لاڈلی بیٹی تھی شہزادی ان کی! اگر وہ اپنی ماں سے خفا ہو گئی تھی تو کم از کم اپنے باپ کی محبتوں کی لاج ہی رکھ لیتی۔ ہوٹل سے نکلتے وقت ایک بار ہی ان کے بارے میں سوچ لیتی...... پتا نہیں اس پر کیا گزری ہے...... کن ہاتھوں میں پہنچ گئی ہوگی وہ...... بہت برے برے خیالات اندھیرا بن کر ان کی آنکھوں کے سامنے چھا رہے تھے۔ انیسہ کو وہ اتنے بے بس اور مجبور دکھائی دیے کہ اپنا غم بھول کر وہ اٹھیں اور بے اختیار اجمل صاحب کو اپنے گلے لگا لیا اور پھر جیسے اجمل صاحب کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے وہ ایسی بے قراری سے روئے کہ انیسہ کو انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا...... پھر وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئیں۔ ان کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ ذرا سی آہٹ پر وہ چونک کر دروازے کی جانب دیکھتیں کہ شاید شہزادی واپس آ گئی ہو...... ہر گزرتا ہوا لمحہ ایک تیز دھار آلے کی طرح ان کے دلوں کو چیرتا ہوا آگے بڑھ جاتا تھا۔

"اجمل خدا کے لیے کچھ کیجیے...... چل کر تھانے میں رپورٹ ہی درج کرا دیں شاید وہ لوگ ہماری کچھ مدد کر سکیں۔" انہوں نے ہمت کر کے اجمل صاحب کو مخاطب کیا جو اب سر پکڑے پلنگ پر گم صم سے بیٹھے ہوئے تھے۔

"تم کیا سمجھتی ہو تھانے میں رپورٹ کرانے

سے شہزادی واپس آجائے گی؟ ارے وہاں مجھ سے ایسے، ایسے سوالات کیے جائیں گے کہ میں جیتے جی مرجاؤں گا...... کیا وہ یہ نہیں پوچھیں گے کہ وہ ہوٹل سے ایک دم کیسے غائب ہوگئی، وہ صاف کہہ دیں گے کہ تمہاری لڑکی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے، اغوا نہیں ہوئی...... ارے انیسہ یہاں نہ کوئی انصاف ہے اور نہ قانون اور میں اس بدنامی کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا...... ہماری رانی بھی برباد ہوجائے گی، انیسہ میں نے اپنے دامن پر ذرا سا بھی چھینٹا کبھی نہیں آنے دیا پھر اتنا بڑا داغ کیسے برداشت کروں گا...... بات پولیس سے فوراً اخبارات تک پہنچ جائے گی۔ اجمل صاحب کی بیٹی گھر سے بھاگ گئی ہر طرف اس خبر کا چرچا ہوگا اور میں سب سے منہ چھپاتا پھر رہا ہوں گا...... تم کسی سے بھی آنکھ ملا کر بات نہیں کرسکوگی...... پولیس میں جانا اپنی ذلت کو خود دعوت دینا ہے انیسہ بس اب کچھ نہیں ہوسکتا...... کچھ بھی نہیں ہوسکتا......" وہ ہسٹیریکل انداز میں بولتے ہی چلے گئے اور ایک بار پھر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ وہ قیامت کی رات ان بدنصیبوں پر بہت بھاری گزری تھی۔ ایک بیٹی نے اپنی عاقبت نا اندیشی سے انہیں بنا کسی خنجر کے ذبح کردیا تھا لیکن اسے اپنے ماں، باپ کی اذیت کا کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ صبح جب فجر کی اذان ہورہی تھی تو اجمل صاحب نے اپنی متورم آنکھیں اٹھا کر انیسہ کی جانب دیکھا۔

"سنو انیسہ میں نے ایک فیصلہ کیا ہے اور ہمیں اس پر فوری عمل کرنا ہے۔"

☆☆☆

اجالا کو وہ ائرپورٹ چھوڑنے نہیں جاسکا تھا کیونکہ وہی ٹائم اس کی شوٹنگ کا تھا گھر پر ہی اسے خدا حافظ کہہ کر وہ اسٹوڈیو چلا گیا تھا۔

"تمہارے آنے سے گھر میں بہت خوب صورت سی رونق بکھری ہوئی نظر آتی تھی۔ اب پھر وہی سناٹا اور عجیب سی بے رونقی چھا جائے گی یہاں پر۔" فاران کے لہجے میں چھپا دکھ محسوس کرکے اجالا نے افسوس بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"فاران یہ سناٹا، یہ بے رونقی سب دور ہوسکتے ہیں اگر تم چاہو...... پلیز تم لوگ ایسی غیر فطری زندگی مت گزارو...... تم نے زنیرا کو جس شدت سے چاہا تھا میں اس کی گواہ ہوں اور......"

"پلیز اجالا اس وقت میں صرف تمہاری بات کررہا تھا، یہ تم ہر بار زنیرا کا ٹاپک کیوں درمیان میں لے آتی ہو یہ چیپٹر اب کلوز ہوچکا ہے۔" فاران نے ناگواری سے اس کی بات کاٹتے ہوئے اسے ٹوکا تو وہ بس اسے دیکھ کر رہ گئی جبکہ دروازے سے اندر داخل ہوتی زنیرا کے دل پر اس کے جملے پھانس بن کر چبھے تھے لیکن بس ایک لمحے کے لیے......

"سنو اجالا، تمہیں شہزادی بھی خدا حافظ کہنا چاہ رہی ہے۔ ان دو دنوں میں وہ تم سے کافی کلوز ہوگئی ہے۔" وہ فاران کو یکسر نظر انداز کرکے اجالا کو بتانے لگی تو فاران کو ایک دم سے اپنے دل کی دھڑکنوں کے بے ترتیب ہونے کا احساس ہونے لگا۔ ان دو دنوں میں وہ اسے صرف کھانے کی ٹیبل پر ہی دیکھ سکا تھا...... سب کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے ایک ٹین ایجر کی طرح وہ اسے چوری چوری دیکھنے پر بھی ایک عجیب سی خوشی محسوس کرتا رہا تھا۔

"ارے ہاں تو اس کو یہیں بلالو ناں...... سارا وقت کمرے میں بند رہتی ہے۔" اجالا کے کہنے پر روشانہ جو اپنے فرینڈ کے جانے پر کچھ اپ سیٹ سی ہورہی تھی فوراً ہی دوڑتی ہوئی شہزادی کو بلانے چلی گئی۔

"یہ بھی اللہ کا شکر ہے کہ تمہارے جانے سے پہلے شہزادی میرے پاس آگئی ورنہ تو روشانہ نے مجھے بہت تنگ کردینا تھا۔ اس کی اور شہزادی کی ٹھیک ٹھاک دوستی ہوگئی ہے۔" زنیرا نے مسکراتے ہوئے کہا تو فاران کی نظریں ایک دم سے ہی سامنے سے

آتی ہوئی شہزادی پر اٹھ گئیں جو زنیرا کے دیے ہوئے گرین سوٹ میں کافی کھلی کھلی سی نظر آرہی تھی۔ وہ شاید ابھی نہا کر نکلی تھی گھنے بالوں کا آبشار اس کی پشت پر بکھرا ہوا تھا۔ رخساروں کا رنگ اتنا سرخ ہورہا تھا کہ فاران کو کافی ٹیبل پر رکھے ہوئے کشمیری سیبوں کا رنگ ماند محسوس ہونے لگا۔

"اُف خدایا، کتنی فیاضی سے اللہ نے اِسے اتنا حسن عطا کیا ہے۔" اس نے دل ہی دل میں اسے سراہا تھا۔ "تم سچ مچ حسن کی شہزادی ہی ہو...... جس نے بھی تمہارا یہ نام رکھا ہے بالکل ٹھیک کیا ہے۔" اس نے خاموش نگاہوں سے اس سے کہا تھا جو اس وقت اجالا سے گلے ملتے ہوئے اسے خدا حافظ کہہ رہی تھی۔

تبھی اسٹوڈیو سے فون آگیا۔ سب اس کا انتظار کررہے تھے...... فاران ایک بار پھر اجالا اور اس کے بچوں کو خدا حافظ کہتے ہوئے اپنی کار کی طرف مڑا۔

"سنیے......!" بے اختیار ہی شہزادی نے اسے پکارا تھا۔

فاران کے بڑھتے ہوئے قدم اس کی آواز پر رک گئے۔ اس نے مڑ کر شہزادی کو دیکھا۔

"آپ کی فلم تیرا میرا پیار امر...... بہت اچھی تھی۔ میں نے اور رانی نے رشیدہ آنٹی کے ساتھ جا کر دیکھی تھی۔ رشیدہ آنٹی آپ کی بہت بڑی فین ہیں۔" شہزادی کی معصومیت سے کی گئی یہ تعریف فاران کو دنیا کی سب سے قیمتی چیز لگی۔ ان دو دنوں میں تو وہ اپنے آپ میں گم اس سے اتنی انجان رہی تھی کہ فاران کو یہ صدمہ بھی رہا تھا کہ اس جیسے مشہور آرٹسٹ کو شہزادی نے پہچاننا تو دور کی بات شہزادی نے نگاہ بھر کر دیکھا بھی نہیں...... اور اس وقت شہزادی کو خود بھی اپنی بے ساختگی پر کچھ شرمندگی سی محسوس ہونے لگی...... جس پچویشن میں وہ ان کے گھر میں آئی تھی بھلا اسے فلم کی بات کرنا یا رشیدہ آنٹی کے بارے میں بتانا کوئی زیب دیتا تھا......! اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو سرزنش کی...... یہ ہی تو بری عادت تھی اس کی...... ہمیشہ ہی بنا سوچے سمجھے جلد بازی سے کام لے لیتی تھی...... اسے پتا ہی نہیں چلا کہ اس کی اس معصومیت کو سب ہی نے بہت انجوائے کیا ہے اور خاص طور پر وہ ہیرو جس کی فلم وہ بہت شوق سے دیکھنے گئی تھی۔ اماں کی کتنی خوشامدیں کی تھیں۔ رشیدہ آنٹی کی بھرپور سفارش پر اماں نے ان دونوں کو رشیدہ آنٹی اور ان کی فیملی کے ساتھ بھیج دیا تھا...... اور

شام کو ابا کے آنے سے قبل وہ لوٹ بھی آئی تھیں اور اب اسی فلم کا ہیرو اس کے جملوں کو اپنے دل میں اتارتے ہوئے بہت شاد ماں سا کار میں بیٹھ رہا تھا...... سیٹ پر بیٹھ کر اس نے اجالا کی طرف دیکھتے ہوئے الوداعی ہاتھ ہلا دیا پھر ایک لمحے کے لیے اس کی نظریں شہزادی کی طرف بھی اٹھیں جو اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ نگاہیں ملنے پر شہزادی نے گھبرا کر نظریں نیچی کرلیں...... کسی کو پتا بھی نہیں چلا لیکن وہ لمحہ جیسے ہمیشہ کے لیے فاران کی زندگی میں آکر ٹھہر گیا تھا۔

☆☆☆

اجالا کے چلے جانے کے بعد گھر میں کافی سناٹا سا چھایا ہوا محسوس ہو رہا تھا...... بچوں کی چھٹیاں ابھی باقی تھیں...... وہ اپنے دوستوں کے چلے جانے سے کچھ بور ضرور تھے لیکن شہزادی کی وجہ سے پھر بھی ان کا دل کافی بہل رہا تھا...... کمپیوٹر پر وہ اسے مختلف گیمز سکھاتے رہتے...... اس سے کہانیاں سننے میں بھی انہیں مزہ آتا تھا۔ زنیرا کو اس کی وجہ سے کافی ریلیف محسوس ہونے لگا تھا اور جب بچے ٹی وی پر اپنے فیورٹ پروگرامز دیکھنے میں بزی ہو جاتے تو شہزادی اس کے پاس آکر بیٹھ جاتی...... کچھ ہی دنوں میں وہ زنیرا کے بہت قریب آگئی تھی۔ اجالا کے جانے کے دوسرے ہی دن فاران کو آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے شہر سے باہر کچھ دنوں کے لیے جانا پڑ گیا تھا سو شہزادی اب زیادہ تر کمرے سے باہر ان لوگوں کے ساتھ ہی اپنا وقت گزار رہی تھی...... اسے زنیرا کی آنکھوں میں ہمیشہ ایک بے نام سا دکھ چھپا ہوا محسوس ہوتا تھا...... لیکن ابھی وہ اس سے اتنی فری نہیں ہوئی تھی کہ کچھ پوچھ سکتی۔ خود وہ بھی تو اپنے دل میں بہت سے اذیت ناک لمحات چھپائے ہوئے بیٹھی تھی...... اپنے ماں باپ کے گھر کو بنا بتائے اچانک چھوڑ دینا اس کا کوئی معمولی قدم تو نہیں تھا اور پھر ایک بہت بڑے جھوٹ کے سہارے اس گھر میں پناہ لینا ایک اور بڑا جرم تھا جو اگر کبھی کھل جاتا تو شاید اس سے یہ ٹھکانا فوراً ہی چھن جاتا...... اس کا کئی بار دل چاہا کہ اپنی ساری سچائیاں زنیرا کے سامنے آشکار کر کے اس سے کہے کہ باجی پلیز مجھے اپنی پناہ میں ہمیشہ کے لیے لے لیجیے...... لیکن لاکھ چاہنے کے باوجود اس کی ہمت نہ پڑتی...... اسے خود اپنے اوپر حیرت ہوئی تھی کہ آخر اس نے اتنا بڑا فیصلہ کر کیسے لیا...... کوئی بھی محبت اس کے پیروں کی زنجیر کیوں نہیں بن سکی...... پتا نہیں اماں کے دل پر کیا گزری ہوگی...... ابا کس اذیت سے گزرے ہوں گے...... رانی کی زندگی پر اس کے یوں اچانک غائب ہو جانے سے کیا اثر ہوا ہوگا...... تنہائی میں جب وہ یہ سب سوچتی تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ اپنی اس بھیانک غلطی پر شدید پشیمانی کا احساس ہونے لگتا...... لیکن اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا...... مایوسی میں کیے گئے فیصلے کتنے کمزور ہوتے ہیں اس کا احساس اسے تب ہوا جب پُل کے نیچے سے بہت سارا پانی بہہ چکا تھا۔ واپس جانے کا تصور ہی اس کے لیے بڑا بھیانک تھا...... جانتی تھی کہ اس کے ابا کو اپنی عزت کتنی پیاری ہے...... وہ اسے زندہ چھوڑ ہی نہیں سکتے تھے، یہ بھی اس کے ابا اور اماں کی کوئی نیکی ہی تھی کہ وہ اتنی اچھی فیملی سے آٹکرائی تھی...... لیکن آگے آنے والے دن اپنے دامن میں اس کے لیے کیا چھپا کر لانے والے تھے، یہ سوچ اسے بہت خوف زدہ کر دیتی تھی اور کل تو ایک دم سے ہی اس کا دل شدت سے چاہنے لگا تھا کہ وہ چپکے سے جا کر اپنے گھر میں جھانک کر تو دیکھے کہ اماں اور ابا کس حال میں ہیں...... اس کی اس گمشدگی نے ان پر کیا اثر ڈالا ہے...... خدانخواستہ اس کے ابا یا اماں کی طبیعت تو نہیں خراب ہوگئی...... لیکن وہ اس محلے میں کیسے جا سکتی تھی...... اب تو یہ بات سارے محلے میں مشہور ہوگئی ہوگی۔ کتنا تھو تھو کر رہے ہوں گے

سب اس کے نام پر...... جذبات اور غصے کا غلبہ آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا اور اب اسے سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ کتنی سنگین غلطی کر بیٹھی ہے...... بچپن میں سنا ہوا یہ محاورہ اب ہر دم اسے اپنا منہ چڑاتا ہوا محسوس ہوتا تھا کہ اب پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

''کیا سوچ رہی ہو شہزادی......؟'' زنیرا کی آواز پر اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کچھ نہیں باجی۔ بس ایسے ہی دل گھبرا رہا تھا۔'' وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

''جانتی ہو شہزادی تمہارے یہاں رہنے پر کراچی میں میرا پورا خاندان بہت پریشان ہو رہا تھا...... اِن فیکٹ آج کل کے حالات کی بنا پر سب ہی کا خیال تھا کہ مجھے پولیس اسٹیشن پر پہلے رپورٹ لکھوانی چاہیے...... لیکن مجھے اللہ اور پھر تمہاری معصوم صورت پر بھی ایک نا معلوم سا بھروسا محسوس ہو رہا تھا، میں تمہیں ہرگز پولیس والوں کی بھینٹ نہیں چڑھنے دینا چاہتی تھی اور دیکھ لیا سب نے کہ میرا تم پر یقین کتنا سچا تھا۔'' زنیرا کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت اور بھروسے کی چمک محسوس کر کے شہزادی کو ایک عجیب سی شرمندگی نے گھیر لیا...... دل چاہا کہ زنیرا کو سب کچھ سچ، سچ بتا دے لیکن بس وہ اسے بے بسی سے دیکھ کر رہ گئی۔

''شہزادی کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہاری خالہ تمہاری گمشدگی کی رپورٹ تھانے میں لکھوا دیں اور پھر ہم لوگوں کو کسی بڑی پرابلم کا سامنا کرنا پڑے؟''

اچانک ہی زنیرا کو اپنے ابو کی خفگی میں کہی گئی بات یاد آئی تو اس نے شہزادی سے پوچھ لیا...... اسلم صاحب نے اپنی بیٹی کی ٹھیک ٹھاک کلاس لی تھی شہزادی کے یہاں رہنے پر سب سے زیادہ مخالفت انہوں نے ہی کی تھی۔

''نہیں باجی، وہ کبھی بھی ایسا نہیں کریں گی۔''

شہزادی نے بہت وثوق سے انہیں یقین دلایا تو زنیرا ایک مطمئن سی مسکراہٹ کے ساتھ بچوں کی جانب متوجہ ہوگئی جو کسی بات پر آپس میں لڑ رہے تھے۔

☆☆☆

آج زنیرا کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ شہزادی نے اپنے ہاتھ سے اسے بہت مزے دار سا سوپ بنا کر پلا دیا پھر دیر تک اس کا سر دباتی رہی...... زنیرا کے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ اس کے سارے چھوٹے بڑے کام خود ہی سر انجام دیتی رہی اور اسے سارا دن بستر سے اٹھنے ہی نہیں دیا...... کتنی فکر مند لگ رہی تھی وہ زنیرا کے لیے بالکل ایسے ہی جیسے کبھی فاران ہوا کرتا تھا۔ وہ ہلکا سا بھی بیمار ہو جاتی تو فاران کی پریشانی دیدنی ہوتی...... آفس سے بار بار فون کر کے اس کی خیریت پوچھتا رہتا...... گھر میں ہوتا تو اس کے سارے کام اپنے ہاتھ سے کرتا، ناز برداری کی انتہا کر دیتا...... کبھی کبھی تو وہ بیزار ہو جاتی تھی لیکن اب سب کچھ بدل چکا تھا۔ نہ جانے کیوں بہت دنوں بعد فاران کا وہ پرانا روپ اسے ایک دم سے یاد آگیا حالانکہ اپنے حساب سے اب اس کے دل میں فاران کے لیے نہ کوئی جذبات رہے تھے اور نہ کوئی احساسات لیکن پھر بھی اچانک دل کے کسی گوشے میں چھپی اس دشمنِ جاں کی محبت چھم سے کیسے باہر آگئی۔ اس نے تو اجالا کی باتوں پر عمل کرتے ہوئے اپنے آپ کو ایک نئے وقت میں ڈھال لیا تھا پھر اس ذرا سے بخار نے اسے کیوں اتنا کمزور بنا دیا کہ دل فاران کے لیے ایک بار پھر مچل اٹھا۔ زنیرا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے...... شہزادی جو ابھی ابھی فریش جوس لے کر کمرے میں داخل ہوئی تھی ایک دم ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ جب سے یہاں آئی تھی اس نے پہلی بار زنیرا کو اتنا مضمحل دیکھا تھا اور اس پر مستزاد اس کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں نے شہزادی کو ہولا سا دیا۔

’’باجی کیا بات ہے...... آپ رو کیوں رہی ہیں۔ اس طرح آپ کا بخار بڑھ جائے گا...... پلیز باجی مجھے بتائیں سب ٹھیک ہے ناں......‘‘ شہزادی کے پریشان لہجے میں چھپی بے لوث محبت کو محسوس کرتے ہوئے زنیرا کا دل مزید بھر آیا...... شہزادی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ زنیرا کو کیسے چپ کرائے۔ اس کا تو اپنا دل ہر وقت سوکھے پتے کی طرح لرزتا رہتا تھا۔ ابا کی فکر، اماں کا خیال، رانی کی یاد اور اپنا ایسے سب کو چھوڑ کر آ جانا اسے ہر روز موت جیسی اذیت سے دوچار کرتا رہتا تھا...... سو اسی وقت زنیرا کے آنسو پونچھتے پونچھتے اسے پتا ہی نہیں چلا کہ اس کا اپنا چہرہ بھی اشکوں سے بالکل بھیگ چکا ہے۔ زنیرا نے اس کی غیر ہوتی ہوئی حالت کو محسوس کیا تو جلدی سے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اسے پیار سے ٹوکا۔

’’واہ پاگل لڑکی یہ تم مجھے تسلی دینے آئی تھیں؟ ذرا اپنی حالت تو دیکھو۔‘‘

’’میں ٹھیک ہوں باجی میری تو زندگی ہی آنسوؤں سے بنی ہوئی ہے لیکن آپ تو مجھے دنیا میں سب سے زیادہ خوش قسمت لگتی تھیں۔ آپ کا اتنا شان دار گھر، پیارے پیارے بچے اور اتنے مشہور ہیرو کی بیوی ہوتے ہوئے بھی اگر آپ خوش نہیں ہیں تو پھر میں بھلا کس کھاتے میں ہوں۔‘‘ شہزادی کو سچ مچ اسے اس طرح سے روتے ہوئے دیکھ کر بہت شاک لگا تھا۔

’’شہزادی کبھی کبھی انسان کو اپنے آنسوؤں پر مسکراہٹوں کا پردہ ڈال کر بھی جینا پڑتا ہے۔ تم نے... وہ شعر تو سنا ہی ہوگا کہ......

’’بتاؤں کہانی تمہیں اداس لوگوں کی
کبھی غور کرنا یہ ہنستے بہت ہیں‘‘

’’لیکن باجی مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کو میں اداس لوگوں میں کیسے شمار کروں...... سب کچھ تو ہے آپ کے پاس...... کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہے۔‘‘ شہزادی کی آنکھوں میں اب بھی بے یقینی کی کیفیت تھی۔

’’تم ابھی ان باتوں کو سمجھنے کے لیے بہت چھوٹی ہو شہزادی...... صرف ظاہری زندگی پر کبھی نہیں جانا چاہیے...... اس سے بڑا دھوکا کوئی اور نہیں ہوتا...... جانتی ہو میری زندگی میں جو سب سے بڑی کمی ہے وہ کس چیز کی ہے......؟‘‘ اس نے نم آنکھوں سے شہزادی کو دیکھا۔

’’کس چیز کی باجی......؟‘‘ شہزادی نے بہت بے تابی سے پوچھا۔

’’شوہر کے پیار، اس کی محبت، اس کی توجہ کی کمی...... وہ میرا ہوتے ہوئے بھی میرا نہیں...... ہم ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی ہیں...... شہزادی میں بالکل تنہا ہوں...... میں بہت بدقسمت عورت ہوں...... بہت ہی بدنصیب......‘‘ وہ بے اختیار رو دی...... شہزادی ایک سکتے کی سی کیفیت میں اسے دیکھ رہی تھی...... فاران کا ہنستا مسکراتا چہرہ اس کی شرارت سے جگمگاتی آنکھیں...... کتنی رونق سی بکھری ہوئی محسوس ہوتی تھی اس کے دم سے اس گھر میں...... وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں ہوتی تھی لیکن اس کے قہقہوں کی آواز اسے وہاں تک بھی آتی تھی...... لیکن اس وقت زنیرا کے انکشاف نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا...... اسے پتا ہی نہیں تھا کہ اس دنیا میں لوگ دُہری زندگی بھی جیتے ہیں، ایک اپنے لیے اور دوسری زندگی لوگوں کو دکھانے کے لیے ہوتی ہے۔ اس وقت زنیرا کو روتا ہوا دیکھ کر اسے اس بات کا ادراک ہوا تھا...... اور پھر اس دن زنیرا نے اس سے اپنے سب دکھ شیئر کرتے ہوئے جیسے اسے اپنی سونی دنیا میں ایک ہمدرد ایک مسیحا ایک دوست کی حیثیت سے شامل کر لیا...... شہزادی نے بھی زنیرا کی محبت کا حق کچھ اس طرح سے ادا کیا کہ اس دن کے بعد سے جیسے اس نے اپنی باجی کے ہر کام کی ذمے داری

اپنے سر پر لے لی...... اس کا دل بہلانے کے لیے نہ جانے کون، کون سے اوٹ پٹانگ قصے سنا کر اسے ہنساتی رہتی...... بچوں کی طرف سے تو بالکل ہی بری الذمہ کر دیا تھا اس نے زنیرا کو...... سارا دن شہزادی کی کمپنی میں کچھ اتنا اچھا گزر جاتا کہ اسے زیادہ سوچنے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ فاران کی محبت کو ایک بار پھر اس نے اپنے دل کے ایک تاریک گوشے میں دھکیلنے کی کامیاب کوشش کر ڈالی تھی۔ اس دن شہزادی جب سو کر اٹھی تو اسے اپنا آپ بہت بیٹھا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا۔ آج رات خواب میں اس نے اپنا گھر دیکھا جہاں وہ اپنے ابا اور اماں کے ساتھ کتنی ہنستی بولتی نظر آ رہی تھی۔ رانی کے ساتھ نوک جھوک پر جب اماں اس پر چلائی تھیں تب اچانک ہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی...... وہ بے اختیار اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دل چاہا ابھی اٹھ کر بھاگتی ہوئی جائے اور ابا کے قدموں سے لپٹ کر ان سے معافی مانگ لے...... اس وقت کچھ زیادہ ہی شدت سے اسے وہ سب لوگ یاد آ رہے تھے...... پتا نہیں ان سب پر اس کی اس حرکت سے کیا گزری...... خدانخواستہ ابا نے اپنے آپ کو کچھ کر نہ ڈالا ہو...... یہ خیال ایک دم سے آ کر جیسے اسے لرزا گیا...... وہ کافی دیر اپنے بیڈ پر بیٹھی اپنے آپ کو کوستی رہی...... آج اتوار تھا...... اور ابھی صبح کے صرف سات ہی بجے تھے۔ زنیرا اور بچے اپنے، اپنے کمروں میں سو رہے تھے۔ گھر میں گہرا سناٹا بکھرا ہوا تھا۔ اس نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے...... زنیرا نے اسے کئی نئے سوٹ سلوا کر دیے تھے۔ اس وقت ہلکے آسمانی سوٹ پر سیاہ چادر اوڑھتے ہوئے وہ لان میں نکل آئی۔ پرس میں ہزار، ہزار کے کچھ نوٹ بھی پڑے ہوئے تھے جو زنیرا نے زبردستی ڈال دیے تھے۔ پرس کاندھے پر ٹکائے وہ گیٹ کی طرف بڑھی۔ اس نے ہمت کر کے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آج وہ چادر سے اپنے آپ کو چھپا کر ایک بار اپنے محلے ضرور جائے گی اور چپکے سے اپنے گھر کا جائزہ بھی لے لے گی۔ کچھ نہ کچھ تو اسے پتا ہی چل جائے گا اور پھر وہ زنیرا اور بچوں کے اٹھنے سے پہلے ہی واپس بھی آ جائے گی اور آج اس نے یہ بھی طے کر لیا تھا اگر گھر میں اس کے ماں باپ اسے خیریت سے مل گئے تب وہ زنیرا کو ہر بات سچ، سچ بتا کر اسے اپنے اور ابا اماں کے درمیان وسیلہ بنائے گی۔ زنیرا باجی اگر اس کی پاک دامنی کی گواہی دیں تو ہو سکتا ہے کہ ابا اسے معاف کر دیں۔ اماں اسے گلے لگا لیں۔ سفارش کے لیے وہ روشانہ اور فرحان جیسے معصوم بچوں کو بھی اپنے ساتھ لے جائے گی پھر تو اماں اور ابا اسے معاف کرنے پر مجبور ہی ہو جائیں گے۔ وہ یہ سب سوچتے ہوئے گیٹ کے پاس پہنچی تو وہاں بیٹھے ہوئے دونوں لحیم شحیم گارڈز نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

’’کیا بات ہے بی بی...... اتنی صبح، صبح کہاں جا رہی ہو تم؟‘‘ ایک گارڈ نے کافی سخت لہجے میں پوچھا تو وہ کچھ نروس سی ہو گئی۔

’’بس ایسے ہی اپنی خالہ سے ملنے جا رہی تھی۔‘‘ اس کا لہجہ لڑکھڑا سا گیا۔

’’نہیں، ہمیں اس بات کا آرڈر ہے کہ تمہیں اکیلے بالکل باہر نہ جانے دیا جائے کیونکہ ابھی کسی کو نہیں پتا کہ تم کون ہو اور اصل میں کہاں سے آئی ہو۔‘‘ گارڈ نے گیٹ کھولنے سے انکار کرتے ہوئے وجہ بھی بیان کر ڈالی۔

’’اوہ تو گویا اب بھی اس پر نظر رکھی جا رہی تھی۔‘‘ وہ کچھ اپ سیٹ سی واپس لان میں آ گئی۔ سرخ گلابوں والی کیاری کے پاس بیٹھ کر اس نے سوچا کہ اب تو اسے زنیرا کو حقیقت بتانی ہی پڑے گی کہ اب اس سے مزید برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ انہی سوچوں میں غلطاں اسے پتا نہیں چلا کہ کب فاران کی کار سبک روی سے چلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ فاران

کی نظر گھر میں داخل ہوتے ہوئے اچانک ہی اس پر پڑی تھی۔ شہزادی کی پشت اس کی جانب تھی جس پر بکھرے اس کے سنہرے گھنے بال اس کی کمر سے نیچے آ رہے تھے۔ سیاہ چادر پاس ہی گھاس پر پڑی ہوئی تھی۔ آسمانی شیفون کے دوپٹے کو بے پروائی سے گلے میں ڈالے وہ بے خیالی میں ایک سرخ گلاب کو توڑ کر اس کی پتیاں نوچتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ وہ زنیرا کو کس طرح سے اپنی حقیقت سے آگاہ کرے۔

''سب خیریت تو ہے ناں اتنی صبح یہاں کیسے؟'' فاران کی آواز پر وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھی اور سامنے اسے کھڑا ہوا دیکھ کر جیسے اس کے باقی ماندہ ہوش بھی اُڑ گئے۔ اس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جلدی سے سلام کر ڈالا۔

اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے فاران نے بہت دلچسپی سے اس کے گھبرائے ہوئے معصوم سے چہرے کی جانب دیکھا...... شہزادی نے تیزی سے جھک کر گھاس پر پڑی ہوئی اپنی سیاہ چادر کو اٹھا کر اپنے سر سے اوڑھتے ہوئے جلدی سے اندر جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

''سنو مجھے گارڈ بتا رہا تھا کہ تم اپنی خالہ سے ملنے جانا چاہ رہی تھیں اور وہ بھی اتنے سویرے کیا...... کوئی خاص بات ہے۔؟ فاران کے سوال نے اس کے جاتے ہوئے قدموں کو روک دیا اس نے پلٹ کر فاران کی جانب دیکھا جو اس کے جواب کا منتظر تھا۔

''نہیں، کوئی خاص بات نہیں تھی۔ بس میں چپکے سے جا کر دیکھنا چاہ رہی تھی کہ میرے یوں چلے آنے سے وہاں سب کا کیا ری ایکشن ہوا ہوگا لیکن آپ کے گارڈ کو شاید مجھ پر شک ہے۔'' اس کے دل گرفتہ سے لہجے پر فاران نے فوراً ہی صفائی دی۔

''نہیں، نہیں بات شک کی نہیں اطمینان کی ہے...... کیا تم اپنے گھر میں کسی اجنبی کو بغیر جانے بوجھے اپنے گھر میں ٹھہرا سکتی ہو......؟ تمہارا لہجہ، تمہارے آنسو، تمہاری یہ معصوم صورت سب گواہی دے رہے تھے کہ تم کسی بری نیت سے ہمارے گھر میں پناہ نہیں لے رہی ہو بلکہ تم اپنے حالات سے مجبور ہو کر اس گھر میں پناہ لینا چاہتی ہو...... تبھی میں نے پولیس کے بجائے بس اپنے گارڈز کو کیئر فل ہونے کا کہہ دیا تھا۔'' وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے بہت تفصیل سے اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔ پتا نہیں اس کی نگاہوں میں کیسی وارفتگی تھی کہ شہزادی کے رخسار سرخ سے ہو گئے۔ وہ سوچا کرتی تھی کہ اگر اسے اپنا یہ فیورٹ ہیرو کبھی ملا تو وہ اس سے آٹوگراف ضرور لے گی جس پر رانی اس کا مذاق اُڑایا کرتی تھی کہ شہزادی بے چاری دن میں خواب دیکھتی ہے لیکن آج اس کا خواب حقیقت بن کر اس کے سامنے کھڑا تھا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے کترا رہی تھی۔

''سنو شہزادی تم اگر اپنی خالہ کے گھر جانا چاہتی ہو تو میری کار میں ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ...... کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا اور تم خاموشی سے جائزہ لے کر واپس آ جانا۔'' فاران کی بات پر ایک بے ساختہ سی خوشی اس کے چہرے پر بکھر گئی۔

''سچ میں چلی جاؤں؟'' اپنی بڑی، بڑی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے شہزادی نے اتنی معصومیت سے پوچھا کہ وہ دل سنبھالتا ہی رہ گیا۔

''ہاں لیکن واپس آنا ہے تمہیں!'' اس نے بہت گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے جیسے دل کی تمام شدتوں کے ساتھ کہا جسے شہزادی نے اپنی دھن میں محسوس ہی نہیں کیا...... ذہن میں تھا تو صرف یہ کہ ابا اور اماں بس خیریت سے ہوں۔

زنیرا اور فاران کی اس سرد جنگ میں شہزادی کیا نیا موڑ لے کر آتی ہے اس کے لیے پڑھیے اگلا حصہ

فریاد نہیں آنسو بھی نہیں

عروہ عالم

''آپی مبارک ہو۔'' وہ جیسے ہی کالج سے آئی فروا نے پُرجوش انداز میں اسے مبارک باد پیش کی۔

''کس بات کی مبارک باد دے رہی ہو؟'' اس کے ذہن میں فوری طور پر ایسی کوئی متوقع بات نہیں آئی جس کی مبارک باد کی امید ہو۔

''حدید بھائی آ گئے ہیں۔'' فروا نے نہایت خوش دلی سے بتایا تو ایک لمحے کے لیے اس کا دل دھڑک کے رہ گیا۔



"کون حدید بھائی؟" اس نے بے پروائی سے پوچھا اور آگے بڑھ گئی۔

"ارے کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ...... آپ کے خوابوں کے شہزادے اور سپنوں کے راجا حدید بھائی اور کون......"

"اچھا تمہیں بڑا پتا ہے میرے خوابوں اور سپنوں کا۔" وہ ناگواری سے کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی اور فروا وہیں کھڑی کندھے اچکا کے رہ گئی۔ اس نے دیکھا امی بھی بڑی خوش نظر آ رہی تھیں۔ وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔

"ہونہہ...... سپنوں کے راجا، خوابوں کے شہزادے، جس کی زندگی میں، میں نہیں، میرے خوابوں اور سپنوں میں وہ نہیں۔" اس نے بیگ پھینکنے والے انداز میں ٹیبل پر پٹخا اور خود بھی بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔

"حدید یزدانی میں تمہیں بھولنا چاہتی نہیں ہوں اور یاد رکھنے کے تم قابل نہیں ہو۔ تمہارے ساتھ خوشگوار یادیں تو نہیں ہیں لیکن خوشگوار رشتہ ضرور جڑا ہوا ہے، اپنے نام کی زنجیر سے مجھے باندھ کے بھول ہی گئے کہ کوئی لڑکی تمہاری منتظر بھی ہے اور اب تمہاری آمد کے مقصد سے بھی میں اچھی طرح واقف ہوں۔"

حدید یزدانی اس کے سگے تایازاد اور خالہ زاد تھے۔ ان کی پسند اور مرضی سے پانچ سال قبل ان کا اور فاکہہ کا نکاح ہوا تھا۔ دونوں خاندانوں میں خوشیاں چھا گئیں۔ بچوں کا آپس میں رشتہ جڑ جانے پر دونوں بھائی اور دونوں بہنیں خوش ہو گئیں۔ اس رشتے کی نسبت سے دونوں خاندان ایک دوسرے کے کچھ اور قریب آ گئے۔ حدید پڑھے لکھے خوبرو اور برسرِ روزگار تھے لہٰذا انکار کا کوئی جواز ہی نہیں بنتا تھا۔ فاکہہ نے بھی ماں باپ کے فیصلے پر رضامندی دے دی ورنہ اس نے بھی حدید کو جیون ساتھی بنانے کی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت تو اس کی نظر اپنی پڑھائی پر تھی وہ آئی آر میں ماسٹرز کر رہی تھی اور یہ اس کا آخری سال تھا۔ اس کا خواب لیکچرر شپ تھا۔ ابھی صرف نکاح ہوا تھا، رخصتی اگلے سال متوقع تھی۔ اس لیے وہ اپنی پڑھائی آرام سے کر سکتی تھی۔

حدید نے ناروے میں جاب کے لیے اپلائی کیا ہوا تھا اور نکاح کے فوراً بعد ناروے سے ان کی کال آ گئی یوں پندرہ دن کے اندر ہی اندر ان کے جانے کا بندوبست ہو گیا۔ جانے سے پہلے امی نے ان کے سب گھر والوں کی ایک شاندار سی دعوت کر ڈالی۔

"تم اچھی طرح تیار ہو جانا، ماشاء اللہ اب تمہارا نکاح ہو چکا ہے۔" امی کے کہنے پر اس نے دعوت والے دن خوب صورت سا پنک کلر کا کام والا سوٹ پہن لیا۔ ویسے تو وہ بہت بولڈ اور پریکٹیکل قسم کی لڑکی تھی لیکن اس وقت ایک فطری سی شرم اور جھجک اس پر غالب تھی۔ وہ بس سلام کرنے سب کے سامنے گئی تھی ورنہ ابھی تک کتراتی پھر رہی تھی۔ کھانے پر خالہ بلاتی رہ گئیں لیکن حدید کے خیال سے وہ نہیں گئی۔

"اچھا تو بھابی جان یہاں براجمان ہیں۔" کھانے کے بعد وہ سب کے لیے چائے بنا رہی تھی جب شمائلہ کچن میں اس کے پاس چلی آئی۔ اس کے بھابی کہنے پر شرم سے فاکہہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ نکاح کے بعد آج پہلی بار اسے کسی نے بھابی کہا تھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے، تم نے مجھے بھابی کیوں کہا ہے پہلے کی طرح میرا نام لو۔"

"ہرگز نہیں، پہلے تم میری بھابی نہیں تھیں اس لیے نام لیتی تھی اب تم میری بھابی بن چکی ہو اس لیے اب بھابی ہی کہوں گی۔"

"اچھا نند صاحبہ! آپ ڈرائنگ روم میں چلیے، میں چائے بھجوا رہی ہوں۔"

"بھجوا رہی ہوں سے کیا مطلب؟ سیدھی طرح سے خود لے کر آؤ۔ تمہاری سسرال والے آئے

ہیں کوئی مذاق نہیں ہے۔"

"اچھا، اچھا اب زیادہ رعب مت جھاڑو اور اندر چلو۔" فاکہہ نے ہاتھ پکڑ کے شمائلہ کو کچن سے نکالا اور ٹرالی فریال کے حوالے کر کے خود اپنے کمرے میں آ گئی۔ کل سے دعوت کی تیاریوں میں لگ کے وہ اپنے کمرے پر توجہ نہیں دے پائی تھی۔ رات وہ دیر تک پڑھتی رہی تھی اس لیے کتابیں ابھی تک بیڈ پر بکھری ہوئی تھیں۔ اس نے جلدی سے کتابوں کو سمیٹ کر ٹیبل پر رکھا بیڈ شیٹ ٹھیک کی اور جلدی جلدی صوفے کے کشن ٹھیک کرنے لگی کہ پیچھے سے کسی کے کھنکھارنے کی آواز آ گئی۔ پلٹ کر دیکھا تو حدید چائے کا کپ ہاتھ میں لیے کھڑے تھے۔

"تم تو سلام کر کے ایسی غائب ہوئیں کہ پھر نظر ہی نہیں آئیں۔ صرف سلام کرنے کی حد تک ہی تعلق ہے کیا؟"

"ابھی تو اتنا ہی تعلق ہے۔"

"تعلق تو خیر اس سے بہت زیادہ ہے یہ الگ بات ہے کہ تم نے اتنا ہی رکھا ہوا ہے۔"

"میرا رشتہ اب کچھ اس قسم کا بن گیا ہے کہ ابھی مجھے اتنا ہی تعلق رکھنا ہوگا اور پھر ہماری کچھ مذہبی اور معاشرتی اقدار اور پابندیاں ہیں، اس لیے معاشرے میں رہتے ہوئے انہیں بھی نبھانا پڑتا ہے۔ میں جانتی ہوں نکاح بہت مضبوط بندھن ہے مگر یہ بہت نازک رشتہ بھی ہے اور میں ہر رشتے کا احترام اس کے تقاضوں کے حساب سے کرتی ہوں۔ میں رشتوں کی ناقدری، بے حرمتی اور پامالی نہ تو خود کرتی ہوں اور نہ کسی اور کی طرف سے برداشت کر سکتی ہوں۔"

"ہوں، ویری گڈ...... اس کا مطلب ہے کہ تم سے رشتہ برقرار رکھنے کے لیے مجھے بہت احتیاط کرنی ہوگی۔"

"صرف رشتوں میں ہی نہیں...... باقی چیزوں میں بھی احتیاط کرنی چاہیے۔"

"تم تو مجھے کافی سخت لگ رہی ہو۔"

"نہیں، میں بالکل سخت نہیں ہوں لیکن یہ ہے کہ میں بغیر کسی وجہ کے کوئی ظلم، زیادتی اور کسی قسم کی کوئی غلط بات برداشت نہیں کر سکتی۔ میرا اصول ہے جو جرم اور غلطی میں نہیں کروں گی اس کی سزا بھی میں نہیں کاٹوں گی۔" اس نے بہت سختی سے کہا۔

"اچھا اگر مجھ سے کبھی کوئی غلطی ہو گئی تو مجھے معافی مل جائے گی؟"

"یہ تو غلطی پر منحصر ہے کہ قابلِ معافی ہو گی یا نہیں۔"

"غلطی جان بوجھ کر تو نہیں کی جاتی ہے یہ تو بس ہو جاتی ہے۔"

"ہو جانے والی زیادہ تر غلطیاں دوسروں کی وجہ سے اپنے حصے میں آتی ہیں اور کی جانے والی غلطیاں اپنی کوتاہی کے سبب جنم لیتی ہیں۔ صحیح وقت پر صحیح فیصلے کرنے کے لیے ہی اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دی ہے کہ وہ سوجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے اچھائی، برائی میں تمیز کر سکے۔"

"تمہاری باتیں ٹھیک ہیں لیکن پھر بھی انسان کو اپنے مزاج میں لچک رکھنی چاہیے اور اپنا دل و دماغ وسیع رکھنا چاہیے۔"

"ہاں، دل بڑا ضرور رکھنا چاہیے لیکن اچھائیوں کے لیے، برائیوں کے لیے ہرگز نہیں۔"

"ہر غلطی جرم تو نہیں ہو جاتی۔" وہ بھی اس سے بھرپور بحث کر رہے تھے۔

"لیکن ہر غلطی قابلِ معافی بھی نہیں ہوتی ہے۔"

"آپی! کھانا لگ گیا ہے جلدی سے آ جائیں۔" فریال کی آواز اسے ماضی سے حال میں کھینچ لائی۔ "اچھا تو حدید یزدانی شروع سے ہی تمہاری نیت خراب تھی غلطی تم سے نہیں ہم سے ہوئی جو عقل رکھتے ہوئے بھی تمہیں پرکھ نہیں سکے۔"

وہ کھانے کی ٹیبل پر آئی تو امی اور بہنیں بہت خوش تھیں۔

"کھانا کھا لو پھر نماز پڑھ کر شکرانے کے نفل ادا کرنا۔" امی نے بہت خوش دلی سے کہا۔

"شکرانے کے نفل کس بات کے لیے امی؟" فاکہہ نے اچنبھے سے پوچھا۔

"ارے تمہیں پتا نہیں چلا ماشاء اللہ خیر سے حدید واپس آ گیا ہے۔"

"تو اس میں شکرانے کے نفل ادا کرنے کی کیا بات ہے؟" اس نے کچھ برہمی اور ناگواری سے کہا۔

"تم تو پاگل ہو گئی ہو، وہ شوہر ہے تمہارا اتنے عرصے کے بعد اس کا واپس آ جانا خوشی کی بات نہیں ہے؟" امی نے تڑخ کے کہا۔

"وہ شوہر جس نے ایک بیوی کے ہوتے ہوئے یہاں سے جاتے ہی دوسری شادی کر لی اور پچھلے پانچ سال میں پوچھا تک نہیں۔"

"اس کی کوئی مجبوری ہو گی تو اس نے شادی کی ناں...... ورنہ وہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔"

"لیکن میری ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے کہ میں اس کے آنے پر شکرانے کے نفل ادا کروں۔" فاکہہ نے قطعی انداز میں کہا۔

"وہ اپنی غلطی پر شرمندہ ہے، اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔"

"اچھا غلطی کا احساس ہونے میں اور اس پر شرمندہ ہونے میں پانچ سال کا عرصہ کچھ مضحکہ خیز سی بات نہیں؟" وہ شدید تلخ ہوئی۔

"اچھا سب باتوں کو چھوڑو...... تم بیوی ہو اس کی وہ تمہارے پاس آیا ہے۔ اگر وہ نہیں آتا تو پھر ساری زندگی ایسے ہی بیٹھی رہتیں ناں؟" امی تلملا کے بولیں۔

"امی میں اب بھی جتنا عرصہ بیٹھی اس کے نام پر ہی بیٹھی لیکن اس کے لیے نہیں بیٹھی، یہ بات آپ اسے بھی بتا دیجیے گا اور اب بھی میں اس کے لیے نہیں بیٹھی ہوں۔ میں اب اس کا نام سننا بھی نہیں چاہتی...... لہٰذا آپ بھی اب میرے سامنے اس کا نام مت لیجیے گا۔"

پھر آئے دن گھر میں حدید کا ذکر ہونے لگا۔ ابو نے اس سے بات ضرور کی لیکن کوئی زور زبردستی نہیں کی۔ فیصلے کا پورا اختیار اسے دے دیا۔ وہ بھی جانتے تھے کہ ان کی بیٹی کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔

"آپا اور بھائی جان شادی کی تاریخ لینے کے لیے آنا چاہتے ہیں۔ آپ فاکہہ کو سمجھائیں کہ ضد اور حماقت چھوڑے اور شادی کے لیے تیار ہو جائے۔"

"دیکھو صوفیہ، میں اس کے ساتھ زبردستی ہرگز نہیں کروں گا تم اس سے بات کر لو اگر وہ اپنی خوشی اور مرضی سے راضی ہو جاتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، وہ کیا اتنی عقلمند ہو گئی ہے کہ اتنا اہم فیصلہ ہم اس کے ہاتھ میں دے دیں۔ ہم ماں باپ ہیں اس کے...... اس کا اچھا برا ہم سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔ ٹھیک ہے حدید نے کچھ غلط کیا ہے لیکن اب وہ سب کچھ ختم کر کے اس عورت کو چھوڑ کے یہاں آ گیا ہے۔"

"عورت کو چھوڑ کے آیا ہے لیکن عورت کی بچی کو تو ساتھ لے کے آیا ہے ناں۔"

"بچی اس کا خون ہے کیسے وہاں چھوڑ آتا اسے، کیسے نہ ساتھ لاتا۔ جس عورت نے گھر نہیں بسایا وہ بچی کو کیا پالتی؟" امی اپنے بھانجے کی حمایت ہی کرتی رہیں۔

"ویسے تو شاید فاکہہ شادی کے لیے تیار ہو جاتی لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ اب بچی کی موجودگی میں وہ ہرگز حدید کو قبول نہیں کرے گی۔"

"ارے اب قبولیت میں رہا ہی کیا ہے...... قول و اقرار سب ہو چکے ہیں اب صرف فاکہہ کا حدید کے پاس رخصت ہو کر جانا باقی رہ گیا ہے اور وہ

ہے کہ ضد پر اڑی ہوئی ہے۔ وہ حدید کی بیوی ہے حدید آئے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر لے جائے تو بتاؤ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ کس حق سے حدید کو اس کی بیوی کو لے جانے سے روک سکتے ہیں؟"

"چپ ہو جاؤ صوفیہ، ایسی فضول اور کمزور باتیں مت کرو۔ ایک تو وہ ہماری بیٹی سے نکاح کر کے وہاں جا کے شادی رچا کے بیٹھ گیا اوپر سے تم اسے خود پر شیر بنا کر خود کو کمزور اور بے بس ظاہر کر کے اسے اور شہ دے رہی ہو۔ تم کیسی ماں ہو ماں تو وہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی اس کی اولاد پر انگلی اٹھائے تو ہاتھ توڑ دے۔ زبان چلائے تو منہ توڑ دے اور آنکھ دکھائے تو آنکھیں نوچ لے، ماں تو خطرے کی صورت میں اپنی اولاد کو اپنے آنچل میں سمیٹ لیتی ہے۔"

صوفیہ کو میاں کی باتیں بہت بری لگیں۔ انہیں حدید سے بچپن سے ہی بہت محبت تھی اور اپنا بیٹا نہ ہونے کی صورت میں وہ اسے اپنا بیٹا ہی سمجھتی تھیں اور وہ ہر حال میں یہ رشتہ برقرار رکھنا چاہتی تھیں۔

"ہماری بیٹی ابھی ہمارے گھر میں ہے تو ہم بے بس ہو گئے اور اب وہ یہاں آیا ہے تو سارے حقوق اس کے ہاتھ میں آ گئے۔ اس نے ہمیں اتنا کمزور اور بے وقوف سمجھا ہوا ہے۔ پانچ سال تک اس نے نہیں پوچھا اس نے میری بچی کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر دوسری شادی رچا لی، وہ عورت چھوڑ کے بھاگ گئی تو یہاں آ گیا اپنا حق جتانے کے لیے...... اس نے ہمیں بالکل پاگل سمجھا ہوا ہے۔ بھابی اور بھائی جان کو منع کر دو وہ ہماری اجازت اور مرضی کے بغیر شادی کی تاریخ لینے نہ آئیں، میری بچی مجھ پر بھاری نہیں ہے۔ ارے جو ایک شادی نہیں چلا سکا وہ دوسری کیا چلائے گا میں تو اب اسے شادی کے قابل ہی نہیں سمجھتا۔"

میاں کی طرف سے تو ان کی نہایت حوصلہ شکنی ہوئی اب وہ جیسے تیسے فاکہہ کو ہی راضی کرنا چاہتی تھیں۔

ایک خواہش

رنگ بہاروں کے
تڑپاتے ہیں
رُلاتے ہیں...... یا
گدگداتے ہیں
پھول لہراتے ہیں
فضا مہکاتے ہیں
یاد دلاتے ہیں
وہ بیتے لمحے، جو
سنگ سنگ بتائے تھے
کیوں نہ
پھر لوٹ آتے ہیں
رنگ بہاروں کے

کاوش: طلعت رانا، چیچہ وطنی

"میں جلد از جلد تمہارے فرض سے فارغ ہونا چاہتی ہوں تمہارے بعد دو چھوٹی اور ہیں۔ مجھے ان کے لیے بھی سوچنا ہے۔" وہ کاپیاں چیک کر رہی تھی جب ہی امی آ گئیں۔

"کیا مطلب؟" فاکہہ نے ان کی طرف دیکھا۔

"تمہاری شادی کرنا چاہتی ہوں اور کیا مطلب ہے۔"

"جہاں آپ چاہتی ہیں وہاں تو ہرگز نہیں، یہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔"

"ایسا کیا غضب کر دیا حدید نے جو تم اس قدر چڑی بیٹھی ہو اس سے؟" امی چیخ پڑیں۔

"حدید نے غضب نہیں کیا بلکہ اس نے تو غضب سے بچایا ہے اور اب میں جان بوجھ کر اور دیکھ بھال کر اس کے غضب کا نشانہ نہیں بننا چاہتی۔"

"بہت سے مرد ہیں جو دوسری شادی کرتے ہیں اس نے کوئی جرم یا گناہ تو نہیں کیا۔"

"دوسری شادی کے بھی کچھ اصول اور قوانین ہوتے ہیں اور مجھ میں کوئی کمی کمزوری نہیں تھی جو اس نے مجھے ٹھکرا کر دوسری عورت کو اپنا لیا۔"

"شکر کرو کہ اس نے ابھی تک تمہیں اپنے نکاح میں رکھا ہوا ہے۔"

"شکر تو وہ کرے کہ میں نے ابھی تک اسے اپنے نکاح سے آزاد نہیں کیا ہے۔"

"ظاہر ہے کہ تم آزادی نہیں چاہتی ہو جبھی تو ابھی تک تم نے نکاح برقرار رکھا ہوا ہے۔"

"میں نے اب تک نکاح کو اس کے انتظار میں برقرار نہیں رکھا ہوا ہے بلکہ طلاق کو اس کے آنے تک روک کے رکھا ہوا ہے۔"

"کیا بکواس ہے یہ...... ہمارے خاندان میں لڑکی تو کیا ابھی تک کسی لڑکے کی بھی طلاق نہیں ہوئی ہے۔" صوفیہ تلملا گئیں۔

"ہمارے خاندان میں اب تک کسی لڑکے نے کسی لڑکی کو برباد کر کے دوسری شادی بھی نہیں کی تھی امی!"

"مرد کو دوسری شادی اور طلاق سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"بالکل، بے غیرتوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا ہے اور آپ کے بھانجے نے یہ دونوں ہی کام کر لیے دوسری شادی بھی کر لی اور اسے طلاق بھی دے دی اور اب مجھ سے شادی کرنے چلے آئے کیونکہ انہیں اپنی بچی پلوانی ہے۔"

"بچی پالنے کے لیے وہ ملازمہ بھی رکھ سکتا تھا، وہ تو تم سے محبت کرتا ہے اس لیے تمہاری محبت میں یہاں بھاگا چلا آیا ہے۔" امی مسلسل بودے جواز دے رہی تھیں۔

"میں نے تو سنا تھا کہ محبت اندھی ہوتی ہے لیکن آپ کے بھانجے نے بڑی عقلمند قسم کی محبت کی ہے۔ پانچ سال سے یہ محبت سوئی ہوئی تھی اور اب ضرورت کے وقت یہ محبت جاگ گئی۔ واہ بھئی واہ......" وہ نہایت تلخ ہو رہی تھی۔

"اس میں ضرورت کی کیا بات ہے، بیوی ہو اس کی وہ جب چاہے تمہیں لے جا سکتا ہے۔ وہ تمہارے اوپر حق رکھتا ہے شوہر ہے وہ تمہارا۔ وہ تمہاری اجازت اور مرضی کے بغیر بھی تمہیں لے جا سکتا ہے۔"

"منکوحہ ہونے کے ناتے میں بھی اس پر بہت حق رکھتی ہوں۔ اس سے اپنے پچھلے پانچ سال برباد ہونے کا حساب لے سکتی ہوں۔ میری مرضی اور اجازت کے بغیر دوسری شادی کے بارے میں بازپرس کر سکتی ہوں۔ مجھ سے رابطہ نہ رکھنے کے بارے میں سوال کر سکتی ہوں۔ جتنے حق وہ مجھ پر رکھتا ہے اتنے ہی حقوق میں اس پر رکھتی ہوں۔ اسلام نے عورت بنا کر مجھے کمزور نہیں بنایا ہے مجھے برابر کے حقوق دیے ہیں۔ میں اتنی کمزور اور وہ اتنا زورآور نہیں ہے کہ مجھے میری مرضی کے بغیر لے جائے۔"

"یہ مردوں کا معاشرہ ہے اور مرد اپنے لیے حدود و قیود نہیں مانتے۔ بس میں تمہاری اور تقریریں نہیں سنوں گی۔ تم ہوش میں آجاؤ کہیں تمہاری عقلمندی تمہیں ہی لے نہ ڈوبے۔ فضول کی ضد چھوڑو اور شادی کی تیاری کرو۔ تم پانچ سال سے بیٹھی ہوئی تھیں وہ تمہیں اپنانے آگیا ہے۔"

"میں پانچ سال سے بیٹھی ہوئی نہیں تھی، میں پانچ سال سے رکی ہوئی تھی۔"

"رکی ہوئی تھی سے کیا مطلب ہے؟" امی چونکیں۔

"میں فیصلہ کرنے کے لیے رکی ہوئی تھی۔"

"تمہیں گھر والوں کی، خاندان کی عزت، ذلت کا کوئی لحاظ نہیں؟"

"آپ کے بھانجے نے میری زندگی خراب کی اس نے گھر اور خاندان کی عزت کا کچھ خیال نہیں کیا...... میں اگر اپنے اوپر کیے گئے کسی ظلم کے خلاف کوئی قدم اٹھاؤں گی تو اس میں بھلا خاندان کیسے رسوا ہو جائے گا۔ اس کی دوسری شادی پر تو خاندان والوں کے منہ سے ہوا تک نہیں نکلی۔"

"میں نے پہلے بھی کہا ہے فاکہہ بات کو سمجھو، مرد تو دوسری، تیسری شادی کر ہی لیا کرتے ہیں لیکن عورتیں ان کے اقدام پر طلاق تھوڑی لیتی ہیں۔ عورت کے لیے طلاق لینا ایک دھبّا ہے ایک گالی ہے عورت کے لیے علیحدگی لینا ایک جرم بن جاتا ہے۔ جبھی تو ہم بھی پانچ سال سے خاموش تھے کہ ایک نہ ایک دن وہ تمہیں لینے ضرور آئے گا۔"

"اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا کوئی قانون دھبّا اور گالی نہیں ہے اور خلع کی صورت میں علیحدگی لینے کا اختیار اللہ تعالیٰ نے عورت کو دیا ہے۔ مرد کو چار شادیوں کی اجازت ضرور ہے لیکن پہلی بیوی سے اجازت لے کر اور وہ بھی مخصوص حالات میں جس کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ محض اپنی تفریحِ طبع کے لیے نہیں۔ جب وہ اللہ کا قانون توڑ کر بیوی کی اجازت اور مرضی کے بغیر شادی کر لیتے ہیں تو ان کے لیے تو یہ شادی دھبا اور گالی نہیں بنتی ہے وہ تو مجرم نہیں کہلاتے۔ میں جانتی ہوں حلال چیزوں میں سب سے ناپسندیدہ طلاق کا عمل ہے مگر طلاق لینا یا دینا حرام تو نہیں...... اگر نبھاؤ کی صورت نہ ہو تو پھر......؟" وہ امی کی مزید سنے بغیر وہاں سے ہٹ گئی۔

☆☆☆

آج چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے وہ اپنی الماری ٹھیک کر رہی تھی کہ فریال نے حدید کے آنے کی اطلاع دی۔

"مجھے کیوں بتا رہی ہو۔ امی گھر پر ہیں تو انہیں امی کے پاس لے جاؤ۔"

"میں ان سے نہیں تم سے ملنے آیا ہوں۔" اس کے کہتے ہی حدید جواب دیتا ہوا کمرے میں آگیا۔

"لیکن میں تو آپ سے نہیں ملنا چاہتی ہوں۔" پانچ سال بعد سامنا ہونے پر بھی فاکہہ نے کسی لگی لپٹی اور ہچکچاہٹ کا اظہار نہیں کیا۔

"میں یہی جاننا چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے ملنا کیوں نہیں چاہتیں؟"

"میں نے ضرورت نہیں سمجھی۔"

"میں تمہارا شوہر ہوں اور مجھ سے ملنے کے لیے کسی ضرورت کا ہونا ضروری نہیں۔"

"شوہر تو آپ پچھلے پانچ سال سے ہیں۔ جب ملنے کا خیال کیوں نہیں آیا؟"

"میں تم سے بحث کرنے نہیں آیا ہوں جو کچھ ہوا اس کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"جو کچھ ہوا ہے کیا اس کا ازالہ ہو سکتا ہے؟"

"ہاں کیوں نہیں۔"

"اچھا وہ کیسے، آپ تو لگتا ہے بڑی تیاری سے آئے ہیں۔"

"میں تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔" حدید نے کچھ آہستگی سے کہا۔

"کس بات کی معافی؟" فاکہہ نے کچھ چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"تم جانتی ہو!"

"مجھے نہیں پتا کہ آپ کس بات پر معذرت کر رہے ہیں۔"

"اس بات سے کیا مطلب ہے تمہارا؟" حدید نے کچھ جھنجلا کے کہا۔

"مجھے واقعی نہیں پتا اور معافی تو کسی کے ساتھ زیادتی کرنے پر مانگی جاتی ہے آپ نے میرے ساتھ کون سی زیادتی کی ہے جس کے لیے آپ کو معافی مانگنے میرے پاس آنا پڑا۔" فاکہہ بہت ٹھنڈے انداز میں بات کر رہی تھی اور حدید کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ طنز کر رہی ہے، مذاق اڑا رہی ہے یا واقعی وہ اس سے ناراض نہیں ہے۔

"مطلب، تم مجھ سے ناراض نہیں ہو؟"

"ہرگز نہیں۔" اس کا اطمینان ہنوز برقرار تھا۔
"یعنی تمہیں میرا شادی کرنا برا نہیں لگا؟"
"بالکل نہیں، شادی کرنا برائی کب سے بن گئی، چار کی گنجائش ہے ابھی تو آپ نے اپنا آدھا حق استعمال کیا ہے آدھا اب بھی باقی ہے۔" اس کے طنز کو شاید حدید نے کافی مشکل سے برداشت کیا۔
"اس کا مطلب ہے کہ تمہیں میری شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہوا؟"
"آپ شادی کر کے آگئے اور میں اعتراض بھی نہ کروں۔ اعتراض تو مجھے بالکل ہے۔"
"ابھی تو تم نے کہا ہے کہ چار کی اجازت ہے۔"
"وہ میرے کہنے سے نہیں ہے، وہ اللہ کا قانون ہے۔"
"جب اللہ کا قانون ہے تو تمہیں اعتراض کس بات پر ہے؟"
"دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی سے اجازت بھی اللہ کا قانون ہے۔ کیا آپ نے اس قانون کی پاسداری کی؟"
"اگر میں تم سے اجازت لیتا تو کیا تم اجازت دے دیتیں؟"
"تو گویا آپ کو میری طرف سے اجازت نہ ملنے کا خدشہ تھا اس لیے آپ نے قانون توڑ کر بغیر اجازت شادی کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔"
"بس ایسا ہو گیا سمجھو کہ اس وقت عقل نے ساتھ نہیں دیا۔"
"اچھا زندگی کا سب سے بڑا کام اور نہایت اہم فیصلہ آپ کی رضامندی اور عقلمندی کے بغیر ہو گیا اور آپ پانچ سال تک عقل و خرد اور مرضی کے بغیر زندگی گزارتے رہے؟" اس کے الفاظ بہت چبھتے ہوئے تھے حدید کچھ سٹپٹا گیا۔
"کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے لیکن بہرحال میں تم سے شرمندہ ہوں۔"

"آپ نے کوئی غیر شرعی، غیر قانونی، غیر اخلاقی حرکت نہیں کی ہے، آپ نے جو کچھ کیا شریعت کے مطابق کیا ہے اور میں اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین کو غلط قرار نہیں دے سکتی لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں اپنی ذات کی نفی بھی نہیں کر سکتی ہوں، میں اتنی ارزاں ہرگز نہیں ہوں کہ میرا شوہر دوسری شادی کرنے کے لیے مجھ سے اجازت لینا بھی مناسب نہ سمجھے۔ میں شادی شدہ اور ایک بچے کے باپ کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔"
"تم ایک کمزور عورت ہو مرد کے سہارے کے بغیر کیسے زندگی گزار سکتی ہو؟"
"مضبوط اور طاقتور مرد کو جنم دینے والی عورت کمزور کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ محض آپ مردوں کا خیال ہے۔ عورت صنفِ نازک ضرور ہے لیکن صرف نازک ہرگز نہیں۔ میں نے خلع کے لیے کیس داخل کر دیا ہے چند روز تک آپ کو نوٹس مل جائے گا۔"
"کیا؟" حدید ہکا بکا رہ گیا۔
"تم نے مجھ سے پوچھے بغیر میری اجازت اور مرضی جانے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا؟"
"مجھ سے پوچھے بغیر میری اجازت اور مرضی جانے بغیر آپ نے بھی تو بہت بڑا فیصلہ کر لیا تھا اور اس فیصلے کا حوصلہ تو آپ نے ہی مجھے دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فیصلے کی ساری ڈور مرد کے ہاتھ میں نہیں پکڑائی ہے اس کا کچھ حصہ عورت کو بھی تھمایا ہے۔"
"تم اپنے فیصلے پر بہت پچھتاؤ گی۔" حدید نے ایسے مواقع پر بولے جانے والے ایک فضول سے ڈائیلاگ کا سہارا لیا۔
"آپ عقل کے بغیر کیے گئے اپنے فیصلے پر نہیں پچھتائے تو میں عقل کے ساتھ کیے جانے والے فیصلے پر کیسے پشیمان ہو سکتی ہوں۔" اس نے کہا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

بند مٹھی

عقیلہ حق



اس کا شمار کامیاب عورتوں میں ہوتا تھا۔ کامیاب کہہ لیں یا خوش نصیب...... لوگوں کی نظر میں بیک وقت وہ ایک کامیاب عورت بھی تھی اور خوش نصیب بھی...... لیکن اپنے آرام دہ بستر پر بیٹھی ہاتھوں پر نائٹ کریم ملتے ہوئے وہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

''پتا ہے امی میری ساس بلکہ ساس ہی کیا پوری سسرال ہی آپ کے بارے میں کیا کہتی ہے؟'' زریں نے کھانے کے بعد کافی کے سپ لیتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں ماں سے کہا۔

''بھلا کیا کہتی ہیں تمہاری ساس؟'' انہوں نے بھی مسکراتے لہجے میں اپنی ہنستی مسکراتی بیٹی سے پوچھا۔

”پتا ہے کیا کہتی ہیں؟ پاپا آپ بھی سنیں ناں!“ زریں نے غور سے خبریں سننے میں مصروف اپنے والد عباد صاحب کو مخاطب کیا۔

”اوے بھئی بتا بھی دو۔ حد ہوتی ہے سسپنس پھیلانے کی...... کہیں انہوں نے تمہارے میک اپ کرنے پر پابندی تو عائد نہیں کردی بلکہ یہ جو تم ہر وقت ڈیزائنرز کے آؤٹ لیٹس پر نظر آتی ہو، تمہارے وہاں جانے پر پابندی لگادی ہے تو میری بہن زندگی میں یہ سب کچھ بھی ہوتا ہے لیکن خبردار تم کسی کی دھمکی میں نہ آنا اگر وہ تم سے بھتا مانگیں تو وہ بھی نہ دینا کیونکہ تم ایک پولیس آفیسر کی بہن ہو......“ حیدر جو عائشہ اور عباد صاحب کا بڑا بیٹا تھا اور محکمہ پولیس میں ایس ایس پی تھا...... نے کافی کے سپ لیتے ہوئے اپنی لاڈلی سی بہن زریں کو چھیڑا۔

”توبہ ہے بھائی توبہ...... کس قدر بولتے ہیں آپ...آپ کی باتیں سن کر تو کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ ایس ایس پی ہیں...... حد ہوگئی۔“ زریں جل ہی تو گئی۔

”جل گیا برنال لگائیں، کٹ گیا برنال لگائیں، کیڑے نے کاٹا برنال لگایئے۔ بوٹس کا برنال آج ہی گھر لائیں۔“ حیدر نے جلتی پر تیل چھڑکا۔

”جی نہیں، میں نہیں جلتی...... جلتی ہے میری جوتی۔“ زریں نے منہ بنایا۔ ”امی آپ دیکھ رہی ہیں بھائی کو، کتنا تنگ کرتے ہیں۔ لوگ تو اپنی بہنوں سے اتنا پیار کرتے ہیں اور ایک حیدر بھائی ہیں......“ زریں نے بچوں کی طرح منہ بسورا۔

”دوسروں کی بہنوں سے پیار کرتے ہیں۔“ حیدر زیر لب بڑبڑایا۔ عائشہ کے ہونٹوں پر ٹھہری ہوئی ممتا بھری مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔

عائشہ اور عباد کی کل کائنات یہی دو بچے ہی تو تھے۔ حیدر سول سروس کا امتحان پاس کرکے پولیس کے محکمے میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہوگیا تھا اور زریں میڈیکل کے دوسرے سال ہی میں تھی کہ اس کا ایک بہت اچھا رشتہ آگیا۔ عرفان، عباد صاحب کے اکلوتے دوست کا اکلوتا بیٹا تھا۔ شہر کے پوش علاقے میں اس کا اسپتال تھا اور وہ خود بھی ہارٹ سرجن تھا سو آگے تعلیم جاری رکھنے کا وعدہ لے کر محبتوں اور دعاؤں کے سائے میں زریں کو رخصت کردیا تھا اور آج زریں کافی دن بعد پورے دن کے لیے ماں باپ کے گھر آئی ہوئی تھی سو ہمیشہ کی طرح حیدر آج بھی اسے چھیڑ رہا تھا۔

ماں باپ کی شفقت و محبت اولاد کے پُرسکون چہروں اور ہنسی مذاق نے اس سیمنٹ اور اینٹوں کے مکان کو گھر بنادیا تھا اور عائشہ کی مکان سے گھر بننے کے سفر کی تھکن اولاد کی ہنسی میں جیسے گم ہوگئی۔

”حیدر بس اب خاموش رہو، بہن کو بات مکمل کرنے دو۔“ عائشہ نے آنکھوں میں پیار بھری خفگی بھر کر حیدر کو مصنوعی انداز میں ڈانٹا۔ زریں نے حیدر کو منہ چڑایا اور ماں کے نزدیک آکر بے حد محبت سے ان کے دونوں ہاتھوں کو اپنے سفید ہاتھوں میں تھامتے ہوئے بولی۔

”میری ساس کہتی ہیں، تمہاری امی بہت خوش نصیب ہیں۔ اللہ نے انہیں ایک مکمل زندگی دی ہے، ایسی زندگی جو ہزار خواہشوں کے باوجود ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔ تمہاری امی گھر، شوہر، اولاد ہر رشتے میں خوش نصیب رہیں، وہ زندگی کے ہر معاملے میں کامیاب رہیں۔ اللہ نے تمہاری امی کا نصیب سونے کے قلم سے لکھا ہے اور......“ زریں نہ جانے کیا، کیا کہہ رہی تھی لیکن انہیں تو کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ ان کے گرد لفظ خوش نصیب اور کامیاب ناچ رہے تھے۔ سونے کا قلم رو رہا تھا۔ ان کے اندر گھٹن بڑھنے لگی۔ سانس لینی دشوار ہوگئی۔ ان کی نظریں بے ساختہ شوہر کے چہرے پر جم سی گئیں۔

☆☆☆

وہ یعنی عائشہ رضا عام سی صورت شکل والی ایک مڈل کلاس گھرانے سے تعلق رکھنے والی عام سی لڑکی تھی...... جو دس بہن بھائیوں کے بیچ اپنے ماں باپ کو شاید کبھی نظر ہی نہیں آئی۔ وہ کب بڑی ہوئی اماں کو جب پتا چلا جب اس کے بدن پر کپڑے بہت چھوٹے لگنے لگے اور اس کا ایک جوڑے کا کپڑا تین میٹر کے بجائے پانچ میٹر آیا اور ابا کو اس وقت احساس ہوا جب اماں نے اس کے لیے بڑی سی چادر بنوانے کا ذکر ابا سے کیا۔

مڈل کلاس گھرانوں میں جہاں دس، دس بچے اللہ کی رحمت کے بجائے زحمت لگنے لگتے ہیں۔ ماں باپ کو تو شاید زندگی کی الجھنوں میں گھر کر بچوں کے نام بھی ترتیب وار یاد نہیں رہتے تو ایسے ماحول میں جہاں ضروریات بھی تعیشات لگتی ہوں وہاں اس کی کیا حیثیت ہوتی سو کیاری میں لگی خودرو جھاڑیوں کی طرح وہ بھی بڑی ہوتی چلی گئی اوپر سے گورے گورے خوب صورت بہن بھائیوں میں اس کی سانولی رنگت اور عام سے نقوش اس کی انفرادیت بن گئے۔ اسے اپنی یہ شناخت کبھی پسند نہیں آئی جب لوگ اس کی ماں سے کہتے۔

”ارے یہ بھی تمہاری بیٹی ہے؟“ تو اس کا دل چاہتا اماں جلدی سے کہیں۔

”اور کیا یہ میری بیٹی ہے۔ میری جان ہے، میری زندگی ہے۔“ لیکن اس لمحے اماں کے لہجے میں ایک عجیب سی محسوس کی جانے والی شرمندگی در آتی اور وہ زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے عجیب شرمندہ سے لہجے میں کہتیں۔

”ہاں، پتا نہیں یہ کس پر چلی گئی۔“ اور اماں کا یہ جواب اس کے دل پر کاری ضرب لگاتا۔ اس کا دل چاہتا اس کی اماں فخر سے مسکراتے ہوئے کہیں۔

”ہاں، یہ میری بیٹی ہے، میرا فخر ہے۔“ وہ سوچ کر رہ جاتی لیکن زبان سے کبھی شکوہ نہیں کرتی یا تو اسے شکوہ کرنے کی عادت ہی نہیں تھی یا اسے شکوہ کرنا آتا ہی نہیں تھا لیکن ہاں ان لمحوں میں وہ یہ ضرور سوچتی کہ وہ ایسا کیا کرے کہ اس کا ذکر اس کے ماں باپ کے لیے باعث فخر ہو۔

”مجھے کچھ ایسا ضرور کرنا ہے۔“ وہ دل میں عہد کرتی۔ خدا نے اسے ذہانت کی دولت سے خوب نوازا تھا سو وہ اس نعمت کے شکرانے کے طور پر نمازیں پڑھتی اچھی، اچھی کتابوں کا مطالعہ کرتی۔ ماں کا ہاتھ بٹاتی اور بالآخر اپنے پورے خاندان کی پہلی لڑکی ٹھہری جس نے ایم اے فارسی ادب میں کیا تھا۔

وقت کا کام گزرنا ہے اور وہ گزر ہی جاتا ہے اور وہ بھی وقت کی ڈولی پر سوار ہوکر باپ کی دہلیز سے عباد کی خواب گاہ میں پہنچادی گئی۔

عباد ابا کے دوست کا بیٹا تھا۔ خوبرو اور اعلیٰ تعلیم یافتہ جب اس کے لیے عباد کا رشتہ آیا تو اس کے ساتھ ساتھ سارے گھر والے بھی حیران رہ گئے اور سب کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”واقعی، جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔“

لیکن کون جانتا تھا کہ آسمانوں پر طے کیے گئے رشتوں کو زمین پر قائم رکھنے کے لیے کیا، کیا نہیں سہا جاتا۔

☆☆☆

شادی شدہ زندگی ایک مسلسل امتحان ہے۔ جہاں روز ایک نیا پرچہ حل کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ اس پرچے میں بہت سارے سوالات ان کہے اور ان سنے ہوتے ہیں۔ یہ بات بابل کے آنگن میں کھیلتی، بے فکری سے ہنستی، گہری نیند سوتی بیٹیاں کبھی نہیں سمجھ سکتیں۔ بابل کا آنگن چاہے کچا ہو، وہاں کی مٹی روز مومی چہروں کو گندا کرتی ہو، کتنا قیمتی ہوتا ہے...... یہ بات صرف وہی بیٹی جانتی ہے جسے نکاح کے تین بول بابل کی دہلیز پار کرواتے ہیں۔

☆☆☆

عائشہ جو زندگی بھر کے سینت سینت کر رکھے

ارمانوں کی گٹھڑی اٹھائے عباد کی خواب گاہ میں بیٹھی اس کے قدموں کی چاپ کا انتظار کررہی تھی۔ ساری رات انتظار ہی کرتی رہ گئی اور صبح عباد نے کسی بھی قسم کی رواداری کا خیال نہ کرتے ہوئے سرد لہجے میں بتایا کہ وہ ان پر زبردستی مسلط کی گئی ہے اور وہ اپنی کلاس فیلو شائلہ کو چاہتے ہیں اور اسے ہی چاہتے رہیں گے کیونکہ وہ بے حد خوب صورت ہے اور عائشہ جیسی عام سی لڑکی نہ ان کی آنکھوں کو بھائی ہے اور نہ ہی دل کو۔

''میں تم سے کبھی شادی نہیں کرتا لیکن میرے ابا نے مجھ سے پوچھے بغیر تمہارا رشتہ ڈال دیا اور جب میں نے منع کیا تو انہوں نے خود کو گولی مارنے کی دھمکی دی...... سو آج تم میری خواب گاہ میں ہو۔''

عباد نے عائشہ کی آنکھوں میں مچلتے سوالات کا جواب دیا اور عائشہ کا دل شرمندگی اور ندامت کے احساس سے رونے لگا۔

ہوتا ہے ناں زندگی میں بعض اوقات انسان دھاڑیں مار مار کر رو رہا ہوتا ہے اور آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ نہیں بہتا۔ ساتوں آسمان اس کے سر پر دھڑ دھڑ آگرتے ہیں اور کمرے میں کوئی بھی چیز اپنی جگہ سے نہیں ہلتی۔ ہوتا ہے ناں ایسا...... ہوتا ہے، اکثر ہوتا ہے، بس دیکھنے والی آنکھ ہونی چاہیے اور محسوس کرنے والا دل۔

☆☆☆

سیاہ کرنکل جارجٹ کا سوٹ جس پر سلور کامدانی ایسی پھیلی ہوئی تھی جیسے سیاہ اندھیری رات میں آسمان پر چمکتے ستارے۔ ہلکا ہلکا سا میک اپ، ناک میں سات ہیروں کی لشکارے مارتی لونگ، کمر پر لہراتی سیاہ چوٹی۔

''خیریت، کہاں کی تیاری ہے؟'' عباد نے سر سے پیر تک عائشہ کو دیکھتے ہوئے کھردرے لہجے میں پوچھا۔

''کچھ نہیں، کہیں کی تیاری نہیں۔'' عائشہ نے محبت سے مہکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تو پھر؟'' عباد کے ماتھے پر بل پڑے۔

''بس آپ کے لیے تیار ہوئی ہوں۔'' اس کی ماں نے ہمیشہ ہی کہا تھا صرف اپنے مرد کے لیے بجنا سنورنا عورت کے لیے باعثِ افتخار ہوتا ہے۔ نیک اور شریف عورت ہر روپ، ہر سنگار اپنے شوہر کے لیے ہی کرتی ہے اور آج عائشہ بہت دل سے اپنے شوہر کے لیے تیار ہوئی تھی۔ اس شوہر کے لیے جس کے دل میں اس کے لیے بالکل جگہ نہیں تھی۔ جس نے آج شادی کے کئی ماہ گزرنے کے باوجود اسے بیوی کی حیثیت نہیں دی تھی۔ عائشہ کے انداز میں محبت سے لپٹی ہوئی ایک آس تھی۔

''میرے لیے؟'' وہ چونکا۔ ''برائے مہربانی میرے لیے آئندہ کسی قسم کی تیاری مت کرنا۔ مجھے شدید ذہنی اذیت ہوتی ہے۔ شائلہ کو ہار سنگار، بجنا سنورنا بہت پسند تھا اور کسی اور کو سجا سنورا دیکھ کر میرے دل میں تکلیف ہوتی ہے۔'' وہ بے رحم لہجے میں گویا ہوئے۔ ''جائیں بدلیں یہ کپڑے۔ منہ دھوئیں مجھے یہ سب قطعی پسند نہیں۔'' عباد کا لہجہ پتھر برسا رہا تھا۔

''اللہ نصیب اچھا کرے، اللہ خوشیوں سے میری بچی کا دامن بھر دے۔ اللہ قدر دانوں سے واسطہ ڈالے۔ اللہ زندگی کا ہر سکھ دے۔ اللہ تم کو وہ بھی دے جو تم نے مانگا اور اللہ وہ بھی دے جو تم نے نہیں مانگا۔ ہر خواہش، ہر خوشی تمہاری دسترس میں ہو۔'' اماں کی دعائیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں اور آنکھیں خشک کہ رونا بھی عباد کو پسند نہ تھا۔

شادی کے کچھ دنوں بعد ہی وہ یہ بھول گئی تھی کہ اس کی پسند ناپسند کیا ہے لیکن ہاں وہ یہ ضرور جانتی تھی کہ عباد کیا پسند کرتا ہے، کیا نہیں اور وہ اسے ناپسند کرتا ہے...... وہ اچھی طرح جان چکی تھی۔ وہ اپنا بھرم دنیا کے سامنے نہیں کھونا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ بند مٹھی لاکھ کی کھل گئی تو خاک کی۔ اس نے اپنے اوپر مطمئن اور خوش حال عورت کا خول چڑھا لیا۔ ایک ایسا خول جس میں اس کا وجود چیختا رہتا۔

اپنے جسم کے جس حصے پر ہاتھ رکھتی ایک ٹیس سی اٹھتی لیکن وہ اس ٹیس کو ایک مسکراہٹ کے نیچے چھپا لیتی۔

وہ ارمانوں، آرزوؤں اور خواہشوں سے گندھی لڑکی اندر سے جیسے ختم ہوگئی۔ کہتے ہیں عورت زندگی کا ہر دکھ اور ہر تکلیف اپنے شوہر کی محبت کے سہارے خوشی خوشی سہہ لیتی ہے۔ مرد کی محبت میں عورت کے ٹو کی چوٹی بھی سر کرلیتی ہے لیکن ان چاہی عورت کو تو پھول بھی سخت مار دیتے ہیں۔ وہ بھی ایک ان چاہی عورت تھی۔ شوہر تو گو اسے دل میں نہ بسا سکا مگر سسرال والے بھی گھر اور دل میں بسانے میں کنجوسی ہی کرتے رہے، اسے آئے دن چھوٹے گھر کی کم صورت لڑکی جیسے طعنے سننا پڑتے۔

شائلہ ان کی شادی کے چند ماہ بعد ہی بیاہ کر کینیڈا چلی گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد اب عباد گھر میں نظر آنے لگے تھے مگر اس کی جدائی کے غم میں ڈوبے، اپنے وجود کو گھسیٹتے عباد اس کے حصے میں آئے تھے اور اس نامکمل عباد کو مکمل کرنے کے لیے اس نے ہر ہنر آزمایا۔

☆☆☆

سارا کمرا گلابوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ کمرے کی سینٹر ٹیبل پر دل کی شکل کا کیک رکھا ہوا تھا۔ کیک پر جلتی موم بتی گواہی دے رہی تھی کہ اسے جلانے والا یہیں آس پاس اس کمرے میں موجود ہے۔ عباد نے ذرا گردن موڑ کر دیکھا تو سفید لباس میں موتیا کے گجروں سے سجی پُرخلوص مسکراہٹ سجائے عائشہ کھڑی تھی۔

''خیریت، یہ سب کیا ہے؟'' عباد کا لہجہ عجیب کوفت زدہ تھا۔

''ارے، آپ بھول گئے، آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔'' عائشہ کے لہجے میں گندھی ہوئی محبت کی خواہش تھی۔

''اوہو...... تو یہ سانحہ آج کی تاریخ میں ہوا تھا؟'' عباد کا لہجہ پتھر برساتا ہوا تھا۔

ایک محبت کی خواہش، ایک مضبوط سائبان کی تمنا عورت کی عزتِ نفس کو کیسے کچلتی ہے کوئی عائشہ سے پوچھتا۔

''سانحہ؟'' وہ جیسے دنگ رہ گئی۔

''دیکھیے عائشہ...... ہوسکتا ہے یہ بات آپ کے لیے خوشی کا سبب ہو لیکن آئی ایم سوری میرے لیے تو یہ ایک سانحہ ہی ہے...... تو برائے مہربانی آپ کو جو خوشی منانی ہے، جو چراغاں کرنا ہے۔ اکیلے ہی کریں میرے سامنے کم از کم اس دن کی خوشی نہ منائیں جس دن شائلہ کو مجھ سے جدا کر کے زبردستی آپ کو میرے سر پر مسلط کردیا گیا تھا۔'' الفاظ تھے کہ پتھر عائشہ تمیز نہ کرسکی۔ وہ تو بس خاموش کھڑی سنگسار ہوتی رہی۔

''میں جانتی ہوں...... میں اپنی حیثیت آپ کی زندگی میں جانتی ہوں لیکن کیا کروں عباد میں نے ہر جذبہ، ہر لفظ صرف اپنے شوہر کے لیے اپنے دل میں سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ ایک ایسی عورت جسے شادی کی پہلی رات سے لے کر اب تک ایک بھی اپنائیت بھرا لمس یا محبت بھرا جملہ نہ ملا ہو۔ وہ عورت اندر سے کسی صحرا کی طرح پیاسی ہوتی ہے، آپ کیا جانیں۔ آپ جان ہی نہیں سکتے۔ میرے نصیب میں محبت نہیں پامالی ہے، میں بس یہ جان چکی ہوں۔'' عائشہ نے سسکتے ہوئے سوچا۔

☆☆☆

اس دن عباد کی باتوں نے اسے بہت رُلایا اور پھر اس نے سمجھوتے کی چادر اوڑھ لی اور گھر کے ایک کونے میں اپنی ساری خواہشیں اور ارمان دفن کردیے۔ اپنی چہکتی، مہکتی روح کو پھانسی دے دی۔ اپنے جہیز اور بری کے جوڑوں کو صندوقوں میں بند کرکے تالے لگا دیے تھے۔

عباد بالآخر ایک مرد تھا محبوبہ دور ہوئی تو عائشہ کے حق میں اتنا بہتر ہوا کہ وہ عباد کی بیوی بن چکی تھی۔ خدا نے اس پر رحم کیا اور وہ یکے بعد دیگرے دو پیارے، پیارے بچوں کی ماں بن گئی۔ اس نے من و سلویٰ کی طرح یہ خزانہ قبول کیا، اب وہ اپنے

سارے دکھ بھول گئی۔

☆☆☆

''کہاں کی تیاری ہے؟'' عباد نے دوپٹا استری کر کے ہینگر پر لٹکاتی عائشہ سے پوچھا۔

''مہینہ بھر سے زیادہ ہوگیا ہے میں سوچ رہی تھی کہ سارے کام نمٹا کر ذرا ابا کی طرف ہو آؤں۔ دو گھنٹے تک واپس آجاؤں گی۔ آپ بھول گئے شاید کل میں نے آپ کو بتایا بھی تھا۔'' عائشہ نے عباد کو یاد دلانے کی کوشش کی۔

''اچھا...... کہا ہوگا۔'' عباد کا لہجہ اجنبی تھا۔

''حسب عادت سنا ہی نہیں، حد ہوگئی بے قدری کی۔'' عائشہ ہمیشہ کی طرح صرف سوچ کر رہ گئی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا عورتوں کا اپنے میکے سے دل کیوں نہیں بھرتا۔ شادی نہیں ہوتی تو رات دن وظیفے پڑھتی ہیں، دعائیں کرتی ہیں اور جب مرغا پھنس جاتا ہے تو بھاگ، بھاگ کر میکے کی دوڑیں لگاتی ہیں۔ گھر بیٹھیں آرام سے، کوئی نہیں جارہا۔'' عباد نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''لیکن عباد میں تو مہینے میں صرف ایک بار ہی جاتی ہوں وہ بھی چند گھنٹوں کے لیے۔''

''تو......؟'' عباد نے درشت لہجے میں دبے دبے لفظوں میں احتجاج کرتی عائشہ کو ٹوکا۔

''پتا نہیں یہ مرد...... ہمیں ہماری جڑوں سے علیحدہ کیوں کرتے ہیں۔ کیا انہیں نہیں معلوم پودا زمین سے نکالو تو سوکھ جاتا ہے، مرجاتا ہے۔ ہم چاہے عمر کے کسی بھی حصے میں جا کھڑے ہوں بچے کتنے ہی بڑے ہوجائیں۔ بابل کا آنگن ہمیں روز یاد آتا ہے۔''

''کیا سوچ رہی ہیں؟'' عباد کی آواز اسے حال میں واپس لے آئی۔

''کچھ نہیں، کوئی بات نہیں آپ کا موڈ نہیں ہے تو نہیں جاتے۔ آپ بیٹھیں میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔ بچوں کو بھی منع کردیتی ہوں وہ تیار ہو رہے ہیں۔'' عائشہ نے دل کو پہنچنے والی تکلیف چھپا کر بظاہر نارمل انداز میں کہا۔

''بچوں سے کیا کہیں گی؟'' عباد کے سوال نے اس کے قدم روکے۔

''کہہ دوں گی کہ میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔'' اس نے کمرے سے نکلتے، نکلتے ایک لمحے کے لیے رک کر جواب دیا اور تیزی سے باہر نکل گئی کہ آنکھ میں امڈتے آنسو باہر آنے کے لیے راستہ ڈھونڈ رہے تھے۔

☆☆☆

ایک گھر کرنے کی خواہش عورت کو ضبط کے کیسے، کیسے مراحل سے گزارتی ہے یہ کوئی عورت سے پوچھے۔ خاندان کی عزت، ماں باپ کا مان، بچوں کی قربت، اپنی ذات کے بھرم اور ایک چھت کے لیے عورت کیا، کیا نہیں سہتی...... اس کے ناتواں کندھوں پر اپنی عزتوں کا بوجھ لاد کر رخصت کرنے والے کاش جان پاتے کہ ان کی پیاری بیٹیاں، بہنیں ان کی پگڑیوں کا مان رکھنے کے لیے کیا کچھ نہیں سہتیں۔ روٹی کا کیا ہے روٹی تو چیل کوؤں کو بھی مل جاتی ہے۔ عورت کو بھی مل ہی جاتی ہے۔

''شادی ہونے کے بعد لوگ یہ کیوں سمجھ لیتے ہیں کہ جس آنگن میں ہماری جڑیں پیوست ہوتی ہیں۔ نکاح کے دو بول اس آنگن سے ہماری جڑیں اکھاڑ دیتے ہیں لیکن یہ غلط ہے ایسا نہیں ہوتا۔ ہم لوگ ہمیشہ اپنے میکے کے آنگن ہی میں سانس لیتے ہیں۔ ہم میں سے ستر فی صد لڑکیاں زندگی باپ کے گھر میں گزارتی ہیں اور شوہر کے گھر میں دن گزرتے ہیں۔ زندگی گزارنے اور دن گزارنے میں بہت فرق ہوتا ہے اور وہ دن جو شوہر کے گھر میں گزرتے ہیں وہ بہت صبر، برداشت اور تحمل کی سلوں کے بوجھ تلے گزرنے کے بعد کبھی کبھی زندگی میں شمار ہونے لگتے ہیں۔'' اس کی کمر پر سرسراتے ہاتھ نے اسے مزید سوچنے سے روک دیا۔

اس نے کروٹ بدل لی کہ اس کے شوہر کو اس کی ضرورت تھی اور زندگی کی حقیقتوں کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی۔

☆☆☆

پھر جیسے اس نے اپنی زندگی سے سمجھوتا کرلیا۔ وہ بچوں میں، گھر میں مگن ہوگئی۔ وہ اپنے بچوں کو پڑھاتی، ان کے ساتھ کھیلتی، ان کے ساتھ ہنستی اور ان ہی کے ساتھ روتی...... وقت کا کام گزرنا ہے، وہ گزر ہی جاتا ہے اور اس طرح ہنستے کھیلتے، روتے سسکتے زندگی کے پچیس سال گزر گئے۔ اس کی بیٹی زریں ڈاکٹر بن گئی اور بیٹا ملازمت میں آگیا۔

زندگی میں بظاہر سکون اور اطمینان آ ہی گیا لیکن چاہے جانے کی خواہش آج بھی اس کے دل میں سر اٹھاتی اور جب اس کو عباد کی چاہت ملی تو......!

☆☆☆

''میں نے زندگی بھر عائشہ کے ساتھ کتنی زیادتی کی لیکن عائشہ کے ہونٹوں پر کبھی شکایت نہیں آئی۔ عائشہ بہت اچھی ہے، نیک سیرت ہے۔ عائشہ میں ہر وہ خوبی ہے جو نیک، وفادار اور سمجھدار بیوی میں ہونی چاہیے۔ میں زندگی بھر شمائلہ کو یاد کرکے آہیں بھرتا رہا اور وہ......''

''لیجیے سوپ تیار ہے۔'' عباد کی سوچوں کے تسلسل کو عائشہ کی آواز نے توڑا۔ ''کیا سوچ رہے ہیں؟'' اس نے سہارا دے کر عباد کو بٹھایا اور پھر اُن کی کمر کے پیچھے تکیہ لگا کر صحیح سے بٹھاتے ہوئے سوپ کا چمچ بھر کر اُن کے منہ کے قریب لے جاتے ہوئے اپنائیت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''آپ کتنی اچھی ہیں عائشہ اور میں...... میں کتنا بدنصیب کہ آپ کی قدر ہی نہیں کرسکا۔ آج سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ مجھے تو ہمیشہ ہی سے آپ سے محبت تھی لیکن اب یہ محبت عشق میں بدل گئی۔ بعض اوقات ہم کسی سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ وہ ہمارے وجود کا حصہ بن جاتا ہے اور ہم کو پتا ہی نہیں چلتا کہ اس کے بغیر ہمارا جینا محال ہے اور آپ...... آپ کے بغیر میں جی نہیں سکتا۔ مجھے آپ سے بہت محبت ہے، شدید محبت......!'' عباد اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑے اقرار کررہے تھے اور آنسو عائشہ کے چہرے کو بھگوتے ہوئے اس کے گریبان میں جذب ہورہے تھے۔

☆☆☆

کچھ ہی دن پہلے شمائلہ کینیڈا سے آئی تو عباد کا اور اس کا آمنا سامنا ایک تقریب میں ہوا۔ عباد جو شاید ایک رات بھی اسے یاد کیے بغیر نہ سویا تھا...... شمائلہ کے سامنے جا کھڑا ہوا صرف اس آس اور امید کے ساتھ کہ شمائلہ آج بھی اس سے اسی محبت اور وارفتگی سے ملے گی لیکن شمائلہ نے اسے پہچاننے سے ہی انکار کردیا۔

عباد کی محبت کا بت منہ کے بل گرا اور وہ گاڑی دوڑاتا ہوا گھر کی طرف واپس چلا...... اس گھر کی طرف جہاں عائشہ رہتی تھی، وہ عائشہ جسے اس طویل رفاقت میں کبھی اس کا محبت بھرا لمس بھی نہ ملا۔ جس کے ساتھ ضرورت نے وقتی محبت کا روپ دھارا اگر عائشہ نے اس کی محبت حاصل کرنے کے لیے ہر وہ کوشش کی جو ایک باوفا بیوی کرسکتی ہے۔

عائشہ کے پاس جانے کی اسے بہت جلدی تھی اور اسی جلدی نے اسے گھر کے بجائے اسپتال پہنچا دیا۔ اس کی ٹانگوں اور کمر پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ بستر پر تھا اور عائشہ دن رات اس کی خدمت گزاری میں مشغول تھی۔

کہتے ہیں جب رات اندھیری ہو تو سمجھو صبح قریب ہے۔ ہر رات کے بعد صبح ضرور ہوتی ہے۔ عائشہ کی زندگی میں بھی محبت بھری صبح طلوع ہوچکی تھی۔ اس کی محبت، اس کا صبر رنگ لے آیا تھا لیکن زندگی کے اس مقام پر جہاں نہ دل میں امنگیں تھیں نہ چاہے جانے کی خواہش انگڑائیاں لیتی تھیں۔ ہاں زندگی کے

اس موڑ پر جہاں محبت بھرا ماحول جوان بچوں کی آئندہ زندگی میں بننے والے رشتوں کی مضبوطی کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اس نے عباد کی محبت کو کھلے دل سے قبول کرتے ہوئے عباد کے سینے پر سر رکھ دیا۔

ہر چیز، ہر احساس کو محسوس کرنے کے لیے دل میں امنگ اور ہاتھ میں چند خوب صورت لمحے قید ہونے چاہئیں۔ اس کی زندگی میں محبت اور خوشیاں، جاڑے کی چاندنی کی طرح داخل ہوئیں جنہیں وہ محسوس تو کرتی تھی لیکن انجوائے نہیں۔

عباد بہت جلد صحت یاب ہوگیا۔ زندگی رواں دواں ہوگئی۔ عباد اس کا خیال رکھتا، اس سے محبت کرتا۔ اپنی کوتاہیوں پر کبھی معافی مانگتا اور کبھی تلافی کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ مسکرادیتی لیکن اس کا دل ان لمحوں کے لیے روتا جب اس کا دل عباد کے ساتھ سمندر کی گیلی ریت پر اس کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ننگے پیر دور تک چہل قدمی کرنے کے لیے مچلتا تھا اور اس وقت عباد اس کی پروا کیے بغیر دوستوں کی محفل میں قہقہے لگا رہا ہوتا۔ اس کی الماری کپڑوں سے زیورات سے میچنگ سینڈلز سے بھری پڑی تھی۔ اس کا دل مرگیا تھا لیکن زندگی جوان ہوگئی تھی۔

کہتے ہیں اللہ اپنے بندوں کو ان کی ہمت سے زیادہ دکھ نہیں دیتا لیکن ان کی اوقات سے زیادہ سکھ ضرور دیتا ہے۔ خدا نے اسے اس کے صبر کا بدلہ دے دیا تھا۔ وہ ایک چاہنے والے شوہر کی بیوی تھی وہ ایک بہت قابل بیٹی اور ایک پولیس افسر بیٹے کی ماں تھی لیکن وہ ایک عورت بھی تو تھی۔ اس کے اندر ایک عورت ہر وقت روتی رہتی، سسکتی رہتی، آہیں بھرتی اپنی جوانی کے رُل جانے پر ماتم کرتی۔ ساس، نندوں کی زیادتیوں کو یاد کرکے دہاڑیں مارتی۔ زندگی بھر پھانس کی طرح چبھی عباد کی ناکام محبت آج بھی اس کے سینے میں اپنی نوک چبھوتی لیکن وہ خاموشی سے اپنی بند مٹھی کو دیکھتی تو ہزار شکوؤں کے باوجود چپ ہوجاتی۔ اپنے بھرم کی پوٹلی اپنے سر پر رکھ کر آنکھوں میں اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو دل میں اتار کر دل میں سر اٹھاتے بہت سارے سوالوں کے جواب میں زور، زور سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے اپنے آپ سے کہتی۔

”میں بہت خوش ہوں...... میں ایک کامیاب عورت ہوں۔“ پھر جیسے کوئی اس کے کانوں میں سرگوشی کرتا اور کہتا۔

”ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔“ وہ پوچھتی ”اور کامیاب عورت کے پیچھے......“ تو سرگوشی میں جواب ملتا۔

”بظاہر ایک کامیاب عورت کے پیچھے بھی اپنی انا کو کچلتی، صبر کے گھونٹ پیتی، برداشت کی انتہا کو چھوتی عورت ہی کا ہاتھ ہوتا ہے۔“

سیاہ روشنائی سے لکھی گئی تقدیر کو سنہری روشنائی میں بدلنے میں عورت کی ساری عمر گزر جاتی ہے اور جب اسے سانس لینی بھی دوبھر لگنے لگے تو اس کی خواہشوں، آرزوؤں، ارمانوں کے مقبرے پر کھڑے ہوکر لوگ اس کے سینے پر ایک کامیاب عورت کا تمغہ لگا دیتے ہیں۔

☆☆☆

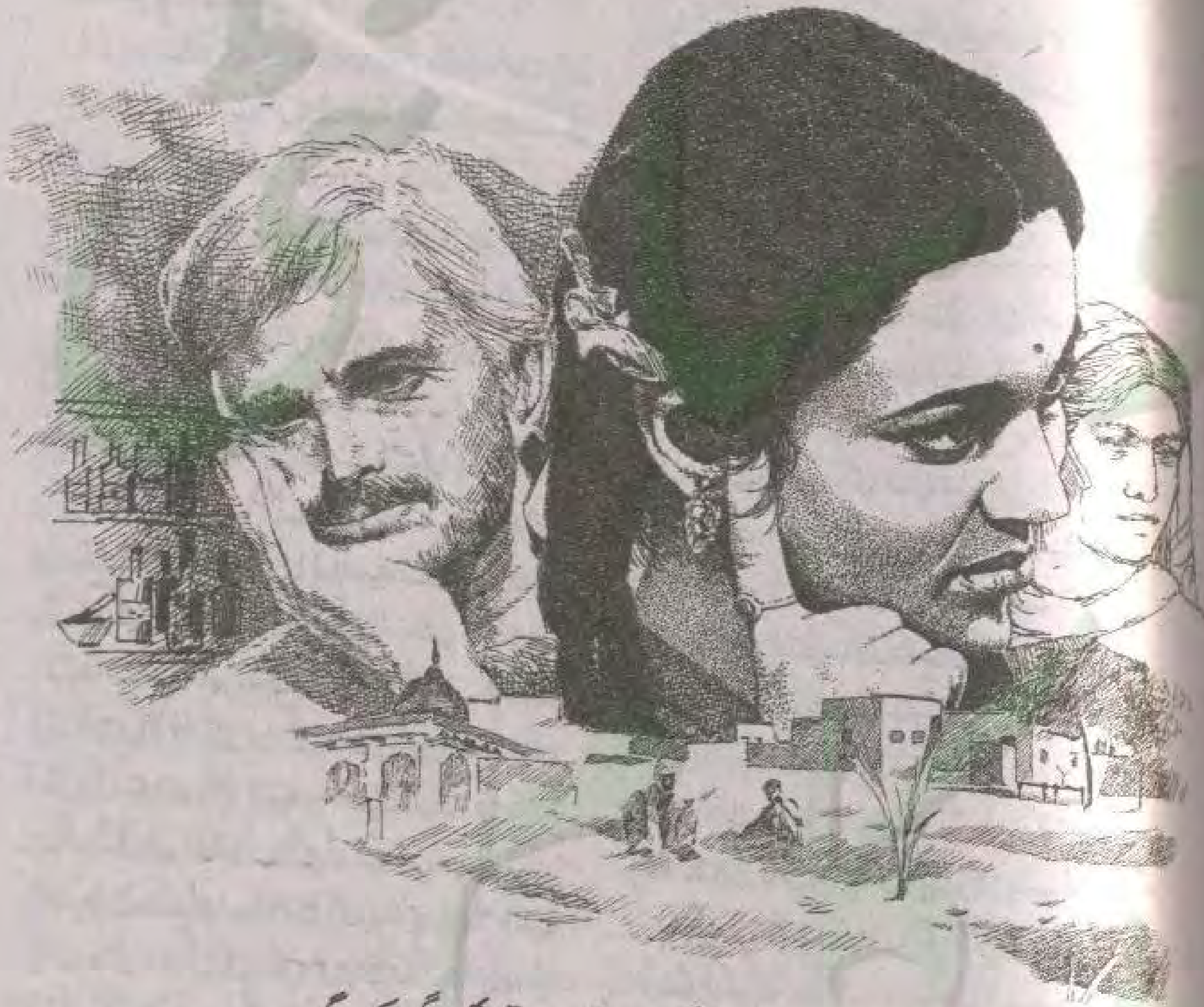
”ہاں...... بیٹا ساری زندگی ناکام گزارنے کے باوجود ساری دنیا مجھے ایک کامیاب عورت سمجھ سکتی ہے۔ ایک ایسی عورت جس کا نصیب شاید سونے کے قلم سے لکھا گیا ہے۔ ہاں میں ایک خوش نصیب عورت ہوں۔“ اس نے آئینے میں نظر آتے، منہ چڑاتے اپنے عکس سے کہا پھر ذرا گردن ترچھی کرکے بستر پر بے خبر سوتے شوہر کو دیکھا اور بالآخر اپنی جگہ لوٹ آئی۔ تکیے پر سر رکھتے ہوئے اس نے اپنی بند مٹھی کو دیکھا اور پھر نہ جانے کیسے اس کی آنکھ سے آنسوؤں کے دو قطرے نکلے اور ہر رات کی طرح خاموشی سے تکیے میں جذب ہوگئے۔



ناولٹ

رانجھے کی ہیر

بشریٰ گوندل



سیانے کہتے ہیں کہ دو برتن بھی اگر ایک جگہ رکھ دو تو وہ بھی آواز پیدا کرتے ہی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں بجتے رہتے ہیں تو پھر ایک ساتھ ایک چھت تلے صبح سے شام کردینے والے افراد کے مابین چھوٹی موٹی کھٹ پٹ ہوجانا کوئی غیر معمولی یا انوکھی بات نہیں ہے۔ ویسے تو لڑائی جھگڑوں کی آوازیں اس محلے کے ہر گھر سے سنائی دیتی تھیں لیکن ڈاکٹر رانجھا کے اس پونے چار مرلے کے گھر میں ہر

وقت معرکہ آرائی ہوتی۔ اس گھر میں مقیم ہیر اور رانجھا کے درمیان ازل سے جنگ جاری تھی...... مطلب جب سے ہیر اور رانجھا نے گھر بسایا تھا۔ وجہ دریافت کرنے پر ہیر بانگِ دہل کہتی۔

''کسی حاسد نے کچھ کیا ہوا ہے، مجھے پکا یقین ہے کہ یہ کالے جادو کے اثراتِ بد ہیں جو اس گھر میں بے سکونی ہے۔''

ہیر کے جنگی گولا بارود کے آگے رانجھا میاں زیادہ تر پسپائی اختیار کر لیتے اور شرافت سے اگلے کئی گھنٹوں کے لیے گھر ہی چھوڑ دیتے۔ کبھی تو بند دروازوں کے پیچھے سے آتی آوازوں پر باہر پبلک فقط آڈیو سے مستفید ہوتی تو بعض اوقات دروازہ دھاڑ سے کھول کے فوجیں جنگی سامان کے ہمراہ گلی میں آنکلتیں اور پبلک کو آڈیو کے ساتھ لائیو پروگرام بھی دیکھنے کا موقع ملتا پھر اگلے کئی روز تک گلی میں بکھرے برتن چن چن کر لوگ حقِ ہمسائیگی ادا کرتے اور اندر جا کر خانہ جنگی کے بعد کے تاثرات اور موجودہ صورتِ حال کا اچھی طرح جائزہ لے آتے۔

آپ نے ہیر رانجھا کی مثالی مشہورِ زمانہ محبت کی داستان تو ضرور سن رکھی ہوگی لیکن ایسی معرکہ آرائی کی روداد ہرگز نہیں...... ویسے آپس کی بات ہے اگر اصلی ہیر رانجھا نے بھی فراق میں مر کے محبت کو امر کرنے کے بجائے وصال کا چولا پہنا ہوتا تو ان کی ازدواجی زندگی بھی ایسی ہی ہنگامہ خیز ہوتی۔ یہ اہلِ محلہ کی مشترکہ رائے تھی۔

رانجھا صاحب کچھ دیر کے لیے اپنے کلینک سے گھر واپس آئے تھے اور دیواروں کی درازوں سے کان لگائے ہوئے شر پسند عناصر نے اپنی سماعتوں کو مزید الرٹ کر دیا اور دیواروں کے کان والا محاورہ سچ... ثابت کر دیا۔

بند دروازے کے پیچھے جنگ کا بگل بج چکا تھا اور فوجیں ہتھیاروں سے لیس میدان میں اتر چکی تھیں۔ ڈاکٹر رانجھا کی غصے سے لبالب آواز ابھری۔

''خدا جانے صبح ہی صبح کس کا منحوس چہرہ دیکھ لیا تھا کہ صبح کا آغاز ہی خراب ہوا ہے۔ اب مجھے پکا یقین ہے کہ میرا آج کا پورا دن ہی خراب گزرے گا۔''

''اور مجھے بھی سو فی صد یقین ہے کہ تم نے واش بیسن کے اوپر لٹکتے اس چٹخے ہوئے آئینے میں اپنی ہی شکل دیکھی ہوگی۔ پھر دن تو ظاہر ہے خراب ہی گزرے گا۔'' ہیر نے حقیقت پر مبنی انکشاف کیا۔

''کتنی دفعہ کہا ہے کہ اس ٹوٹے پھوٹے شیشے کی جگہ کوئی نواں لگا دو اس میں تو بندے کی شکل ہی ٹوٹی ٹوٹی نظر آتی ہے۔''

''شکل جیسی ہوگی ویسی ہی نظر آئے گی ناں۔'' رانجھا نے اگرچہ منہ ہی منہ میں کہا تھا مگر ہیر کی سماعتیں بھی خاصی تیز تھیں۔

''ہاں، ہاں دیکھی ہوئی ہیں سوہنی، سوہنی شکلیں تمہارے ٹبّروں کی بھی۔ صبح، صبح میرا منہ نہ کھلوانا۔'' ہیر نے وارننگ دی۔

''منہ تو چوبیس گھنٹے کھلا ہے، صبح اور شام کی کیا تفریق!'' رانجھا نے ہاتھ میں پکڑے کپ میں بچ جانے والی چائے فرش پر انڈیل کر ہیر کے غصے کے بھڑکتے شعلوں پر تیل ڈال دیا۔

''کچھ تو دھیان کیا کرو تمہاری تو مت ماری گئی ہے۔ بالکل ہی سٹھیا گئے ہو۔ ابھی ابھی میں نے فرش پر ٹاکی لگائی تھی۔''

''ہاں تو فرش میرے ہی گھر کا ہے کوئی تمہارے پچھلوں کا تھوڑی ہے۔'' رانجھا اس کی بات پر چمک کر بولا۔

''خیر سے صلا میرے پچھلوں کے فرش ایسے گھٹیا اور بدرنگ ہیں بھی نہیں۔'' ہیر نے بھی ترکی بہ ترکی کہا۔

''نہیں وہاں تو جیسے ماربل اور سنگِ مرمر لگا ہوا ہے ناں۔ بھول گئیں تم اپنے میکے کا صحن جس کے عین وسط میں گٹر ابلتا رہتا ہے ہر وقت۔'' چائے کے داغ پر جھنجھناتی مکھیوں کو اُڑا کر پوچا لگاتی ہیر تلملا کر پلٹی۔

''اور یہ جو تمہاری گلی میں دروازے کے سامنے ہر وقت گٹر ابلتا رہتا ہے اس میں سے کون سی خوشبوئیں تمہاری سانسوں کو مہکاتی ہیں۔'' ہیر اب دھونے والے برتن کھرے میں پٹخ کے اندر کا غبار نکال رہی تھی اور ساتھ ساتھ بڑبڑا رہی تھی۔ ''صبح، صبح سارا موڈ خراب کر دیا۔''

''اچھا، پہلے کون سا تم نے راگ دیپک چھیڑا ہوا تھا۔'' دو تکیے جوڑ کر نیم دراز ہوتے ہوئے رانجھا نے کہا۔

''میں کیوں راگ چھیڑنے لگی، کسی میراثیوں کے خاندان کی نہیں ہوں میں۔ سارے پنڈ میں سب سے شریف اور معزز خاندان ہے ہمارا۔''

''ہاں، اسی خاندانی ہونے کے بھلیکے نے تو میرے بہشتی ابا کی عقل پر پردے ڈال دیے تھے اور میرے نصیبوں پر راکھ۔ جب تمہارے بوہے پہ مج بندھی ہوئی دیکھی تو سوچا کھاتے پیتے لوگ ہوں گے وہ تو بعد میں پتا لگا کہ ابا حضور کو مغالطہ ہوا تھا اور مج تو پڑوسیوں کی تھی جو انہوں نے اپنی بیٹی کو واج میں دینے کے لیے خریدی تھی۔ اماں بہشتن کو مرتے دم تک اس بات کا دکھ تھا کہ لگے ہاتھوں اس وقت گوانڈیوں کے گھر میں بھی جھاتی ڈال لیتے مگر قسمت چنگی ہوتی تب ناں۔'' دونوں میں بھلا چنگا معرکہ شروع ہو چکا تھا۔

ہیر نے اگلی پچھلی ساری کسر نکال دی تھی اور اب ڈاکٹر رانجھا کی ڈگریاں گنوا رہی تھی۔

''میری اماں بہشتن کہا کرتیں کہ ڈاکٹر لڑکا ہے زندگی کے ساہ سکھی رہیں گے مگر اماں نمانی کو کیا پتا تھا۔'' اب کے ہیر کا لہجہ رقت آمیز ہو گیا اور برتن مانجھتے ہاتھوں میں مزید تیزی آگئی۔

''جب نصیب ہی ماڑے ہوں تو آنکھوں پر ایسے ہی پٹی بندھ جاتی ہے ورنہ میرے کتنے ہی رشتے آئے تھے ان دنوں، ایک سے ایک پڑھے لکھے افسر آدمی کا رشتہ...... رشتوں کی کوئی تھوڑ نہیں تھی۔'' ہیر کسی بھولی بسری یاد کے صحرا میں بھٹکی تو رانجھا کو تیر پھینکنے کا موقع ملا۔

''ہاں...... پڑھے لکھے رشتے...... ہ گاؤں کے پرائمری اسکول سے پانچ جماعتوں کا سرٹیفکیٹ لے کر خود کو پڑھا لکھا ہی کہلاتے ہوں گے وہ لوگ۔''

''چلو...... پانچ جماعتوں کا سرٹیفکیٹ ہی سہی، کوئی تعلیمی سند تو تھی ناں ان کے پاس...... چٹا ان پڑھ ڈاکٹر میں نے زندگی میں پہلی واری تمہاری شکل میں ہی دیکھا۔''

اب کے ڈاکٹر رانجھا ذرا سا کھسیا گیا۔

''علم اور تجربہ ڈگریوں کا محتاج نہیں ہوتا میں نے جن سے ڈاکٹری کی تعلیم لی ہے وہ بڑے......''

''چل رہن دے، کئی واری یہ قصہ سن چکی ہوں۔'' ہیر نے رانجھے کی بات ادھوری کر دی۔

''ویسے بھی یہ کہانی مجھے ازبر ہو چکی ہے کہ تین چار سال تم نے جن کے ساتھ بطور کمپوڈر (کمپاؤنڈر) کام کیا ہے وہ بڑے جانے مانے حکیم تھے جن کے پاس پھکیاں کوٹتے، معجون کی ڈبیاں بھرتے اور شربت کی بوتلیں لبالب بھرتے ہوئے تم نے دیسی حکمت کے ساتھ انگریزی ڈاکٹری بھی سیکھ لی، ہونہہ...... نیم حکیم اور خطرۂ جاں، ہر وقت خدا جانے کیا گند بلا کوٹتے رہتے ہو تم۔ میں پوچھتی ہوں کہ خوفِ خدا نہیں آتا تمہیں کہ حشر والے دن پکڑے جاؤ گے جب ایک ہزار ایک بندہ آجائے گا دعویٰ لے کر اور اپنی، اپنی موت کا ذمے دار تمہیں ٹھہرائے گا۔''

''او پاگلے کبھی دیکھ آ کے اُدھر کلینک میں۔ اللہ نے کیسی شفا دی ہے میرے ہاتھ میں۔ کتنے مریض آتے ہیں کتنا رش ہوتا ہے، جمگھٹا لگا رہتا ہے سارا دن۔ وہ سارے کے سارے کیا پاگل ہیں؟''

''تو بھی کسی دن قبرستان میں جا کے بیٹھ کر دیکھ کتنے جنازے آتے ہیں۔'' وہ بھی ہار ماننے والی کہاں تھی۔

''ہاں تو ان سب کی موت کا ذمے دار میں

تھوڑی ہوں اکیلا......تو سب فوت شدگان کو میرے کھاتے میں ڈال رہی ہے اور ان میں سے کچھ طبعی عمر پوری کر کے بھی تو مرے ہوں گے۔ موت سے کس کو رُستگاری ہے۔ آج وہ "کل" تمہاری "باری ہے۔"

رانجھا نے بھی مصرعے میں اپنے حساب سے تبدیلی کر ڈالی۔ ڈاکٹر رانجھا واش بیسن کے کئی ٹکڑوں میں تقسیم چٹخے ہوئے آئینے کے سامنے ہو کر اپنی دورنگی داڑھی میں کنگھا کرتے ہوئے گنگنایا۔ اب ہیر خدا جانے لڑلڑ کر تھک چکی تھی یا رانجھا کی گنگناہٹ سن نہ پائی تھی یا شاید جواب دینا ضروری نہ سمجھا تو خاموش رہی۔ داڑھی کو اچھی طرح سنوار چکنے کے بعد اس نے آئینے کے پس منظر میں صحن کے بیچ و بیچ کھیس تان کر سوئے دو نفوس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ دونوں جو سواری اور مال برداری کے تمام جانور بیچ کر ہر وقت سوئے رہتے ہیں، کبھی ان کو بھی جگا دیا کرو جو ابھی تک دھوپ سینک رہے ہیں، میرے ساتھ ہی ہر وقت متھا لگائے رہتی ہو۔"

"وے......" اب کے ہیر کی توجہ پوری کی پوری چارپائیوں پر کروٹیں بدلتے گڈو اور شہزادی پر ہوگئی۔ جو نیند پوری کر چکے تھے اور بڑی دیر سے جاگتے ہوئے دونوں کی لڑائی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"وے گڈو، وے بیڑا اتر جائے تیرا شالا......تو نے بھی مجھے اسی طرح کے سکھ دکھانے ہیں جیسے تیرے پیو نے دکھائے ہیں۔ اٹھ جا وے کسی پوستی کی اولاد نہ ہو تو۔" اس الزام پر ڈاکٹر رانجھا نے اچھا خاصا پہلو بدلا مگر جانے کیوں جواب دینے سے گریز کیا۔

"اسے بھی دوپہر تک سونے کی عادت ہے اپنے نانکوں کی طرح۔" رانجھا نے جانے کس بات کا بدلا اتارا۔

"تم ہر بات میں میرا میکا کیوں گھسیٹ لاتے ہو؟" ہیر بری طرح تلملائی۔

"ان کی طرف بڑا پرانا حساب کتاب نکلتا ہے اس لیے......میرا بس چلے تو دھوکا دہی کے الزام میں انہیں اندر کروادوں۔"

"تم اندر کراؤ اپنے اگلوں اور پچھلوں کو۔" ہیر کے غصے کی آنچ پھر بھڑکی۔ "تمہارا خاندان ہے ہی اندر کروانے جوگا...... ایک سے ایک بدمعاش بیٹھا ہوا ہے، یاد نہیں تمہارا پھوپھڑ......وہی حضرت پیر صاحب جن کی پیری اور فقیری کے تم بھی بڑے قائل تھے ایک زمانے میں۔ وہ جو اپنی ہی مریدنی کے ساتھ فرار ہوگیا اور اس نمانی کے آدھا درجن بچے ماں کے وچھوڑے پر بلکتے رہے۔"

"ہاں تو وہ نمانی بھی تو برابر کی قصوروار تھی اور نہیں تو اپنے آدھا درجن بچوں کا ہی خیال کر لیتی۔"

"خیال کہاں رہا ہوگا اس (گالی) کو کالے جادو اور سفلی عمل نے مت ماردی ہوگی وچاری کی۔"

"تمہاری کھوپڑی ہی الٹی ہے، تمہارے ساتھ متھا ماری ہے ہی فضول۔" رانجھا گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں کلینک جا رہا ہوں اور اپنے لاڈلے کو بھی اٹھا دے اور اسے سمجھا کہ میرے ساتھ بیٹھ کے کام سیکھنا شروع کر دے۔"

"ہونہہ...... کام سیکھنا تو تم ایسے کہہ رہے ہو جیسے ڈاکٹری کوئی درزی کا یا نائی کا کام ہے کہ دو چار دن سیکھے گا تو سرجن بن جائے گا۔ تمہیں ہی مبارک ہو یہ موت کا کاروبار......تم نے تو لگتا ہے حضرت عزرائیلؑ سے کوئی سودے بازی کی ہوئی ہے۔"

"استغفراللہ!" رانجھا نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے گھر کی دہلیز پار کی اور گلی میں ملنے والے لوگوں کے لبوں پر کھیلتی استہزائیہ مسکراہٹ کو ہمیشہ کی طرح نظرانداز کر کے آگے بڑھ گیا۔ یہاں صبح کا آغاز کم و بیش اسی طرح ہوتا تھا اور ہر دن کا اختتام بھی تقریباً اس سے ملتا جلتا ہی ہوتا تھا۔

☆☆☆

"ماسی، کبھی پراٹھا بھی بنا دیا کرو ناشتے میں۔" شہزادی منہ ہاتھ دھو کر کچن میں چولھے کے پاس رکھی چوکی پر آ بیٹھی تو اپنے سامنے رکھے آدھا کپ چائے کے ساتھ دو پاپے دیکھ کر سخت بدمزہ ہوئی۔

"سچی اماں اب تو پراٹھوں کو یاد کریں تو رمضان شریف یاد آجاتا ہے اور سحری کے پراٹھے یاد آجاتے ہیں۔ اماں کبھی سحری کے علاوہ بھی تو پراٹھا کھلا دیا کریں۔" گڈو نے بھی اعتراض کیا۔

"ہاں، نواب صاحب کی اولاد ہو ناں تم دونوں......فرمائشیں تو اس طرح کرتے ہو جیسے ٹرک بھر بھر کے راشن کے آتے ہیں اس گھر میں۔ سیدھی طرح چائے میں پاپے ڈبو کر کھالو۔ اس غریب ویلے یہ ہی مل جائے تو غنیمت ہے۔ آٹے کے لیے یہ لمبی لائن میں لگنا پڑتا ہے۔ صبح سے شام کر دو قطار میں کھڑے، کھڑے اور کبھی کبھی خالی ہاتھ لوٹ آؤ۔ کسی کو کیا پڑی ہے کہ غریب بھوک سے مر رہا ہے۔"

"مگر اماں چائے میں چینی تو ڈال دی ہوتی۔ یہ کڑوا جوشاندہ پیا جاتا ہے بھلا۔" گڈو نے چائے کا ایک گھونٹ بھر کے کپ واپس رکھ دیا۔

"چینی کی قیمتوں کا پتا ہے آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔"

"پھر ایسا کرتے ہیں ہم بھی آسمان پر ہی چلے جاتے ہیں۔" گڈو نے کڑوی چائے حلق سے... بمشکل اندر اتاری۔

"آئیڈیا برا نہیں ہے۔" شہزادی نے چائے میں ڈوب جانے والے پاپے کو چمچ سے اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "ویسے بھی اب زمین پر رہنے کا کیا فائدہ۔ نہ ہی زمین اس قابل ہے کہ اس پر رہا جائے۔"

"ہر کسی نے چلے جانا ہے اپنے، اپنے ویلے (وقت) پر۔ آسمان والے خود ہی بلا لیں گے۔" اماں نے ناگواری سے گھر کا۔

"اماں۔" گڈو باہر نکلتے نکلتے پھر پلٹ آیا۔ "فون میں بیلنس تو ڈلوا دے اماں۔ پچھلے ہفتے سے خالی پڑا ہے۔ پچھلے ہفتے ابا نے بیس روپے کا ایزی لوڈ کروایا تھا وہ بھی کتنی منتوں اور ترلوں کے بعد۔"

"وے......وے شرما دا گھاٹا کچھ تو حیا کر...... گھر میں نہیں دانے اور تو چلا بھنانے ...... میرے پاس اگر پیسے ہوتے تو میں میٹھی چائے نہ پکا لیتی۔" اماں کو غصہ آگیا۔ "میں تمہارے لیے پراٹھے نہ ڈال لیتی۔ وے میں پوچھتی ہوں تجھے اس موئے فون کی ضرورت کیا ہے ویلا سیاپا۔ کون سا پورے ملک میں تیرا کاروبار پھیلا ہوا ہے جسے تو گھر بیٹھ کر فون پر چلائے گا۔ اس مہنگائی میں ایک وقت کی روٹی نہیں پوری پڑتی اور اوپر سے یہ فضول کے خرچے۔"

گڈو منہ بسورتا دہلیز پار کر گیا جبکہ اماں دیر تک بڑبڑاتی رہی۔ مہنگائی پر، ملکی معیشت پر، غریب کی غریبی پر، نئی نسل کی بے حسی پر اور اپنی بے بسی پر کتنے رونے تھے۔ شہزادی سر جھکائے چپ چاپ سنتی رہی اور جب جی بھر کے بور ہو چکی تو سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

"اب تم کہاں جا رہی ہو؟" ابھی وہ دوسری سیڑھی پر تھی کہ ماسی کی کراری سی آواز اس کے قدموں کی زنجیر بنی۔

"کہیں نہیں ماسی، بس ذرا اوپر چھت پر۔" وہ منمنائی۔

"اوپر چھت پر کوئی تمہارے نانکے نہیں آئے بیٹھے۔ اِدھر تھلے آؤ اور یہ چائے کے برتن دھو دو، تمہاری عمر کی لڑکیاں تو اتنی سگھڑ اور سلیقہ مند ہوتی ہیں کہ ماؤں کو منجی پر بٹھا دیتی ہیں مگر ہائے میرے ایسے چنگے نصیب کہاں۔"

شہزادی نے انتہائی تابعداری سے تیسری سیڑھی سے ہی قدم واپس موڑ لیے اور کُھرے میں رکھے دھونے والے برتنوں کے پاس آ بیٹھی۔

"سارا دن گلی میں کدکڑے لگانے کے علاوہ

تجھے اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔ اب تو بڑی ہوگئی ہے۔ یہ لچھن چھوڑ دے اور شریف کڑیوں کی طرح گھر داری سیکھ۔ برتن دھونے کے بعد کچن صاف کر پھر کمروں اور صحن میں جھاڑو لگا۔ پورے گھر میں جگہ جگہ جتنا گند پڑا ہے لگتا ہے کوئی وس وس کے اجڑ گئے ہیں۔ دوپہر تک تو تم دونوں نشیوں کی طرح پڑے منجیاں توڑتے رہتے ہو پھر یا کوٹھے پر لٹک گیا یا باہر گلی میں نکل گیا۔ شرم حیا ہے نہ لحاظ۔ ہم تو تمہاری عمر میں...... وے گڈو......" بات ادھوری چھوڑ کر اماں نے زینہ بہ زینہ چھت پہ جاتے گڈو کو آواز دی۔

"کہاں جا رہے ہو اور یہ ہاتھ میں کیا دبا رکھا ہے؟" گڈو نے وہ ہاتھ پھرتی سے آگے کیا جس میں سفید کبوتر دبا تھا۔

"کچھ نہیں ہے اماں۔" اس نے کہا اور ساتھ ہی سیٹی بجا کر شہزادی کو چھت کے اوپر آنے کا اشارہ کرتا چھت پر پہنچ گیا۔

"میں دیکھ آؤں ماسی؟" وہ لپکی مگر ایک بار پھر سیڑھیوں کے پاس سے لوٹا دی گئی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے تو پانڈے مانجھ۔" اس نے ڈپٹا پھر لگی دکھڑا رونے۔

"سارے جہاں کی اولاد فرمانبردار، لائق اور سگھڑ ہوتی ہے مگر میرے اپنے نصیب...... کتنی واری کہا ہے کہ دسویں کے پرچے دوجی واری دے لے مگر اس کا آوارگی میں ہی دل لگتا ہے پڑھائی میں کہاں...... ہک ہا، قسمت اگر چنگی ہوتی تو وخت اور سیاپا نہ ہوتا۔ جانے والے بہشتی خود تو مر کے دنیا چھوڑ گئے اور زمانے بھر کی نالائق اور نکھٹو اولاد میرے متھے مار گئے۔"

"کون......؟" شہزادی نے ناراض نظروں سے ماسی کو دیکھا۔

"تمہارے اماں، باوا اور کون؟"

"میرے اماں اور باوا تک جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" دھلے ہوئے برتن پٹخ کر اس نے غصہ اتارا۔

"تمہارے اماں باوا تک میں جا تھوڑی رہی ہوں، نہ ہی مجھے ابھی کوئی شوق ہے اور پھر وہاں جا کر واپس کون آنے دیتا ہے۔ تو یُن دھیان اپنا کر جانے والے میرے بھی کچھ لگتے تھے۔" اور شہزادی اپنا دھیان کام میں لگانے کے بجائے ماسی کا دھیان ذرا سا اِدھر اُدھر ہوا تو جھٹ پٹ سیڑھیاں چڑھ گئی۔

"کب سے بلا رہا تھا تمہیں میں آپا! ایک چیز دکھانی تھی۔" گڈو اسے دیکھتے ہی بولا۔

"سخت پہرہ لگا رکھا تھا ماسی نے۔ اب بھی سمجھو جیل توڑ کر آئی ہوں۔ دکھاؤ کیا لائے ہو؟" وہ متوجہ ہوئی۔

"چینی کبوتری لایا ہوں، ذرا آنکھوں کے ڈورے دیکھو گلابی اور سیاہ ایک دم نشیلے سے۔"

"کس کی پکڑی ہے؟"

"کسی کی بھی نہیں۔ چوک والی منڈیر پر گردن کاندھوں میں دبائے اداس بیٹھی تھی شاید کسی وچھڑے کبوتر کے سوگ میں، میں نے جھپٹ لی۔"

"اور تھوڑی دیر میں اس کے والی وارث آ گئے پھر......؟"

"کوئی نہیں۔" اس نے بے پروائی سے کہتے ہوئے کبوتری کے پر کاٹ کر ڈربے میں دوسرے کبوتروں کے ہمراہ بند کر دیا۔

"لو جی اب ہم ہی اس کے والی بھی ہیں اور وارث بھی۔" اس نے ہاتھ جھاڑے پھر باجرے کا ڈبا اٹھا لیا۔

☆☆☆

ہیر اور رانجھا اس محلے کے دو مشہور و معروف کردار تھے۔ وجۂ شہرت ان کی آپس میں ہر گھڑی کی چپقلش تھی۔ ساری عمر ان کی ایک دوسرے سے نہیں بنی تھی۔

رانجھا کوئی تخت ہزارے کا رانجھا نہیں تھا نام تو کچھ اور تھا مگر اس کی ذات رانجھا تھی چند سال کسی حکیم کے پاس بطور معاون کام کیا اب اس کی محنت تھی، قسمت کی یاوری یا مریضوں کی بہتات کہ نہایت قلیل عرصے میں وہ گلی کے نکڑ پر اپنا کلینک بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ ایک نہایت مختصر سا کمرا تھا جو اس نے کرایے پر حاصل کیا جس کے بالائی کمرے میں بیوٹی پارلر تھا۔ بیوٹی پارلر کی مالک مس روزی سے ڈاکٹر رانجھا کے مراسم کچھ یوں تھے کہ ان دونوں کے درمیان یہ کاروباری معاہدہ تھا۔ بزنس ڈیلنگ یعنی پاکستانی زبان میں مک مکا۔

مس روزی اپنے بیوٹی پارلر سے مستفید ہونے والی کھاتے پیتے قدرے خوش حال گھرانوں کی ریگولر کسٹمرز کو ڈاکٹر رانجھا کے کلینک جانے کا مشورہ دیتیں اور اس بات پر خاصا زور دیتیں کہ ان کے سب مسائل کا حل صرف ڈاکٹر رانجھا کے پاس ہی ہے جس میں موٹاپا، جلد کے مسائل، زنانہ پوشیدہ و سنجیدہ امراض کے لیے ڈاکٹر رانجھا سے رجوع کریں اور کاروباری معاہدے کی رُو سے ڈاکٹر رانجھا بھی خال خال مریض بخوشی مس روزی کو دان کر دیتا۔ اس پنجابی محاورے کے مطابق کہ کھنڈ کھاؤ تے ونڈ کھاؤ (چینی کھاؤ اور بانٹ کر کھاؤ) یہ دستورِ زمانہ ہے اس ہاتھ دو اس ہاتھ لو اور رانجھا کی ہیر کا مختصر تعارف یہ ہے کہ وہ بھی کوئی وارث شاہ کی اصل ہیر نہیں تھی رانجھا کی طرح اس کا اصلی نام بھی پسِ پشت چلا گیا تھا اور وہ محلے بھر میں ہیر کے نام سے مشہور ہوگئی۔

شہزادی، ہیر کی بھانجی تھی۔ اس کی بہن اور بہنوئی ایک حادثے میں جاں بحق ہوگئے تب شہزادی چار سال کی تھی، ددھیال میں اس سانولی سلونی بچی کی ذمے داری قبول کرنے پر کوئی بھی رضامند نہیں ہوا تو ہیر اسے اپنے ساتھ لے آئی۔ وہ ہیر کو بے حد عزیز تھی۔ تب اس کی گود خالی تھی اور شادی کو دس سال

ہو چکے تھے اسی لیے ہیر کو وہ اپنی سگی اولاد کی طرح لگتی تھی اور یہ بقول ہیر.... شہزادی کا ہی مبارک وجود اس کی گود میں آیا تھا کہ ٹھیک تیسرے سال وہ خود صاحبِ اولاد ہو گئی۔ ہیر کے ساتھ ساتھ رانجھا نے بھی گڈو اور شہزادی میں کبھی فرق نہ کیا، دونوں کو یکساں محبت و توجہ دیتا۔

شہزادی اگرچہ گڈو کی ہم عمر نہیں تھی مگر ان دونوں کے کھیل، ان کے مشاغل، ان کی دوستیاں سب کچھ مشترک تھا۔ میٹرک میں اچھی طرح فیل ہونے کے بعد شہزادی نے پڑھنے کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔ ویسے بھی اس کا پڑھائی میں دل ہی نہ لگتا تھا اسے تو اور ہی مشغلے بھاتے تھے۔ اس کی دوستیاں لڑکیوں کے بجائے اپنے سے کئی سال چھوٹے لڑکوں کے ساتھ تھیں۔ اسے کبوتر بازی کا شوق تھا اس کے اور گڈو کے کبوتر سارا دن چھت پر غٹرغوں کرتے۔ کبھی چھت پر پتنگ اڑاتے، بوکاٹا کا نعرہ لگاتے ہوئے وہ ماسی ہیر کے غصے کو جان بوجھ کر ہوا دیتی۔

”تو لڑکی ہے لڑکی ہی بن کر رہ۔ کم بخت، نا ہنجار گلے کی پھانس۔“

”ہاں تو لڑکی ہوں، میں کون سا کہہ رہی ہوں کہ میں لڑکا ہوں۔“

”اسی لیے تیرے لچھن بھی لڑکیوں والے ہی ہیں، ہے ناں؟“ وہ پوری جان سے جل جاتی۔

”ماسی وہ زمانے گئے جب لڑکا اور لڑکی میں فرق ہوا کرتا تھا اب سب برابر ہیں بلکہ لڑکیاں دو چار قدم آگے ہی ہیں، وہ کون سا کام ہے جو لڑکے کرتے ہیں اور لڑکیاں نہیں کر سکتیں اب تو جہاز بھی لڑکیاں اڑا رہی ہیں شوں......“ اس نے ہاتھ کا جہاز بنا کر اڑایا۔

”توبہ، توبہ۔“ ماسی نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ”یہ ساری بے حیائی اور تباہی اس شیطانی ڈبے کی پھیلائی ہوئی ہے، ورنہ ہمارے وقتوں میں تو ایسی کھلے عام بے حیائی پر ٹوٹے کر کے نہر میں پھینک دیتے تھے۔“ ماسی نے ڈرا دیا مگر وہ شہزادی ہی کیا جو کسی ڈراوے، دھمکاوے میں آ سکے۔ وہ من موجی تھی اس کے من میں جو سما جاتی وہ کر گزرتی۔ انجام چاہے کچھ بھی ہو پروا نہیں۔ ماسی ہیر لاڈ پیار میں اسے کچھ بھی نہ کہتی تھی۔

اس کی دیکھا دیکھی گڈو بھی اسی کے رنگ میں رنگا تھا کہ اس سال میٹرک کے سارے پرچوں میں فیل ہو گیا مگر شہزادی نے اسے زیادہ دیر دکھی نہ رہنے دیا۔

”حوصلہ رکھو یار، ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں تم ابھی سے حوصلہ ہار بیٹھے ہو۔“ وہ ایک دو دن سوگوار کیفیت میں رہا پھر شہزادی نے اس کی پیٹھ ٹھونکی اور تسلی دی تو وہ پہلے جیسا ہو گیا ہنستا کھلکھلاتا ہوا، کدکڑے لگاتا ہوا، موج مستیاں کرتا ہوا۔ کبھی اگر جو اُن کا کرکٹ کھیلنے کا موڈ بنتا تو محلے کے تمام لڑکے پچھلے خالی گراؤنڈ میں پہنچ جاتے پھر کبھی خیر کی خبر نہ آتی۔ کسی کی کہنی ٹوٹتی تو کسی کا ماتھا گومڑ زدہ ہو جاتا اور کسی گھر کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹتا تو کسی کی گاڑی کا۔ متعلقہ افراد کے پہنچنے تک کچھ وہاں سے بھاگ نکلتے تو کچھ خوب اچھی طرح دُھنائی کے بعد کئی روز تک کئی جگہوں پر ٹکوریں کرتے ہوئے پائے جاتے۔

”شہزادی آپا!“ اس کا ننھا سا دوست جگنو پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ اس کے پاس آیا۔

”آرام سے، کوئی گاڑی نہیں چھوٹی جا رہی ہے تمہاری۔“

”وہ ......وہ آپا وہ چاچا نیک دین تمہارے بارے میں بڑی عجیب سی باتیں کرتا ہے بے بے حلیمہ کے پاس بیٹھ کر۔“

”اچھا، کیا کہہ رہا تھا وہ لنگور کے بوتھے والا؟“

”وہ......وہ آپا میں کیا بتاؤں تجھے۔“ جگنو جھجکا۔

”جلدی بتاؤ مجھے، اس سے تو میں پوچھتی ہوں آیا وڈا محلے کا ٹھیکے دار چل بتا جلدی کر۔“ وہ چیخی تو جگنو سہم گیا۔

”یہی کہہ رہا تھا کہ شہزادی کوئی چنگی کڑی نہیں ہے۔ جوان جہان ہے اور محلے کے منڈے کھنڈے اس کے بیلی ہیں۔ آپا مجھے تو بڑا غصہ چڑھا مگر میں اکیلا تھا۔“

”ٹیپو، گڈو، جگنو، رستم سب سوٹے نکالو۔“ شہزادی غصے سے تھر تھر کانپ رہی تھی اور اس کا گندمی رنگ مارے طیش کے لو دے رہا تھا۔ اس کی صرف ایک للکار پر سب ڈنڈے سوٹے اٹھائے اس کے ساتھ ساتھ ہو لیے۔ ان کا رخ چاچا نیک دین کے گھر کی طرف تھا۔

”خیر نال، اَج فوجاں کتھے؟“ کئی ایک نے راستہ روک کر پوچھا مگر جواب دینے کی فرصت کسے تھی۔ ایک دہاڑ سے چاچا کے گھر کا لکڑی کا بوسیدہ و سال خوردہ دروازہ کھولا گیا تو اس کی چولیں ہل گئیں۔ بقول جگنو چاچا کی قسمت چنگی تھی جو آج گھر پر نہیں ملا ورنہ ٹوٹے ٹوٹے ہو جاتا ہماری آپا کے ہاتھوں۔

”نی!“ چاچے کی بیوی جو پہاڑ جیسے گوشت بھرے تھل تھل کرتے وجود کے ساتھ نواڑی پلنگ پر براجمان حُقے کے سُوٹے لگا رہی تھی شہزادی کی للکارتی ہوئی بلند آواز پر پلنگ پر خاصی ہلچل ہوئی تھی۔ ہاتھ میں سوٹا پکڑے شہزادی پنجابی فلموں کی ولن کا پارٹ ٹو لگ رہی تھی۔

”کہاں چھپا لیا ہے اپنے اس ہوتے سوتے کو......؟ ہمت ہے تو سامنے آئے اور شہزادی کے روبرو اسے برا بھلا کہے۔ دند توڑ کے ہتھیلی پر نہ رکھ دیے تو شہزادی نام نہیں ہے میرا۔ اس پھاپے کٹنی حلیمہ کے پاس بیٹھ کر کہتا ہے کہ شہزادی شریف کڑی نہیں ہے۔ وہ سمجھتا کیا ہے خود کو۔ نام نیک رکھ لینے سے بندہ خود نیک اور شریف نہیں بن جاتا۔ آدمی کے کرتوت اچھے ہونے چاہئیں۔ نیت کے ساتھ ساتھ کردار صاف ہونا چاہیے اور مجھے سب پتا ہے اس کا بھی اور اس کی بہن کا بھی جو بیٹھک میں رنگ برنگے ڈبے سجا کے ریوڑیاں بیچتی ہے۔ کون جانے کہ کیا کچھ بیچتی ہے۔ اپنے گھر میں اگر نقب لگی ہو تو دوسروں پر انگلی اٹھانے سے پرہیز کرنا چاہیے۔“ نیک دین کی بیوی جو عرف عام میں چاچی شریفاں کے نام سے مشہور تھی وہ ٹکر ٹکر شہزادی اور اس کے ہمراہ ڈنڈے اٹھائے محلے کے لڑکوں کو دیکھتی رہی۔

”جا رہی ہوں میں اب اور......“ ایک ڈنڈا ایک ہاتھ سے دوسرے میں منتقل کرتے ہوئے اس نے وارننگ دی۔ ”آئندہ اگر شہزادی کے بارے میں کوئی بے ہودہ بات کی تو نتائج کا ذمے دار وہ خود ہوگا، بتا دینا اپنے خصم کو۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی فوج کے ہمراہ ڈیوڑھی پار کر گئی۔ گڈو جو دروازے کے باہر کھڑا تھا اس کی ٹانگیں ابھی تک لرز رہی تھیں کہ ابھی کہیں سے آ کے چاچا نیک دین اسے دبوچ لے گا۔

”یہ تو کیوں تھر تھر کانپ رہا ہے؟“ شہزادی نے اس کی کمر پر ہاتھ مارا۔ ”شہزادی کے ہوتے ہوئے کسی کو کسی سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ محلہ سب کا سانجھا ہے ہم نے دوسروں کے معاملات میں کبھی مداخلت کی ہے جو؟ چلو چھوڑو، کتے بھونکتے رہیں گے، قافلے گزرتے رہیں گے۔“ اور شہزادی کو جو یہ خوش فہمی تھی کہ دو چار گلیاں گھوم کر وہ جب گھر واپس آئے گی تو ماسی ہیر آج کے تازہ ترین واقعے کے بارے میں قطعی لاعلم ہوگی۔ یہ محض گمان رہا۔ ماسی آج کا واقعہ نہ صرف پوری جزئیات کے ساتھ سن چکی تھی بلکہ غصے سے لبالب گھر کی دہلیز پر کھڑی بلکہ شاعر کے خیال کے مطابق دل و نگاہ فرشِ راہ کیے شہزادی کی منتظر تھی۔

”بڑ فٹے منہ ہے تیرا شہزادی اور لخ لعنت ہے تجھے۔“ ماسی کا غصہ سوا نیزے پر تھا۔ ”تجھے شرم

نہیں آئی شریفاں کے گھر جا کر بکواس کرتے ہوئے۔ مرن جوگی محلے میں روز کے روز نئے چن چڑھاتی ہے۔ روز کسی نہ کسی گھر سے تیری شکایت آتی رہتی ہے۔ کیا ضرورت تھی تجھے۔"

"اور اسے کیا ضرورت تھی میرے بارے میں بک، بک کرنے کی۔ میں بڑی چنگی طرح جانتی ہوں اسے بھی، اس کے پورے خاندان کو بھی۔" کمر پر تیسری چپل کھانے کے بعد شہزادی بھی چپ نہ رہ سکی۔ "وہ چاچا نیک دین کے کرتوت بھی کوئی ڈھکے چھپے نہیں ہیں دوسروں کی دھیوں، بہنوں کو وہ کیسے فرصت سے دیکھتا ہے سارے کم چھوڑ کر اور اس کی اپنی دھی جو نائیوں کے مُنڈے کے ساتھ......" اس کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ ماسی نے بڑی زور کا ہاتھ مارا تھا۔

"تارے لائی نہ ہو تو...... شرم نہیں آتی تجھے دوسروں کے عیبوں سے پردہ اٹھاتے ہوئے۔ یہ تربیت کی ہے میں نے تیری۔ یہ سکھایا ہے تیری تعلیم نے تجھے؟ غلطی میری ہی ہے، میں نے تجھے ضرورت سے زیادہ لاڈ پیار دیا۔ تیری جائز ناجائز مانی اس لیے کہ تو یتیم ہے تجھے کسی بات سے نہ روکا۔ مجھے بتانا چاہیے تھا کہ یہ تو جس رستے پر چل پڑی ہے یہ شریف لڑکیوں کے چھن نہیں ہوتے۔ مجھے شرم آرہی ہے تو نے محلے میں کسی کو منہ دکھانے جوگا نہیں چھوڑا۔" ماسی آنکھوں پر اپنی چادر رکھ کر رو پڑی۔

"اور ماسی..." وہ بدکی۔ "وہ چاچے کو شرم نہیں آئی میرے بارے میں غلط سلط باتیں کرتے ہوئے۔ مجھ پر الزام لگاتے ہوئے جیسے خود تو بڑا پارسا ہے ناں اور کون سی شرافت کی بات کرتی ہے تو ماسی شرافت ہم غریبوں کو راس نہیں آتی۔ ویسے بھی یہ بدمعاشی کا زمانہ ہے اور بدمعاش بن کر جینے میں ہی عافیت ہے شریفوں کو نی زمانہ نہ کوئی مرنے دیتا ہے اور نہ ہی جینے۔ عالمی مارکیٹ میں شرافت کی کوئی ویلیو نہیں ہے، کیوں گڈو؟" اس نے ایک زور کا ہاتھ گڈو کی کمر پر جمایا تو گڈو جو اپنے دھیان گیان میں تھا چارپائی سے سیدھا زمین پر آرہا اور ماسی ہیر...... توبہ، توبہ کرتے ہوئے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کے ہٹانا بھول گئی۔

"توبہ توبہ تیرے جیسے اوتھری اولاد سے تو بندہ بے اولاد ہی بھلا...... مجھ سے تیری تربیت میں بڑی کوتاہی ہوئی ہے جو رب نے یہ دن دکھائے ہیں۔ ہک ہا...... کیا کیا نہیں سوچا تھا میں نے تم دونوں کے بارے میں۔ مجھے بڑی چاہ تھی بڑا ارمان تھا کہ تم دونوں پڑھ لکھ کر وڈے آدمی بن جاؤ گے مگر میرے اپنے ماڑے نصیب کہ تم دونوں نکے آدمی بھی نہیں بن سکے۔" یہ کہتے ہوئے ہیر کی ہچکیاں جب بلند ہوئیں تو ان دونوں کے ہاتھ پاؤں پھولے اور وہ اس کے پاؤں میں آبیٹھے پھر ہمیشہ کی طرح تسلی، دلاسے، قسمیں، جھوٹے لارے ہیر جانتی تھی کہ اس طرح کے فلمی اور سیاسی وعدے وہ اکثر ہی کیا کرتے تھے۔ گڈو نے کھڑے ہو کر سینہ پھلایا۔

"میں تو اماں تمہاری قسم اب بندے دا پتر بن جاؤں گا۔"

"ماں کو جھوٹے لارے کی آس نہ دے۔ میں ماں ہوں تیری اور تجھ سے زیادہ جانتی ہوں تجھے۔" ہیر کے لہجے سے اداسی ٹپکی۔ "اور شہزادی تیری عمر کی کڑیاں تو پورا ٹبر سنبھالتی ہیں اور تو میرے پتے جھاڑے میں سواہ ڈلوا کر لڑکوں کے ساتھ گلی ڈنڈا، کرکٹ اور کنچے کھیلتی رہتی ہے۔ نہ سینا نہ پرونا، نہ گھرداری اور سلیقہ مندی...... ہیں کوئی لڑکیوں والے کام تیرے۔ ہول اٹھتے ہیں مجھے کہ کس نے تیرا ہتھ مانگنے میرے بوہے پر آنا ہے۔ ساری حیاتی میرے سینے پر ہی تو نہیں بیٹھے رہنا، اگلے گھر بھی جانا ہے اور اس بات کا تو مجھے پورا پک (یقین) ہے کہ اگلوں نے دوجے ہی دن تجھے نکال باہر کرنا ہے۔

سوچتی ہوں کہ اگر گڈو سے جوڑ ہوتا تو اس سے ہی تجھے ویاہ دیتی مگر......"

"کیا......" وہ جو نمک مرچیں لگا ابلا ہوا بھٹا سی سی کرتے اور آنکھوں سے پانی بہاتے ہوئے کھا رہی تھی دانتوں میں دبا بھٹا کھانا بھول گئی اور ٹکر ٹکر ماسی کی صورت دیکھنے لگی۔

"لے دس۔" گڈو خواہ مخواہ ہی ہنس دیا تو اسے آگ لگی۔

"تو کیوں دندیاں نکال رہا ہے اور ماسی تو نے یہ بات سوچی بھی کیسے کہ میں اس باندر کے ساتھ ویاہ کرلوں گی۔"

"کوئی گل نہیں آپا، میں جلدی بڑا ہو جاؤں گا۔" گڈو نے ہونٹوں کے اوپر اگے ہلکے سے روئیں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سیانا پن دکھایا جو شہزادی کو ہضم نہیں ہوا۔

"باندر اگر بڑا بھی ہو جائے ناں تو وہ باندر ہی رہتا ہے۔" شہزادی نے بھٹا اسے کھینچ مارا۔

☆☆☆

گڈو بازار سے سرخ اور سفید بڑی بڑی آنکھوں والی نئی نکور پتنگ خرید لایا تھا ساتھ ڈورے اور مانجھے بھی اور شہزادی کو رازداری سے بتا کر چھت پر رکھ آیا اور اب اسی ڈور کا شہزادی چھت پر بیٹھ کے گولا بنا رہی تھی۔ پتنگ اس کے پاس ہی رکھی تھی وہ اپنے دھیان میں گم تھی جب اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا وہ بنا دیکھے سر جھکائے اپنے کام میں مصروف رہی۔ تیز سیٹی کی آواز پر اس نے ایک دم سر اٹھا کر دیکھا، وہ برابر والوں کا کبوتر باز تھا۔ اس کے جتنے کبوتر پورے محلے میں کسی کے پاس نہ تھے، شہزادی کئی دنوں سے محسوس کر رہی تھی کہ وہ جب بھی اسے گلی میں ٹکراتا یا چھت پر دیکھتا تو عجیب لوفرانہ انداز میں دیکھتا اور متوجہ کرتا کبھی سیٹی بجا کے تو کبھی آنکھ دبا کے۔ اب بھی وہ دونوں چھتوں کے درمیان موجود تقریباً پانچ فٹ کی دیوار سے جھانک رہا تھا۔

"اے...... جھاتیاں کیوں ڈال رہا ہے؟"

"میں نے کہا گڈے اڑا رہے ہو سوہنیو۔" اس کی آوارگی بھری آواز شہزادی کے کانوں میں پڑی تو وہ غیظ و غضب سے سرخ ہو گئی مگر ہنوز اپنے کام میں مصروف رہی۔

"سنو...... تمہاری پتنگ کی آنکھیں بڑی خوب صورت ہیں، ایک دم نشیلی سی۔" شہزادی جو بڑی دیر سے ضبط کر رہی تھی ایک دم سے اٹھی اور اس کے روبرو جا ٹھہری۔

"وے...... کیا تکلیف ہے تجھے؟" شہزادی نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا تو وہ خباثت سے ہنس دیا۔

"کیا تجھے نہیں اندازہ میری تکلیف کا۔" وہ ایک آنکھ کا کونا دبا کر ذرا سا جھکا تو شہزادی کا ضبط جواب دینے لگا وہ کہاں بھلا اس طرح کی بکواس اتنی دیر برداشت کرنے کی عادی تھی۔

"مجھے سوں (قسم) ہے اگر میں نے ماسی ہیر سے کسی سے پنگا نہ لینے کا وعدہ نہ کیا ہوتا تو میں تیرے ٹوٹے ٹوٹے کر دیتی۔" وہ پتنگ اور ڈور وہیں چھوڑ کر نیچے آگئی کہ وہ مزید اس لوفر کے منہ لگنا نہیں چاہتی تھی۔ اگلے دن چھت پر ہنگامہ برپا تھا۔ ٹیپو، گڈو، بھولا، کاکا، کالا اور شہزادی سب پتنگ اڑا رہے تھے شہزادی ابھی پتنگ کو پیچا لگا رہی تھی جب اس کے سر کو کوئی چیز چھوتی ہوئی گزری تھی۔

"ارے...... آپاں یہ کیا ہے...... کسی نے وٹا پھینکا اور وٹے کے ساتھ کوئی چھوٹا سا کاغذ بندھا ہوا ہے۔" ٹیپو نے کاغذ کھول کر شہزادی کے سامنے کیا۔ صرف ایک سطر لکھی تھی۔ ٹیپو نے بہ آواز بلند پڑھا۔

"میں پتنگ اڑانا سکھا دوں؟"

"دفع دور۔" شہزادی کے ماتھے پر بل پڑ گئے اردگرد دیکھا کوئی نہ تھا اس نے دوبارہ سے ڈور تھام لی۔ گڈی ابھی ہوا میں لڑکھڑا ہی رہی تھی کہ دوسرا وٹا

اس کے ہاتھ پر آن لگا۔ ڈور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور گڈی ایک زوردار چھال (چھلانگ) لگا کر قریبی درخت کی سب سے اونچی شاخ پر جا بیٹھی۔ اب کی بار کاغذ کھولا گیا تو اس پر ڈیڑھ سطر درج تھی۔

"تم مجھ سے ویاہ کرلو، میں اپنے سارے کبوتر تمہیں تحفے میں دے دوں گا۔" بس اب کسی شک و شبے کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی۔ جب کوٹھے کی دیوار سے پرلی طرف جھانکا گیا تو کبوتر باز شلوار کے اوپر بنیان میں ملبوس ایک جھلنگا سی چارپائی پر لیٹا تھا۔

"وے...... فٹے منہ تیرا۔" شہزادی نے دور سے للکارا پھر اسے اور اس کے ساتھیوں کو پانچ فٹی دیوار پھلانگنے میں ذرا وقت نہ ہوئی وہ کبوتر باز کے سر پر پہنچ چکے تھے۔

"لاکھ لعنت ہے تجھ پر لعنتیا...... وے سات گھر تو ڈائن بھی چھوڑ دیتی ہے اور تو ہے کہ گوانڈیوں سے متھا لگانے لگا ہے۔ تو ویاہ کرے گا شہزادی سے؟ بوتھا دیکھا ہے کبھی اپنا...... منہ نہ متھا۔" وہ سب کے سب اس پر پل پڑے تھے کہ اس کی کراہیں نکل گئیں۔

"وڈا آیا کبوتروں کے بدلے ویاہ کرنے والا۔"

☆☆☆

"ویسے آپا...... تم نے چنگا نہیں کیا تھا کل اس کو چھڑوا کے... میرا دل کر رہا تھا میں اس کے اتنے ٹوٹے کروں جتنے اس کے کبوتر ہیں۔" ٹیپو کو رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا کہ کبوتر باز ابھی تک زندہ کیوں ہے۔

"چھوڑ ٹیپو، کتے بھونکتے رہیں گے اور کارواں گزرتا رہے گا۔" شہزادی نے کہا۔ "ویسے بھی ہمیں کیا فرق پڑتا ہے اس طرح کی بکواس سے۔ تو یہ ڈانگ تو ہٹا آگے سے۔" اس نے گڈو کو ڈپٹا جو چلتی ٹریلر سے ایک گنا کھینچ لایا تھا اور اب شڑ شڑ چوس رہا تھا۔

"میرا دل کر رہا ہے آپا میں اس گنے کی طرح اس کبوتر باز کو چوس لوں۔" گڈو نے ایک بار پھر زوردار شڑ کی۔

"سنا ہے اس کے اگلے دو دانت ٹوٹ گئے ہیں۔"

"وہ میں نے گھسنا (گھونسا) بھی تو زور کا مارا تھا۔" ٹیپو نے مسلز پھلائے۔ "اور آپا اس کا کھنا بھی کھل گیا ہے پٹی لگوائی تھی ڈاکٹر صاحب کے کمپوڈر سے۔"

"میں ابا سے بات کروں گا ہمارے شریکوں کو پٹیاں لگاتے ہیں۔" گڈو نے کہا۔

"رہن دے۔" شہزادی نے اسے ٹوکا پھر جو ماسی ہیر نے ان سب کو بے نقط سنائیں تو وہ چپ چاپ سنتے رہے۔

ماسی ہیر کا خیال تھا کہ شہزادی جان بوجھ کر ان کے اشتعال میں اضافہ کرتی ہے اور پھر ان کے اشتعال کے نتیجے میں ابلتے آتش فشاں کا ہدف اکثر ڈاکٹر رانجھا کو بننا پڑتا۔ اب بھی ان کے غصے کے چھینٹے اڑاڑ کر ڈاکٹر رانجھا پر گر رہے تھے۔

"میں بتا رہی ہوں تمہیں، اس گھر میں تم تینوں رہو گے یا میں۔" ہیر کے تیور خاصے جارحانہ تھے۔

"تم پچھلے بائیس سالوں سے یہ دھمکی دے رہی ہو اور مجھے پورا یقین ہے اگلے بائیس سال تک یہ دھمکی صرف دھمکی ہی رہے گی۔" ڈاکٹر رانجھا نے کہا۔ "ویسے تم یہ گھر چھوڑ کر جاؤ گی کہاں؟"

"اپنے پیکے (میکے) اور کہاں۔"

"پچھلے بائیس سالوں میں تو تم اپنے پیکے (میکے) صرف ایک رات رہ سکی ہو جبکہ ایک مہینے کا لارا لگا کے گئی تھیں جب تمہاری بے بے کو سانپ نے ڈسا تھا اب بھی سوچ لو تم وہاں رہ سکو گی؟"

"کیوں؟ خیری صلا میری پیکے کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ تمہارے پچھلوں کی طرح نہیں ہیں کنگلے، فقیر، منگتے۔"

"ہاں، ہاں دیکھے ہوئے ہیں تمہارے پچھلے لاکھ پتی۔"

"اور تمہاری پچھلے کیا ہیں لکھ پتی۔ جانتی ہوں میں سب کو کنجوس مکھی چوس۔" پھر ہیر نے ڈاکٹر رانجھا کے خاندان کا شجرہ غلط سلط کر کے نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ ہیر نے روتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میرے پیو نے نہ جانے تم میں کیا دیکھا تھا جو تمہارے ساتھ مجھے ویاہ دیا۔ میرے تو نصیب ہی ماڑے تھے جو تم پلے پڑ گئے جب تمہارے بارے سنا کہ ڈاکٹر ہو تو دل کو چنگی بھلی تسلی ہوئی تھی۔ یہ نہیں پتا تھا کہ تم پھکیاں، معجون اور رنگ برنگے شربت پلا کر لوگوں کی قیمتی جانوں سے کھیلتے ہو۔"

"اللہ نے شفا دی ہوئی ہے میرے ہتھ میں۔ لوگ ایویں نہیں اٹھ کے آجاتے۔" ڈاکٹر رانجھا نے تلملا کر جواب دیا۔ "اور تمہارے پیو نے بھی بڑی سوچ وچار کے بعد تمہارا ہتھ میرے ہتھ میں دیا تھا۔ میرے ورگا قابل اور شریف جوائی اسے پورے پنڈ میں نہ ملتا اور تم بھول گئیں اپنے پیکے کی وہ کچی گلیاں اور کچی پکی دیواریں جن پر اُپلے لپٹے ہوئے ہوتے تھے اور تم ہاڑ کی گرمی میں بھی فلیٹ اور شیشہ پیلس کے کپڑے پہنتی تھیں کہ پت نکل آتی تھی اور اب چکن بریزے پہن کر اے سی کے سامنے لیٹتے ہوئے بھی تمہیں تکلیف ہوتی ہے۔"

"رہن دے وے رانجھیا۔" ہیر نے ناک سے نادیدہ مکھی اڑائی۔ "بڑی دیکھی ہیں تیری شانیں۔ میرے پیکے والوں سے تو تجھے اللہ واسطے کا بیر ہوتا جا رہا ہے۔"

"وہ ہیں ہی اس قابل۔"

"اور خود تم...... تم کس قابل ہو۔ تمہاری تو بڑھاپے میں آکے مت وج گئی ہے۔ نرے سٹھیا گئے ہو۔"

"مت تو میری اسی دن وج گئی تھی جس روز تیرے بوہے پر جنج لے کے گیا تھا۔ ہائے ہائے...... کیا جن ورگا گبرو جوان تھا میں اُن دنوں...... اور تو میری جوانی کو کھا گئی ہے۔" ڈاکٹر رانجھا کسی بھولی بسری یاد میں کھویا پھر تو دونوں کے اپنی، اپنی جوانیوں کے قصے تھے اور ساتھ ساتھ مزے دار چٹکلے۔ شہزادی اور گڈو جو بڑی دیر سے ہنسی ضبط کر رہے تھے اب ان کی ہنسی کے فوارے ابل پڑے اور وہ قہقہے لگانے پر مجبور ہو گئے۔

"اوئے تم دونوں کیوں دندیاں نکال رہے ہو۔" رانجھا نے انہیں ڈپٹا۔

☆☆☆

عصر سے ذرا پہلے کا وقت تھا۔ بدلتے موسم کا سندیسہ دیتی ہواؤں نے موسم کو اچھا خاصا خوشگوار کر دیا اور انہوں نے بڑے گراؤنڈ میں کرکٹ کھیلنے کا پروگرام بنایا جو کئی دنوں سے التوا کا شکار تھا۔ ویسے بھی جب سے انہوں نے نکڑ والے حاجی صاحب کا گھٹنا توڑا تھا ان کے کرکٹ کھیلنے پر پابندی عائد ہو چکی تھی۔ آج جب حاجی صاحب کسی کام سے شہر سے باہر گئے تو ان کی موجیں ہو گئیں۔

"آپا بڑا رولا ڈالا تھا کل حاجی صاحب نے۔" ٹیپو نے کہا۔

"اچھا...... وہ کیوں؟" شہزادی نے گیند پر ٹیپ لگاتے ہوئے پوچھا۔

ٹیپو اور گڈو نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگایا جب انہوں نے کل کا واقعہ سنایا کہ کس طرح انہوں نے حاجی صاحب کی گاڑی میں بلی پکڑ کر ڈال دی اور پھر جو اُن کی بیگم کی چیخیں...... اللہ ہی اللہ۔

"پکے بدمعاش ہو تم دونوں۔" شہزادی نے ہنس کر کہا۔

"دیکھنا آپا اب کی بار ان کی گاڑی میں سانپ چھوڑ دیں گے جیتا جاگتا...... شوں شوں کرتا ہوا ناگ۔" یہ کہہ کر گڈو نے بولنگ کروا دی اور گڈو کی بولنگ پر تو ہر بار ہی چوکا اور چھکا لگ رہا تھا اور شہزادی کے اسکور میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ اب بھی ہوا میں اڑتی ہوئی گیند پر ان سب کی نگاہیں

مرکوز تھیں۔ گیند اگرچہ باؤنڈری لائن کراس کر گئی تھی مگر یہ کیا۔ ان کے ہاتھوں کے طوطے تو کیا سب کے سب پرندے اُڑ گئے۔ گیند ہوا میں اُڑی پھر نیچے گری اور میدان کے آخری کنارے تک آٹھہری، نیلی جینز اور سفید دھاری دار شرٹ میں ملبوس دراز قد شخص تیزی سے گاڑی سے باہر نکلا اور قدم انہی کی جانب بڑھا دیے۔ اس شخص کی آنکھوں سے نکلتے شعلے وہ دور سے محسوس کر سکتے تھے اور اس اجنبی کے ہاتھوں اپنا متوقع انجام ان سب کے حواس گم کر رہا تھا۔

''سب بھاگ چلو۔'' ٹیپو نے بہ آواز بلند للکارا تو سب نے سر پر پاؤں رکھ لیے اور بھاگنے میں دوسرا لمحہ نہ لگایا مگر شہزادی جہاں تھی وہاں کھڑی رہ گئی اگرچہ وہ بھاگنا چاہ رہی تھی کیونکہ وہ بھی انہی کے ساتھ شرارت کرتے ہوئے پکڑے جانے پر بھاگ کھڑی ہوتی لیکن آج...... آج پہلی بار ہوا تھا کہ وہ بھاگ نہ پائی تھی اسے لگا جیسے اس کے قدم زمین نے پکڑ لیے ہوں۔ وہ ایک ٹک اپنے قریب آتے ہوئے اس شخص کو دیکھے جا رہی تھی جس کے تیور خاصے جارحانہ تھے وہ لمبے، لمبے ڈگ بھرتا شہزادی کے روبرو آٹھہرا۔ سن گلاسز آنکھوں سے ہٹا کر وہ شہزادی کو گھور رہا تھا اس کے چہرے کے تنے، تنے نقوش میں بلا کی سختی تھی اور اس کی بھوری آنکھوں سے لپکتے شعلے بھسم کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے وہ چپ چاپ سر جھکائے مقابل کے لش پش کرتے جوتوں پر نگاہ جمائے کھڑی تھی۔

''تو تم اس شرپسند گروہ کی سرغنہ ہو؟'' کچھ ہی دیر بعد شہزادی کی سماعتوں سے اس کی آواز ٹکرائی۔ اس کا لہجہ قدرے نرم تھا۔ شہزادی نے بے حد حیران ہو کر سر اٹھا کر اسے دیکھا تو اس کی آنکھوں کے تاثر میں بھی وہی نرمی تھی۔

''دیکھا، تمہارے ساتھی تمہیں تنہا میدان میں چھوڑ کر خود بھاگ گئے حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ تمہاری حفاظت کرتے۔ تمہاری ڈھال بن جاتے کیونکہ وہ سب لڑکے ہیں اور تم لڑکی ہو۔''

''وہ...... میں...... میں......'' وہ زندگی میں پہلی بار ہکلائی۔ زندگی میں پہلی بار اسے بولنا مشکل لگا۔ الفاظ ہاتھوں سے چھوٹتے ہوئے لگے۔

''سنو!'' وہ مزید ایک قدم آگے بڑھا۔ ''جو بیچ راہ میں تنہا چھوڑ جائیں ایسے بے بھروسا ساتھیوں کے ساتھ تعلق رکھنے سے بہتر ہے کہ آدمی تنہا رہے۔''

شرمندگی سے شہزادی کا سر مزید جھک گیا اور وہ جو اندر سے لرز رہی تھی کہ یہ اجنبی نہ جانے کتنی بے عزتی کرے گا اس کے نرم رویے سے حوصلہ پا گئی۔

''ایک بات پوچھوں؟''

شہزادی نے بے ساختہ نگاہ اٹھائی نہ صرف ہونٹوں پر بلکہ مقابل کی آنکھوں میں بھی تبسم تھا۔

''تم ہمیشہ لڑکوں کے ساتھ کیوں کھیلتی ہو جبکہ تمہاری عمر کی لڑکیاں تو اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ ...... بلکہ تمہاری اب کھیلنے کی عمر تو نہیں ہے۔'' بات کرتے، کرتے بڑی گہری نظر اس نے اس پر ڈالی تو وہ خود میں سمٹ گئی۔ وہ جو دوبدو جواب دے کر اگلے بندے کو پل میں لاجواب کر دیا کرتی تھی آج ایک اجنبی کے سامنے جانے کیوں وہ گپ چپ کھڑی تھی۔

''کوئی لڑکی تمہاری سہیلی نہیں ہے کیا؟'' اس نے پوچھا تو وہ غیر ارادی طور پر نفی میں سر ہلا گئی۔

''ایک بات بتاؤں تمہیں۔ اچھی لڑکیاں لڑکوں سے دوستی نہیں کرتیں۔'' شہزادی نے ٹکر ٹکر اس ناصح کے چہرے کو دیکھا۔ ''آئی ہوپ کہ آج کے بعد تم ان لڑکوں سے ہر قسم کا تعلق ختم کر دو گی۔ ویسے کرنا بھی چاہیے جن کو تم سے زیادہ، تمہاری عزت سے زیادہ اپنی جان عزیز ہے۔ ویسے ایک بات بتاؤں میں تمہیں......'' اس نے باٹل برش کے تناور درخت سے ایک کھلا ہوا سرخ برش اچک کے توڑتے ہوئے شہزادی کے چہرے پر گہری جانچتی نگاہ ڈالی۔

''مجھے لڑکیوں کا لڑکی ہونا ہی پسند ہے کہ ان میں لڑکیوں والی تمام خوبیاں ہوں...... اب چلتا ہوں ویسے شکر کرو لڑکی، میری گاڑی کی ونڈ اسکرین سلامت ہے ورنہ میں ہرجانہ ضرور وصول کرتا تم سے۔'' وہ جانے کے لیے پلٹا اور شہزادی گم صم اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔ ساکت وجامد اس نے ڈانٹا نہ ڈپٹا نہ برا بھلا کہا۔

دو قدم چلنے کے بعد وہ ایک دم اپنے چمکتے ہوئے جوتے کی ایڑیوں کے بل گھوما اور شہزادی جو بت بنی اس کی پشت کو غور سے دیکھ رہی تھی اس کے پلٹنے پر سٹپٹا گئی اور اس لمحے وہ جانے کیوں کھل کر مسکرایا تھا۔

''کیا سارے لوگ ہنستے ہوئے اتنے ہی خوب صورت لگتے ہیں؟'' شہزادی کے دل میں یہ سوال دھیرے سے ابھرا۔

''تم نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں؟''

''آپ...... آپ نے پوچھا ہی کب؟'' وہ یہ جملہ کہتے کہتے رہ گئی اور جھٹ سے نام بتا دیا۔

''شہزادی۔'' اس نے اگرچہ ہونٹوں میں ہی اپنا نام بتایا مگر سننے والے کی سماعتیں تیز تھیں جو سن لیا۔ وہ حیران ہوا۔

''ارے یہ کیا نام ہوا...... شہزادی، واہ کیا خوب صورت نام ہے۔ کسی ان دیکھی ریاست کی شہزادی۔ کسی پریوں کے دیس کی شہزادی ویسے یہ نام تم پر جچتا بھی بہت ہے۔'' وہ ایک بار پھر پلٹا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گاڑی تک گیا پھر پلٹ کر ایک نظر شہزادی کو دیکھا جو ابھی تک بت بنی کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آٹھہری، بڑی جاندار مسکراہٹ۔

☆☆☆

پورے گھر میں عجیب سی اداسی بھری خاموشی کا راج تھا ہر کوئی اپنے دھیان میں گم تھا اپنی سوچ میں مگن تھا اور تو اور آج ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر بھی لڑائی کے موڈ میں نہیں تھے۔ یا اللہ خیر اس طرح کے سنگین حالات تو سال میں ایک دفعہ ہی ہوتے تھے۔ گڈو پریشان سا تھا۔ ظاہری بات ہے جس گھر میں ہر وقت جنگ وجدل کا سماں رہتا ہو، لڑائی جھگڑے کی آوازیں دور تک جاتی ہوں وہاں کی پُرامن فضا کیسی نامانوس سی لگتی ہے۔ جیسے فوجوں نے بالآخر تھک ہار کر سیز فائر کا اعلان کر دیا ہو کسی جیت کے بغیر، کسی مات کے بنا۔

ماسی ہیر اپنے سر کے دو چار بچ جانے والے بالوں میں مہندی لگائے انار کے پیڑ کے چھدرے سائے میں محو استراحت تھی۔

ڈاکٹر رانجھا بڑی دیر سے چولہے کے پاس اکڑوں بیٹھا کوئی نادر نسخہ پکا رہا تھا۔ گڈو اپنے اصیل مرغ کو دیسی انڈا کھلانے میں مصروف تھا اور شہزادی کسی گہری سوچ میں گم برآمدے کی سیڑھی پر ستون سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ زرد پتے گھر کے کونوں میں ڈھیریوں کی صورت پڑے اداس موسموں کی کہانی سنا رہے تھے۔

''سب خیر تو ہے آپا؟'' گڈو پوچھ پوچھ کے تھک گیا تھا مگر اس کی چپ نہ ٹوٹی۔ آج تیسرا دن تھا وہ یونہی گم صم اور ہر چیز سے لاتعلق سی تھی ہر لمحہ کھوئی کھوئی رہتی۔ اسے لگتا اس کا کچھ کھو گیا ہے۔ کوئی بہت قیمتی شے، کوئی انمول متاع۔

''آپا مجھے لگتا ہے تمہارا کچھ کھو گیا ہے۔'' گڈو ہنستا۔

گزرنے کو صرف تین دن گزرے تھے مگر اسے لگتا وہ صدیوں کا سفر بھوگ آئی ہے۔ وہ ان تین دنوں میں بہت بدل گئی تھی سر سے پاؤں تک۔ دل و دماغ، سوچ، رویہ، ظاہری حلیہ۔ مفلر بے پروائی سے گلے میں لپیٹنے والی نے قرینے سے دوپٹا اوڑھ لیا تھا اور گلے میں، کاندھوں پر جھولتی بالوں کی لٹوں کو خوب اچھی طرح تیل لگا کر چٹیا کی صورت باندھ لیا تھا اور تو اور اس نے

ان تین دنوں میں بقول ماسی ہیر دروازے کے باہر جھانکی بھی نہیں ڈالی تھی اور نہ ہی چھت پر کبوتروں کی سیوا کو گئی تھی۔ ماسی ہیر کو اس کی تبدیلی پر اگرچہ خوشی ہوئی تھی مگر دل سے پریشان ہو گئی تھی۔

''ہائے میں مرجاواں، میری شہزادی کو کسی بد نظر کی نظر نہ لگ گئی ہو۔'' اگرچہ وہ شہزادی کی حرکتوں سے نالاں تھی اسے برا بھلا کہتی ہر وقت چھت پر لٹکنے، لڑکوں کے ساتھ کھیلنے اور لڑکوں والے مشغلے اپنانے سے روکتی مگر اس سے محبت بھی بے حساب تھی کہ اس کی گم صم کیفیت پر دل تھام لیا۔ وہ ان کی گود میں تب آئی تھی جب ان کی گود خالی تھی اور انہوں نے اسے اپنی سگی اولاد تسلیم کر لیا تھا۔

''میری دھی رانی کہیں بیمار تو نہیں ہو گئی۔ دیکھ رانجھیا کیسا چوسنی جتنا منہ نکل آیا ہے۔'' ماسی ہیر نے ڈاکٹر رانجھا کو بھی ہولانا چاہا۔

''کچھ نہیں ہوا ہے، اللہ اپنا فضل کرے گا، دو روز تک افاقہ نہ ہوا تو میں دوائی دے دوں گا۔''

''رہن دے۔'' ہیر بدکی۔ ''کوئی ضرورت نہیں ہے تمہاری دوائیوں کی۔ میں کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھلاؤں گی۔ تم اپنے نسخے اپنی کچھ ہوتی سوتی پر ہی آزماؤ جو کلینک کے کوٹھے پر ٹنگی بیٹھی ہے۔'' ہیر نے مس روزی کا حوالہ دیا۔ ''خبردار جو میری دھی پر اپنی غلط سلط ڈاکٹری آزمائی تو۔''

''اس نمانی کا کیا قصور؟'' رانجھا گڑگڑایا۔

''سارا قصور ہی اس نمانی کا ہے، وہ فسادن ہی تو سارے فساد کی جڑ ہے جب سے تمہارے کوٹھے پر آئی ہے زندگی سے سکھ رخصت ہو گئے ہیں۔ گھر میں نہ برکت ہے نہ صحت اور نہ آپس میں محبت، اس کلموہی نے کوئی ایسا سخت جادو کروایا ہے کہ...... اور اب اچھی خاصی کدکڑے لگاتی یہ کڑی ایک دم گم صم ہو گئی ہے۔'' ہیر نے اگلے پچھلے سارے الزام مس روزی کے کھاتے میں ڈال دیے اور ڈاکٹر رانجھا نے وہاں سے اٹھنے میں دیر نہ لگائی۔

''کچھ نہیں ہوا ہے مجھے ماسی۔'' شہزادی اداسی سے مسکرا دی۔

''اللہ نہ کرے کہ تجھے کچھ ہو۔ میرے کلیجے میں ہتھ پڑتا ہے۔ میں تیری ماں نہیں ہوں ماسی تو ہوں ناں اور ماسی بھی ماں جیسی ہوتی ہے کچھ فرق نہیں ہوتا۔'' وہ سچ مچ آبدیدہ ہو گئی اور شہزادی محبت کے اس مظاہرے پر نم آنکھوں سے مسکرا دی۔

''کچھ بھی نہیں ہوا، صرف یہ ہوا ہے کہ میں سدھرنے کی کوشش کر رہی ہوں جن باتوں پر آپ کو اعتراض تھا وہ سب چھوڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔ لڑکوں کے ساتھ کھیل کود، کبوتر بازی، پتنگ بازی سب کچھ...... میں آپ سے گھر داری سیکھوں گی، کھانا پکانا، سینا پرونا اور دوسرے لڑکیوں والے کام یہ سب اگرچہ راتوں رات نہیں آئے گا مگر مجھے امید ہے کہ آہستہ آہستہ آجائے گا۔'' وہ کہہ رہی تھی اور ماسی ہیر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''تو کہیں مخول تو نہیں کر رہی ناں شہزادی؟''

''میں کیوں مخول کروں گی ماسی۔''

''مگر یہ راتوں رات تبدیلی؟'' ماسی اب تک بے یقین سی تھی۔

''کبھی کبھی ایک ذرا سی تبدیلی کے لیے ساری عمر انتظار کرنا پڑتا ہے اور کبھی کبھی صرف ایک لمحہ بندے کو سر سے پاؤں تک بدل ڈالتا ہے۔'' شہزادی نے زندگی میں پہلی بار فلسفہ بولا۔ وہ کھوئی کھوئی کیفیت کے حصار میں تھی۔ کسی ایک لمحے کی جکڑن میں جکڑی ہوئی۔ وہ کیسا جان لیوا لمحہ تھا جو اس کی زندگی میں آیا اور ٹھہر گیا اور اس ایک لمحے نے اس کی پوری زندگی بدل دی۔ زندگی کی کہانی بدل دی۔ اس کی سوچ کے انداز بدل دیے، اس کے رنگ ڈھنگ بدل دیے۔ صرف ایک دل کے بدلنے سے کہاں، کہاں کیسی کیسی تبدیلیاں آئی ہیں وہ ابھی تک حیران تھی۔

اس نے یاد کیا اس لمحے کو جب اس کے قدم زمین نے پکڑ لیے تھے کہ وہ لاکھ چاہ کے بھی اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکی وہ ایک ٹک بنا پلک جھپکائے اس اجنبی کو دیکھ رہی تھی جس کا آگے بڑھتا ایک، ایک قدم اسے اپنے دل کی سرزمین پر محسوس ہو رہا تھا۔ اجنبی کی بے تحاشا لودیتی آنکھیں، اس کے چہرے کے تیکھے، تیکھے نقوش میں ٹھہرا ہلکا سا تبسم اور اس کے اجلے بے داغ لباس سے پھوٹتی حواسوں پہ چھاتی مسحور کن مہک۔

شہزادی کو شروع سے ہی لڑکیوں کا بہت زیادہ لڑکی ہونا پسند نہیں تھا۔ بے وجہ شرماتی، لجاتی، دوپٹے کا کونا انگلی پر لپیٹتی، چھوئی موئی لڑکیاں اسے سخت ناپسند تھیں۔ لڑکیوں کے یہ طور طریقے یہ ادائیں اسے ابنارمل لگتیں اس لیے اس کی لڑکیوں کے ساتھ دوستی شروع سے ہی نہ ہونے کے برابر تھی اور کچھ لڑکیوں کی مائیں اپنی بیٹیوں کو شہزادی سے دور رہنے کی تلقین بھی کرتیں کہ انہیں شہزادی کی حرکتیں مشکوک اور قابلِ اعتراض لگتی تھیں۔ یہی بات ماسی ہیر کے غصے اور اشتعال کو مہمیز کرتی اور اب اس نے اچانک ماسی ہیر کو حیران بلکہ پریشان کر دیا اپنے حلیے، باتوں اور قرینے سے۔ گزشتہ کئی دنوں سے ٹیپو، گڈو اور دوسرے تمام دوست اسے بُلا بُلا کر تھک چکے تھے مگر وہ ہر بار انہیں بری طرح ڈانٹ دیتی۔

''خدا جانے اس لڑکی کو کیا ہوا ہے کہ ہنسنا بولنا ہی بھول گئی ہے۔'' ماسی ہیر کو پھر اندیشے نے گھیرا۔

''کیا ہے ماسی پہلے آپ میری حرکتوں اور غیر زنانہ سرگرمیوں کی وجہ سے پریشان رہا کرتی تھیں اور اب جب میں نے وہ سب کچھ چھوڑ دیا ہے تب بھی آپ پریشان ہو۔''

''مگر دھیے اس طرح اچانک......؟''

''تو کیا پہلے الٹی میٹم دینا چاہیے تھا کہ میں لڑکی بن گئی ہوں باادب باملاحظہ ہوشیار۔'' اس نے عجیب مسخرے انداز میں کہا۔

''مجھے لڑکیوں کا لڑکی ہونا پسند ہے۔'' یکایک کسی کی بارعب آواز اس کے کانوں میں ابھری۔ کیسی فرمائش تھی اور خود اسے تو لڑکیوں کا لڑکی ہونا قطعی پسند نہیں تھا اور یہ شہزادی کی زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ اس نے اپنی پسند پر کسی اور کو ترجیح دی تھی۔ کسی اور کی پسند کا احترام کیا تھا۔ کسی اور کی پسند کو اپنانے کی کوشش کی تھی اور پورے دل سے کسی اور کی پسندیدہ بننے کی کوشش کی تھی۔

ابھی تو ماسی ہیر نے اسے کسی بڑے اور چنگے ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا تھا۔ ابھی تو ماسی نے اسے کسی پیر سائیں کے مزار پر لے کر جانا تھا کہ اس کے خیال میں شہزادی پر کسی تعویذ کا اثر تھا کسی نے کالا جادو کر دیا تھا اور ماسی کو سو فی صد یقین تھا کہ یہ کام مس روزی کے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا۔ ماسی صبح شام اسے مرچوں کی دھونی دے رہی تھی، نظرِ بد سے بچاؤ کے لیے، مرچیں قریب الختم تھیں ابھی تو اور مرچیں منگوانی تھیں کہ اس شام دروازہ کھولنے پر شہزادی، دروازے کے بیچ وبیچ کھڑی دنگ رہ گئی۔

باہر کھڑے اس اجنبی نوجوان کے ہمراہ سفید چادر میں لپٹی کوئی تنومند عورت تھی مگر دروازے کے پٹ تھامے شہزادی کو آنے والوں کو راستہ دینا بھول گیا۔

ماسی ہیر اس عورت سے بڑے تپاک اور غیر معمولی گرم جوشی سے مل رہی تھی۔ وہ تو بعد میں ماسی ہیر نے تعارف کروایا کہ وہ ان کے بچپن کی پکی سہیلی ہے۔

''لے دس بھلا...... مجھے کیا پتا تھا کہ فہد مجھے جس گھر میں لے کر آئے گا وہ تمہارا ہے۔''

''ہائے بتولاں مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا۔'' وہ دونوں بار بار گلے مل کر دلی مسرت کا اظہار کر رہی تھیں اور وہ دونوں بے حد حیران ہو کر اس والہانہ مظاہرے کو دیکھ رہے تھے۔ بڑی دیر کے بعد انہوں نے ایک دوسرے کو چھوڑا تو دوسروں کا خیال آیا۔

"نی شہزادی اس طرح کیا دیکھ رہی ہے منہ کھول کے، کملی نہ ہو تو آگے ہو کے مل اپنی ماسی کو۔" اور شہزادی ہڑبڑا کر جیسے نیند سے جاگی اور ماسی کے لحیم شحیم سینے میں آسمائی تو ماسی نے چٹاچٹ اس کے بوسے لے ڈالے۔

"یہ میری دھی ہے شہزادی۔" ہیر نے تعارف کروایا تو ماسی نے سینے سے لگی شہزادی کو ایک جھٹکے سے خود سے علیحدہ کیا اور زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا پھر وہ ایسا ہنسیں کہ ان کا تھل تھل کرتا جسم باقاعدہ ہچکولے کھانے لگا بڑی دیر بعد ان کی ہنسی تھمی تو وہ آنکھوں سے بہتے پانی کو صاف کرتے ہوئے بولیں۔

"لے دس، ہن آئے گا سواد۔ یہ شہزادی اور میرا پتر شہزادہ، چل آگے ہو کر ماسی کے سینے سے لگ۔" انہوں نے اپنے بیٹے کو دھکا دے کر ہیر کے سینے سے لگا دیا اور وہ بدحواس سا ہو کر ہیر کے پیار کے ستم سہنے لگا۔ ہیر نے جلدی سے انہیں اندر بٹھا کر خاطرداریاں شروع کر دیں۔

"میرے بیٹے کا اصلی نام تو فہد ہے بس بچپن میں لاڈ اور پیار سے شہزادہ بلایا تو پھر شہزادہ ہی مشہور ہو گیا۔" ماسی بتولاں نے لسی کا بڑا سا گھونٹ بھر کے اتنی ہی بڑی ڈکار لی۔

"اور اس کا نام اس کی ماں صغریٰ نے تو خورے کچھ اور ہی رکھا تھا مگر میرے لیے یہ شہزادیوں ورگی تھی ای لیے میں نے اس کا نام شہزادی رکھ دیا۔" ہیر نے بھی تفصیلی تعارف کروایا۔ "ویسے ڈاکٹر اور میں دونوں پورے محلے میں ہیر رانجھا کے نام سے مشہور ہیں اور ہم دونوں میں محبت بھی بڑی مثالی ہے۔" شہزادی نے سٹپٹا کر ہیر کو دیکھا مگر وہ خود میں مگن تھی۔

"اور اب یہ شہزادی اور شہزادہ......" ماسی بتولاں نے کہا۔ "پھر میں رشتہ پکا ہی سمجھوں؟"

"آہو۔" ہیر نے بے پروائی سے ہاتھ جھاڑے جیسے وہ اسی رشتے کے انتظار میں تھی اور شہزادی رشتہ مانگنے اور رشتہ دینے کے طریقے پر غور ہی کرتی رہ گئی جو اچانک پکا ہو گیا تھا پورے گاؤں میں اس طرح رشتہ پکا نہیں ہوا ہوگا۔

اس نے حیران ہو کر نگاہ اٹھائی تو شہزادہ بڑی گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا، وہ ایک دم مسکرا دیا اور شہزادی خود میں سمٹ کر ماسی بتولاں کے بھاری بھرکم وجود کے پیچھے چھپ گئی۔

ماسی بتولاں اور ماسی ہیر نہ جانے کن، کن وقتوں کے کون سے قصے کہانیاں چھیڑ بیٹھی تھیں جب شہزادہ اس کے قریب چلا آیا۔

"سنو...... کیا شہزادی اور شہزادہ بھی ایک دوسرے سے اتنی ہی محبت کریں گے؟"

"کتنی؟" شہزادی نے پلکیں اٹھائیں۔

"ہیر رانجھا جتنی۔" وہ بولا تو اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"ہائے ربا، اس کی آنکھیں تو بتیوں کی طرح چمکتی ہیں۔" شہزادی نے دل میں سوچا۔

"بتاناں؟" وہ مُصر تھا۔

"کیا؟"

"ہیر رانجھا کے جتنی محبت!"

"مجھے نہیں پتا۔" وہ وہاں سے ہٹ آئی... ہلکا سا مسکرا کر اس نے بہ مشکل قہقہہ روکا تھا۔ وہ ایک مشہور کیریکٹر کی طرح پوچھنا چاہتی تھی کہ "وہ جو ہیر اور رانجھا کرتے ہیں وہ محبت ہوتی ہے؟"

مگر یہ گھر کے اندر کی بات تھی اور وہ ابھی گھر کا فرد نہیں تھا پھر ویسے بھی بتانے کی ضرورت نہ ہی پڑتی اور اس شام اس گھر سے آتے ہاسے (ہنسنے) کی آواز پر گلی سے گزرتے لوگوں نے ٹھہر ٹھہر کر دیکھا کہ شاید مکین بدل گئے تھے یا مکینوں کے آپس میں خیالات و نظریات نسبتاً اچھے تعلقات میں تبدیل ہو گئے تھے۔

اسے اپنا انجام ہیر رانجھا سے مختلف کرنا تھا۔



لوکھے کی نیکی

خولہ بنتِ حوا

ڈرائنگ روم کے سامنے سے گزرتے ہوئے نغمہ کے قدم ٹھٹکے... اندر اس کی چودہ سالہ نند نمرہ اپنی دوست سعدیہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ موضوعِ گفتگو یقیناً نغمہ ہی کی ذات تھی۔

"اور سناؤ کیسی ہیں تمہاری بھابی؟" نغمہ خود کو ایک نئی لڑائی کے لیے تیار کرنے لگی کیونکہ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اب اس کی ذات کے بخیے ادھیڑے جائیں گے لیکن اندازے کبھی کبھار غلط بھی تو ثابت ہو جاتے ہیں ناں۔ نمرہ کا جواب نغمہ کی سوچ کے برعکس تھا۔

"الحمدللہ بہت اچھی ہیں۔" کہہ کر دوسرا موضوع چھیڑ دیا تو نغمہ پلٹ آئی۔

☆☆☆

نغمہ شادی کی اس تقریب میں جی بھر کے بور ہو رہی تھی۔ یہ اس کے سسرالی عزیز کے ہاں کی تقریب تھی۔ شادی میں عورتوں اور مردوں کے لیے الگ، الگ انتظامات تھے۔ مووی اور تصاویر کھینچنے جیسی کوئی خرافات یہاں نہیں تھی۔

''آپ لوگ تصویریں نہیں کھنچواتے؟'' یہی دیکھ کر نغمہ نے یونہی پوچھ لیا۔

''نہیں۔'' جواب بہت ناگواری سے آیا۔

''کیوں؟''

''کیونکہ ہمارے ہاں پردے کا اہتمام ہوتا ہے جبکہ تصویریں کھینچنے والے نامحرم ہوتے ہیں۔''

''تو کسی محرم سے کھنچوالیں۔'' نغمہ بوریت سے بچنے کے لیے بات بڑھا رہی تھی۔

''لیکن جہاں سے تصویریں ڈھل کر آئیں گی وہاں تو نامحرم ہوں گے ناں یا وہاں بھی محرم کو بھیج دیں۔ ایسا تو ممکن نہیں اور ہمیں ضرورت بھی نہیں تصویروں کی۔''

''لیکن صرف تصویروں سے کیا ہوتا ہے؟''

''وہی ہوتا ہے جو وجود کو دیکھنے سے ہوتا ہے کیونکہ تصویریں بھی تو عدم کی نہیں وجود کی ہی ہوتی ہیں۔''

''تو کیا اس چکر میں پڑ کر اب بندہ تصویریں بھی نہ کھنچوائے۔ یہ تو یادگار ہوتی ہیں۔''

''کھنچوائے...... ضرور کھنچوائے جسے شوق ہو اور جسے ضرورت محسوس ہو۔ ہمارے ہاں دونوں مرض نہیں ہیں۔ یادگار کو یاد رکھنے کے لیے ہمارے دماغ ہی کافی ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ باپردہ خاتون آگے بڑھ گئیں۔ معلوم نہیں کون تھیں۔

''بڑی تیکھی مرچ ہے۔'' نغمہ نے جل کر سوچا اور مزید خراب موڈ کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ ایک طرف کوئی خاتون نمرہ کو گھیرے کھڑی تھیں۔ نغمہ متجسس ہو کر وہاں آ گئی۔

''سچ بتاؤ کیسے گزارہ کرتے ہو تم لوگ نغمہ کے ساتھ...... یہ تو بڑی نخریلی ہے۔'' آواز سن کر نغمہ چونکی۔ یہ ان کے اپنے محلے کی آنٹی خورشید تھیں۔ جن کی بیٹی کا رشتہ نغمہ کے بھائی کے لیے لینے سے انہوں نے انکار کیا تھا۔ نغمہ کے اندر آگ لگی۔

''نہیں آنٹی، بھابی تو اچھی ہیں، نخریلی تو نہیں ہیں۔''

''اچھا گھر کے کام وام کر لیتی ہے؟''

''ارے نہیں آنٹی، ابھی تو نئی ہیں، ہم ابھی سے تھوڑی کام کروائیں گے۔'' نمرہ نے اس کی کام چوری پر پردہ ڈالا لیکن نغمہ بجائے شکر گزار ہونے کے بھڑک اٹھی۔

''ہونہہ، یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ کرتی ہوں کام لیکن پھر اپنی واہ واہ کیسے ہوتی۔''

''اچھا تبھی اچھی ہے۔ ذرا کام شروع کرواؤ پھر دیکھنا اس کا اصل رنگ۔'' آنٹی زور سے ہنسیں۔

''نہیں، ایسی تو نہیں ہیں وہ۔''

''اچھا۔'' وہ مایوس سی ہو کر دوسری طرف بڑھ گئیں۔ نغمہ غصے سے آگے بڑھی۔

''جی۔'' نمرہ بھاوج کو دیکھ کر ٹھٹکی۔

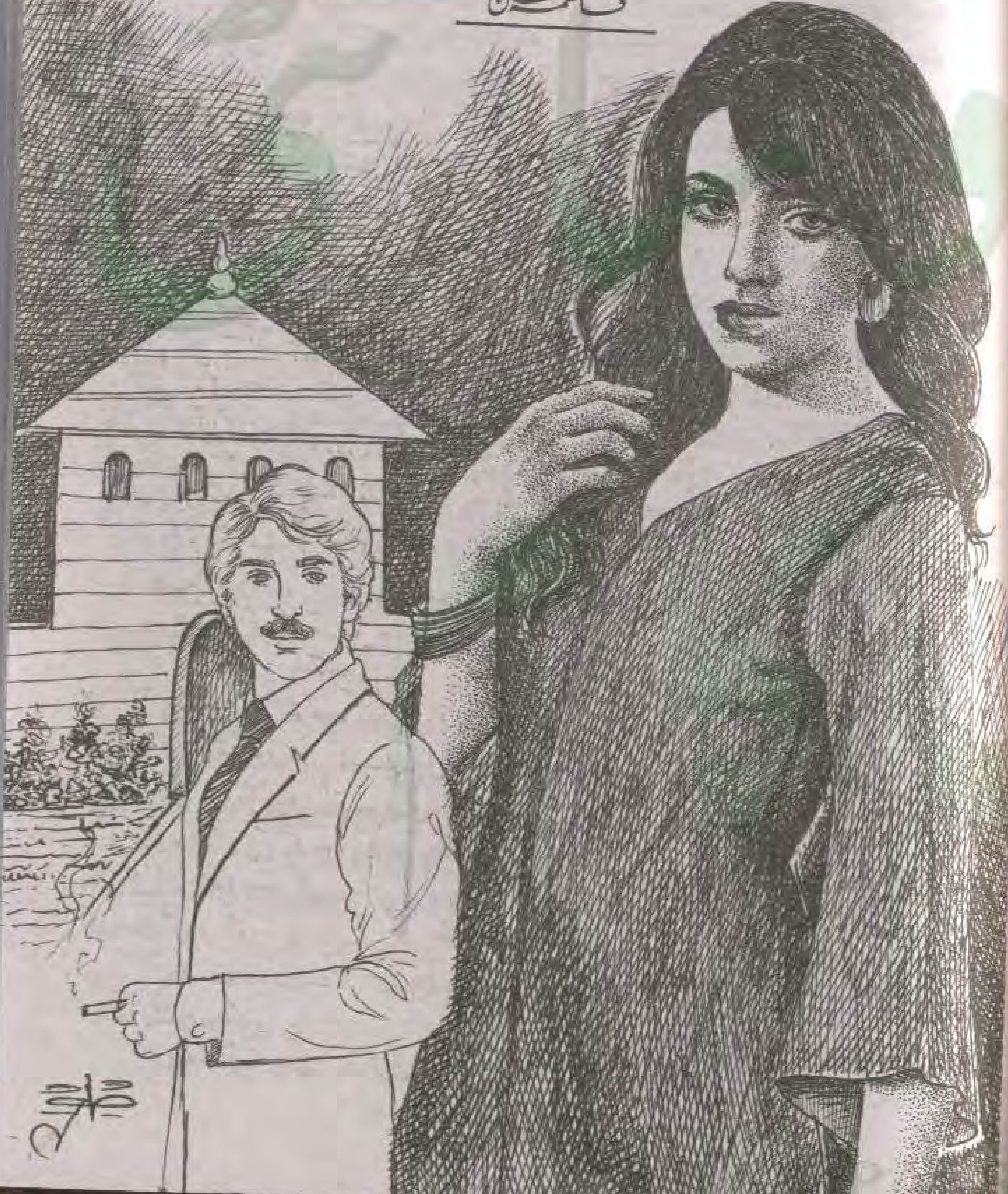
''جی کی بچی...... تم کیا سمجھتی ہو اس طرح کی باتیں کر کے تم خود کو بہت عظیم ثابت کر دو گی۔'' نمرہ سپاٹ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''نہیں بھابی۔'' آواز میں سنجیدگی تھی۔ ''میں خود کو کچھ بھی ثابت نہیں کرنا چاہتی۔ میں صرف خود کو غیبت سے بچانا چاہتی ہوں تاکہ نیکیاں ضائع نہ ہوں کیونکہ......'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ''کیونکہ میرے پاس نہ تو نیکیوں کے ڈھیر کے ڈھیر ہیں نہ ہی میری نیکیاں لوہے کی بنی ہیں۔'' نغمہ اس کی بات پر حیرت زدہ رہ گئی اس کے پاس مزید بولنے کو کچھ نہیں تھا۔

☆☆☆

میں مسلمان ہوں

فاطمہ خان



فرانس کے شہر پیرس کے میڈیلین نامی اس چرچ میں سنڈے مارننگ کی دعائیہ سروسز جاری تھیں۔ تمام افراد فادر جوزف کی تقلید میں بائبل کے گیت گا رہے تھے۔ میری بھی اپنے والدین کے ساتھ ہر اتوار کو یہ دعائیہ سروسز اٹینڈ کرتی تھی مگر اس بار اس کا ذہن بہت منتشر تھا یہی وجہ تھی کہ وہ دوسرے افراد کا ساتھ دینے کے بجائے خاموش کھڑی تھی۔ اس کی والدہ نے اسے کہنی ماری تو کچھ دیر کو اس کے لب بھی

ہلتے دکھائی دیے مگر اکتا کر وہ پھر خاموش ہوگئی۔ ان گیتوں کے بعد اب فادر نے انجیل مقدس کے کچھ ابواب پڑھ کرسنائے جنہیں اس چرچ میں موجود لوگوں نے نہایت خاموشی سے سنا تھا۔ صلیب کا نشان بنائے یہ لوگ میری کو پہلی بار بہت مختلف اور عجیب سے لگ رہے تھے۔ گھنٹیاں بجائی جارہی تھیں اس کا مطلب یہی تھا کہ ان سروسز کا اختتام ہونے والا ہے۔ عیسائیت کے پیروکاروں کے لیے ہر اتوار کی صبح کو چرچ کی ان سروسز میں شرکت کرنا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے عقیدے کے مطابق یہ سب کرنے سے ان کے پورے ہفتے کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ سروسز کے اختتام پر اب یہ لوگ پُرسکون تھے کہ ان کے گناہ معاف ہوگئے ہیں اور اب وہ نارمل انداز میں زندگی کے دیگر معمولات سرانجام دیں گے۔ میری نے نہایت بے دلی سے یہ مذہبی رسومات ادا کیں۔ اس کی یہ بیزاری اس کے والدین اور خاندان کے دوسرے افراد نے بھی محسوس کرلی تھی اور صرف اس روز ہی نہیں بلکہ وہ پچھلے ایک ہفتے سے اس کی یہ کیفیت دیکھ رہے تھے۔ اس کے والدین نے مختلف طریقوں سے اس سے پوچھنے کی کوشش کی تھی مگر وہ کوئی بھی واضح جواب نہیں دے پائی تھی اور سچ تو یہ تھا کہ وہ خود بھی نہیں سمجھ پارہی تھی کہ اپنے مذہب کی سچائی سے متعلق کیوں اس کے دل میں وسوسے سر اٹھانے لگے تھے۔

☆☆☆

”ماں......! میں کیتھرین سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ فہد، سکینہ کے قدموں میں بیٹھا اپنی خواہش بیان کررہا تھا۔ اس کی ہمیشہ سے عادت تھی جب کوئی بات منوانا ہوتی تھی ماں کے پاؤں پکڑ لیا کرتا اور اس وقت تک نہیں چھوڑتا جب تک وہ اس کی بات مان نہیں جاتی تھی۔

”تم جانتے ہو وہ کون ہے؟“ سکینہ نے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ماں وہ کیتھولک عیسائی ہے اور اس کی فیملی فرانس میں رہتی ہے۔ شادی کے بعد ہم فرانس چلے جائیں گے۔ میرا مستقبل میرا انتظار کررہا ہے۔ ماں میں آپ کو بھی لے جاؤں گا۔ وہ اہلِ کتاب ہے اور میرا مذہب مجھے اس سے شادی کی اجازت دیتا ہے۔“ فہد نے اپنے ذہن میں ترتیب دیے چند جملے بول دیے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ پہلے سے ہی سب کچھ سوچ کر آیا ہے۔

”کیا تم نے اسے اللہ کا پیغام پہنچایا، وہ پیغام جو میں نے تمہاری پیدائش کے ساتھ ہی تمہاری رگوں میں اتار دیا تھا؟“ یہ بات کرتے ہوئے سکینہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں سے اب اللہ سے محبت کا رنگ غائب ہوتا جارہا تھا۔

”میں نے اس سے بات کی تھی...... مگر وہ نہیں مانتی، ہم دونوں نے اپنے، اپنے مذہب پر قائم رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔“ فہد نے نہایت عام سے انداز میں کہا۔ اس نے اب بھی سکینہ کے پاؤں پکڑے ہوئے تھے اور سکینہ کو الجھن ہورہی تھی کہ وہ اس کے پاؤں چھوڑ دے۔

”یہ بات اگر کوئی اور شخص کرتا تو مجھے حیرت نہ ہوتی مگر سکینہ کا بیٹا فہد یہ سب کچھ کہہ رہا ہے تو اس کا مطلب ہے میری تربیت میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔“ سکینہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے مگر انہوں نے آنسوؤں کو نیچے گرنے نہیں دیا۔ وہ انہیں بے مول نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

”ٹھیک ہے، کل تم اسے میرے پاس لے آنا میں اس سے مل لوں گی۔“ سکینہ نے یہ کہہ کر آہستگی سے فہد کے ہاتھوں سے اپنے پیروں کو آزاد کیا۔ فہد اٹھ کر چلا گیا مگر سکینہ کے لیے ایک نئی آزمائش ان کا انتظار کررہی تھی۔

☆☆☆

پیرس کی یہ شام ہمیشہ کی طرح بہت رنگین تھی، ہلکی ہلکی بارش نے اس کی خوب صورتی میں مزید اضافہ کردیا تھا۔ نوجوان جوڑے ایک دوسرے کے سنگ ہنستے مسکراتے ان خوشبودار شاموں کو اور رنگین بنارہے تھے۔ میری نے حسرت سے ان نوجوان لڑکے،

لڑکیوں کو دیکھا جو دنیا سے بے نیاز اپنے آپ میں مگن تھے، انہیں اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ کوئی انہیں دیکھ رہا ہے۔ وہ یہ مناظر دیکھنے کی عادی تھی مگر اس روز اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کبھی وہ بھی ان شاموں کی رنگینیوں کا حصہ ہوا کرتی تھی۔ اپنے منگیتر ایڈم کے ساتھ دریائے سین کے کنارے اس نے بہت دفعہ چہل قدمی کی تھی۔ شانزے لیزے کی وسیع وعریض حسین شاہراہ پر وہ دونوں بھی ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دنیا سے بے نیاز ہوکر چلا کرتے تھے مگر اب تو میری خود سے بھی بیزار تھی۔ وہ ایک کیتھولک عیسائی تھی اور اسے اپنے عیسائی ہونے پر بہت فخر محسوس ہوتا تھا مگر اب کچھ عرصے سے عیسائیت سے متعلق بہت سے سوالات اس کے ذہن میں جنم لینے لگے تھے۔ اس نے فادر جوزف سمیت بہت سے لوگوں سے ان سوالات کے جوابات مانگے تھے مگر کوئی بھی اسے مطمئن نہیں کرسکا تھا۔ وہ بائبل کھولتی تو اپنی یہ مقدس کتاب اسے تضادات کا مجموعہ لگتی، کتنے ہی نسخے اس نے بائبل کے منگوا کر دیکھ لیے تھے مگر ہر نسخہ دوسرے سے کسی نہ کسی طرح مختلف ہوتا تھا۔ صرف...... وضع قطع اور جلد میں نہیں بلکہ معانی اور مطلب کے حساب سے مختلف ہوتا تھا۔ وہ بہت پریشان رہنے لگی تھی اسے چرچ کی سنڈے مارننگ سروسز سے حد درجہ بیزاری ہونے لگی تھی۔ وہ اس وقت اپنی پسندیدہ شاہراہ شانزے لیزے کے ایک بک اسٹور کے پاس سے گزر رہی تھی۔ یہ وسیع سڑک اسے ہمیشہ اپنی، اپنی سی لگتی تھی وہ جب بھی اداس ہوتی تھی یہاں کی رونقیں دیکھ کر کچھ دیر کو اس کا دل بہل جاتا تھا مگر اس روز تو شاید یہ... پُررونق شاہراہ بھی اسی کی طرح اداس تھی۔ وہ اپنے پسندیدہ بک اسٹور میں داخل ہوچکی تھی۔ عیسائیت کے متعلق بہت سی کتابیں اس اسٹور میں موجود تھیں۔ ان میں سے اکثر کتابیں اس نے پڑھ رکھی تھیں۔ کوئی بھی کتاب ایسی نہیں تھی جو اس کی ذہنی الجھن کو کم کرسکتی۔ وہ ابھی واپسی کی راہ لے ہی رہی تھی کہ اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ فرش پر گرگئی۔ بک اسٹور پر موجود لوگوں نے اس کو اٹھایا۔ بظاہر تو اس کو کہیں پر چوٹ نہیں لگی تھی مگر پاؤں میں شدید تکلیف کا احساس تھا۔ شاید اس کے پاؤں میں موچ آگئی تھی۔ اس نے چلنے کی کوشش کی مگر پاؤں میں درد اتنا شدید تھا کہ وہ چل نہیں سکی اور پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ابھی اسے کرسی پر بیٹھے چند منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ ایک سانولی سی رنگت والا دراز قد نوجوان ہاتھ میں پانی کا ایک گلاس لے کر آیا۔ اس نے میری کو بتایا کہ یہ آبِ زم زم ہے، وہ یہ پانی پی لے اسے آرام آجائے گا۔ میری نے بے دلی سے وہ پانی پیا کیونکہ وہ ان چیزوں پر یقین نہیں رکھتی۔ پانی پینے کے کچھ دیر بعد ہی اسے محسوس ہوا کہ پاؤں میں تکلیف کچھ کم ہوگئی ہے۔ نوجوان کے کہنے پر ہی اس نے اس پانی کو اپنے پاؤں کے اس حصے پر بھی گرایا جہاں اسے خدشہ تھا کہ موچ آئی ہے، اس نے کھڑے ہوکر چلنا شروع کیا تو اب تکلیف کا احساس پہلے سے بہت کم ہوگیا تھا۔ اس نوجوان نے میری کو وہ پانی ایک بوتل میں بند کرکے دیا اور کہا کہ وہ دن میں تین بار تھوڑا تھوڑا کرکے یہ پانی پیے۔ اس کے علاوہ وہ اسے یہ بھی بتاتا رہا کہ پانی کھڑے ہوکر نہیں بیٹھ کر پینا ہے، تین سانسوں میں پینا ہے وغیرہ وغیرہ اس مقدس پانی آبِ زم زم کی کہانی بھی بہت دلچسپ تھی جو اسے نوجوان نے سنائی تھی۔ اس کے مزید پوچھنے پر نوجوان نے بتایا کہ اس کا نام اکرم ہے اور وہ پاکستان کے شہر لاہور سے آیا ہے اور یہ بھی کہ وہ مسلمان ہے۔ میری کی مسلمانوں کے بارے میں رائے کچھ اچھی نہیں تھی وہ یہی سمجھی تھی کہ مسلمان اچھے نہیں ہوتے ہیں اور وہ اپنی عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے مگر اکرم کو دیکھ کر اس کی رائے تبدیل ہوچکی تھی۔ اس نے تشکر آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا وہ یہ ارادہ کرچکی تھی کہ اس نوجوان سے اس کے بارے میں مزید باتیں پوچھے گی۔ اسلام سے اس کا پہلا تعارف ہوچکا تھا۔

☆☆☆

کیتھرین نے بڑے غور سے سفید چادر میں لپٹے ہوئے نور کے اس ہالے کو دیکھا جس سے ملنے کا اسے بہت شوق تھا اور جب فہد نے اسے بتایا کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہیں تو کتنی ہی دیر اسے یقین نہیں آیا تھا مگر حقیقت یہی تھی کہ وہ اس وقت ان کے سامنے موجود تھی۔ فہد اسے اپنے گھر کے باہر اتار کر خود کسی کام سے چلا گیا تھا، وہ چاہتا تھا کہ کیتھرین، ماں سے اکیلے میں ملے۔ کیتھرین کا استقبال سکینہ نے بہت اچھے طریقے سے کیا تھا۔ اس کی تواضع کے لیے انہوں نے کھانے پینے کی کتنی ہی چیزوں کا اہتمام کرلیا تھا۔ فہد ٹھیک کہتا تھا ان کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ زیادہ دیر ان کو دیکھ نہیں سکتی تھی، ایک عجیب سا رعب تھا ان کی شخصیت میں جس کے زیرِ اثر وہ آتی جارہی تھی۔

''اپنے بارے میں کچھ بتاؤ؟'' سکینہ نے پلیٹ میں دو چکن رول اور تھوڑی سی چٹنی ڈال کر کیتھرین کو پلیٹ پکڑائی۔ کیتھرین نے مسکراتے ہوئے ان کے ہاتھ سے پلیٹ لے لی۔ اسے لگا کہ آج وہ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی کھالے گی۔ سکینہ کی آواز بھی اسے ان کی شخصیت کی ہی طرح بہت پیاری لگی تھی۔ اس نے اپنے بارے میں سب کچھ تفصیل سے بتادیا مگر کچھ باتیں چھپالیں۔ جنہیں بتانے کا اس کے خیال میں ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ وقت آئے گا تو وہ خود ہی سب کچھ جان جائیں گی۔

''میں چاہتی ہوں کہ تم مسلمان ہوجاؤ مگر میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوگا جب تک تمہاری اپنی رضا اس میں شامل نہیں ہوگی۔'' سکینہ نے کیتھرین سے کہا اس وقت ان کی آنکھوں میں آئی نمی کو کیتھرین نے واضح طور پر محسوس کرلیا تھا۔

''یہ کچھ کتابیں ہیں تم انہیں اپنے ساتھ لے جاؤ اور میری خاطر انہیں ایک دفعہ ضرور پڑھنا، میں دعا کروں گی کہ تمہارے دل میں ایمان کی ایسی شمع روشن ہو جس سے تمہارا پورا وجود جگمگا اٹھے۔'' سکینہ نے چند کتابیں اس کو دیتے ہوئے کہا۔ کیتھرین نے بے دلی سے وہ کتابیں پکڑلیں حقیقت میں جو کچھ وہ چاہتی تھی سکینہ کو پتا چل جاتا تو وہ شاید اس سے ملنا بھی پسند نہ کرتیں۔

''میں اب چلتی ہوں۔'' کیتھرین نے وہ کتابیں اپنے بیگ میں ڈال کر کہا۔ اسے لگا کہ اگر وہ کچھ اور دیر یہاں بیٹھی رہی تو وہ یہیں کی ہوکر رہ جائے گی اور اسے تو واپس بھی جانا ہے۔ سکینہ نے اسے گلے لگا کر پیار کیا۔ کیتھرین اب اس گھر سے باہر آچکی تھی مگر اندر بیٹھی خاتون جن سے وہ ابھی مل کر آئی تھی وہ کوئی فرشتہ تھیں اسے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں تھا کہ ان جیسی خاتون اس نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔

☆☆☆

میری اپنے کمرے میں آرام کررہی تھی جب اس نے دروازے پر ہلکی سی دستک کی آواز سنی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو ایڈم مسکراتا ہوا اس کے کمرے میں داخل ہوچکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پھولوں کا گلدستہ تھا جو اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی میری کے سرہانے رکھ دیا۔ پھول میری کی کمزوری تھے اور ان پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو نے میری کے اعصاب پر بہت اچھا اثر ڈالا تھا۔ ایڈم اس کے انکل جانسن کا بیٹا تھا۔ اس کے والد اور جانسن انکل دو ہی بھائی تھے جن کا پیرس میں ایک مشترکہ اسٹور تھا۔ وہ اور ایڈم دونوں ہی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ ان دونوں کی منگنی ہوچکی تھی اور اس کرسمس پر ان دونوں کی شادی ہونے والی تھی۔ میری کی تعلیم ابھی جاری تھی مگر ایڈم اپنی تعلیم مکمل کرچکا تھا اور اسے بہت اچھی کمپنی میں جاب بھی مل چکی تھی۔ ایڈم ہر لحاظ سے ایک آئیڈیل مرد تھا۔ ان دونوں کی اکثر شامیں اکٹھی ہی گزرتی تھیں مگر جب سے اس کی اپنی طبیعت میں بیزاری اور بے سکونی اتر آئی تھی اسے ایڈم کی قربت بھی بہت بری لگنے لگی تھی۔ ایڈم ابھی اس کے پاس آکر بیٹھا ہی تھا کہ میری کی ممی ان دونوں کے لیے کافی اور کچھ اسنیکس بنا کر لے آئیں۔

فرانسیسی کی طرح ایڈم کو بھی کھانے پینے کا بہت شوق تھا اور ممی بھی اس کی خوب خاطر کرتی رہتیں۔

"ایڈم اسے سمجھاؤ کہ اپنی نارمل زندگی گزارے، ہر وقت کی بیزاری اور چڑچڑاپن ختم کرے۔" ممی نے نہایت فکر مندی سے ایڈم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آنٹ آپ فکر نہ کریں ابھی اس کا پاؤں ٹھیک ہو جائے پھر ہم دونوں روز دریائے سین کے کنارے فرنچ گیت گایا کریں گے۔" ایڈم نے کافی کے ساتھ اسنیکس لیتے ہوئے کہا۔

میری نے اثبات میں سر ہلایا۔ ایڈم کافی دیر تک اس کے پاس بیٹھا رہا مگر میری کو اس روز ایڈم کی قربت بہت بے سکون کر رہی تھی۔ ایڈم اس کے آرام کا خیال کر کے چلا گیا۔ میری نے اپنی کچھ میڈیسنز لیں اور ساتھ میں اکرم کا دیا ہوا وہ جادوئی پانی پیا جس کے پینے سے نہ صرف اس کا پاؤں تیزی سے ٹھیک ہو رہا تھا بلکہ اس کی طبیعت میں بھی ایک عجیب سا سکون اتر آیا تھا۔ اب وہ کافی بہتر تھی اور اس کا ارادہ تھا کہ چند دن بعد ہی وہ اکرم کے پاس دوبارہ جائے گی۔ اسے اس کا شکریہ ادا کرنا تھا۔ وہ اس سے ملنے کے لیے بہت بے قرار تھی۔

☆☆☆

"فہد.....! تمہاری ماں بہت سحر انگیز شخصیت کی مالک ہیں۔ ان کے چہرے پر جو ایک عجیب سا نور اور روشنی ہے وہ میں نے ابھی تک کسی کے چہرے پر نہیں دیکھی۔" کیتھرین ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھی فہد کو اپنی اور سکینہ کی ملاقات کی تفصیل بتا رہی تھی۔

کیتھرین اور وہ ایک ہی آفس میں کام کرتے تھے۔ وہ یہاں پر ریجنل منیجر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا جبکہ کیتھرین اسی آفس کی پیرس والی برانچ سے شفٹ ہو کر ادھر آئی تھی۔ وہ یہاں پر پروجیکٹ کوآرڈینیٹر تھی۔ نیلی آنکھوں والی اس فرنچ ڈول نے پہلی ہی نظر میں اسے اپنا اسیر بنا لیا تھا۔ وہ فطری طور پر بہت شرمیلی طبیعت کا مالک تھا اور خاص طور پر لڑکیوں سے بات کرتے ہوئے تو وہ گھبرا جاتا تھا اس میں اس کی ماں کی تربیت کا بہت عمل دخل تھا۔ وہ عورتوں کو ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھتا۔ اس کے مقابلے میں کیتھرین بہت بولڈ اور شوخ و چنچل طبیعت کی مالک تھی۔ آفس کی طرف سے دی جانے والی ایک پارٹی میں کیتھرین نے سب کے سامنے اس قدر بے باکی سے فہد سے اظہارِ محبت کیا تھا کہ ایک لمحے کو تو وہ بھی حیران رہ گیا۔ آفس کے سب لوگ جان گئے تھے کہ کیتھرین اور فہد ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ وہ فہد کی قسمت پر رشک کرتے تھے مگر فہد، کیتھرین سے شادی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ کیتھولک عیسائی تھی اور ماں نے تو بالکل بھی نہیں ماننا تھا۔ فہد نے بہت دفعہ کیتھرین کے سامنے اسلام کا پیغام پہنچانے کی کوشش کی تھی مگر کیتھرین نے ہر بار اس کی باتوں کو نظر انداز کیا۔ کیتھرین کی باتوں سے اسے لگتا تھا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں سے بہت بدظن ہے مگر پھر بھی اس نے فہد کو شادی کے لیے پسند کیا یہ بات فہد کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ اس نے فہد پر واضح کر دیا تھا کہ شادی کے بعد وہ اسے لے کر پیرس چلی جائے گی۔ اس نے مستقبل کے رنگوں کی اس قدر خوب صورت تصویر کشی کی تھی کہ فہد اس تصوراتی دنیا میں کھو سا گیا تھا اب وہ خود چاہ رہا تھا کہ جلد از جلد پیرس جا کر اپنا مستقبل بنائے۔ اسے لگتا تھا کہ ماں نہیں مانے گی مگر ماں نے اگر واضح اقرار نہیں کیا تھا تو انکار بھی نہیں کیا تھا۔

ریسٹورنٹ میں بیٹھی کیتھرین مسلسل ماں کی شان میں قصیدے پڑھ رہی تھی۔ فہد کو اپنی ماں پر فخر تھا بلاشبہ وہ دنیا کی بہترین ماں تھیں مگر جب سے فہد نے اپنی شادی کی بات کی تھی اس وقت سے ماں کا چہرہ بجھا بجھا سا تھا۔ ماں کو اس نے اداس کر دیا تھا۔ کیتھرین کی محبت نے اس کی آنکھوں پر ایسی پٹی باندھی تھی کہ اسے ماں کی اداسی بھی نظر نہ آسکی۔ وہ دونوں اب اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ کیتھرین چاہ رہی تھی کہ اگلے ہفتے وہ دونوں کورٹ میرج کر لیں۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو جائے گا یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

ہر فرانسیسی کی طرح ایڈم کو بھی کھانے پینے کا بہت شوق تھا اور ممی بھی اس کی خوب خاطر کرتی رہتیں۔

”ایڈم اسے سمجھاؤ کہ اپنی نارمل زندگی گزارے، ہر وقت کی بیزاری اور چڑچڑا پن ختم کرے۔“ ممی نے نہایت فکر مندی سے ایڈم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آنٹ آپ فکر نہ کریں ابھی اس کا پاؤں ٹھیک ہو جائے پھر ہم دونوں روز دریائے سین کے کنارے فرنچ گیت گایا کریں گے۔“ ایڈم نے کافی کے ساتھ اسنیکس لیتے ہوئے کہا۔

میری نے اثبات میں سر ہلایا۔ ایڈم کافی دیر تک اس کے پاس بیٹھا رہا مگر میری کو اس روز ایڈم کی قربت بہت بے سکون کر رہی تھی۔ ایڈم اس کے آرام کا خیال کر کے چلا گیا۔ میری نے اپنی کچھ میڈیسنز لیں اور ساتھ میں اکرم کا دیا ہوا وہ جادوئی پانی پیا جس کے پینے سے نہ صرف اس کا پاؤں تیزی سے ٹھیک ہو رہا تھا بلکہ اس کی طبیعت میں بھی ایک عجیب سا سکون اتر آیا تھا۔ اب وہ کافی بہتر تھی اور اس کا ارادہ تھا کہ چند دن بعد ہی وہ اکرم کے پاس دوبارہ جائے گی۔ اسے اس کا شکریہ ادا کرنا تھا۔ وہ اس سے ملنے کے لیے بہت بے قرار تھی۔

☆☆☆

”فہد......! تمہاری ماں بہت سحر انگیز شخصیت کی مالک ہیں۔ ان کے چہرے پر جو ایک عجیب سا نور اور روشنی ہے وہ میں نے ابھی تک کسی کے چہرے پر نہیں دیکھی۔“ کیتھرین ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھی فہد کو اپنی اور سکینہ کی ملاقات کی تفصیل بتا رہی تھی۔

کیتھرین اور وہ ایک ہی آفس میں کام کرتے تھے۔ وہ یہاں پر ریجنل منیجر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا جبکہ کیتھرین اسی آفس کی پیرس والی برانچ سے شفٹ ہو کر ادھر آئی تھی۔ وہ یہاں پر پروجیکٹ کوآرڈینیٹر تھی۔ نیلی آنکھوں والی اس فرنچ ڈول نے پہلی ہی نظر میں اسے اپنا اسیر بنا لیا تھا۔ وہ فطری طور پر بہت شرمیلی طبیعت کا مالک تھا اور خاص طور پر لڑکیوں سے بات کرتے ہوئے تو وہ گھبرا جاتا تھا۔ اس میں اس کی ماں کی تربیت کا بہت عمل دخل تھا۔ وہ عورتوں کو ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھتا۔ اس کے مقابلے میں کیتھرین بہت بولڈ اور شوخ و چنچل طبیعت کی مالک تھی۔ آفس کی طرف سے دی جانے والی ایک پارٹی میں کیتھرین نے سب کے سامنے اس قدر بے باکی سے فہد سے اظہارِ محبت کیا تھا کہ ایک لمحے کو تو وہ بھی حیران رہ گیا۔ آفس کے سب لوگ جان گئے تھے کہ کیتھرین اور فہد ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ وہ فہد کی قسمت پر رشک کرتے تھے مگر فہد، کیتھرین سے شادی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ کیتھولک عیسائی تھی اور ماں نے تو بالکل بھی نہیں ماننا تھا۔ فہد نے بہت دفعہ کیتھرین کے سامنے اسلام کا پیغام پہنچانے کی کوشش کی تھی مگر کیتھرین نے ہر بار اس کی باتوں کو نظر انداز کیا۔ کیتھرین کی باتوں سے اسے لگتا تھا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں سے بہت بدظن ہے مگر پھر بھی اس نے فہد کو شادی کے لیے پسند کیا یہ بات فہد کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ اس نے فہد پر واضح کر دیا تھا کہ شادی کے بعد وہ اسے لے کر پیرس چلی جائے گی۔ اس نے مستقبل کے رنگوں کی اس قدر خوب صورت تصویر کشی کی تھی کہ فہد اس تصوراتی دنیا میں کھو سا گیا تھا اب وہ خود چاہ رہا تھا کہ جلد از جلد پیرس جا کر اپنا مستقبل بنائے۔ اسے لگتا تھا کہ ماں نہیں مانے گی مگر ماں نے اگر واضح اقرار نہیں کیا تھا تو انکار بھی نہیں کیا تھا۔

ریسٹورنٹ میں بیٹھی کیتھرین مسلسل ماں کی شان میں قصیدے پڑھ رہی تھی۔ فہد کو اپنی ماں پر فخر تھا بلاشبہ وہ دنیا کی بہترین ماں تھیں مگر جب سے فہد نے اپنی شادی کی بات کی تھی اس وقت سے ماں کا چہرہ بجھا بجھا سا تھا۔ ماں کو اس نے اداس کر دیا تھا۔ کیتھرین کی محبت نے اس کی آنکھوں پر ایسی پٹی باندھی تھی کہ اسے ماں کی اداسی بھی نظر نہ آسکی۔ وہ دونوں اب اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ کیتھرین چاہ رہی تھی کہ اگلے ہفتے وہ دونوں کورٹ میرج کر لیں۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو جائے گا یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

بالآخر وہ دن بھی آگیا جب میری کا پاؤں بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔ اب اسے اکرم سے ملنے جانا تھا۔ اس روز وہ بہت دنوں بعد دل سے تیار ہوئی۔ مما اسے دیکھ کر بہت حیران ہوئیں۔ انہیں خوشی ہو رہی تھی کہ ان کی بیٹی اپنے پہلے والے رنگ میں پھر سے لوٹ آئی ہے۔ وہ ہنستی مسکراتی اپنی پسندیدہ شاہراہ شانزے لیزے پر آچکی تھی۔ وہی شامیں پھر سے مسکرا اٹھی تھیں۔ ہنستے مسکراتے لوگ اسے بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔ وہ اتنی خوش کیوں تھی وجہ وہ بھی نہیں جانتی تھی بس وہ خوش تھی۔ ایک حبشی کو ناچتے اور گاتے ہوئے اس نے بہت دلچسپی سے دیکھا۔ اس کی جھولی میں جانے کتنے ہی سکے اس نے ڈال دیے تھے۔ اب ایک پھولوں والی دکان سے میری نے خوب صورت پھولوں کا ایک گلدستہ خریدا۔ چلتے چلتے وہ اسی بک اسٹور کے بالکل سامنے آگئی جہاں جانے کا سوچ کر ہی وہ مسکرا اٹھتی تھی۔ وہ بک اسٹور کے اندر داخل ہوئی تو اکرم اپنے مخصوص کاؤنٹر پر بیٹھا کتابوں کا حساب کتاب کر رہا تھا۔

”ہیلو...... اکرم!“ اس نے مسکراتے ہوئے پھولوں کا گلدستہ اسے پیش کیا۔ اسے اکرم سے بات کرتے ہوئے کوئی دقت نہیں ہوتی تھی کیونکہ اس کی انگلش بھی بہت اچھی تھی اور اکرم بھی نہایت روانی سے انگلش بول اور سمجھ لیتا تھا۔ حالانکہ فرانسیسی اپنی زبان میں ہی بات کرنے کو ترجیح دیتے ہیں مگر یہاں کی اکثریت نوجوان نسل انگریزی بھی اسی روانی سے بول لیتی تھی۔

”السلام علیکم......!“ اکرم نے خوش دلی سے وہ گلدستہ اس کے ہاتھ سے لیا۔

”اکرم......! مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا۔ آپ کے دیے ہوئے پانی سے میرے پاؤں کو بہت آرام آیا۔“ میری نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

ابھی اکرم کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ کتابیں لینے کے لیے چند اور لوگ آگئے۔ اکرم نے اسے ہاتھ ہلا کر بتایا کہ بارہ سے ایک بجے تک اس کے لنچ آورز ہیں۔ وہ اس دوران میری سے تفصیل سے بات کرے گا۔ میری نے بھی سر ہلا کر جواب دیا اور اب وہ ایک بینچ پر بیٹھ کر اکرم کا انتظار کرنے لگی۔ بارہ بجے کے بعد اکرم مسکراتا ہوا اپنے کاؤنٹر سے اٹھ کر باہر آیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ دونوں اسٹور کے پاس ایک کیفے میں موجود تھے۔

”اکرم......! میرا تعلق عیسائیت کے کیتھولک فرقے سے ہے مگر کچھ عرصے سے اپنے مذہب سے متعلق میرے ذہن میں بہت عجیب سے سوالات اٹھ رہے ہیں۔ مجھے عیسائیت میں خدا کے تصور پر بہت حیرت ہے۔ حضرت عیسیٰؑ خدا کے بیٹے کیسے ہو سکتے ہیں، انجیل مقدس کے نسخے آپس میں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ اگر یہ خدائے واحد کا کلام ہے تو اس میں اتنا تضاد کیوں ہے...... بہت سی باتیں ایسی ہیں جنہیں پڑھ کر سوچ کر میرا دماغ پھٹنے لگتا ہے۔ میرے ان سوالوں کے جوابات کسی کے پاس نہیں ہیں۔ فادر جوزف بھی مجھے مطمئن نہیں کر سکے۔ تم ملے تو یوں لگا کہ تم مجھے ان تمام ذہنی الجھنوں سے نکال لوگے۔“ میری نے اپنے دل کی ساری باتیں اکرم سے کہہ ڈالیں۔ اب وہ منتظر تھی کہ وہ اس کے جواب میں کیا کہتا ہے۔

”میری! میں مسلمان ہوں اور میرا مذہب اسلام ہے جو خدائے واحد کے تصور پر یقین رکھتا ہے۔ تمہاری باتیں سن کر مجھے یقین ہو چلا ہے کہ تم عنقریب دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاؤ گی۔ تمہارے تمام سوالوں کے جوابات ہماری مقدس کتاب قرآن مجید میں موجود ہیں۔ میں تمہیں نہ صرف قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ دوں گا بلکہ کچھ اور کتابیں بھی دوں گا جنہیں پڑھ کر تمہارے ذہن میں موجود الجھنیں دور ہو جائیں گی۔“ اکرم بولا جا رہا تھا اور وہ سنتی جا رہی تھی پہلی بار اسے محسوس ہوا کہ کسی کا اندازِ گفتگو اتنا دلکش بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے میری کو اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں جن سے وہ پہلے آگاہ نہیں تھی اسے یہ سب جان کر بہت حیرت ہوئی وہ تو آج تک مسلمانوں کو ظالم، سخت گیر، ہوس پرست اور نہ جانے کیا، کیا...... سمجھتی آئی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ دنیا میں جتنی بھی برائیاں ہیں وہ سب مسلمانوں کی وجہ سے ہیں مگر اب اسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ یہ سب میڈیا کی پھیلائی ہوئی من گھڑت باتیں تھیں حقیقت میں مسلمان کیا ہیں، یہ اب اسے اکرم کی زبانی پتا چل رہا تھا۔ لنچ آور کب ختم ہوا اسے پتا ہی نہیں چلا۔ اب وہ دونوں کیفے سے باہر آچکے تھے اکرم اسے لے کر دوبارہ بک اسٹور میں آگیا۔ اس نے میری کو قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ اور کچھ کتابیں پڑھنے کو دیں۔ میری نے یہ سب کتابیں مسکراتے ہوئے اکرم سے لے لیں۔ اب اسے یہ کتابیں پڑھنا تھیں اور اسلام کے متعلق بہت کچھ جاننا تھا۔

☆☆☆

”ماں! کیتھرین اور میں اس سنڈے کو کورٹ میں جا کر شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے میرا پاسپورٹ بھی بنوا دیا ہے چند ہی روز میں میرا ویزا لگ کر آجائے گا اور پھر ہم ہمیشہ کے لیے فرانس چلے جائیں گے جہاں ایک بہت شاندار مستقبل میرا منتظر ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں، آپ اِدھر اکیلی کیسے رہیں گی؟“ فہد نے سکینہ کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

سکینہ نے اپنے ذہن میں گنتی کی تو سنڈے آنے میں صرف دو دن باقی تھے۔ دو دن بعد ان کے فہد کی زندگی میں ایک کیتھولک عیسائی لڑکی داخل ہو جائے گی۔ پتا نہیں انسان کا ماضی اس کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتا۔ انہوں نے عجیب نظروں سے فہد کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں دنیا سے محبت کے رنگ بھرتے جا رہے تھے۔

”میں رہ لوں گی بیٹا...... مجھے اِدھر ہی رہنا ہے، میرے جسم کو اِدھر کی مٹی ہی نصیب ہو گی۔“ سکینہ نے نم آنکھوں سے فہد کی طرف دیکھا، وہ رونا نہیں چاہتی تھیں مگر پھر بھی ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرتی جا رہی تھیں۔

”مجھے معاف کر دینا ماں۔“ اس نے سکینہ کی آنکھوں میں آئے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”ماں......! میں نے اپنے بچپن میں بڑی محرومیاں دیکھی ہیں، ابا تو بہت جلد ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ آپ کا اپنا کوئی رشتے دار اِدھر تھا نہیں اور ابا کے رشتے دار ہم سے زیادہ بات کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ دادا ابو میرے سب کزنز سے پیار کرتے تھے مگر مجھے تو انہوں نے ایک دفعہ بھی گلے نہیں لگایا۔ آپ نے گھر پر بچوں کو قرآن پڑھا کر میری پرورش کی۔ مجھے پڑھایا، لکھایا مگر زندگی میں بہت سی آسائشیں میں نے نہیں دیکھیں......“ فہد جانے کیا کچھ بول رہا تھا اور سکینہ حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں کہ یہ کن آسائشوں کی بات کر رہا ہے۔ بچپن سے لے کر آج تک تو انہوں نے اسے قناعت کا درس دیا تھا، توکل سکھایا تھا پھر یہ شکوؤں کی زبان کہاں سے سیکھ لی تھی اس نے۔

”ماں! میں پانچ وقت نماز باجماعت پڑھتا ہوں، روزانہ قرآن پاک کی تلاوت بھی کرتا ہوں۔ رمضان کے بھی پورے روزے رکھتا ہوں مگر ماں کیتھرین میرا مستقبل ہے۔ اس سے شادی کر کے مجھے فرانس کی شہریت مل جائے گی۔ ڈھیر سارا پیسہ کمانا ہے مجھے، میں اپنے مستقبل کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔“ فہد یہ کہہ کر اب کمرے سے باہر چلا گیا تھا اور سکینہ نے اب آنسوؤں کی قطار کو بہنے سے نہیں روکا۔ ان کے لیے رب کی طرف سے آنے والی یہ نئی آزمائش بہت کڑی تھی۔

☆☆☆

میری جیسے جیسے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ پڑھتی جا رہی تھی اس کی آنکھوں کے سامنے سے جیسے کوئی دھند چھٹتی جا رہی تھی۔ ہر ایک آیت گویا اسے تاریکی سے روشنی کی طرف لا رہی تھی۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ یہ تو کوئی الوہی ہستی کا ہی پیغام ہو سکتا ہے۔ خداوند کو تو وہ بھی مانتی تھی مگر فلسفۂ توحید سے وہ ناآشنا تھی۔ باقی دو کتابوں نے بھی اس کے ذہن میں موجود ساری گتھیوں کو سلجھا دیا تھا۔ جہاں وہ اٹکی

وہاں اس نے اکرم کے ذریعے عالم دین سے مل کر اپنی کنفیوژن دور کی...... اسے یہ سب سمجھنے میں کئی دن لگے۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اتنے شاندار مذہب کے بارے میں اس نے پہلے کیوں نہیں پڑھا۔ ان سب کو پڑھنے کے بعد حضرت محمد ﷺ اس کی پسندیدہ شخصیت بن گئے تھے کہ وہ اللہ کے افضل ترین نبی ہونے کے باوجود کس قدر سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اسے یہ پڑھ کر بھی حیرت ہوئی کہ یورپ عورت کی جس آزادی کی بات کرتا ہے اسلام نے تو عورت کو وہ حقوق چودہ سو سال پہلے ہی دے دیے تھے۔ اسے اپنے تمام سوالوں کے جوابات مل چکے تھے۔ اس نے یہ تمام کتابیں کتنی دفعہ پڑھ ڈالی تھیں اور اب ایمان کی روشنی اس کے اندر سرایت کرتی جا رہی تھی۔ اب وہ روزانہ تقریباً ایک گھنٹا اکرم سے اسلام سے متعلق مختلف موضوعات پر گفتگو کرتی تھی، اس کا حلیہ بھی اب بدل چکا تھا، وہ اب مکمل لباس پہنتی اور سر بھی ڈھک کر رکھتی۔ اس کے والدین اور ایڈم اس کی شخصیت میں ہونے والی تبدیلیوں کو دیکھ رہے تھے اور محسوس کر رہے تھے کہ اس تبدیلی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے مگر اصل وجہ سمجھنے سے قاصر تھے۔ میری نے اب عربی زبان بھی سیکھنا شروع کر دی تھی۔ اسے عیسائیت کو خیر باد کہنا تھا۔ ذہنی طور پر تو وہ کب کی مسلمان ہو چکی تھی مگر اب باقاعدہ طور پر اسلام قبول کرنے کے لیے پیرس کے اسلامک سینٹر میں موجود تھی۔ وہ لمحہ آ گیا تھا جس نے میری کی زندگی کا رخ مکمل طور پر بدل دیا تھا۔

☆☆☆

لمبا سا وائٹ فراک پہنے کیتھرین اس وقت فہد کے پہلو میں کھڑی تھی مختصر سی عدالتی کارروائی کے بعد اب وہ دونوں قانونی طور پر میاں، بیوی تھے۔ وہ اس وقت اتنی خوب صورت لگ رہی تھی کہ فہد ٹکٹکی باندھ کر اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اب وہ دونوں عدالت سے باہر تھے۔ فہد کا خیال تھا کہ اب وہ دونوں ماں کے پاس چلیں گے مگر کیتھرین نے چرچ جانے کی فرمائش کر دی۔ اگر وہ کسی اور دن یہ بات کرتی تو فہد کو بہت برا لگتا مگر اس روز فہد کو وہ اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ وہ اس کی کوئی بھی بات رد نہیں کر سکتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ دونوں چرچ میں موجود تھے۔ فادر مائیکل نے ان دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ میں دیے۔ انجیل کے کچھ ابواب پڑھائے...... کیتھرین نے ہاتھوں سے صلیب کا نشان بنایا۔ فہد کو یہ سب دیکھ کر بہت گھبراہٹ ہو رہی تھی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ جلد از جلد یہاں سے نکلیں۔ فادر کی دعائیں لینے کے بعد وہ دونوں اب چرچ سے باہر آ چکے تھے فہد نے باہر آتے ہی سکون کی سانس لی۔

”فہد میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، سر میں بہت درد ہے، میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔“ اس سے پہلے کہ فہد کیتھرین کو مسجد اور اس کے بعد ماں کے پاس چلنے کے لیے کہتا، کیتھرین نے گاڑی میں بیٹھتے ہی اپنی تھکن کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ جس کے باعث فہد اسے مزید اور کچھ کہہ ہی نہیں سکا۔ اب وہ دونوں ہوٹل جا رہے تھے جہاں پہلے ہی کیتھرین نے روم بک کروا رکھا تھا۔ فہد نے سکینہ کو فون کر دیا تھا۔

”میں نے کیتھرین سے کورٹ میرج کر لی ہے مگر اس کی طبیعت کی خرابی کے باعث ہم گھر آنے کے بجائے ڈائریکٹ ہوٹل جا رہے ہیں۔“ دوسری طرف سے سکینہ نے کیا جواب دیا وہ سن نہیں پایا اور لائن کٹ گئی۔ وہ رونا چاہتا تھا مگر کیتھی کے سامنے اپنی کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر کیتھرین نے اس کا بایاں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنا سر اس کے کندھے سے لگا رکھا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے کوئی فرانسیسی گیت گا رہی تھی مگر فہد کسی اور ہی دنیا میں تھا اس روز پہلی بار اس نے اپنی بے بسی محسوس کی تھی۔

ہوٹل میں ایک شاندار سا کمرا ان کا منتظر تھا۔ وہ اس ہوٹل میں دو دن رہے، کیتھی کی نرم زلفوں کی چھاؤں تلے یہ دن کیسے گزرے فہد کو پتا ہی نہیں چلا۔ اسے یوں گمان ہوتا تھا کہ وہ دنیاوی بہشت میں ہے۔

اس روز بھی وہ کیتھی کی گود میں سر رکھے لیٹا ہوا تھا جب کیتھی نے اسے یہ خوش خبری سنائی کہ اس کا ویزا لگ گیا ہے اور ان کی جلد ہی فلائٹ ہے۔ یہ سنتے ہی فہد کے دل کی عجیب حالت ہو گئی۔ اسے تو خوش ہونا چاہیے تھا مگر وہ خوش نہیں تھا۔ اب اسے کیتھی کو لے کر ماں کے پاس جانا تھا، وہ چاہتا تھا کہ اب کم از کم ایک دن تو ان دونوں کو ماں کے ساتھ گزارنا چاہیے تھا مگر کیتھی نے اسے کتنے ہی کام بتا دیے کہ ابھی ان دونوں کو ایمبسی جانا ہے اور بے شمار کام جن کو کرنا شاید ماں سے ملنے سے زیادہ ضروری تھا۔

☆☆☆

میری اب اسلامک سینٹر کے ہال میں مولانا صاحب کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اب اس نے چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ اپنے پورے جسم کو اچھی طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ اس نے مولانا صاحب کو بتایا کہ وہ باقاعدہ طور پر مسلمان ہونا چاہتی ہے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اکرم بھی اس کے ساتھ اسلامک سینٹر میں موجود تھا۔ مولانا صاحب نے کلمہ پڑھا۔ میری نے ان کے پیچھے، پیچھے وہی کلمہ دوبارہ پڑھا۔ اس کے بعد انہوں نے قرآن مجید کھولا اس میں سے کچھ آیات پڑھ کر میری کو سنائیں۔ وہ مسلمان ہو چکی تھی۔ خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جب اسے قبولِ اسلام کا باقاعدہ طور پر سرٹیفکیٹ دے دیا گیا تو اس کا اسلامی نام سکینہ رکھا گیا۔ اب وہ میری نہیں سکینہ تھی۔ اسے سب نے مبارک باد دی۔ خوشی سے بار بار اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ اب وہ اور اکرم اسلامک سینٹر سے باہر آ چکے تھے۔ ہلکی ہلکی بارش سے موسم مزید خوشگوار ہو گیا تھا۔ اسے لگا کہ یہ موسم بھی اس کے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اب اسے گھر جانا تھا۔ قبولِ اسلام کے بعد ابھی اسے بڑے مشکل مرحلے طے کرنا تھے۔

☆☆☆

فہد جانے سے پہلے اپنی ماں سے ملنے آیا تھا۔ کیتھی نہیں آ سکی تھی۔ شاید وہ آنا بھی نہیں چاہتی تھی اس

شہرِ کراچی کے نام

یہ کس بھوت کا سایہ ہے جو ٹلتا ہی نہیں
کیوں تیرے آنگن امن کا شجر پلتا ہی نہیں

روز امید کی کونپل سر اٹھائے کھڑی رہتی ہے
کسی سمت سے مگر تیرے عروج کا سورج نکلتا ہی نہیں

کیوں شب کی تاریکی دوام ہوئی جاتی ہے مسلسل
کیوں تیری دہلیز پر سکون کا دیا جلتا ہی نہیں

سرِ شام لوٹنے کے وعدے پر جو نکلتا ہے گھر سے
پھر یوں ہوتا ہے کہ وہ گھر پلٹتا ہی نہیں

خونِ ناحق ہے جابجا مگر اے شہر کے ناسور
تیرے اندر کیسا کافر دل ہے جو پگھلتا ہی نہیں

شاعرہ: نصرت جبیں ملک

لیے فہد نے اصرار بھی نہیں کیا تھا۔ وہ جس وقت اپنی ماں کے کمرے میں داخل ہوا وہ ظہر کی نماز ادا کر رہی تھیں۔ فہد جوتے اتار کر کمرے میں داخل ہوا تھا اور اب اپنی ماں کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ سکینہ اب دعا مانگ رہی تھیں اور دعا مانگتے وقت اُن کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ انہوں نے جیسے ہی دعا مکمل کی۔ فہد نے انہیں کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور بیڈ پر بٹھا دیا اور خود بھی تھوڑی سی جگہ بنا کر ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اس نے اس روز پھر ان کے پاؤں پکڑ لیے تھے۔ انہیں حیرت ہو رہی تھی کہ اب تو انہوں نے اس کی ساری باتیں مان لیں تھیں اب اور کیا کچھ منوانا تھا اس نے؟ یہ وہ نہیں جانتی تھیں۔

"ماں! آج شام کو میری فلائٹ ہے، میں کیتھی کے ساتھ پیرس جا رہا ہوں۔ آپ سے آخری بار ملنے اور معافی مانگنے آیا ہوں۔ آپ مجھے معاف کر دیں گی؟" یہ کہتے ہوئے فہد کے آنسو سکینہ کے پاؤں پر گرنے لگے۔ وہ شرمندہ تھا، اتنا شرمندہ تھا کہ سر اٹھا کر ماں کی آنکھوں میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"فہد بیٹا......!" سکینہ نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ "مائیں کبھی اپنے بچوں سے ناراض نہیں ہوتیں۔" انہوں نے یہ کہہ کر اس کا سر اپنے کندھوں سے لگا لیا...... وہ رو رہا تھا، اپنی ماں کے گلے لگ کر سارے آنسو بہا دینا چاہتا تھا۔

"فہد تم جہاں جا رہے ہو ناں...... برسوں پہلے میں اس جگہ کو چھوڑ آئی تھی...... مجھے اسی جگہ ایمان کی روشنی نصیب ہوئی تھی...... اب میں چاہتی ہوں کہ کیتھرین کو بھی وہیں سے ایمان کی روشنی ملے۔" انہوں نے فہد کو دھیرے سے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"ماں......! آپ کا فہد آپ سے وعدہ کرتا ہے کہ اب جب دوبارہ آؤں گا تو کیتھی آپ کے سامنے ایک مسلمان لڑکی کی حیثیت سے کھڑی ہوگی۔" فہد نے سکینہ کے ہاتھ پکڑ کر انہیں یقین دلاتے ہوئے کہا۔ وہ کھڑا ہو گیا تھا۔ اب وہ جانا چاہتا تھا اسے لگا کہ وہ اب مزید یہاں پر رکے گا تو پھر کبھی واپس نہیں جا سکے گا۔

"ماں! اب میں چلتا ہوں...... آپ مت اٹھیں، میں خود ہی چلا جاؤں گا۔" اتنا کہہ کر وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہ گھر سے باہر آچکا تھا۔ اب وہ کھلے آسمان کے نیچے کھڑے ہو کر کچھ دیر رونا چاہتا تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے لگ رہا تھا کہ وہ ماں سے آخری بار مل رہا ہے۔

☆☆☆

"میں مسلمان ہو گئی ہوں۔" میری نے بالآخر اپنے والدین کے سامنے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس وقت اس کے گھر میں ایڈم بھی موجود تھا اور وہ یہ چاہتی تھی کہ ایڈم کے سامنے یہ بات کرے تاکہ وہ بھی اس کے اسلام قبول کرنے کے متعلق جان جائے۔

تینوں نے اس کی طرف غصے سے دیکھا کچھ دنوں سے اس کی مشکوک حرکات سب کے علم میں تھیں اور وہ کچھ اسی قسم کے اعلان کی اس سے توقع کر رہے تھے۔

"اب تم ہم سے کیا چاہتی ہو؟" اس کی ممی نے اجنبی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں چاہتی ہوں کہ آپ لوگ میرے فیصلے کا احترام کریں اور خود بھی اسلام کا مطالعہ کریں۔"

"ہم تمہاری بات نہیں مان سکتے......" اس کے والد نے چیختے ہوئے کہا۔

"سمارتھا اسے کہو میری نظروں کے سامنے مت آیا کرے۔" انہوں نے اس کی ممی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اس کے والد بہت بری طرح چیخ رہے تھے۔ اس نے انہیں پہلے کبھی اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔

"میری......! تم اپنا فیصلہ واپس لے لو، میں تمہیں فادر جوزف کے پاس خود لے کر جاؤں گا وہ ان دنوں بائبل اور جدید سائنس کے اوپر کتاب بھی لکھ رہے ہیں۔ وہ تمہارے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں کے جوابات دے دیں گے۔" ایڈم اس کے قریب آ کر بولا۔

"میرا نام میری نہیں سکینہ ہے اور اب میں اپنے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹوں گی۔" یہ کہتے ہوئے وہ ایڈم سے اور دور ہو گئی۔ اب کی بار ایڈم بھی غصے میں آگیا۔ وہ اسے دھمکیاں دے رہا تھا کہ وہ اسے اس کے کیے کی سزا ضرور دے گا۔ وہ سب لوگ غصے سے چیخ رہے تھے، اس کی ماں رو رہی تھی۔ اس نے بے بسی سے ان سب کو روتے اور چیختے ہوئے دیکھا، اپنا بیگ اٹھایا اور اپنے گھر اور خاندان کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔ وہ ایک بار پھر اکرم سے مدد مانگنے کے لیے اس کے پاس آگئی تھی۔

☆☆☆

پی آئی اے کی فلائٹ پیرس کے وسیع و عریض ائر پورٹ پر لینڈ کر چکی تھی۔ فہد اور کیتھی اب ائر پورٹ سے باہر آ رہے تھے۔ پیرس کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی فہد کو ایک عجیب سی اپنائیت کا احساس ہوا تھا۔ اس نے چند گہری سانسیں لیں وہ اس خوشبو کو اپنے اندر اتار رہا تھا جو اسے اس جگہ سے محسوس ہو رہی تھی۔ اب وہ ائر پورٹ سے باہر آچکا تھے۔ کیتھی متلاشی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی اچانک تین افراد مسکراتے ہوئے ان کے سامنے آ گئے۔ ایک درمیانی عمر کا مرد تھا جب کہ ایک بوڑھا مرد اور اس کے ساتھ ایک بوڑھی خاتون تھی۔ ان تینوں کے ہاتھ میں پھولوں کے گلدستے تھے جو انہوں نے فہد اور کیتھی کو دیے، کیتھی ان تینوں سے مل رہی تھی۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ یہ جو درمیانی عمر کا مرد ہے یہ کیتھی کے فادر ایڈم جانسن ہے۔ جن سے اس کا غائبانہ تعارف تھا اور کیتھی کی زبان سے وہ کئی دفعہ ان کا تذکرہ سن چکا تھا۔ وہ بوڑھا اور بوڑھی دونوں فہد کو بہت عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ اس کے چہرے میں کسی کا چہرہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ وہ بوڑھی عورت فہد کو غور سے دیکھتی ہوئی اب اس کے بالکل سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ فہد نے دیکھا وہ رو رہی تھی۔ روتے روتے اس نے فہد کو گلے لگا لیا۔ اب وہ فہد کے ہاتھوں کو اور اس کے ماتھے کو چوم رہی تھی۔ وہ بوڑھا شخص بھی اب اس کے پاس آ گیا تھا۔ وہ دونوں رو رہے تھے اور فہد سخت گھبرا گیا تھا۔ اچانک کیتھی کے فادر نے ان دونوں کو فہد سے علیحدہ کیا اور خود اس کو گلے لگا لیا۔

"فہد! ینگ مین...... یہ تمہارے گرینڈ فادر اور گرینڈ مدر ہیں اور میں تمہاری ماں کا کزن ایڈم جانسن ہوں اور اس لحاظ سے کیتھی تمہاری کزن ہے۔" ایڈم جانسن نے اس کے ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ فہد کے لیے یہ سب انکشافات بہت حیران کن تھے، اسے سب سے زیادہ حیرت کیتھی پر ہوئی تھی کہ وہ سب کچھ جانتی تھی مگر اس نے فہد کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ اب وہ ان سب کے ساتھ اپنے گھر جا رہا تھا۔ وہ گھر جہاں اس کی ماں نے اسلام قبول کرنے سے پہلے کی زندگی گزاری تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اب اس کی زندگی اسے کہاں لے کر جائے گی۔

☆☆☆

سکینہ ایک بار پھر اسلامک سینٹر میں موجود تھی اور اس بار بھی وہ..... اکیلی نہیں تھی اس کے ساتھ اکرم تھا جس کے ساتھ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اسے نکاح کے مقدس بندھن میں باندھ دیا گیا تھا۔ اب مولانا صاحب ان دونوں کے حق میں دعا فرما رہے تھے۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس روز وہ بے سروسامانی کے عالم میں اکرم کے پاس ہی گئی تھی اسے لگا تھا کہ وہ اسے کچھ اچھا مشورہ دے گا۔ اکرم نے اس کی پوری کہانی سننے کے بعد اس سے نکاح کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ سکینہ نے اس کا پروپوزل قبول کرنے میں ایک لمحے کی دیر نہیں لگائی کیونکہ وہ بھی کسی اچھے انسان کے سہارے کی تلاش میں تھی۔ اکرم کے بارے میں وہ زیادہ نہیں جانتی تھی، اس کے لیے یہی حوالہ کافی تھا کہ وہ مسلمان ہے، اپنے کام میں مخلص ہے اور سکینہ کو اپنانا چاہتا ہے۔ میاں، بیوی کے بندھن میں بندھنے کے بعد اب وہ دونوں اسلامک سینٹر سے باہر آچکے تھے۔ سکینہ نے مسکرا کر اکرم کی طرف دیکھا۔ سانولی سی رنگت والا یہ دراز قد نوجوان اب اس کا اپنا بن چکا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ دونوں اکرم کے فلیٹ میں موجود تھے۔ اکرم کی خوشی

اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ پیرس کے بہت ہی سستے سے علاقے میں قائم یہ چھوٹا سا اپارٹمنٹ ہی اب سکینہ کی جنت تھا۔ پہلی بار اس نے اکرم کو غور سے دیکھا تھا جو انتہائی پُرکشش خدوخال کا مالک تھا اور ناقابلِ بیان حد تک مردانہ وجاہت رکھتا تھا۔ وہ سکینہ کے سامنے بیٹھا اسے اپنی محبت کا یقین دلا رہا تھا اور سکینہ کو اگر وہ نہ بھی یقین دلاتا تب بھی یقین آ جاتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جلتے محبت کے دیے، بہت روشن تھے۔ اس نے سکینہ کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا اور جواب میں سکینہ نے بھی اسے اپنی وفاؤں کا یقین دلایا تھا۔ ان دونوں کے درمیان صرف ایک چیز مشترک تھی اور وہ اسلام تھا اور وہی ان دونوں کو قریب لایا تھا۔ اکرم سے اس کی شادی تو ہوگئی تھی مگر چند ہی دنوں میں اسے احساس ہوگیا تھا کہ اکرم کے لیے یہ بہت مشکل فیصلہ تھا۔ اکرم نے اسے بتایا تھا کہ اس کے گھر والے اس کے خاندان میں ہی اس کی شادی کرنا چاہتے تھے اور اس مقصد کے لیے انہوں نے اس کے چچا کی بیٹی کو اپنی بہو بنانے کا سوچ رکھا تھا، وہ لوگ چاہتے تھے کہ پیرس جانے سے پہلے اس کی منگنی کر دیں مگر اکرم کا دل راضی نہیں تھا اس لیے منگنی نہیں ہوسکی۔ اب اکرم کی اچانک شادی کے فیصلے سے وہ سب بہت ناراض تھے۔ وہ روزانہ اپنے گھر والوں کو فون کرتا تھا مگر کوئی بھی اس سے بات نہیں کرتا تھا۔ سکینہ جانتی تھی کہ مشرق میں شادی بیاہ کے معاملات میں گھر والوں کی مرضی کتنی ضروری ہوتی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ آج نہیں تو کل اس کے گھر والے ضرور مان جائیں گے۔ بہت دفعہ اس نے اس چھ فٹ لمبے چوڑے انسان کو روتے ہوئے دیکھا تھا۔ سکینہ ہر نماز میں یہی دعا مانگا کرتی تھیں کہ اللہ ان کے لیے آسانیاں پیدا فرمائے، انہی دنوں وہ امید سے ہوگئی۔ اکرم اس خبر کو سن کر بہت خوش ہوا۔ وہ دونوں اب اکثر دریائے سین کے کنارے چہل قدمی کے لیے جایا کرتے تھے مگر سکینہ جانتی تھی کہ اکرم دل سے خوش نہیں ...... ایک دن اچانک اکرم کے پاس فون آیا کہ پاکستان میں اس کی ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ اسے بہت یاد کر رہی ہیں۔ اکرم نے اسی وقت سکینہ کو ساتھ لے کر پاکستان جانے کا فیصلہ کرلیا۔ اور یوں سکینہ، اکرم کے ساتھ پاکستان کے شہر لاہور آ گئی۔ جہاں اندرون شہر کی تنگ و تاریک گلیوں میں اکرم کا گھر تھا۔ ائرپورٹ سے سیدھے وہ لوگ اسپتال پہنچے جہاں اکرم کی والدہ داخل تھیں۔ ان کی حالت بہت نازک تھی۔ شاید وہ اکرم کے آنے کا ہی انتظار کر رہی تھیں اکرم کو دیکھ کر انہوں نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں۔

اکرم کے گھر میں گویا کہرام مچ گیا۔ اکرم خود بھی حد درجہ ملول تھا۔ سکینہ اس گھر کے ایک کونے میں بیٹھی سب دیکھ رہی تھی۔ بعد تدفین جب اکرم گھر میں آ کر خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ بیٹھا تھا تو اسے اچانک یاد آیا کہ وہ سکینہ کو تو بالکل ہی بھول گیا ہے۔ وہ تیزی سے اٹھا تو دیکھا خاندان کی دیگر خواتین کے ساتھ سکینہ بھی بیٹھی ہوئی ہے مگر کوئی اس سے بات نہیں کر رہا وہ بہت تھکی تھکی اور نڈھال سی لگ رہی تھی۔ ویسے بھی وہ لوگ بہت طویل سفر کر کے آئے تھے اور سکینہ کی حالت کے پیشِ نظر اس کے لیے آرام بہت ضروری تھا۔ اکرم نے اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور ایک کمرے میں جا کر لٹا دیا۔ وہ بہت زیادہ تھکی ہوئی تھی... اس لیے لیٹتے ہی اسے نیند آ گئی۔ ان دونوں کو یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا اس دوران سکینہ نے نہ صرف گھر کے کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا بلکہ اکرم کے خاندان کی دیگر خواتین کے ساتھ گھلنے ملنے کی کوشش بھی کی تھی مگر وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکی تھی کیونکہ ایک تو زبان کا فرق تھا دوسرے خاندان کی خواتین بھی اس سے بات کرنے سے ڈرتی تھیں شاید گھر کے مردوں نے انہیں منع کر رکھا تھا۔ اکرم کے والد اور اس کے بھائی اکرم پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ سکینہ کو چھوڑ کر اپنے چچا کی بیٹی سے شادی کرلے جسے بہو بنانے کی حسرت لیے ان کی والدہ اس دنیا سے چلی گئیں۔ اکرم نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا حالانکہ سکینہ اسے اجازت دے چکی تھی کہ اگر وہ ایسا کرے گا تو اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا مگر اکرم خود اپنی اور سکینہ کی محبت میں شراکت برداشت نہیں کر سکتا تھا اس لیے اس نے سکینہ کو بھی باور کروایا تھا کہ وہ آئندہ ایسی کوئی بات نہیں کرے گی۔

اکرم اپنے گھر والوں کا رویّہ سکینہ کے ساتھ دیکھ رہا تھا مگر خاموش تھا ایک دن اس نے بتایا اس نے اپنے اور سکینہ کے لیے ایک الگ گھر لے لیا ہے اور اب وہ مستقل طور پر پاکستان آ گئے ہیں۔ ان کے والد نے اسی وقت دھمکی دی تھی کہ اگر وہ یہ گھر چھوڑ کر جائیں گے تو پھر دوبارہ وہ ان کی شکل بھی نہیں دیکھیں گے۔ اکرم نے کسی کی پروا نہیں کی اور وہ سکینہ کے ساتھ اپنے نئے گھر میں شفٹ ہوگیا۔ اس نے ایک چھوٹی سی دکان لے لی تھی اور اسی طرح گھر کی گزر بسر ہونے لگی۔ انہی دنوں فہد کی پیدائش ہوئی۔ اکرم اور سکینہ کی جنت کا ایک اور مکین آ گیا تھا۔ ان دونوں کی خواہش تھی کہ فہد کو سچا اور پکا مسلمان بنایا جائے۔ فہد ابھی چار سال کا تھا کہ اکرم ایک روڈ ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں ان دونوں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا گیا۔ سکینہ کے لیے یہ صدمہ بہت بڑا تھا مگر اس نے یہ سب صبر کے ساتھ برداشت کیا۔ اس نے اکرم کے گھر والوں کو اس کی موت کی اطلاع دے دی تھی۔ سبھی نے اس کے جنازے میں شرکت کی تھی اور اب وہ فہد کو لے کر جانا چاہتے تھے۔ سکینہ کے پاس ایک واحد سہارا ابھی بیٹا ہی تو تھا وہ کیسے ان لوگوں کے حوالے کر دیتی۔ جب سکینہ کو اس سلسلے میں دھمکیاں دی جانے لگیں تو اس نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ عدالت نے.... سکینہ کے حق میں ہی فیصلہ دیا۔ اب وہ مطمئن تھی کہ فہد کو اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ اکرم کے جانے کے بعد سب سے بڑا مسئلہ گھر کی گزر بسر کا تھا۔ اکرم کی دکان اس نے کرائے پر چڑھا دی اور خود محلے کے بچوں کو قرآن پڑھانے لگی۔ وہ ایک اچھے اخلاق کی خاتون تھی اس لیے محلے والے بھی اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ محلے کی اکثر خواتین شام کو دینی مسائل سمجھنے کے لیے اس کے پاس آیا کرتی تھیں۔ سکینہ نے اس عرصے میں اردو زبان بھی سیکھ لی تھی۔ انگریزی تو اچھی تھی ہی اس لیے محلے کے بچوں کو وہ انگریزی بھی پڑھانے لگی۔ فہد اب اسکول جانے لگا تھا وہ بہت حساس بچہ تھا چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بہت محسوس کرتا تھا۔ سکینہ اس کی ذہنی تربیت بھی بہت اچھی طرح کر رہی تھی۔ وقت پر لگا کر اڑتا رہا اور وہ دن بھی آ گیا۔ جب فہد نے بزنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز کرلیا۔ ماسٹرز کرنے کے ساتھ ہی اسے ایک بہت اچھی کمپنی میں جاب بھی مل گئی۔ دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ سکینہ نے فہد کی دینی تعلیم کا بھی خاص خیال رکھا یوں تو سکینہ مطمئن تھی مگر آنے والے کسی طوفان سے بے خبر تھی۔ اب وہ چاہ رہی تھی کہ فہد کی شادی کر دی جائے مگر فہد نے یہ کہہ کر اسے حیران کر دیا کہ وہ ایک کیتھولک عیسائی لڑکی کا شادی کے لیے انتخاب کر چکا ہے اس روز سکینہ کو شدت سے احساس ہوا کہ بچے کی تربیت میں ماں کے ساتھ ساتھ باپ کا شامل ہونا بھی کتنا اہم ہوتا ہے۔ فہد نے کیتھرین سے شادی کرلی تھی اور وہ ان کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے پیرس چلا گیا تھا۔ وہ بچہ جس کو اپنے پاس رکھنے کے لیے اس نے عدالت کا سہارا لیا تھا آج اسے خود چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اسی جگہ انہی راستوں پر جنہیں وہ ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ آئی تھی۔ وہ اس سازش سے بے خبر تھی جو اس کے بیٹے کے حصول کے لیے کی جا رہی تھی۔ فہد کے جانے کے بعد اس کے سجدے بہت طویل ہونے لگے تھے۔ اس کی طبیعت بھی اکثر خراب رہنے لگی تھی مگر اس نے اللہ سے کبھی شکوہ نہیں کیا تھا۔ اس نے رب کو جا لیا تھا کیا یہ سعادت کم تھی۔

☆☆☆

فہد کو پیرس آئے پورے چھ ماہ ہونے کو آئے تھے، اب وہ کافی حد تک یہاں پر سیٹ ہو چکا تھا۔ یہاں آ کر اسے اتنے رشتے ملے تھے کہ وہ کچھ عرصے تک تو یہاں سے جانے کا سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اسے ایڈم انکل

نے اپنی کمپنی میں شاندار مراعات کے ساتھ ایک بہت اچھی جاب دے دی تھی۔ وہ تو اسے اپنا پارٹنر بنانا چاہتے تھے مگر فہد نے خود ہی منع کر دیا تھا کیونکہ وہ ابھی اپنے طور پر کچھ کرنا چاہتا تھا۔ اب وہ صبح جاب پر جاتا تھا اور شام کو وہ اور کیتھی ایک ساتھ پیرس کی حسین شاموں میں گم ہو جاتے تھے۔ شروع شروع میں اسے ماں بہت یاد آتیں اور وہ ماں کو روزانہ فون بھی کرتا تھا مگر اب کام کی مصروفیات کے باعث اس نے فون کرنا کم کر دیا تھا۔ وہ ماں کو ساری حقیقت بتانا چاہتا تھا مگر ایڈم انکل نے اسے منع کر دیا تھا کہ وقت آنے پر وہ خود ہی انہیں بتا دیں گے۔ گرینڈ مدر اور گرینڈ فادر سے اس کی خوب دوستی ہو گئی تھی وہ اکثر ان دونوں سے اپنی ماں کی باتیں کیا کرتا تھا اسے حیرت ہوتی تھی کہ اسلام قبول کرنے سے پہلے ماں کتنی ماڈرن تھیں، وہ پارٹیاں اٹینڈ کرتی تھیں، ان کے دوست تھے...... یہ سب باتیں اس کے لیے خاصی حیران کن تھیں کیونکہ اس نے ماں کو بغیر پردے کے کبھی کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ ایک بات کا اسے یہاں رہتے ہوئے بہت اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ لوگ بہت سخت قسم کے کیتھولک عیسائی تھے۔ گھر میں بائبل روزانہ پڑھی جاتی تھی۔ چرچ جانا ان کے معمولات میں شامل تھا۔ اس کے نانا اور ایڈم انکل عیسائیوں کی بہت سی مشنری تنظیموں کے رکن بھی تھے۔ ان حالات میں فہد کے لیے بہت مشکل ہو جاتا تھا کہ وہ اپنے مذہبی ارکان پر باقاعدگی سے عمل کرے مگر وہ پھر بھی کوشش کرتا تھا کہ نماز کی پابندی کرے۔ کیتھی اسے زبردستی کئی دفعہ چرچ لے کر گئی تھی۔ ایڈم انکل اکثر جب بائبل پڑھتے تو اسے اپنے ساتھ بٹھا لیتے۔ گرینڈ فادر نے اسے عیسائیت کے متعلق کئی کتابیں پڑھنے کو دیں، وہ لوگ اپنے مذہب کی تبلیغ فہد کے سامنے بھرپور طریقے سے کر رہے تھے مگر فہد کو عیسائیت کے متعلق یہ ساری کتابیں جھوٹ کا پلندہ لگتیں۔ قرآن کی تعلیمات اس سے کہیں بہتر تھیں پھر ایک روز وہ سب ہو گیا جو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی اور فہد کروٹیں بدل رہا تھا مگر اسے نیند نہیں آ رہی تھی جبکہ کیتھی گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ فہد کا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ وہ اٹھا اس نے وضو کیا اور اپنے بیگ میں سے قرآن پاک کا نسخہ نکالا اور بہت دھیمی آواز میں تلاوت کرنے لگا۔ اس کی آواز میں ایک عجیب سا سوز تھا۔ اس کی ماں اکثر کہتی تھی کہ فہد تمہاری آواز بہت اچھی ہے تم تلاوت باقاعدہ طور پر سیکھو مگر فہد ہمیشہ کی طرح ماں کی یہ بات بھی نظر انداز کر دیا کرتا تھا۔ وہ تلاوت کرنے میں اس قدر محو تھا کہ اسے محسوس ہی نہیں ہوا کہ کیتھی اٹھ کر بیٹھ گئی ہے اور بہت غور سے اس کی تلاوت سن رہی ہے۔ تلاوت ختم کرنے کے بعد جب قرآن پاک بند کر کے اس نے نظریں اوپر اٹھائیں تو دیکھا کہ کیتھی کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ بہت حیران ہوا کہ ایک دم اسے کیا ہو گیا ہے۔ وہ رات شاید دل و ذہن بدلنے کی رات تھی اور اس رات کیتھی کا سب کچھ بدل گیا تھا۔ وہ کیتھی جو فہد کو پیرس محض اس مقصد کے لیے لائی تھی کہ اسے عیسائی کر کے اپنے فادر کی خواہش پوری کرے اور سکینہ آنٹی کو سزا دے مگر اب تو وہ خود اسلام کی طرف بڑھنے لگی تھی۔ اس نے اسلام کے متعلق بہت سی کتابیں پڑھنی شروع کر دیں۔ مختلف اسلامک اسکالرز کے لیکچرز سننے کے بعد اب وہ قبولیتِ اسلام کے متعلق سنجیدگی سے سوچنے لگی تھی۔ فہد بہت خوش تھا اور وہ جان گیا تھا کہ یہ صرف اور صرف اس کی ماں کی دعا ہے۔ بالآخر چار ماہ کے طویل مطالعے کے بعد کیتھی نے بھی اسلامک سینٹر جا کر اسلام قبول کر لیا۔ اس کا اسلامی نام عائشہ رکھا گیا۔ کیتھی بہت خوش تھی اسے لگتا تھا کہ یہ اس کی زندگی کا حسین ترین لمحہ ہے، اب وہ اور فہد دونوں پاکستان جا کر سکینہ سے ملنے کے لیے بے تاب تھے مگر اس سے پہلے عائشہ کو اپنے گھر والوں کو اپنے قبولیتِ اسلام کے بارے میں بتانا تھا۔ اسلام میں داخل ہونے کے بعد اب اسے کسی سے کوئی ڈر نہیں تھا کیونکہ اس نے اللہ پر بھروسا کر لیا تھا۔ جب اس نے اپنے گھر والوں کے سامنے مسلمان ہونے کا اقرار کیا تو گویا ایک طوفان آ گیا۔

سب فہد کو برا بھلا کہہ رہے تھے اسے گالیاں دے رہے تھے۔ فہد حیران رہ گیا کہ اس کے انتہائی نرم خو نانا، نانی کس بری طرح چیخ رہے ہیں۔ ایڈم انکل اسے نظر نہیں آ رہے تھے جبکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی وہ وہاں پر موجود تھے۔ وہ انہیں ڈھونڈتا ہوا...... ان کے کمرے میں گیا تو وہ کسی سے فون پر بات کر رہے تھے۔ جب فہد پہنچا تو وہ اپنی گفتگو ختم کر چکے تھے۔

☆☆☆

سکینہ بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر فارغ ہوئی تھیں کچھ بچوں کے والدین ابھی ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک ان کے فون کی بیل بجی۔ ان بچوں کے والدین سے معذرت کرتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں آئیں اور ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف جو کچھ کہا گیا وہ ان کے پیروں سے زمین نکالنے کے لیے کافی تھا۔

”ہیلو......! میری، میں ایڈم بول رہا ہوں، میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ برسوں پہلے میں نے تمہیں کہا تھا کہ میں تمہیں قبولِ اسلام کی سزا ضرور دوں گا تو اب سن لو تمہاری سزا کا عمل شروع ہو چکا ہے، تمہارا بیٹا فہد جس نے میری بیٹی کیتھی سے شادی کی تھی اور یہ شادی بھی ہمارے منصوبے کا حصہ تھی، ہم اسے عیسائی بنانا چاہتے تھے اور آج وہ دن آ ہی گیا جس کا میں نے برسوں انتظار کیا تھا۔ تمہارا بیٹا فہد عیسائی ہو گیا ہے، اس نے چرچ سے عیسائیت کا سرٹیفکیٹ بھی لے لیا ہے......“ ایڈم نے شاید اور بھی کچھ کہا تھا مگر سکینہ وہ سن نہیں پائیں۔ ان کو لگا کسی نے گرم گرم پگھلتا ہوا سیسہ ان کے کانوں میں ڈال دیا ہو۔ ریسیور ان کے ہاتھ سے گرا اور وہ چکرا کر گر پڑیں۔ ان کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔ انہیں اسپتال لے جایا گیا مگر وہ دو دن کومے میں رہنے کے بعد زندگی کی بازی ہار گئیں۔ ان کے بیٹے کو فون پر اطلاع کر دی گئی کہ اس کی ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

☆☆☆

فہد اور عائشہ کی ٹیکسی اب سکینہ کے گھر کے سامنے

آ کر رک گئی تھی۔ وہ دونوں بہت تیزی سے ٹیکسی سے باہر نکلے۔ گھر کے اندر بہت لوگ تھے اور داخلی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ فہد کا دل بہت بری طرح گھبرا رہا تھا۔ وہ سب سے پہلے اپنی ماں کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ گھر کے اندر داخل ہوا تو لوگ اسے دیکھ کر اسے گلے لگا کر تسلی اور دلاسا دینے لگے۔ اس نے غصے سے لوگوں کو پیچھے کیا اور وہ بہت جلدی سے ماں کے کمرے میں گیا۔ کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی جو منظر اس نے دیکھا وہ اتنا اذیت ناک تھا کہ اسے لگا اس کی ٹانگوں میں جان نہیں رہی وہ ابھی کھڑے کھڑے گر جائے گا۔ عائشہ یہ سب دیکھ کر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ پائی اور زمین پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ فہد کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح ماں کے قدموں کی طرف بیٹھ گیا۔ کفن میں لپٹی اس کی ماں آنکھیں موندے پڑی تھی، وہ کبھی ماں کے قدموں میں بیٹھتا، کبھی ماں کے کندھوں کے پاس جا کر کچھ کہنے لگتا۔ اس کی حالت پاگلوں جیسی ہو رہی تھی، وہ زور زور سے بول رہا تھا۔

”ماں، ماں، میں مسلمان ہوں۔“

”ماں، دیکھو میں مرتد نہیں ہوا۔“

”ماں! میں مسلمان ہوں...... ماں! میں مسلمان ہوں۔“ اس کے گریہ و بکا میں شدت آتی جا رہی تھی۔ عائشہ، فہد کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی مگر وہ کسی کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں سکینہ کی میت کو قبرستان لے جانے لگے تب وہ بہت تڑپا تھا۔ فہد نے اپنے ہاتھوں سے اپنی ماں کو لحد میں اتارا تھا۔ اس سانحے کو کئی روز گزر گئے مگر اسے قرار نہیں آ رہا تھا۔ عزیز و اقارب تو تھے نہیں، محلے والے اس کی دلجوئی کرنے میں لگے رہتے۔ فہد کے دل و دماغ میں ایک ہلچل سی مچی رہی، اسے عجیب سی جلن کا احساس ہر وقت رہنے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ پچھتاوے کی آگ ہے اور اب اسے اپنی ساری زندگی اسی آگ میں جلنا تھا۔



مکمل ناول

چشمِ غم آشنا

درِدانہ نوشین



لوٹس کی ڈرائیونگ سیٹ پر باوردی ڈرائیور کے بجائے رئیس زادہ منعم پیرزادہ بیٹھا تھا کیونکہ فرنٹ سیٹ پر رشناج بٹ تھی۔ یہ گوری چٹی ماڈل جیسے قدوقامت والی لڑکی جس نے سلیولیس ٹاپ اور جینز پہن رکھی تھی۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں حتیٰ کہ انگوٹھوں میں بھی قیمتی پتھروں کی انگوٹھیاں تھیں۔ نازک سے بازو پر بندھا انٹیک گولڈ کا بازو بند جس کی لڑیاں ہلکی ہلکی کھنکتی اور اپنی موجودگی کا خوب صورت

احساس دلاتی تھیں۔ رشناج کی گود میں اس کا قیمتی آئی پوڈ پڑا تھا اور وہ map دیکھ کر منعم کو گائڈ کرتی جاتی...... اس آفس کا راستہ جہاں اس نے شوقیہ جاب اپلائی کی تھی۔

ملتان کی زیرِ تعمیر سڑکوں اور ادھورے فلائی اوورز کے پھیلے ملبے اور لمبی ٹریفک پر منعم پیرزادہ کی کوفت عروج پر تھی۔

منعم پیرزادہ آٹھ سال ہیمبرگ (جرمنی) میں گزار کر آیا تھا۔ رشناج اس کے بابا کے دوست اور تایا کے بزنس شریک ہم پلہ امیر جمال بٹ کی بیٹی تھی۔ دونوں خاندان سونے چاندی کی زبان بولتے اور سمجھتے تھے۔ جمال بٹ ملتان کے نواح میں ملک پلانٹ لگوا رہے تھے۔ کچھ عرصہ ملتان میں قیام رکھنا تھا اور رشناج ایڈونچر کے اشتیاق میں آ گئی تھی۔ منعم پیرزادہ کا ننھیال ملتان کا تھا...... اور ننھیال کے جاگیردار خاندان میں جرمنی پلٹ ہینڈسم منعم کی خوب مانگ تھی۔ وہ ماموں کا لاڈلا مہمان رشناج کی وجہ سے بنا ہوا تھا۔

رشناج بٹ دفتر میں داخل ہوئی تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ چپراسی انتظار کرنے کا کہہ کر پلٹ گیا تھا۔ رشناج بڑی توجہ سے آفس کا معائنہ کرنے لگی۔ باقی سب کچھ تو حسبِ معمول تھا مگر میز پر رکھا فوٹو فریم عجیب سا تھا۔ یہ ایک بائیسکل کی فوٹو تھی۔ جسے فریم کر وا کے میز پر ایسے رخ رکھا گیا تھا کہ فریم میں موجود تصویر صاحب کو بھی دکھائی دیتی رہے...... بائیسکل کے ساتھ کوئی ہوتا تو کوئی وجہ سمجھ آتی مگر یہ صرف بائیسکل؟ ندیم رجب بیگ قابلِ مطالعہ شخصیت لگ رہے تھے۔ رشناج کی ذہانت بھری کرید بیدار ہو گئی تھی۔

ندیم رجب بیگ لگ بھگ چالیس بیالیس سالہ جوان، منظم، با اصول، معاملہ فہم، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سب سے بڑھ کر محنت پر یقین رکھنے والا اور محنت سے محبت کرنے والا انسان تھا۔ اپنی سیٹ پر آتے ہوئے رشناج پر نظر ڈالی اور ایک ہلکی ناگواری (اس کا حلیہ کو دیکھ کر جو طاری ہوئی تھی) سے بیٹھنے کا اشارہ کیا...... کلرک رشناج کی فائل اور متعلقہ چیزیں کی نشان دہی کر کے چلا گیا انہیں نئے پروجیکٹ کے لیے ایچ آر کی ضرورت تھی، انٹرویو کی مقررہ تاریخ سے الگ وہ خصوصی ریکوئسٹ پر آئی تھی۔ بلاشبہ وہ بلا کی ذہین تھی اور اس نے واضح کر دیا تھا کہ وہ نوکری معاشی مجبوری کے تحت نہیں کر رہی ...... وہ کچھ غیر معمولی کام کرنا چاہتی تھی۔ غیر معمولی کام کرنے کے جذبے کو غیر معمولی پزیرائی دینے کے باوجود ندیم رجب کو انگوٹھیوں بھرے یہ ہاتھ خاصے کھٹک رہے تھے۔ بالآخر مناسب لفظوں میں اس نے مناسب لباس اور اطوار کی اہمیت جتا ڈالی۔ تاہم اسے جوائن کر لیا گیا تھا یعنی کسی بہتر کام کے لیے اسٹاک کر لیا گیا۔

آفس سے باہر نکلتے ہی رشناج نے منعم پیرزادہ کو فون ملایا اور خوشخبری دی۔

''خاصا کوئی حُسن پرست باس ہے۔'' منعم نے ایک دم سوچا۔ ''اس وقت کہاں ہو؟'' وہ فوراً پوچھنے لگا۔

''آفس کے سائے میں کھڑی ہوں۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''کھڑی ہو......؟ میڈ حسینہ جاؤ...... کہیں اندر جا کر بیٹھو میں گاڑی بھجواتا ہوں۔''

''بھجواتا نہیں، خود آؤ۔''

''کم آن رشناج......!''

''آج کسی ریڑھے سے گنّے کا جوس پئیں گے تھرل کریں گے۔''

''یہ شہر اس تھرل کے قابل نہیں، گنے کا تازہ جوس تمہیں ماموں کی جاگیر پہ جتنا چاہو پلوا دوں...... باہر مجھے گرمی لگتی ہے، ڈرائیور بھیج رہا ہوں۔'' اس کے خالص مردانہ شاہی جملوں سے تلملا کر رشناج نے موبائل آف کر دیا اور منہ پھلا کر شیڈ

کے نیچے جا ٹھہری۔ لوگ اسے رک کر اور مڑ کر دیکھتے رہے۔ گاڑی آتے ہی اس نے ڈرائیور کو حکم دیا۔

''خان...... مجھے واپڈا ٹاؤن والے گھر اتار دیں۔''

''پیرزادہ صاحب کہہ رہے تھے......'' مگر اس نے بات کاٹ کر کہا۔

''میں جو کہہ رہی ہوں آپ وہی کریں۔''

''جی جناب!''

جمال بٹ کی رہائش کا سرسبز و شاداب استقبالیہ گرمی کا تاثر کم کر دیتا تھا۔ لان کے پودے صبح شام تازہ اور دُھلے ہوئے ہوتے تھے۔ مالی مستقل ان کی دیکھ بھال پر مامور رہتے تھے۔ رشناج ڈرائیووے پر چل رہی تھی کہ بیگ میں پڑے موبائل پر منعم پیرزادہ کی مخصوص بیل بجنے لگی۔ یہ سلسلہ رک رک کر چلتا رہا یہاں تک کہ وہ اپنے بیڈ روم میں پہنچ گئی جہاں کوئی ہو نہ ہو اے سی چلتا رہتا تھا اور کمرا ٹھنڈا یخ ہوتا۔ بیگ بیڈ پر ڈال کر کال ریسیو کی ...... وہ چھوٹتے ہی بولا۔

''خان نے مجھے بتا دیا ہے...... ضدی ہو میں جانتا ہوں۔''

''تم نے کیا سوچ کر مجھے مامے کی حویلی میں بلایا تھا۔ میں اس طرح کے اجنبی ماحول میں...... بے مقصد آنے والی تھی؟'' اس کا لہجہ جون کی دھوپ کی تیزی کا سا تھا۔ منعم ہنس دیا۔

''لیونارڈو نے غصے والی مونالیزا کا روپ نہیں دیکھا تھا، ہم نے وہ بھی دیکھا ہے۔''

مگر جلد ہی اس کا عارضی غصہ تحلیل ہو گیا اور رات کو ڈنر پر ملنے کا طے پایا۔ رشناج بٹ نے اپنے بور معمولات سے نجات پانے کے لیے جاب کا ایڈونچر اپنایا تھا۔ دن کا بڑا حصہ سوئے رہنے، رات کے پُرتکلف ڈنرز جن میں نہ، نہ کرتے بھی کچھ نہ کچھ کھا لیا جاتا تھا۔ اس کی اسمارٹنس پر سرخ بتی جلنے لگی تھی۔ جم کی انسٹرکٹر نے بھی دن میں ایکٹو رہنے کی ہدایت کی۔

دراصل ہمارا معاشرہ واضح طور پر دو طبقوں میں تقسیم ہے ان دو کے درمیان ایک تیسرا طبقہ ہے جو ہوتا دوسرا طبقہ ہے بنتا پہلا ہے۔ ہوتا غریب، تنگ دست ہے ظاہر خوشحالی کرتا ہے۔ ان کی ایک آنکھ عُسرت کی مصائب زدہ پُرنم ہوتی ہے تو دوسری خود کو ان بھوکے ننگوں کے روایتی مناظر سے الگ رکھنا چاہتی ہے۔ غریب کی زندگی کے مدارج لالچ، حسد، نفرت، احساسِ کمتری، خوشامد، خود ترسی اور خود استہزائی پر مشتمل ہیں۔ امیر کی زندگی فخر، تکبر، نفرت، احساسِ برتری، خودستائشی کے زینے طے کرتی ہے۔ رشناج بٹ کے ہاں دادا، پڑدادا کے دور سے لکشمی کا راج تھا۔ منعم پیرزادہ بھی ٹکر کا رئیس تھا۔ غربا کے ساتھ ان کی ذہنی اپروچ مشترکہ تھی۔

ندیم رجب بیگ کے منہ سے جب پہلی بار چپراسی سے پانی لیتے ہوئے ''جزاک اللہ'' کا لفظ سنا تو رشناج نے سوچا ملازمین سر چڑھا رکھے ہوں گے مگر بعد کے چند دنوں نے ثابت کر دیا کہ سارا عملہ رجب صاحب سے ڈرتا بھی تھا اور عزت بھی کرتا تھا۔ وہ کام کروانا جانتے تھے اور کام کا حصہ بنتا بھی...... لیکن بائیسکل والا فریم......؟ دوسری بار اس نے منعم سے یہی ذکر کیا تو وہ ہنس کر بولا۔

''اس کا یہی مقصد ہے...... جو تم کر رہی ہو۔''

''یعنی......؟''

''curiousity''

''وہ کیوں......؟''

''آجاتے بے جا ئیسکل تے......'' وہ گنگنایا اس کا چہرہ سرخی سے چمکتا تھا۔

''لیکن میں تو پوچھوں گی۔''

''کہیں دونکیا کی نوکری سے نکال نہ دی جاؤ۔''

''دونکیا کی نوکری میری فکر نہیں ہے۔'' وہ اسی

طرح ہنستے، گپ مارتے، کم کھاتے، زیادہ پلیٹوں میں چھوڑ جاتے۔ بڑا نوٹ بقایا لیے بغیر ڈال جاتے۔ پارکنگ میں کھڑی گاڑی کو کپڑا مارتے چھوٹے کو منعم نے کرختگی سے ڈانٹا۔ ہاکر کو دھکا دے کر ہٹایا اور تفاخر سے گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔

رشناج بٹ اور ایچ آر توقیر کوریا ڈیلیگیشن سے میٹنگ کے پوائنٹس لینے اس کے آفس میں تھے۔ فارغ ہو کے توقیر تو لیپ ٹاپ اٹھا کر چلا گیا مگر رشناج اپنی سیٹ پر بیٹھی رہی۔

''ایکسکیوزمی سر...... کیا میں ایک بات پوچھ سکتی ہوں؟'' ندیم رجب کی سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا۔

''کام سے متعلق ہے تو ضرور پوچھیے۔'' ندیم رجب لڑکیوں کے شخصی امپریشن سے لاتعلق ہوتا تھا۔

''کام سے تو نہیں...... مگر آفس سے ریلیٹڈ ضرور ہے۔'' رشناج کا اعتماد کبھی کم نہیں ہوتا تھا اور پھر اس نے جلدی سے سوال کر ہی ڈالا۔

''آپ نے یہ بائیسکل کی فوٹو یہاں رکھی ہے...... حالانکہ آپ کی پروڈکشن کا تعلق بائیسکل سے نہیں ہے؟'' پل بھر میں صاحب کے چہرے کی سنجیدگی کرختگی میں بدلی، رشناج نے سوچا لو چھٹی ہوگئی آج...... مگر دوسرے ہی لمحے وہ سپاٹ ہوگئے۔

''obviously کوئی اہمیت تو ہے......''

یقیناً اس ادھورے جملے کا اگلا حصہ یہی بنتا تھا کہ یہ تمہارا مسئلہ نہیں اور رشناج نے معصومیت سے کہا۔

''لیکن میرا اس سے کوئی concern نہیں ہونا چاہیے؟'' ندیم رجب کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ کی لکیر کھنچی۔

''you are very intelligent''

اب اسے اٹھنا ہی تھا۔

رشناج نے ایچ آر توقیر سے یہی ذکر اٹھایا۔ وہ کہنے لگا۔ ''سر رجب ایک سیلف میڈ انسان ہیں، لائف کو انہوں نے زیرو سے اسٹارٹ کیا تھا اور اب اتنے فگرز ہیں کہ شمار نہیں، ہوسکتا ہے اس کا کچھ ان کی اسٹارٹنگ لائف سے تعلق ہو۔''

''زیرو سے اسٹارٹ؟ یہ فوڈ فیکٹریز، ماڈل فروٹ فارم، باغات، ماڈل ڈیری، ماڈل پولٹریز، ملک پروڈکشن پلانٹ، ہوٹلز، موٹلز...... سیلف میڈ؟ عمر کتنی ہوگی بیگ صاحب کی؟'' رشناج کی حیرت چھیکتی چلی گئی پھر ایک دم اس کے ذہن نے پلٹا کھایا۔ ''کیوں ناں ندیم رجب بیگ کے پروجیکٹ پہ کام کیا جائے۔'' جب منعم پیرزادہ نے اس سے یہ سنا تو بھنا گیا۔

''تم خود ایک پروجیکٹ ہو جس پر تھیسس تیار ہوسکتا ہے۔'' مگر وہ مسلسل ایسے مسکراتی رہی جیسے نادان کو کیا سمجھانا۔

''مائی فیری...... یہ ہماری کلاس کے لوگ نہیں ہیں۔ تمہیں suit نہیں کرتا یوں عام سے لوگوں سے امپریس ہوجانا۔'' منعم اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سمجھانے لگا۔

''پہلی بات...... وہ عام لوگ نہیں ہے جو ہم نے نسلوں سے وراثتوں میں پایا ہے وہ اس نے چالیس سال تک بنالیا ہے...... دوسری بات...... ہم دوست ہیں سو نام...... سو فیوڈل لارڈ والی شوہرانہ حاکمیت نہ اپناؤ یار......'' منعم پیرزادہ آکسفورڈ سے پڑھ کر آیا تھا تو کیا ہوا اس کے دودھ اور خون کے اثرات ختم تو نہیں ہوگئے تھے۔ یہی سوچ، اس کے بڑوں نے ٹھیک کہا تھا منگنی، شادی کرلو، اس طرح تو پھر اس طرح ہی رہنا ہوگا۔ رشناج کا مسئلہ منعم پیرزادہ کی منظوری نہ تھی بلکہ بیگ صاحب کی آمادگی تھی اور وہ ہمہ وقت موقع کی تلاش میں تھی۔

☆☆☆

موقع کچھ یوں ملا کہ فارن ڈیلیگیشن کے ساتھ ندیم رجب صاحب، توقیر عباس اور رشناج

ٹ کو اگلے پلانٹ کی سائٹ فیلڈ میں ڈسکس کرنا تھی۔ یہاں گفتگو کے دوران رجب صاحب نے اپنے آبائی گاؤں میں لگائے گئے واٹر پروجیکٹ کی مشکلات کا دوبارہ ذکر کیا۔ واپسی پر جب سب ریلیکس موڈ میں تھے رشناج کو بات نکالنے کا موقع مل گیا۔ ندیم رجب بھی اس دن ذاتی کاوش کے اظہار کے موڈ میں تھے، کہنے لگے۔

''مس رشناج...... میں نے پریکٹیکل لائف کا آغاز 14 سال کی عمر میں مزدوری سے کیا...... زمانے کے سرد و گرم کو اپنے اوپر جھیلنا میں اتنی سی عمر میں جان گیا تھا......''

رشناج چونکی، توقیر کا چہرہ حیرت زدہ ہوگیا۔

''میں ذاتیات کی بات پسند نہیں کرتا...... کیونکہ میں سچ سننا اور سچ سنانا چاہتا ہوں۔ میرا تجربہ ہے کہ ہماری سوسائٹی میں سچ بولنا اور سننا آرام دہ نہیں ہوتا۔'' رشناج نے ہمت کا سرا پکڑتے ہوئے کہا۔

''آپ کی اس سچائی پسندی نے مجھے حوصلہ دیا ہے کہ میں بھی وہ سچ بول دوں جو جاب کے پہلے دن سے میرے دل میں ہے۔'' توقیر نے رشناج پر تنبیہی نگاہ ڈالی اور خود کو چند قدم الگ کرلیا۔ اب ندیم رجب اور رشناج برابر برابر چل رہے تھے۔

''کہیے...... مس رشناج۔'' رشناج نے جھجکتے ہوئے آغاز کیا مگر جلد ہی بھرپور اعتماد سے کہنے لگی۔

''سر...... آفس ٹیبل پر رکھے فریم نے میرا تجسس بیدار کیا...... پھر آپ کے سیلف میڈ اسٹیٹس کا پتا چلا...... آج آپ نے 14 سال کی عمر سے مزدوری کی بات کی...... اس سائیکل کا آپ کی زندگی سے ضرور کوئی اہم تعلق ہے...... میری خالہ کی پروڈکشن کمپنی ہے آج کل کئی چینلز پر ان کے پروگرام چل رہے ہیں۔ آپ نے غالباً دیکھا ہو۔ ''سیلف میڈ ہستیاں'' مشہور چینل سے چلتا ہے۔ خالہ مسز نوشیلہ اکرام کو ایسی شخصیات کی تلاش رہتی ہے۔ ایسے قابلِ تقلید انسان سامنے آنے چاہئیں...... سر! اس سے نہ صرف دوسرے لوگوں کی پوشیدہ صلاحیتیں مہمیز پاتی ہیں بلکہ سچ بولنے کی پروموشن ہوتی ہے یہ ایک پوزیٹو پلیٹ فارم ہے...... پلیز آپ مجھے مایوس نہیں کیجیے گا۔''

''اچھا......'' وہ چلتے چلتے اتنا ہی بولے......

رشناج چائے کے وقفے میں بھی اس ٹاپک پر اصرار کرتی رہی...... ندیم رجب بیگ کی خاموشی بھی حوصلہ افزا تھی ورنہ وہ ڈپٹ چکے ہوتے۔

قدرت کی فیاضی یہ ہوئی کہ منعم پیرزادہ کو انہی دنوں والد کے کاروبار کے سلسلے میں فرانس جانا پڑ گیا۔ یہ ٹور تقریباً دو ماہ کا تھا۔ منعم، رشناج کی دوری اس طویل عرصے کے لیے برداشت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یوں بھی اسے ملتان پسند تھا نہ رشناج کا یہاں جاب کرنا۔ لگاؤ تو رشناج کو بھی یہاں سے نہیں تھا مگر وہ ہمیشہ سے ایڈونچرس رہی تھی۔ وہ اپنا پروجیکٹ چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی اور شادی تو فی الحال بالکل نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ہاں ہر کنواری لڑکی کی طرح شادی اس کا بھی تخیلاتی رومان تھا مگر اپنے سے دو بڑی بہنوں کی بیس، اکیس سال کی عمر میں شادی ہوجانے کے بعد اس نے انہیں محدود زندگی گزارتے ہی دیکھا۔ دونوں رئیس ترین گھرانوں کی بہوئیں تھیں۔ دونوں عیش کر رہی تھیں مگر رشناج کو نظم و ضبط سے کوفت ہوتی۔ اس کی تو صبح کہاں تو شام کہاں ہوتی۔ وہ صبح لحاف میں دبکی ست پڑی ہوتی تو شام کو مری کی گلیات میں پھرتی نظر آتی۔ اسے کچھ کرنا ہوتا تو کر گزرنا تھا مگر منعم پیرزادہ مسلسل اصرار کر رہا تھا۔

''ڈئیر وہاں کوئی ایڈمیشن لے لینا...... ایسا کوئی پروجیکٹ سرچ کرلینا...... مگر یار...... اس dust سے نکلو یار......''

''بس ہنی...... یہ کام پورا کرلوں، اب تو نوشیلہ اکرام بھی شامل ہوگئی ہیں۔''

''اچھا کتنا ٹائم لوگی۔ آٹھ دس دن میں دفع کرو۔''

"اوکے جانو...... I will try کہ جلد ہو......اب بیگ صاحب پر بھی تو ڈیپینڈ کرتا ہے۔"

"بیگ صاحب......" وہ کچھ زیرِ لب بڑبڑا کر بولا۔ "اپنی حفاظت کرنا، ایسے میسنے صاحب کسی وقت بھی چوغہ اتار پھینکتے ہیں۔" رشناج ہنس دی۔ منعم... پیرزادہ چلا گیا تھا۔

ندیم رجب بیگ صاحب نے آمادگی کا اظہار تو کر دیا تھا مگر دفتر کے اوقاتِ کار میں وہ مصروف ہوتے۔ کہیں باہر ملنا بھی فی الحال طرفین کو ناگوار لگ رہا تھا۔ رشناج کی رہائش گاہ کو ترجیح دی گئی۔ نوشیلہ اکرام نے ٹیکنیکل مددگار بھیج دیا تھا مگر پہلی ملاقات کے بعد اس کی ضرورت نہ رہی۔

بیگ صاحب اپنی مصروفیات سے فارغ ہو کر نو بجے شب بٹ ہاؤس پہنچے۔ سرسبز لان کی ہواؤں نے استقبال کیا۔ باوردی شوفر نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ ندیم رجب بے شکن عمدہ کُرتہ شلوار میں ملبوس تھے۔ کوٹ سوٹ والا دفتری تاثر نہ تھا۔ رشناج نے لان میں ہی خوش آمدید کہا اور ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ رسمی علیک سلیک ہوئی...... ملازم موسمِ گرما کے کمیاب کنو کا جوس رکھ چلا گیا۔ رشناج نے مسکرا کر گفتگو کا آغاز کیا۔

"سر میں اس ڈائری میں نوٹس لے سکتی ہوں۔ مگر الحمدللہ میرا حافظہ بھی تسلی بخش ہے۔ کیمرا مین صرف ضروری کٹس لے گا...... آپ چاہیں تو ٹیلی کاسٹ ہوتے ہوئے اصلی نام hidden رکھے جائیں ورنہ اصلی نام، شہر اور علاقے بھی لیے جا سکتے ہیں۔"

"درست۔" ندیم رجب نے گلاس رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے اپنے بچپن میں لے چلیے۔ اب میں صرف ایک خاموش سامع ہوں۔" رشناج نے آنکھیں موندتے ہوئے کہا۔ سیدھے سنہرے بالوں والی امیر لڑکی...... ندیم رجب نے اس پر ایک نظر ڈال کر شروعات کی۔

"ندیم رجب ضلع خوشاب کے بہت ہی پسماندہ علاقہ چکی شمالی کے ایک کچے پکے مکان میں رہنے والا سات سالہ یتیم لڑکا تھا۔ بیوہ ماں کے علاوہ چھوٹا بھائی فہیم کل کائنات تھی۔ آیئے چلتے ہیں اس کے بچپن میں...... ماں نے آج سادہ روٹی کے ساتھ گڑ کی بھیلی دی تو ندیم کا مزاج برہم ہو گیا، بے شک وہ حالات سے سمجھوتا کرنے والا صابر بچہ تھا۔ لیکن جب بھی اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا تو آنسو بہانے کے بعد کسی کونے میں بیٹھ کر اس مشکل کا حل سوچنے لگتا۔ اس کے ننھے سے دماغ میں امید کی مشعل روشن ہو جاتی اور وہ اسلامیات کے استاد کا کہا ہوا فقرہ بار بار دُہرانے لگتا۔ "ہر مشکل کے بعد آسانی ہے۔" اس کے اندر یہ یقین میخ کی طرح گڑا ہوا تھا کہ ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے صرف اسے ڈھونڈنا پڑتا ہے، ڈھونڈتا وہی ہے جو اس کا بوجھ اٹھاتا ہے۔ اس نے اپنی مٹی کی گلک توڑ کر پیسے نکالے۔ مرغی کی قیمت سے کم پیسے تھے۔ ایک ہفتے تک وہ سائیکلوں کی دکان پر ہوا بھرنے اور جھاڑو دینے کا کام کرتا رہا۔ ایک ہفتے کے بعد وہ ایک موٹی تازی مرغی خرید لایا۔ اس کی بغل میں دبی ہوئی بھوری مرغی کو دیکھ کر ماں چیل کی طرح جھپٹی۔

"بتا کس کی چوری کر لایا ہے؟"

"ماں چھوڑ دو مجھے، چوری کی نہیں ہے۔" ماں نے ہاتھ روک کر گھورا۔

"پھر کس نے دی؟" وہ مرغی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "پہلے اس کے پاؤں تو کھولو...... ہاں ایک پتلی رسی سے اسے چارپائی کے پائے سے باندھ دو ورنہ بھاگ جائے گی۔ میں سب کچھ بتاتا ہوں۔"

جب ماں نے سچ سنا تو ندیم کو سینے سے لگا کر رو پڑی۔ اس ایک مرغی میں رحم کرنے والے رب نے اتنی برکت ڈالی کہ چند مہینوں میں ماں کو مرغیوں کا ڈربا بنانا

پڑا...... اب وہ انڈے سے ناشتا کر سکتے تھے۔ ماں نہیں چاہتی تھی کہ ندیم گھر چلانے کی راہیں تلاش کرتا رہے اور محنت، مشقت میں پڑ کر تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ ماں نے اسے اسکول جانے پر آمادہ کر لیا۔

جس دن ندیم رجب ماں کی انگلی پکڑے چکی شمالی پرائمری اسکول کے ٹوٹے دروازے سے داخل ہوا۔ اس نے ایک لمبا چولا اور جانگیہ پہن رکھا تھا۔ ماں، بیٹوں کی شلواریں نہیں بناتی تھی کیونکہ زیادہ کپڑا لگتا تھا۔ ندیم جب ٹاٹ پر بیٹھتا تو بار بار اپنی قمیص کو نیچے کھینچ کر ٹانگیں چھپاتا تھا۔

اسکول میں کوئی رحم نہیں کرتا تھا...... وہ ہنستے تھے یا مار پٹائی کرتے تھے۔ اسکول نے اسے برداشت کا سبق دیا۔ وہ روز ماں کو کہنا چاہتا تھا کہ اسے شلوار لے کر دیں مگر گھر کی غربت، فاقہ زدگی اسے منہ کھولنے نہ دیتی...... لیکن اندر ہی اندر ماں کو احساس تھا۔ اس لیے اس نے بیٹے کے لیے کسی نہ کسی طرح ایک شلوار کا بندوبست کر ہی لیا۔

مرغیوں کے علاوہ ان کی آمدنی کا وسیلہ ایک بھینس تھی۔ جسے ماموں نے خرید کر دیا تھا۔ ندیم اسکول سے آ کر بھینس کی دیکھ بھال کرتا اسے نہلانے لے جاتا اور اس کا چارا لاتا...... وہ بیرونی کاموں کے علاوہ گھر کے کاموں میں بھی ماں کا ہاتھ بٹاتا۔ بہت بعد جب اس نے ابراہم لنکن کے لڑکپن کو پڑھا تھا کہ کیسے وہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتا تاکہ ان کی جھونپڑی کے گرد باڑ بن سکے اور وہ جنگلی جانوروں سے محفوظ ہو تو اسے یہ بالکل اپنا لڑکپن لگا۔

چند ماہ بعد ملتان سے ماموں آتے، ندیم اور فہیم کو ماموں دنیا کے امیر ترین انسان لگتے تھے۔ ماموں کی آمد، ماں کے چہرے پر مسکراہٹ اور خوشی لاتی تھی۔ ماموں ہمیشہ پھل، میوے، مٹھائی اور کپڑے، تحفے سے لدے ہوتے وہ ماں کو پیسے بھی دے جاتے تھے۔ ماموں چلے جاتے تو وہی ایک پکا کمرا، ایک چھپر، بھینس کا باڑا مرغیوں کا ڈربا، دستی پنکھے جھلتی ماں اور دن بھر کھیلتا فہیم...... ندیم رجب کی کل دنیا تھی جسے دیکھتے، برتتے، محسوس کرتے وہ پرائمری جماعتیں پاس کر کے چھٹی میں آ گیا۔ اب چکی شمالی کا پرائمری اسکول مڈل تک ہو چکا تھا۔ کالے رنگ کی ملیشیا کی وردی جس میں ہفتے بھر کا میل کچیل چھپا رہتا تھا اب ختم ہو گئی تھی مگر پیلا اسکول جس کے درختوں اور چھپروں کے نیچے بھی جماعتیں لگتیں۔ استاد ٹوٹی کرسی پر تختۂ سیاہ رکھے، ہاتھ میں چھڑی لے کر پڑھاتے، جب پیتل کے توے پر ہتھوڑے سے چھٹی کی گھنٹی بجتی تو ندیم کو بھی اپنے ہم جماعتوں کی طرح خواہ مخواہ کی خوشی ہوتی مگر اس دن خوشی کو شان دار جواز مل گیا جب گھر کے دروازے پر رکے تانگے سے ماموں کو چمکتی دمکتی نئی سائیکل اتارتے دیکھا جس پر خاکی کاغذ لپٹے ہوئے تھے۔ ندیم نے گلے سے بستہ اتار کر فہیم کو پکڑایا اور دوڑ کے ماموں کے گلے لگ گیا۔

"دیکھ پتر تمہاری سائیکل آئی ہے۔" ماموں اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر مسکراتے ہوئے بولے۔

"یہ میری سائیکل ہے......؟" وہ خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔

"ہاں بالکل تمہاری ہے...... فہیم کو بھی بٹھانا ......جھگڑا نہ کرنا......" ماموں صحن میں داخل ہوئے اور پیچھے ندیم سائیکل کھینچتا ہوا آیا اس کا بستہ سائیکل کے کیریئر میں دبا تھا۔ فہیم بھی ساتھ ساتھ تھا۔ دُھلے کپڑے تار پر ڈالتی ماں کے چہرے پر خوشیوں کی پٹاری کھل گئی۔

"بھائی جی آئے ہیں، سائیکل کہاں سے لائے؟" ماموں نے ماں کے سر پر ہاتھ رکھا اور وہ ہنستی تھیں اور کہتی تھیں۔ "آپ اپنے لاڈوں سے انہیں سر چڑھا لیں گے......" لگتا تھا در و دیوار بھی آج مسکراتے ہیں واقعی ماموں اس گھر کی خوشیوں

کے واحد منبع تھے۔

پھر ایک دم طلسم ہوش ربا کا ماحول ٹوٹ گیا۔ ندیم رجب بیگ کے سیکرٹری کا فون آگیا۔ اس نے انہیں کسی اہم میٹنگ کی یاد دہانی کرائی اور ندیم رجب بیگ وعدۂ فردا پر اٹھ گئے۔

رشناج کی ممی کا فون آیا تھا۔ کسی حالیہ شادی کو ڈسکس کر رہی تھیں بلکہ جی کھول کر اعتراضات کر رہی تھیں۔

''ڈھائی لاکھ کا سستا سا بیڈ تھا۔ گاڑی بھی دی تو پتا ہے کون سی؟''

''پلیز مہران نہ ہو......'' رشناج چلائی۔ ممی نے خوب ہنستے ہوئے کہا۔

''جی ہاں...... مہران۔''

''no way''

''بائی گاڈ ہنی...... جو چاہو قسم لو۔''

''اُف، اجمل چاچو کو کیا ہو گیا ہے۔'' رشناج کراہ اٹھی۔

''بس وہی کنجوسی جو شروع سے عادت تھی۔ ایک ہی تو بچی تھی، مال سمیٹ کر کیا کرے گا اجمل...... یہ منعم کہاں پیرس پہنچ گیا ہے۔ یہ پیرزادہ سارا گلوب گھومے گا کیا؟''

''گلوب......'' رشناج کی سُریلی ہنسی اُبھری۔ ''آپ کے محاورے بھی بس۔''

''تو کیا وہاں ملتان پڑی ہے۔''

''میں ڈاکومنٹری پر کام کر رہی ہوں، بتایا تھا ناں۔''

''ایک تو شیلہ دیوانی تھی دوسری تو ہو گئی...... مجھے تیری یہ پروجیکٹ کی باتیں بور کرتی ہیں...... آج مسز جے داؤد پرل کلب میں ڈنر دے رہی ہیں۔ بتا میں کیا پہنوں...... لو بھلا۔ تجھ سے کیا پوچھنا۔''

''تھنک پنک سی ساڑی لے آؤ ممی...... نیو پہنو۔''

''لے تو آؤں مگر جیولری میچ کا پرابلم ہو جائے گا، اب دیکھو کوئی تھکن سی تھکن ہے شاپنگ، میچنگ...... تیاری، پھر ڈنر۔'' ممی نے لمبی سی جمائی لے کر فون آف کر دیا۔

کچھ ہی دنوں میں اپنی جاب رشناج کو...... بے مقصد لگنے لگی۔ دن کو جلد جاگنے اور فضول مصروف رہنے کا ولولہ اب دوسری طرف منتقل ہو رہا تھا۔ اصل شوق تو کچھ کر سکنے کی طلب تھی اور وہ فلمی اسکیچ میں بہتر پورا ہو رہا تھا۔ ندیم رجب بھی غالباً ایسا ہی چاہتے تھے۔ اپنے ماتحت کے ساتھ دُہرا تعلق قائم رکھنا ان کے بااصول مزاج سے لگا نہ کھاتا تھا۔

ڈاکومنٹری کے لیے اگلی میٹنگ بھی بٹ ہاؤس پر ہوئی۔ ندیم رجب کی دھیمی گمبھیر آواز ابھرتی تو ایک خاموش اجالا در و دیوار کو سمیٹ لیتا۔

''ماں اب ندیم کے حوالے سے زیادہ سنجیدہ اور متفکر رہنے لگی تھی۔ ندیم نے آٹھویں کا امتحان اپنی جماعت میں دوسری پوزیشن لے کر پاس کر لیا تھا اور چھوٹا بھائی فہیم ششم درجے میں آگیا تھا۔ ماں کو یہ تو یقین ہو گیا تھا کہ ندیم محنت کرنے والا بچہ ہے۔ اسی لیے وہ اسے چکی شالی میں ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

دوپہر کو ماں چھپر تلے ہنڈیا بھون رہی تھی۔ نیم کے درخت پہ بیٹھا کوا بول رہا تھا۔ ماں نے ناشتے دان سے ناشتے کی بچی ہوئی چپڑی روٹی توڑ کر اس کے بھورے بنائے اور کوے کی طرف اچھال کر مسکرائی۔

''آج میرا ویرن آئے گا۔''

سائیکل کو پرانی ٹاکی سے رگڑ رگڑ کر چمکاتے ہوئے ندیم نے سوچا کہ آج چوزہ پک رہا ہے تو ماں کا جی چاہ رہا ہوگا کہ ماموں آجائیں مگر اسی سہ پہر ماموں چمڑے کا تھیلا لیے ڈیوڑھی سے ظاہر ہوئے اور ''السلام علیکم'' کی آواز نے چونکا دیا۔ ندیم تو مارے حیرت کے سلام کرنا بھول گیا۔ اس دن ندیم کے دل میں بیٹھ گیا کہ اس کی مظلوم جوانی کی بیوہ غریب ماں کوئی خاص روحانی مقام رکھتی ہے۔ دن رات کے معمولات کو سامنے رکھ کر دیکھا جاتا تو

ہیں جسمانی محنت، مشقت، صبر و رضا اور دعا کا پیکر تھی۔ یہ تو جب ندیم، فہیم سمجھدار ہوئے تو پتا چلا کہ اٹھارہ بیس سال بڑی ماں بوڑھی نہ تھی جب ندیم، فہیم چودہ، بارہ سالوں کے تھے۔ ایسا نہ تھا کہ گاؤں میں عورتیں بنتی سنورتی نہ تھیں۔ ہار سنگار، کاجل، چوڑیاں، ریشمی رنگ برنگے کپڑے، جوتے، پراندے، ربنیں سب کچھ ہوتا تھا۔

اس بار ماموں کی روانگی میں ندیم کو بھی شامل کر دیا گیا تھا۔ ماموں اس لیے آئے تھے کہ وہ ندیم کی شاندار کامیابی کے بعد اسے سائنس پڑھانا چاہتے تھے۔ اور یہاں سائنس کے ٹیچر نہیں تھے۔ وہ اسے ملتان لے جانا چاہتے تھے اور عقلی طور پر ماں بھی یہی چاہتی تھی مگر دل عقل کے فیصلے پر احتجاج کرتا تھا۔ ندیم کو ماموں کے ہاں مستقل چلے جانا اچھا نہ لگا...... ماموں سے پیار ضرور تھا مگر ماں سے بڑھ کر نہیں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ماموں کے سامنے مسکراتی تسلی دلاتی ماں اس کی عدم موجودگی کو بہت محسوس کرے گی۔ ماں کہہ رہی تھی۔

''فہیم اب بڑا ہو گیا ہے پڑوسی سارے اپنے ہیں، دکھ سکھ میں ساتھ دیتے ہیں۔ یہ آپ کے ساتھ آتا جاتا رہے گا۔''

''بہن تم بھی چلو، میں تو کہتا ہوں یہاں کیوں اکیلی پڑی ہو......''

''نہیں...... ندیم کے ابا کے کھیت ہیں، قبر ہے...... میں نہیں جا سکتی۔'' ندیم جانتا تھا کہ رات کو کمرے سے نکل کر برآمدہ اور نیم اندھیارا صحن پار کر کے ٹاہلی کے گہرے سیاہ اندھیرے کو دیکھتے ہوئے بیرونی دروازے پر تالا لگانے کے لیے وہ اسے ساتھ لے جاتی تھی اور وہ جانتا تھا کہ باہر کے سودے لانے میں فہیم بقایا ریزگاری کی کوئی چیز کھا لیتا تھا، ماں چپ کر جاتی مگر جب ندیم لا کر دیتا تو وہ ایک ڈبیا میں ڈال دیتی۔ اس بچت سے بھی کچھ نہ کچھ آ جاتا۔

مگر ماں جیسے تمام فکروں سے بے نیاز ٹین کا صندوق برآمدے میں رکھے خاموشی سے ندیم کے کپڑے تہ کر کے رکھتی جا رہی تھی۔ دیوار میں لگی کیل پر سے بستہ اتارا اسے جھاڑ کر خالی کر کے رکھ دیا۔ ایک چھوٹا نیا تولیا اندر پیٹی سے نکال لائی...... پرانے کپڑے میں بوٹ لپیٹ کر رکھے اور جرابوں کا ایک جوڑا...... نماز کی ٹوپی وہ سب کچھ جو ندیم کی ضرورت ہوتی۔

صبح ہوئی...... ٹاہلی میں پرندے بولنے لگے۔ سورج کی پہلی پہلی کرنیں چھپر کے ماتھے کو چھو رہی تھیں۔ چھپر میں چولھا جل رہا تھا۔ کیکر کی لکڑیوں کی دھیمی آنچ تھی جہاں ابھی ابھی ماموں اور ندیم کے ناشتے کے لیے پراٹھے پکائے گئے تھے تو اور چائے کی کالی کیتلی اب خاموش تھی۔ ان کے جانے کے بعد ماں فہیم کے لیے پراٹھا ڈالے گی اور اوڑھنی میں آنسو جذب کرے گی اسے آج بھوک نہیں لگے گی۔ ماں نے ندیم کو رخصت کرتے ہوئے جیسے جلدی ڈالی ہوئی تھی اور اسے ہلکا سا سینے سے لگایا...... جب ندیم، ماموں کے ساتھ گلیوں میں چل کر بس اڈے کی طرف جا رہا تھا تو راستے میں نابینا فقیر ملا...... ماموں نے اپنی جیب سے سکہ نکال کر ندیم کو دیتے ہوئے کہا تم اپنے ہاتھ سے دو...... سکہ لیتے ہوئے نابینا نے دعا دی۔ پتر تم بڑا مال کماؤ گے، بڑے آدمی بنو گے...... اس وقت غریب کی مدد کرنا نہ بھولنا...... اس وقت یہ بہت عجیب، ناقابلِ یقین بات تھی...... کہ یہ لڑکا ایک دن ارب پتی بنے گا۔''

ندیم بیگ صاحب نے رک کر پانی کا گلاس اٹھایا تو رشناج بے ساختہ بولی۔

''سر...... اس فوڈ فیکٹری اور فائیو اسٹار کے علاوہ اور کوئی بزنس ہے آپ کا؟''

''دو فوڈ پروڈکشن فیکٹریز، دو سوپ فیکٹری، فلور مل، لاہور میں فلیٹس اور مارکیٹ پلازہ...... کبیر والا میں تین مربع زرعی نہری اراضی، باقی لائیو اسٹاک

پولٹری، ملک پلانٹس وغیرہ وغیرہ......"

"اووو...... unbelievable"

"یہ میں نے اس لیے بتایا that you can compare...... باقی کوئی فخر نہیں...... اللہ محفوظ رکھے۔"

ترقی کی اس قدر بڑی چھلانگ کے باوجود مزاج میں اس قدر سکون اور متانت، نو دولتیا پن کا کوئی عکس نہ تھا...... اتراہٹ چھو کے نہ گزرتی تھی۔ انکساری بھی معتدل تھی ایک مکمل گروئڈ شخصیت...... رشناج حیرت سے سوچتی۔ شخصیت کی اتنی تراش خراش پنا سونے کا چمچہ منہ میں لیے؟ بنا اے لیول او لیول؟ اخلاقیات اور کردار میں کون بہتر ہوتا ہے سیلف میڈ امیر یا پیدائشی امیر؟ چلیے آگے کہانی سنتے ہیں۔ شاید کوئی جواب مل جائے۔

"چکی شمالی پسماندہ گاؤں سے آنے والے ندیم رجب کو ملتان بڑا، راستے گم ہو جانے والا شہر لگا۔ ماموں کا گھر اندرونِ شہر تھا۔ گنجان آباد محلے کی زندگی بہت مختلف تھی۔ کھلی چھت پر سوتے ہوئے بھی گھٹن کا احساس نہ جاتا۔ ماموں کے دو بیٹے ندیم کے تقریباً ہم عمر تھے۔ بیٹی سیماں ساتویں میں پڑھتی تھی اگرچہ ان سب سے پہلی بار ملنا ہوا مگر سب گھل مل گئے۔ وہ ندیم کو اپنے گھر کا حصہ بنانے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھے۔ ندیم نے سائنس مضامین کے ساتھ ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ ساٹھ، ستر طلبا کا ایک سیکشن ہوتا...... ہر نوع کا لڑکا ملتا۔ محنتی، پڑھاکو ایک، ایک نمبر پر سخت مقابلہ کرنے والے، کھلنڈرے، جگت باز، نقل کرکے پاس ہونے والے اور درمیانے جو ہر سطح پر درمیانے تھے۔ ندیم ہمیشہ گھر چھوڑ کر یہاں آنے کا...... مقصد یاد رکھتا۔ وہ جلد ہی جماعت کا نمایاں ترین طالب علم بن گیا۔

اب تو اسکول سے آکر بھینس نہیں چرانا ہوتی تھی۔ چارا نہیں لانا ہوتا تھا۔ دور دراز سے پینے کا پانی بھر کر نہیں لانا ہوتا تھا۔ لالٹین صاف نہیں کرنی ہوتی تھی مگر وہ دل میں ان سب کاموں کو بھی مس کرتا۔ کوشش کرتا کہ مامی کا ہاتھ بٹا دے لیکن مامی کو اس کی ضرورت کیونکر ہوتی...... دو چوٹیوں والی سیماں جس کے رخسار ہمیشہ لال ہوتے تھے اور اسے گھر والے کشمیرن کہتے۔ وہ اپنا ہوم ورک مکمل کرکے بستہ جھاڑتی پھر ایک، ایک کرکے کاپیاں رکھتی پھر کتابیں اور پھر بیگ کی جیب میں پنسل، پین، ربڑ ڈالتی پھر زپ کھینچ کر بیگ بند کرکے اونچی جگہ پر رکھ آتی تو کچن میں آٹا گوندھتی چھوٹے چھوٹے کام کرواتی۔ کشمیرن سے سب پیار کرتے تھے۔ ماموں، مامی اور بھائی لوگ، کبھی، کبھی وہ محبتوں سے لبریز اور مغرور لگتی، ندیم جس کی مسیں بھیگ رہی تھیں اور آواز بھاری ہو رہی تھی اسے کشمیرن پر رشک بھی آتا اور محبت بھی...... اس کے پاس سب تھے، ندیم کے پاس کوئی نہیں تھا۔

ہر رات تکیے پر سر رکھتا تو ماں کو تصور میں لاکر دن بھر کی رُوداد سناتا اور ہفتے میں ایک لمبا چوڑا خط لکھ کر ضرور ڈاک میں ڈال آتا۔ نویں کے امتحان میں ندیم اپنی جماعت میں اول آیا تھا اور اب دسویں میں تھا۔ اول آنے والے دن ندیم نے ماں کو لمبا سا خط لکھا۔ مستقبل کے منصوبے یوں بنائے جیسے وہ مقابلے کا امتحان پاس کر گیا ہو۔ خط فہیم ماں کو پڑھ کر سناتا تھا۔ ماں بھی اسی سے جواب لکھواتی تھی۔ ماموں، ندیم کو اکثر تلقین کرتے "بیٹا دور بیٹھے ہوئے غریبوں کو اچھی خبریں سنایا کرو، پریشانی والی خبر کا ذکر نہ کیا کرو۔ ماموں سمجھداری کی باتیں کرتے تھے، ان دنوں انہوں نے اپنے مکان کے ہم دیوار کچا مکان خریدا تھا اور درمیان والی دیوار گرا کر دونوں کو ایک کر دیا تھا۔ تب اندازہ نہیں تھا کہ آنے والے دنوں میں یہ مکان کتنا کام آنے والا ہے۔

ندیم اسکول سے آیا تو اس کی چٹھی آئی رکھی تھی۔ مامی اس کی چٹھی برآمدے میں لٹکے چھیکے میں رکھ دیتی تھیں۔ گھر میں داخل ہوتے ہی ندیم کی نظریں اُدھر جاتیں۔ اس نے کتابیں رکھیں اور...... چارپائی پر بیٹھ کر لفافہ کھولا۔ لکھائی تو فہیم کی تھی مگر خط کی عبارت اجنبی سی لگی۔ لکھا تھا۔

"میں یہ خط ماں سے چھپ کر لکھ رہا ہوں۔ ماں بہت دنوں سے بیمار ہیں۔ تقریباً ایک مہینہ ہو چکا ہے مگر وہ تمہیں خبر نہیں کرنے دیتیں۔ گھر میں پیسے بھی تھوڑے سے ہوتے ہیں۔ حالات کافی تنگ ہیں۔ ماں کا علاج کیسے ہو...... اس پریشانی میں میرا اسکول میں دل لگتا ہے نہ پڑھائی میں...... ماں کمزور ہو گئی ہیں۔ وہ میرے لیے ایک گلاس دودھ رکھ کر باقی سارا بیچ دیتی ہیں...... وہ اب چائے بھی نہیں پیتیں۔"

خط ایک بم دھماکے کی طرح ندیم کے قلب پر وار کر گیا۔ آنکھوں سے دفعتاً آنسو گرنے لگے۔ وہ ماموں، مامی سے خط چھپا لینا چاہتا تھا اور اپنے طور پر ماں کے کام آنا چاہتا تھا مگر یہ تو خام خیالی تھی۔ کشمیرن نے اسے روتے دیکھ لیا وہ چپکے سے پوچھنے آئی۔

"کیا ٹیچر نے ڈانٹا ہے یا...... پٹائی ہوئی ہے؟" وہ ٹال گیا، کشمیرن نے بھائیوں کو بتا دیا...... وہ ہمدردانہ کُریدتے رہے۔ بات ہوتے ہوتے ماموں تک جا پہنچی۔ ماموں نے اسے بلایا پیار سے پہلا سوال یہی کیا۔

"گھر سے خط آیا تھا؟"

مامی نے تائید کی کہ خط تو آیا تھا۔ ماموں نے کہا۔ "لاؤ دکھاؤ کیا بات ہے۔" ندیم نے ہچکچاتے ہوئے خط لا دیا۔ ماموں خط پڑھ رہے تھے اور وہ ٹپ ٹپ آنسو بہا رہا تھا۔ ماموں کی پلکیں نم ہو گئیں۔ ندیم کو بلا کر پیار کرتے ہوئے مخاطب بہن سے رہے۔

"جھلی نہ ہو تو بھلا...... اس میں چھپانے والی کیا بات تھی۔ بھائی ہوں اس کا بڑا، ذمے داری ہے میری......" پھر ندیم کو منہ دھو کر آنے کو کہا۔ وہ منہ دھو کر آیا تو ماموں نے چکی شمالی جانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ ندیم بضد ہو گیا کہ وہ بھی جائے گا مگر ماموں نے اس کے تعلیمی حرج کے سبب انکار کر دیا۔ اسے تین چھٹیاں لینی پڑتیں جبکہ ماموں ندیم کی تعلیمی ترقی پر کوئی سمجھوتا کرنے کو تیار نہیں تھے۔ انہوں نے یہ بتا کر اس کی تسلی کرا دی کہ وہ اس کی ماں کو علاج کے لیے ساتھ لے کر آئیں گے۔

ماموں جب واپس آئے تو فہیم اور ماں اپنے تمام سامان سمیت ہمراہ تھے۔ ان کا پورا گھرانا یہیں منتقل ہو گیا تھا۔ ندیم خوشی سے کھل اٹھا۔

ماں بہت کمزور ہو رہی تھیں۔ ایک سانس میں لمبی بات نہیں کر سکتی تھیں اور چلتے ہوئے تھک جاتیں لیکن وہ باعزم تھیں ہمیشہ کی طرح...... کچے مکان میں ان کا سامان رکھوا دیا گیا اور ندیم بھی وہیں رہنے لگا۔ کھانا تو ماموں کے ہاں پکتا تھا۔ ندیم، فہیم کا ذریعۂ آمدنی کوئی نہ تھا۔ ماں یہاں بھی بھینس لے آئی تھیں۔ ان دنوں گھروں میں دودھ کے جانور پالنے ممنوع نہ تھے لیکن ماں دودھ نہیں بیچتی تھیں، وہ اسے بھائی کے گھر میں استعمال کے لیے دے دیتیں۔ باقی دودھ سے گھی مکھن نکال کر اپنے بیٹوں کو کبھی کبھار کھلا دیتیں، ماں کا علاج ہوا، صحت بہتر ہو گئی اب وہ آمدنی کے لیے دوسرے چھوٹے موٹے کام بھی کرنے لگیں۔ جیسے اخباروں سے لفافے بنانا (شاید تب شاپر بہت عام نہیں ہوئے تھے) اور دوپٹوں کی رنگائی...... معاشی تنگدستی تو ہمیشہ سے رہی تھی مگر دن اچھے تھے، کشمیرن اپنے آنگن میں جھاڑو لگا کر پائپ سے چھڑکاؤ کرتی، ان کا صحن پختہ تھا۔ ماں نے اپنے کچے صحن کے اطراف میں پھولوں اور سبزیوں کی کیاریاں بنائی تھیں۔ چست و مستعد بچی کشمیرن یہاں بھی پانی لگاتی اور کچے صحن کو سوندھی مہک سے رچا دیتی۔ ندیم اور فہیم ماموں کے صحن میں پڑھتے تھے کیونکہ وہاں کا بلب زیادہ روشنی والا تھا۔ البتہ سرما میں

وہ اپنے گھر کے کمروں میں سمٹ جاتے۔ زندگی سادہ اور پُرسکون تھی۔ ندیم میٹرک کے امتحان کا آخری پرچہ دے کر گھر آرہا تھا۔ آج وہ خوش اور پُرجوش تھا اور مختلف کھیلوں کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اپنی گلی میں داخل ہوتے ہی کسی ہمسائے نے اسے روک کر نہایت بری خبر سنادی۔ ماموں کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ ندیم کے تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

وہ دوڑتا ہوا گھر پہنچا مگر وہاں صحن کی چارپائی پر اکیلی بیٹھی روتی ہوئی سیماں (کشمیرن) کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ سب اسپتال گئے تھے۔ اسے یوں ہی روتا چھوڑ کر وہ بھی اسپتال کی طرف دوڑا۔ ماموں اس کی زندگی کا قیمتی اثاثہ اور سائبان تھے۔ وہ ان کی خدمت اپنی ذمے داری سمجھتا تھا۔ ماموں گھر تو آئے مگر سر پر ایسی چوٹ لگی تھی کہ ان کی نگاہ شدید متاثر ہوگئی تھی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ ان کی دنیا اندھیر ہو رہی تھی اور ان کے ساتھ سات افراد کا کنبہ اندھیرے میں ڈوب رہا تھا۔ سر جوڑ کر بیٹھے اور باتیں کرنے کے باوجود کوئی راہ نہیں نکل رہی تھی۔ ماموں اپنے بیٹوں کو بھی مزید پڑھانا چاہتے تھے مگر انہوں نے ایف اے اور میٹرک کے بعد باپ کے کاروبار کو سنبھال کر اپنی روزی روٹی کا وسیلہ کرلیا۔ مگر اب ندیم، فہیم اور ان کی والدہ کی کفالت ان پر ڈالنا درست نہیں تھا اگرچہ ماموں نے اپنی طرف سے کوئی انکار نہیں کیا تھا۔

جولائی کی رات میں کچے صحن میں تین.... چارپائیاں بچھی تھیں۔ ماں عشا کی نماز سے فارغ ہو کر گٹھڑی کی طرح دوپٹا لپیٹے اپنی چارپائی پر تھی اور نیم روشنی میں یہ گٹھڑی ہولے ہولے ہل رہی تھی۔ شاید وہ وظیفہ کررہی تھیں۔ ندیم بازو کا تکیہ کیے تاروں بھرا آسمان تک رہا تھا۔ کہیں دور ریل گاڑی کی کوک سنائی دی پھر کہیں دور کوئی پرندہ بولا اور پھر خاموشی چھا گئی۔

''ماں......'' ندیم نے ماں کو دھیرے سے آواز دی۔

گٹھڑی میں حرکت ہوئی۔

''ماں...... میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔''

''کیا......؟'' ماں نے اس کی طرف رخ موڑا، ہونٹوں کی حرکت کو وقفہ دیا اور سر کے اشارے سے پوچھا۔

''بس اب وقت آگیا ہے کہ میں...... باہر نکلوں، میں ملتان چھوڑتا ہوں۔''

''کہاں جاؤ گے؟ کیا کرو گے......'' ممتا نے تڑپ کر پوچھا۔

''میں کراچی جاؤں گا...... کراچی بہت بڑا شہر ہے وہاں روزی کے وسیلے بہت ہیں۔ آپ مجھے نہیں روکیں گی ماں...... یہ فکر نہیں کریں گی کہ میں کہاں رہوں گا، کیا کروں گا...... ان سوالات کے جوابات ابھی میں خود بھی نہیں جانتا۔'' ان دنوں کراچی کے متعلق مشہور تھا کہ غریب پرور شہر ہے اور یہاں مزدوری مل جاتی ہے (اگرچہ یہ خیال آج بھی مستحکم ہے) ماں حیرت بھری سنجیدگی لیے ندیم کی جانب مڑیں۔

''بیٹا...... کچھ پتا ہے کیا بات کررہے ہو...... تم ابھی چودہ سال کے ہو اور زمانہ بے حد ظالم ہے۔ میں اپنے عیش کی خاطر اپنا بیٹا گنوانا قبول نہیں کرسکتی۔'' ندیم اٹھ کر ماں کے پاس آبیٹھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ فہیم کی آنکھ کھل جائے۔

''ماں...... میں پندرہ سال کا ہونے والا ہوں...... مجھے ممتا کی نظر سے نہ دیکھیں، میری عمر کے بہت سے لڑکے کام کرتے ہیں۔ میں نے خرچے کا حساب لگالیا ہے آپ کسی طرح مجھے 700 روپے کرایے کے لیے کردیں۔'' ماں ششدر بیٹھی رہی۔

ایک بار پھر ندیم بولا۔

''غریب اور یتیم کا کوئی بچپن نہیں ہوتا، میں بچپن کو بہت پہلے ہی خیرباد کہہ چکا ہوں۔ محنت، ہمت اور ذمے داری سے رہوں گا۔ فکر نہ کرنا...... میں جلد ہی

پیسے بھجوانا شروع کردوں گا۔ اپنی تعلیم بھی جاری رکھوں گا۔ بھوک، آرام و سکون کو نظرانداز کردوں گا۔ اپنا نفس کچلنا مجھے آگیا ہے...... ماں ہم یہاں یوں کب تک بیٹھیں...... ماموں ہماری کسمپرسی پر کڑھتے ہوئے اپنے بیٹوں کو ہماری اعانت کرنے کا اصرار کریں اور... بدمزگی پیدا ہو...... اس سے پہلے مجھے کچھ کرنا ہوگا...... ہمیں ہماری کشتی خود کھینا ہوگی...... بس پیاری ماں...... آپ انکار نہ کریں۔'' ماں نے آہ سرد بھر کر آسمان کی طرف دیکھا اور پھر ندیم کو سینے سے لگالیا۔

ایک مختصر بیگ تیار ہوگیا تھا۔ ماموں کے گھر کسی کو بتایا نہیں گیا تھا مگر سیماں کو پتا چل گیا تھا۔ وہ صبح شام اِدھر آتی تھی کوئی سی بھی تبدیلی اس سے پوشیدہ نہیں رہتی تھی۔ جس صبح ندیم نے روانہ ہونا تھا وہ چپکے سے آکر ندیم کے بیگ کے خانے میں تیس روپے اور ایک پرچی جس پر لکھا تھا۔ ''ندیم بھائی کے لیے۔'' رکھ گئی تھی ندیم رجب زکریا ایکسپریس میں بیٹھا اور سب پیار کرنے والے بہت پیچھے رہ گئے۔

کراچی کا پہلا ریلوے اسٹیشن آیا اور ندیم اتر گیا یہ تو بعد میں کبھی پتا چلا تھا کہ کراچی میں ایک ریلوے اسٹیشن نہیں ہے۔ اسٹیشن پر اتر کر وہ ہونقوں کی طرح کبھی چلتا اور کبھی بیٹھ رہتا اور ہر لمحے ہشیار رہتا کہ اس سے کوئی نوسر بازی نہ کرجائے۔ ان دنوں اس درجہ غنڈہ گردی اور دہشت گردی نہیں ہوا کرتی تھی یا پھر ماں کی دعائیں تھیں کہ اس کم عمر بدھو پر کسی زمانہ شناس بدمعاش کی نظر نہ پڑی۔ ایک ادھیڑ عمر قلی اسے کافی دیر سے بے آسرا گھومتے پھرتے دیکھ رہا تھا۔ وہ کم سے کم کھاتا اور زیادہ پانی سے پیٹ بھرتا اور اسٹیشن چھوڑتے ایسے ہچکچاتا جیسے یہاں سے نکل کر واپسی کا راستہ بھول جائے گا۔ بھوک اور پریشانی اس کے چہرے پر رقم ہوتی جارہی تھی۔

''بیٹا، کیا بات ہے؟ کس کو تلاش کرتے ہو؟'' قلی پیالے میں چائے پیتا ہوا اس کے پاس آیا۔ آہستہ سے بولا۔

''نہ...... نہیں میں تو ابھی ٹرین سے اترا ہوں۔''

''میں اس اسٹیشن پر سولہ سال سے قلی ہوں۔ یہاں کسی بینچ کی پٹی ٹوٹے یا کوئی نئی بتی لگے مجھے پتا چل جاتا ہے۔ میرا گھر بال، بچے اُدھر کوارٹر میں رہتے ہیں۔ تمہاری عمر کا میرا بیٹا ہے۔ مجھ سے نہ ڈرو...... روزگار کی تلاش میں آئے ہو؟ پنجاب سے آئے ہو؟''

ندیم غور سے اسے دیکھتے ہوئے سچ اور جھوٹ کو اس کے چہرے سے پرکھتا رہا پھر سوچا شاید اسی کے وسیلے سے روزگار کا کوئی سرا نکلے...... تھوڑی ردوبدل سے اپنی کہانی سنادی، ردوبدل یہ تھا کہ فلاں جگہ اس کے چچا رہتے ہیں مگر وہ خود کمانا چاہتا ہے کسی کا محتاج نہیں رہنا چاہتا۔ اس نیک شخص نے اسے پانچ روپے بھی دیے اور وہاں جانے والی بس پر بٹھا کر سمجھایا کہ فیکٹری ایریا میں جاکر قسمت آزماؤ۔ ندیم جب بس سے اترا تو سامنے کسی انڈسٹری کا گیٹ تھا جس پر چاق و چوبند چوکیدار بیٹھا تھا۔ اپنے کاندھے سے سفری بیگ اتار کر ندیم نے مزدوری کے لیے اندر جانے کی درخواست کی۔

''جاؤ جاؤ، سر مت کھاؤ، بچہ کام نہیں کرتا۔'' وہ ڈپٹ کر بولا۔

''میں کوئی بھی مزدوری کرسکتا ہوں، تم میری بڑے صاحب سے بات کرادو...... میں تمہاری منت کرتا ہوں۔ مجھے روزگار کی اشد ضرورت ہے۔'' مگر وہ کسی بھی منت سماجت سے ٹس سے مس نہیں ہوا۔ ندیم تھک ہار کے سامنے والے چھپر ہوٹل پر جا بیٹھا۔ وہ سارا دن وہیں بیٹھا رہا۔ بے چارہ ناتجربے کار لڑکا جہاں ایک دفعہ بیٹھ جاتا وہاں سے اِدھر اُدھر ہوتے ڈرتا مبادا... کھو جائے۔ ہوٹل والا خدا ترس بندہ تھا یا پھر ہوٹلوں والے ایسے چہروں کو پہچان لیتے ہیں جو... خوددار ہوتے ہیں... اور خالی پیٹ پر صبر کے تالے لگانے

میں کوشاں ہوتے ہیں۔ اس نے دو روٹیاں، دال کی پلیٹ، سلاد کے ساتھ بھجوادی۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' وہ ہچکچایا۔ پیسے خرچ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''استاد کہہ رہا ہے کھالو، پیسے نہیں لے گا۔ مہمانی ہے۔''

ندیم کچھ دیر غیر یقینی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ ملازم لڑکے کے اصرار پر پہلا لقمہ توڑا۔ بعد میں تو پتا ہی نہیں چلا کب برتن خالی ہوگئے۔ برتن واپس کرنے والے کے ساتھ وہ استاد کے پاس گیا اور کھانے کے بدلے میں برتن دھونے کی پیشکش کی۔

''جا پتر، تو مہمان ہے، چائے پیے گا؟ چائے پی لے۔'' استاد نے تھپک کر کہا۔

وہ چائے پی رہا تھا کہ دیکھا سامنے والی فیکٹری پر اسی چوکیدار کے پاس کوئی دوسرا سکیورٹی گارڈ آبیٹھا تھا اور وہ باتیں کرتے ہوئے اسے دیکھتے تھے۔ ندیم ہر بات پر خوف زدہ بھی ہوجاتا اور امید کی کرن بھی تلاش کرتا تھا۔ انہوں نے ندیم کو دیکھتے پا کر اشارے سے بلایا وہ امید وبیم کی کیفیت میں گیا۔ اس کے کندھے پر لٹکے سفری بیگ کو دیکھتے ہوئے سکیورٹی گارڈ نے پوچھا۔

''کہاں سے آئے ہو؟'' اس نے وہی کہانی سنادی۔ سامنے سے کوئی تین چار مرد آرہے تھے سکیورٹی گارڈ نے کہا۔ ''یہ فیکٹری کے مزدوروں کی یونین کا صدر ہے۔ میں اس سے تری بات کرادیتا ہوں، اگر یہ مان گیا تو دیہاڑی پر رکھ لیے جاؤ گے۔''

بات کرائی گئی اور وہ نائٹ شفٹ پر رکھ لیا گیا۔ ہوٹل والے کی کھولی میں جہاں دوسرے ملازم لڑکے سوتے تھے، اسے پہلا ہفتہ فری دوسرے ہفتے سے دو روپیہ یومیہ پر جگہ مل گئی۔ یہ تھا ندیم رجب بیگ کی عملی زندگی کا آغاز......

☆☆☆

ندیم رجب بیگ قیمتی اسٹائلش تھری پیس سوٹ میں شہر کے عالیشان ہوٹل سے نکل رہے تھے۔ رشناج جینز، جیکٹ اور شانے پر بیگ لٹکائے ان کے برابر چل رہی تھی۔ وہ ابھی کل ہی لاہور پہنچے تھے۔ کچھ دنوں بعد بیگ صاحب کو جاپان روانہ ہوجانا تھا۔ رشناج پروڈیوسر خالہ سے ان کی مختصر ملاقات کا ٹائم مانگنا چاہتی تھی مگر وہ اتنے مصروف تھے کہ کوئی بھی وقت خالی نہ تھا۔ رشناج کی ابھی کچھ دیر پہلے منعم سے بات ہوئی تھی۔ وہ پیرس کے مہنگے ترین شاپنگ سینٹر سے خریداری کرتے ہوئے اسے بے تحاشا مس کرتا رہا اور اب پیچ کا جوس پیتے ہوئے کسی بیچ کی ایزی چیئر پر سلکی گاؤن لپیٹے دراز تھا۔ پانی کی حرارت بخش خوشبوئیں اس کا حصار کیے ہوئے تھیں اور مہنگے ترین موبائل پر بات کرتے ہوئے سکون اور محبت کی تلاش کا رونا رو رہا تھا اور پیسے کو گالیاں دے رہا تھا۔ pleasure کا پیسے سے کوئی تعلق نہیں بتا رہا تھا۔ ادھر ندیم رجب بیگ کہہ رہے تھے۔

''رشناج...... جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پیسہ کچھ نہیں اور پرچار کرتے ہیں کہ دولت کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں وہ اوّل درجے کے منافق ہیں۔ وہ خود بہترین رہتے ہیں، بہترین کھاتے پیتے ہیں اور بہترین کے سوا برتتے نہیں مگر وہ غریب کی فریاد پر کان نہ دھرنے کی خاطر کہتے ہیں کہ دولت لالچ ہے، باعث اذیت ہے۔ میں کسی لگی لپٹی کے بغیر دولت کے بارے میں رائے دیتا ہوں۔ دولت valueable ہے۔ اس کو خود پر خرچ کرکے دنیاوی آرام حاصل ہوتا ہے اور دوسرے پر خرچ کر کے ابدی راحت ملتی ہے۔ یہ انسان کی انا اور خودی کو محفوظ رکھنے میں مدد دیتی ہے لیکن اگر اس کے بغیر جینا پڑے تو وحشی اور مشتعل ہوجانا extremity ہے مگر ہر طرح کی راحت کا منبع دولت کو سمجھنا غلط ہے۔ محنت کے بعد سادہ کھانا لذیذ ہے۔ کامیابی کی تھکن

کے بعد جیسی میٹھی نیند کوئی نہیں۔ تلخ رویوں کی دھوپ محبت کی چھدری چھاؤں کی قدر سکھا دیتی ہے جب دکھ سننے والا دیواروں کے سوا کوئی نہ ہو تو اچھے الفاظ کا محض ایک میسج مرہم لگتا ہے مگر جو کبھی سخت محنت کی بھوک سے گزرا نہ ہو، تھکن سے چور ہوکر کامیابی تک پہنچا نہ ہو، بدنما رویوں کی تمازت سے جھلسا نہ ہو، تنہائیوں کا کرب جھیلا نہ ہو وہ نعمتوں کی کثرت اور قلت کا ادراک ہی نہیں رکھتا۔ وہ ناقدر دان جیتا ہے۔ آپ سوال کرسکتی ہیں کہ اگر قدر و قیمت کا یہی پیمانہ ہے تو صحت کی قدر کے لیے بیماری کا تجربہ لازم ہوگا؟ جی ہاں بیماری کا تجربہ بھی بہت ضروری ہے۔

ندیم رجب نے فرسٹ ائیر میں داخلہ بھی لے لیا۔ چکی کی مشقت کے ساتھ مشق سخن تو جاری نہیں تھی مگر مزدوری کی مشقت کے ساتھ علم کی شمع جلانے کی مشق ہو رہی تھی...... اسے کرکٹ کھیلنے کا بہت شوق تھا اور اس نے سنا تھا کہ قومی ٹیم کے کرکٹرز بینک میں برائے نام جاب کرتے ہیں۔ رہنمائی تو کوئی حاصل نہیں تھی فیصلے اپنے بل بوتے پر کرتا رہتا۔ جب اکاؤنٹس سے پالا پڑا جو اختیاری مضمون کے طور پر رکھ لیا تھا تو اندازہ ہوا کہ بغیر ٹیوشن کام نہیں چلے گا۔ ان دنوں وہ 26 روپے دیہاڑی دار مزدور تھا۔ اس رقم میں سے فہیم کی تعلیم کا خرچہ بھی بھیجتا تھا۔ یہ کافی نہیں تھا لہٰذا اس نے اخبار بیچنا شروع کردیے۔ حبیب بینک پلازہ سے ناظم آباد تک بسوں میں جا کر اخبار بیچتا۔'' یہاں رک کر ندیم رجب بیگ اس سے بولے۔

''مس رشناج! میں جب بھی کسی اخبار بیچنے والے کو دیکھتا ہوں تو مجھے اس کے چہرے پر بولتی آنکھیں صاف سنائی دیتی ہیں، ایک شدید تمنا کہ سب اخبار بک جائیں اور جلد بک جائیں، سو میں ان سے سارے اخبار خرید کر گاڑی میں ڈال دیتا ہوں۔''

''سو جدوجہد چل پڑی۔ ندیم کی زندگی کا پہلا انعام اکاؤنٹس میں اپنی جماعت میں ٹاپ کرنا تھا۔ یہ اس کی پہلی عزت بھری مشہوری تھی۔ اکاؤنٹس کے ٹیچر سر شفقت نے اس کے اعزاز میں اکیڈمی میں فنکشن منعقد کرایا۔ آج وہ مزدور بچہ جس کے کپڑے بھی استری شدہ نہ تھے۔ خوشی سے گلال ہو رہا تھا۔ انعام اور تحسین آمیز لفظوں کے علاوہ چائے، سموسے اور برفی بھی تھی اور اس نے یہ ساری تفصیل خط میں ماں کو لکھی تھی۔

''بیٹا تم مہینے میں کچھ دن ضرور لیٹ آتے تھے حالانکہ تم ریگولر اسٹوڈنٹ ہو...... اس کی کیا خاص وجہ تھی؟'' سر شفقت نے اس سے اس دن اہم سوال کیا۔

ندیم اپنے حالات پر بھی احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہوا تھا۔ وہ اعتماد سے بتا رہا تھا۔

"سر! میں فیکٹری میں کام کرتا ہوں۔ جب میں لیٹ ہوتا تھا تو میری B شفٹ ہوتی تھی۔ یہ شفٹ 3 بجے سہ پہر سے گیارہ بجے شب تک ہوتی ہے۔ اس میں 7 بجے سوا گھنٹے کا وقفہ ہوتا ہے۔ میں اس وقفے کے ایک، ایک منٹ کی اہمیت جانتا تھا۔ میں بھاگ، دوڑ کر نکلتا مگر راستے میں پندرہ بیس منٹ لگ جاتے۔ پینتالیس منٹ کا پیریڈ پورا کرتے ہی نکلتا مگر شفٹ میں لیٹ پہنچتا...... میں کیا کرتا سر۔"

یہ سن کر سر شفقت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ندیم کو پیار سے تھپکی دیتے رہے، اگلے دو دن چھٹی تھی۔ تیسرے دن ندیم اکیڈمی میں داخل ہوا تو سامنے ایک نئی نکور چمچماتی سہراب سائیکل کھڑی تھی۔ جس پر رنگین چکنے روغنی کاغذ لپٹے تھے۔ جسے دیکھتے ہی ندیم نے حسرت سے سوچا کاش یہ میرا انعام ہوتی۔ شہ رگ سے قریب وہ مہربان ذات تھی۔ سر شفقت اسے جماعت سے لے کر باہر آئے اور بائیکل پر ہاتھ رکھ کر بتایا۔

"ندیم...... یہ چھ ہزار روپے کی سائیکل ہے، سائیکلوں کی سردار ہے۔" یہ ایک بہت بڑی قیمت تھی۔

"یہ میں تمہیں دوں گا۔" ندیم کی باچھیں کھل اٹھیں۔

"یہ میں تمہیں صرف تین ہزار میں دوں گا۔" ندیم کا منہ لٹک گیا۔ "بیٹا یہ برانڈ نیو ہے۔ کل ہی خریدی گئی ہے۔ اس کی رسید تمہیں دی جائے گی۔"

"مگر سر میں تین ہزار کیسے دے سکتا ہوں؟"

"تین ہزار تو میں لوں گا چاہے جیسے دو۔" دو ٹوک جواب دیا۔

"سر میں سو روپے ماہانہ...... دے سکتا ہوں۔"

"قسطوں میں قبول ہے...... تمہیں سو روپے میں مشکل ہو تو 50 ماہانہ رکھ لو...... مگر دینے میں باقاعدگی ٹوٹی تو سمجھو سائیکل دس ہزار کی ہو گئی۔"

"جی...... اچھا۔"

"میں نے یہ قسط کیوں رکھی، یہ بھی تمہیں جلد معلوم ہو جائے گا، غور سے سنو بیٹا...... آج میں تمہیں زندگی جینے کے نہیں، زندگی جیتنے کے تین الفاظ دے رہا ہوں۔ انہیں پکی گرہ سے باندھ لو۔ نمبر ایک... با مقصد محنت...... نمبر دو pure نیت...... نمبر تین عمدہ اخلاق...... کیا سمجھے؟" سر شفقت نے کہا۔

"سمجھ گیا سر......! ان میں دو صفات میرے پاس ہیں تیسری کو اپنا لوں گا انشاء اللہ۔"

اس وقت ندیم نے یہ بھی سوچا تھا کہ سر کتابی نصیحتیں کر رہے ہیں۔ نیک نیت اور اخلاق سے کب کاروبار آگے بڑھتے ہیں۔ اخلاص اور نیک نیتی والا اخبار ہی بیچ سکتا ہے تاہم اس نے یہ اقرار کیا کہ جو بھی ہو اس وعدے پر عمل کرے گا، یہ سائیکل ہی تھی جو پہلی بار اس کی زندگی میں بھرپور مسرت اور اعتماد کی علامت بن کر آئی تھی اور اب دوسری بار امید اور آگے بڑھنے کا ولولہ ثابت ہوئی...... ماموں کی دی ہوئی سائیکل تو اس نے فہیم کو دے دی تھی۔ استاد محترم کی عطا کردہ سائیکل نے اس کے کنوینس کا مسئلہ حل کر دیا۔ وہ کافی حد تک بسوں اور ویگنوں سے بے نیاز ہو گیا۔

زندگی نے قدم، قدم پر رکاوٹیں دیکھیں مگر ہر مقام پر کوئی مخلص سہارا بھی ملتا رہا۔ اگر اخلاص کے یہ جگنو نہ ہوتے تو شاید وہ ناکامی کے سیاہ اندھیروں میں گم ہو جاتا۔ اس کی پشت پر ماں کی ان تھک دعائیں آگے بڑھنے پر مہمیز کرتی رہیں۔ "ہرڈل ریس" جاری رہی۔ رکاوٹیں عبور کرتا چلا گیا مگر واضح منزل سامنے نہیں تھی۔ لنڈا بازار سے مال لے کر ستے بازاروں میں ٹھیا لگایا ساتھ فیکٹری کا کام بھی چلتا رہا، ایف اے ہو گیا مگر منزل پھر بھی سامنے نہیں تھی۔ اس روز وہ دل برداشتہ شفقت صاحب کے ہاں بیٹھا تھا۔ وہاں ایک میز پر پلیٹ میں تین آم رکھے تھے۔ سر شفقت نے پھر ایک بار اپنی سنہری نہ بھولنے والی نصیحت سے اسے امید دلائی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"ندیم آج فیصلہ کر لو کہ تم نے کس فیلڈ

میں آگے جانا ہے جو کام کرو ہمیشہ better new کرنے کا سوچو...... اپنا آئیڈیا لاؤ، لکیر کے فقیر نہ رہو...... مثلاً یہ آم کاٹنے لگو تو سوچو کہ کیا روایتی طریقے سے کوئی بہتر طریقہ ہے...... اگر اسے مرکز سے کٹ لگا کر اوپر کی قاشیں الگ اور نیچے کی الگ کر لیں تو بہتر نہ ہوگا۔" انہوں نے آم کاٹ کر دکھاتے ہوئے سمجھایا۔ تب ندیم نے ایک دم فیصلہ کر لیا کہ بس فوڈ میں قدم جمانے ہیں، فوڈ میں ہمیشہ زیادہ امکانات ہوتے ہیں۔ ندیم نے اپنے ٹائیوں کے کام کے دوران نوٹ کیا تھا کہ کھانے پینے کے ٹھیلے ہوں یا دکانیں یا ہوٹل ان میں ریل پیل ختم نہیں ہوتی۔ اس کام میں برکت بھی ہے ورائٹی بھی...... فی سبیل اللہ کا سلسلہ بھی چلتا ہے۔ خیر کا کام ہے...... فوڈ میں غریب مسکین کا حصہ خود بخود نکل آتا ہے دیگر پروڈکٹ والے بچ جانے والا مال بانٹ نہیں سکتے۔

اس وقت تک وہ اپنی فیکٹری کا بہترین ورکر مانا جاتا تھا تاہم دیہاڑی دار تھا۔ بقول سپرنٹنڈنٹ وہ اس قابل نہیں کہ ماہانہ تنخواہ مقرر کی جائے نیز وہ کم عمر ہے۔ کام میں تو وہ خوب رگیدا جاتا...... سخت سے سخت کام اس کے سپرد کرتے ہوئے اس کی کم عمری کو نہ سوچا جاتا۔ مگر تنخواہ کے لیے اناڑی اور ناتجربہ کار بنا دیا جاتا۔

بی اے اکنامکس کا وہ پیپر بھی کبھی نہیں بھولنے والا تھا۔ جب ندیم پرچہ دے کر نکلا تو جیب میں ایک روپیہ پچیس پیسے تھے اور شدید پیاس لگ رہی تھی۔ کوئی ٹھنڈا مشروب پیتا تو بس کا کرایہ نہ بچتا۔ ایک کشمکش تھی جو ندیم کے ذہن میں جاری تھی کبھی عقل جیت جاتی اور کبھی پیاس...... آخر وہی ہوا پیاس کے ہاتھوں ہار کر ندیم نے 75 پیسے کا لیموں پانی کا بڑا گلاس پی لیا۔ دل کو سکون آ گیا مگر دوسرے ہی لمحے عقل چابک لے کر چڑھ دوڑی۔ "یہ کیا، کیا...... کرایہ کہاں سے آئے گا۔" سائیکل کا راستہ نہ تھا سو وہ سائیکل پر نہیں آیا تھا...... اللہ کا نام لے کر بس میں

غزل

کھا گئی اس کو کس کی نظر
نوحہ کناں ہے نورِ سحر
کیسی ہے یہ راہ گزر
جھلسے ہوئے ہیں سارے شجر
جانے قفس پہ کیا گزری
گھائل ہیں سارے خون میں تر
گلشن گلشن سناٹا
بول اٹھا صحرا کا نگر
ہر سو وحشی چیتے ہیں
جنگل سے چپ چاپ گزر
ہاتھ میں حق کا پرچم ہے
کس کا خوف اور کیسا ڈر
چپ ہے دریا یوں جیسے
طوفاں کی ہے اس کو خبر
کیوں انوار پریشاں ہو
بھیگی رات ہے جاؤ گھر

کلام: انوار فیروز

چڑھ گیا کنڈیکٹر کرایہ لینے آیا تو اس نے ادب و اخلاق سے درخواست کی کہ کرایے کی رقم سے کچھ پیسے کم ہیں مگر کنڈیکٹر گرمی کے تھپیڑے کھائے ہوئے پسینہ بہاتا جنگلی وحشی ہو رہا تھا۔ گالیاں بکنے لگا اور دھکا دے کر گرا دیا۔ جون کا سورج سر پر چمک رہا تھا۔ اجنبی دھوپ انگارے برسا رہی تھی۔ چوٹ کا درد جدا، گالیوں کا گھاؤ گہرا تھا۔ وہیں سڑک کنارے آسمان کی طرف ہاتھ پھیلا کر رو پڑا۔ کسی نے غور کیا نہ پروا کی...... کسی طرح گرتا پڑتا ٹھکانے پہنچا۔ اپنے کمرے کے دروازے میں ہی ڈھے گیا۔ ماں کو پکار کر جو رویا تو بس رونا تھمتا نہیں تھا۔ اللہ سے روٹھ

گیا تھا۔ بس اتنا کہا میں تجھ سے نہیں بولتا تو تماشا دیکھ...... تجھے تماشا بنانے میں مزہ ہے تو یہی سہی...... نعوذ باللہ حق و باطل کا امتیاز یاد نہ رہا تھا۔

وہیں فرش پر اسے نیند آگئی۔ خواب میں یسماں کو دیکھا...... پیازی دوپٹا اوڑھا ہوا ہے، خوب صورت اور بڑی ہوگئی ہے اس کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس ہے۔ اسے دے کر کہتی ہے ”یہ بہت ٹھنڈا اور میٹھا ہے ماں نے دیا ہے...... پی لو......“ اور وہ دودھ کی ٹھنڈک جاگنے پر بھی گردن اور سینے میں محسوس کر رہا تھا۔ اسے تسلی اور اطمینان سا حاصل ہوا۔

اگلے ہی دن خوشگوار انہونی ہوئی۔ جیسے ہی وہ فیکٹری سے نکلا ایک معزز شخص اجلی شرٹ، پتلون میں ملبوس اسے ملا۔ نام پوچھ کر تصدیق کی پھر ایک ٹیلی فون نمبر دے کر کہا۔

”محمد نقوی صاحب کے پاس آپ کے لیے جاب ہے، اس نمبر پر بات کر لیجیے گا۔“ محمد نقوی صاحب...... وہ بہت بڑے صنعت کار تھے۔ چند ہفتے پہلے فیکٹری میں راؤنڈ پر ملے تھے۔ لیبر یونین کے صدر نے ندیم رجب کی کارکردگی کی تعریف کے ساتھ تعارف کرایا تھا۔ سنا تھا کہ وہ صلاحیتوں کے قدر دان ہیں، ندیم نے انہیں فون کیا تو انہوں نے اسی وقت گاڑی اور ڈرائیور بھیج دیا جو ندیم کو ان کی کمپنی لے گیا۔

”اپنے دونوں ہاتھ دکھاؤ، سیدھے، الٹے، بے شک تم باصلاحیت، ذہین اور محنتی ہو...... ملازمت کے حصول کے لیے ایک درخواست لکھ سکتے ہو۔ تمہاری تعلیمی قابلیت دیکھنا چاہتا ہوں۔“ نقوی صاحب نے اپنے سامنے بیٹھے ندیم سے کہا۔

”جی کیوں نہیں...... ابھی لکھتا ہوں۔“ ندیم نے انگلش میں درخواست لکھ کر پیش کر دی، وہ کاغذ دیکھ کر مسکرائے اور کہا۔

”میں تو اُردو دھرتی کا بیٹا ہوں...... اسے کیا کروں۔“ ندیم نے فٹافٹ اردو میں لکھ دی۔

”کیا تنخواہ لو گے؟“ کاغذ پر ایک نظر ڈال کر پوچھا۔

”تنخواہ......؟“ ندیم کا ہر بن مُو خوشی سے سرشار ہو گیا۔ میٹرک پاس کر کے گھر سے نکلا تھا چار سال ہو چکے تھے، بی اے بھی کر چکا تھا مگر دیہاڑی دار مزدور تھا۔ کٹی پتنگ کو ڈور کون دیتا۔ حشرات کو عزت مقدر کب ہوتی ہے پلکوں کی نمی چھپاتے ہوئے عاجزانہ کہا۔

”آپ جو دے دیں سر۔“

”تین ہزار......؟“

”جو بھی آپ مناسب سمجھیں سر۔“

”اچھا...... ساڑھے تین ہزار فی الحال ٹھیک ہے؟“

”آپ کی مہربانی ہے سر۔“ وہ تو دیہاڑی کے حساب سے اٹھارہ سو ماہانہ کماتا تھا۔ جس دن کام نہیں کرتا تھا دیہاڑی نہیں ملتی تھی۔ اور اب ساڑھے تین ہزار یعنی ڈبل ترقی...... جاتے ہی فیکٹری کو خدا حافظ کہا اور نقوی صاحب کی کمپنی میں آگیا اور کمپنی کے کوارٹر میں رہنے لگا۔ ایک مہینہ جم کر کام کیا...... تنخواہ ملی تو تین دن کی چھٹی کی درخواست لکھی۔ گھر چھوڑنے کے بعد پہلی بار گھر جا رہا تھا۔

”عرصہ چار سال تین ماہ بعد مجھے اب ملتان اپنے گھر جانا ہے...... تین دن کی رخصت چاہیے۔“

”احمق لڑکے، دو دن تو تمہیں آنے جانے کے لگیں گے اور اتنے عرصے بعد جا رہے ہو...... تین دن کاٹو اور ایک ہفتہ لکھو......“ نقوی صاحب نے بلا کر ڈپٹا۔

نقوی صاحب کا اس قدر مشفقانہ رویّہ، دل کے نہاں خانوں سے دعائیں نکلتی تھیں۔ انسان کو صاحبِ اختیار ہو کر ایسا ہی ہونا چاہیے...... افسر اور باس کیوں یہ خود پر لازم کر لیتے ہیں کہ اپنے لفظوں اور لہجوں سے بوٹوں کی ٹھوکر ماریں، چہرے کے تیور سے نفرت کا زہر انڈیلیں، تلخی اور تکبر کا مجسمہ بن کر رہیں، ملازمین کو ہمیشہ کام چور، مفت خور، حرام خور

قرار دیں اور خود کو ہمیشہ اعلیٰ، ذہین، دور اندیش، مردم شناس اور صحیح فیصلے کرنے والا جانیں...... ایسے افسر اور باس زندگی میں بد دعا، بدگمانی، غیبت کا موضوع، نفرت و طنز کا محور اور زندگی کے بعد قابلِ عبرت موت کا نمونہ بنتے ہیں۔

ندیم رجب نے اپنے گھر میں قدم رکھا۔ کچے صحن اور دو کمروں کے مکان کے نقشے میں تبدیلی آگئی تھی۔ کمرے اونچے اور پختہ ہو گئے تھے آگے ایک چھوٹا پختہ برآمدہ تھا۔ بھینس کے چھپر کی جگہ کچا کوٹھا بن گیا تھا۔ سرسبز گملے اور پودے اچھے لگ رہے تھے۔ یہ سب کچھ اس رقم سے ہوا تھا جو ندیم ہر حال میں پس انداز کر کے گھر بھجواتا رہتا تھا۔ فہیم لمبا اور بڑا ہو چکا تھا۔ ماں جسمانی طور پر کمزور مگر مستعد تھیں۔ شاید احساسِ ذمّے داری انہیں بوڑھا نہیں ہونے دیتا تھا۔ مامی کے بال سفید ہو رہے تھے اور وہ مہندی بھی نہیں لگاتی تھیں۔ ماموں بوڑھے ہو رہے تھے۔ ماموں زاد بڑے مرد لگنے لگے تھے۔ وہ گلابی رخسار والی کشمیرن تو بالکل ہی پہچانی نہ گئی۔ اس کے تو شانوں تک کٹے بال تھے جن کی پونی باندھے وہ ماڈرن اور بڑے شہر کی لڑکی لگتی۔ بعد میں پتا چلا کہ اس کے لمبے بال ٹائیفائڈ کے بعد گرنے لگے تھے۔ اس لیے کٹوا دیے گئے۔ ندیم کو بھی روایتی مردوں کی طرح لمبے بال کا عشق نہ رہا تھا۔ وہ تو لمبے بالوں پر باتیں بناتا تھا اور اب یہ سلجھی، سمجھ دار یسماں...... جسے سب کشمیرن کے بجائے یسمی کہنے لگے تھے اس کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے، ایک پل کے لیے یہ خیال ندیم کو گزرا تھا مگر دوسرے ہی پل اس کے دماغ نے قہقہے مار کر دل کو شرمندہ کر دیا۔

وہ سب ندیم کی ایسی پزیرائی کر رہے تھے گویا وہ ولایت سے آیا ہو، انہیں بھی ندیم پہلے سے میچور اور بڑا لگ رہا ہوگا۔ ماموں کی نظریں جیسے کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ وہ اپنے بے بصارتی کے سبب دن بھر گھر میں ہی رہتے۔ شوگر نے مایوس کر دیا تھا۔ ندیم ان کے پاس بیٹھتا ان کی خدمت، عزت، محبت کرتا...... ماضی کے حوالے سے ان کا شکر گزار ہوتا مگر اسے لگتا وہ کسی اور بات کا انتظار کر رہے ہیں۔ یسماں کے حوالے سے ندیم کوئی ذمّے داری لینا نہیں چاہتا تھا۔ یہاں اسے شہزادہ ولیم لیا جا رہا تھا مگر وہ اپنی مشکلات جانتا تھا۔

”کراچی میں کیسی لڑکیاں ہوتی ہیں؟“ یسماں نے ایک بار پوچھا۔

”لڑکیاں تو ہر جگہ ایک جیسی ہوتی ہیں۔“

”تم جس گھر میں رہتے ہو وہ کیسا ہے؟“

ندیم نے تفصیل سے بتایا کہ پہلے وہ ایک کمرے میں ایک بستر کا کرایہ بھر کے رہتا تھا۔ چار لوگ اور بھی رہتے تھے پھر ایک کمرا کرایے پر لے لیا...... اب ایک کوارٹر ہے لیکن وہ اس کی ضرورت سے زائد ہے۔ اس کے پاس اس کی صفائی کا وقت نہیں ہوتا اور وہ ایک کمرا ہی استعمال کرتا ہے۔

”میں کسی شریف ضرورت مند شخص کو رکھ لوں مگر اجازت نہیں ہے۔“ اور یہ بھی کہا۔ ”ابھی بہت زیادہ محنت کرنی ہے۔ راستہ طویل ہے لیکن منزل ضرور پاؤں گا۔“

وہ خاموشی سے بالٹی میں سے دھلے کپڑے نکال کر تار پر پھیلاتی رہی۔ ایک بولتی خامشی فضا میں ٹھہر گئی۔

”اور...... منزل کیا ہے؟“ اچانک اس نے پوچھا۔

”او...... کشمیرن...... تُو واقعی عالم فاضل ہو گئی ہے...... منزل ترقی ہے۔“ ندیم دیوار سے پشت ٹکائے اس کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔

”یسماں...... کشمیرن نہیں......“ اس نے ایک نگاہ ڈال کر کہا۔ ندیم مسکرا پڑا احمق لڑکی کو دل سے کہے ناموں کی قیمت کا اندازہ نہیں ہے۔

”آپ کی ترقی سے مجھے خوشی ہوگی۔“ وہ

خالص بناوٹی اخلاق میں بولی تھی۔

''اور......؟''

''اللہ بہت ترقی دے۔'' وہ بالٹی اٹھا کر پرلے کونے میں چلی گئی۔ ندیم کے پاس کہنے کو کچھ ہوتا تو وہ دور نہ تھی مگر وہ دور ہی تھی شاید، ندیم اسے دور ہی رکھنا چاہتا تھا۔

وہ چھٹیاں گزار کر چلا گیا۔ دعائیں، نم آنکھیں، امید کی جوت وقت کی زور آور باگیں اور ندیم...... اس نے کسی کو یہ بھی نہیں کہا انتظار کرنا۔''

''آپ تھک گئی ہیں رشناج......؟''

کامیاب ندیم رجب بیگ مسافتوں کی ان گنت منزلوں سے لوٹ آیا...... رشناج نے پلکیں جھپکا کر خود کو جیسے حنوط شدہ حالت سے نکالا۔

''نہیں...... مجھے بہت...... میرا مطلب ہے، مجھے لگتا ہے جیسے میں ان تمام مناظر میں تھی...... کیا میں تھی......؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی زمان میں کوئی کسی کی حیات میں دور، دور تک نہ ہو اور وہ بعد میں آکر وہیں سے جینے لگے جہاں کوئی جیتا تھا...... عجیب لگے مگر جب آپ گرم سڑک کی بات کرتے ہیں تو میرے پاؤں کے تلوے سلگنے لگتے ہیں۔ میں جون کے سنگدل سورج کے نیچے ٹھنڈے لیموں پانی کا ذائقہ زبان پر محسوس کرتی ہوں...... آپ کی آگے بڑھتی تنخواہ میرے اندر گرم جوش مسرت کی لہریں پیدا کرتی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے میں بہت اچھا داستان گو ہوں اور مجھے اپنی اس صلاحیت کا ہرگز اندازہ نہ تھا۔ جانتی ہو پہلے وقتوں میں داستان گو ایک مقبول منصب ہوتا تھا۔ چاندنی راتوں میں وہ داستان کا آغاز کرتا اور تارے ڈھل جاتے لوگ سنتے رہتے۔'' ندیم رجب بیگ مسکرائے۔

وہ مسکرائی اس لیے نہیں کہ بیگ صاحب نے عمدہ بات کی تھی بلکہ اس پر کہ سماں نے تب ایسا ہی محسوس کیا ہوگا۔

''آپ کے احوالِ حیات میں ایک کمی لگ رہی ہے...... یہ محنت کش، باصلاحیت، بلند خیال لڑکا جب اپنے ساتھ تنہا ہوتا تھا تو...... کیا سوچتا تھا؟ زندگی اور محبت کے بارے میں آپ کا تخیل کس حد تک تھا؟'' رشناج نے ایک روز پوچھ لیا۔

''اول تو ذہنی و جسمانی مشقت تھکا اتنا دیتی تھی کہ تکیے پر سر رکھا اور سوئے...... دوسرا میرے خواب بھی مادی عروج کی انتہاؤں پر رکتے تھے...... اور وہ اس لیے نہیں کہ مجھے بہترین کھانے پینے یا رہنے کی حسرت تھی...... نہیں، میں جیسے یہ کر دکھانا چاہتا تھا کہ جس پر لوگ اتنا ناز اور غرور کرتے ہیں وہ میں بھی رکھتا ہوں مگر ناز اور غرور کے قابل نہیں سمجھتا...... شاید میں واضح نہ کر پاؤں...... میں گویا اپنے گھر والوں کو سب کو بہت، بہت آسائشات فراہم کر کے خود کو الگ کہیں رکھ کر دیکھنے کے لطف سے اندوز ہونا چاہتا تھا......'' بیگ صاحب نے دور خلا میں نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

ندیم رجب بیگ کے ساتھ گاڑی میں آتے جاتے رشناج نے بہت سی باتیں نوٹ کیں، وہ بھی جن کا تعلق ڈاکومنٹری سے نہیں تھا۔ وہ عابدہ پروین کو سنتے تھے۔ وہ کبھی کبھی اچانک اداس سے لگنے لگتے تھے، وہ قہقہہ لگا کر بہت کم ہنستے تھے۔ وہ اعلیٰ درجے کے پُراعتماد اور مضبوط سہی مگر کہیں اندر کسی تہ میں وہ کمزور اور کم اعتماد تھے جسے کوئی بہت باریک بین ہی پہچان سکتا تھا...... منعم پیرزادہ تو پاپ فاسٹ میوزک کے سوا کچھ سننے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ منعم سنجیدہ بھی ہوتا تو کسی قہقہے کے انتظار میں...... مگر وہ منعم اور ندیم کا تقابل کیوں کر رہی تھی...... آخر وہ کیا سوچے جا رہی ہے۔

داستان گو اپنے محل کی چھت پر نشست بردار تھا۔ چاندنی تو خوب تھی مگر ٹیوب لائٹس بھی آن

تھیں چھت کے کناروں پر سرسبز پودوں والے دیدہ زیب گملے تھے جن کا ایک، ایک پتا صاف اور چمکیلا تھا۔ ملازمین مشروبات اور پھلوں کی سلیقے سے وضع کر رہے تھے۔ ان کا طریقہ مہذب اور تربیت یافتہ تھا۔ سی گرین ٹی شرٹ اور اس کے گہرے شیڈ میں جینز کے غیر رسمی لباس میں ندیم رجب بیگ خاصی بدلی ہوئی شخصیت لگ رہے تھے۔ چہرے پر ایک نمکین سی تمازت اور مصفا طمانیت، روشن گہری آنکھوں میں خاموشی وہ چہرے سے الجھی تھی کہ لہجے کے سحر نے گرفتار کر لیا۔ ندیم نے کمپنی میں گم پلانٹ خود اسٹارٹ کیا...... اس نے کر گزرنے کی حدیں پار کر دیں۔ پہلے پہل سیمپل بنانے پڑتے ہیں اس نے 175 سیمپل بنائے۔ ہاتھ سے کام کرتا تھا ناخن جل گئے تھے۔ اتنے اپنے پن اور لگن سے محنت کی شب و روز کا فرق بھول گیا۔ جب سیمپل مارکیٹ میں گئے تو وہ تھک کر چور ہو چکا تھا اور فکر مندی نے نیندیں اڑا دی تھیں۔ کمرشل رسپانس کا انتظار تھا اور یہ رسپانس ریکارڈ توڑ پسندیدگی کی صورت ملا تو وہ خوشی سے ناچ اٹھا۔ نقوی صاحب بلائیں لیتے، بیٹا بیٹا کہتے نہ تھکتے تھے۔ اس کی تنخواہ ساڑھے تین ہزار سے بارہ ہزار کر دی گئی۔ یہ ماں کی دعائیں تھیں...... دعا کسی اور نے بھی تو کی تھی...... مگر اب وقت نامی چڑیا اس کے دریچے میں نہ تھی۔ اگلے سال ندیم رجب نے ایک اور پروڈکٹ لانچ کر دی...... حریف کمپنیاں بوکھلا گئیں۔ نقوی صاحب کے ہاتھ کون سا جن لگا تھا۔ پروڈکٹ کی دھوم ندیم رجب کی دھوم تھی۔ اب اس دیہاڑی دار مزدور کو ریٹ لگا کر، بولی لگا کر مانگا جا رہا تھا۔'' یہ کہتے، کہتے ندیم بیگ صاحب کی آواز بھرا گئی۔ وہ سر جھکا کر چند منٹ خود کو کنٹرول کرتے رہے۔ رشناج نے گلاس میں پانی انڈیل کر ان کے سامنے رکھا...... انہوں نے سر اٹھاتے ہوئے گلاس تھاما۔

''شکریہ!'' کہہ کر ایک گھونٹ لیا اور پھر کہا۔ ''اللہ آپ کے ہاتھ سلامت رکھے۔'' پھر ہلکا سا مسکرا کر کہا۔ ''اس طرح کی چھوٹی چھوٹی اچھی دعائیں استنبول میں سن کر عادت ہوئی تھی...... اچھا لگتا ہے۔''

''جی...... بہت اچھا لگتا ہے۔'' رشناج نے تائید کی...... وہ گلاس رکھ کر گویا ہوئے۔

''ہاں کہانی...... آگے بڑھتی ہے...... ان دنوں کمپنی میں وہی سپرنٹنڈنٹ ندیم کے ماتحت سلیکٹ ہوا جس نے اسے کہا تھا کہ تم ماہانہ تنخواہ کے قابل نہیں ہو...... مگر جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اسی کم عمر اناڑی کے ماتحت کام کرنا ہوگا تو کسی بدلے کے اندیشے سے واپس چلا گیا۔ حالانکہ وہ کام کرتا تو ندیم اسے کبھی احساس نہ دلاتا...... بہرحال اسی سال ندیم کو یورپ کے ٹور پر بھیجا گیا۔ اس کے خاندان کے لیے حیران کن اور قابلِ فخر بات تھی مگر ندیم کے لیے نہیں...... اس نے اپنی منزل کسی کے تحت کام کرنا نہیں سوچی تھی، اس کی منزل اپنے لیے کام کرنا تھا۔ یورپ سے نقوی صاحب نے جتنی مشینری منگوائی ندیم پر بھروسا کیا...... ندیم اس تجربے کو اپنے مستقبل کے لیے محفوظ کرتا چلا جا رہا تھا...... erectio، انجینئرنگ، سول بلڈنگ، سیلز، انوویشن سب کچھ ندیم کی مٹھی میں تھا۔ وہ نئے مشہور برانڈز لا رہا تھا۔ وہ چھا چکا تھا۔ نقوی صاحب نے اسے آل اِن آل کر دیا تھا۔ جی ایم کے عہدے پر لا بٹھایا تھا۔ وہ جو پہلی بار ملتان سے کراچی چلا تھا تو ایک نہتا اناڑی، کم سن اجنبی، پردیسی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اب صبح جرمنی ہوتا تو شام فرانس، جہاز اس کے قدموں تلے رہتا۔

ندیم جرمنی میں تھا جب ماموں کے انتقال کی خبر ملی۔ گویا آسمان گر پڑا۔ چنگی شالی کی گلیاں، گھر، اسکول، ماموں کی آمد اور ان کے تحفے اور سائیکل کا تحفہ...... یوں لگا جیسے خوشیوں کا خزانہ تھا جو کھو گیا۔ ترقی کے جنون میں بھاگتے، بھاگتے وہ کتنی دور نکل آیا تھا۔ وقت کہاں دبے پاؤں نکل گیا تھا۔ ماموں

کی آنکھوں میں رکا وہ سوال جس کے جواب سے نظریں چرا کر وہ چلا آیا تھا۔ کیسی ہوگی سیماں؟ ذہن یادوں سے الجھا رہا...... جرمنی سے واپسی رپورٹ کر کے کراچی سے ملتان کی فلائٹ پکڑی۔ ماموں کا تخت پوش گاؤ تکیہ خالی پڑا تھا۔ ماموں نے دونوں بیٹوں کی شادیاں تو کردی تھیں، ایک بیٹا بہو بہاول پور رہتے تھے۔ دوسرا ماموں کے سامنے والے گھر میں...... مگر پتا چلا کہ وہ بھی یہ مکان بیچ کر بہتر جگہ شفٹ ہوگئے ہیں۔ مامی اور سیماں تھے گھر کو خاموش اداسی نے گھیر رکھا تھا۔ ندیم خود کو مجرم سمجھ رہا تھا۔ سیماں... سامنا کرنے سے کترا رہی تھی۔ جب رات کو وہ ماں کے برابر والے پلنگ پر لیٹا تو ماں بیٹوں میں یادوں کی دُہرائی چل پڑی۔ نومبر کی سرد رات غم زدہ اور اداس تھی۔ ماموں کا گھر رونق سے بھرپور ہوتا تھا اب وہاں اِکا دُکا مہمان کے علاوہ مامی اور سیماں اکیلے تھے۔

''کیا اب بھی اس فیصلے کا وقت نہیں آیا ندیم؟ جبکہ تم اپنا نیا بڑا گھر بنوانے کا سرمایہ جمع کر چکے ہو۔'' ندیم نے خود سے سوال کیا۔

''اچھی ماں......'' اس نے رک کر پکارا۔

''ہاں میرے لعل......''

''سیماں آپ کو کیسی لگتی ہے ماں؟''

''سیمی تو جنت کی حور ہے، حوروں جیسی صورت اور حوروں جیسی سیرت......'' ندیم زیر لب بے ساختہ مسکرا پڑا حوروں کی سیرت کا ذکر آج تک سنا نہ تھا مگر ماں سرد آہ بھر کر یہ کہہ رہی تھی۔

''کاش تم میں سے کوئی اس سے شادی کرلیتا...... فہیم یا......''

''فہیم نہیں...... ماموں مجھ سے بہت پیار کرتے تھے...... آپ...... اب بات کرلیں۔'' ندیم نے جھجک کر مدعا بیان کرہی دیا۔

''تو کیا...... کیا تمہیں پتا نہیں ہے؟'' ماں سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگیں۔

''کیا...... کیا ماں؟'' ضرور کچھ بہت بڑا ہو چکا تھا۔

''سیمی کا نکاح ہو چکا ہے۔''

''نکاح......؟ کب؟...... اتنی بڑی خبر مجھ سے چھپائی گئی۔''

''بھائی نے...... بس موت سے دو ہی دن پہلے تمہاری مامی کے بھانجے سے کمرے میں سادہ سا نکاح پڑھوایا...... میں لاکھ فہیم سے کہتی رہی مگر اسے کوئی اور پسند آ چکی تھی......'' ماں نے بتایا۔

یہ کیا ہوا؟ روشنی کی ایک لکیر تھی جو بند ہوگئی اور گھپ اندھیرا ہوگیا تو کیا سیماں کو اس سے کوئی وابستگی نہیں تھی۔ ماں نے اسے فون کر کے کیوں نہ بتادیا۔ وہ کوئی بھی گلہ نہ کرسکا مگر ماں اس کی غیر معمولی خاموشی اور آنکھوں کی نمی کو دل پر محسوس کررہی تھی۔ اس موضوع پر اب کہنے کو کیا باقی تھا وہ چپ رہی...... ندیم نے ہی سکوت توڑا۔

''کون ہے وہ......؟ اس کا نام...... کیا ہے؟''

''نام......؟ شکیل نام ہے...... پرائمری اسکول ٹیچر ہے۔ گاؤں میں رہتے ہیں...... میرا بھائی سوچتا ہوگا جس بہن کی ہر دکھ مصیبت میں مدد کی۔ کسمپرسی میں پناہ دی...... اس کا بیٹا امیر ہوا تو...... بہن کا دماغ اونچا ہوگیا...... یا اسے میرے دماغ کا تو بھروسا تھا...... یہ یقین تھا کہ تمہارا دماغ اونچا ہوگیا۔'' ندیم کو ایک اور جھٹکا لگا اس پر وہی الزام لگ گیا جس سے اسے شدید جنگ تھی۔ وہ کس بری طرح ہار گیا۔ اسے اندازہ کرادیا گیا کہ دولت سے خوشی ملتی ہے تو جاؤ لے آؤ...... ماں فہیم کے لیے منتخب ہونے والی لڑکی کے کوائف بتا رہی تھیں اور اسے بھی جلد شادی کرلینے کی تلقین کررہی تھیں...... مگر اس کی سماعتوں سے لے کر قلب تک برف جم چکی تھی۔ وہ جتنے دن وہاں رہا سیماں سامنے تک نہ آئی۔ ہوا کے جھونکے کی طرح اِدھر اُدھر نکل جاتی۔ کتنی خاموشی سے یہ باب ہی بند ہوگیا۔ فہیم کی بات طے کردی گئی۔ اس دوران شہر کے پوش ایریا میں بڑا سا پلاٹ خرید لیا گیا۔ فہیم کی شادی گھر کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد ہونا تھی۔ یہ کام کرنے کے بعد ندیم چکی شمالی ابا جی کا فاتحہ دینے چلا گیا۔

چکی شمالی میں کچھ بھی تو نہ بدلا تھا۔ سب کچھ جوں کا توں تھا۔ بس چند نئے مکانات، کچھ نئے پیڑ پودے، اسکول کی عمارت پہلے سے بھی خستہ حال، پانی کے حصول کی دقت جو پہلے معمول کا حصہ لگتی تھی۔ اب نہایت تکلیف دہ لگی۔ انسان کی زندگی کا معیار اس قدر کمتر کہ بارشوں کا پانی اکٹھا کر کے دِنوں استعمال کرے...... جانور اور انسان ایک پانی میں نہائیں۔ یہ مناظر اذیت ناک تھے۔ وہ قبرستان سے لوٹ رہا تھا کہ دیکھا ایک عمر رسیدہ عورت گدھے پر پانی سے بھرے دو گیلن لیے جاتی تھی۔ کہیں کھڈے میں گدھے کا پاؤں رپٹا اور گیلن گر گئے، ڈھکن پرانے تھے ڈھیلے تھے تمام پانی گر گیا۔ وہ عورت اتنی روہانسی ہوئی کہ ترس آتا تھا۔ رقت کے مارے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر گریہ وزاری کرنے لگی۔

''ہاہا...... ہائے...... خدا...... اب کیا کروں گی میں...... پانی کو ترستے مرجائیں گے ہم تو، کب ہماری سنے گا...... ہائے ہائے آب...... ہائے آب......!''

ندیم نے اسی لمحے سوچا کہ اس بستی میں سب سے پڑھا لکھا، پیسے والا میں ہی ہوں میری ذمے داری بنتی ہے کہ چارہ گری کروں...... مجھے کچھ بھی کرنا ہوگا یہاں پانی لانا ہوگا...... جو بات ندیم کے ذہن میں داخل ہوجاتی تھی وہ جم جاتی تھی اور نہیں نکلتی تھی۔

ندیم نے سب سے پہلے ایشین بینک سے رابطہ کیا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ ایشین بینک دور دراز مقامات تک پانی لے جانے کے پروجیکٹ پر کام کرتا ہے۔ ان کی ٹیم کو چکی شمالی کا وزٹ کرایا۔ پانی کا زیرِ زمین لیول چیک کرایا...... واپس کراچی بھی جانا تھا اس لیے گاؤں کے پڑھے لکھے سمجھ دار افراد پر مشتمل کمیٹی

چھوڑو بھی

عاشق نے کہا۔ ''تمہارے بال دیکھ کر ساون کی گھٹائیں یاد آتی ہیں۔''

محبوبہ نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''اچھا۔''

عاشق نے کہا۔ ''تمہاری آنکھیں تو بالکل ہرنی جیسی ہے۔''

محبوبہ۔ ''واقعی!''

عاشق۔ ''تم جب چلتی ہو تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی مورنی جنگل میں رقص کررہی ہو۔''

محبوبہ شرم سے دُہری ہوگئی اور بولی۔

''اچھا ایسا ہے۔''

عاشق نے کہا۔ ''تمہارا چہرہ تو چاند سے بھی حسین اور روشن ہے۔''

محبوبہ سے اتنی تعریف ہضم کرنا مشکل ہوگئی بولی۔ ''کیا کہہ رہے ہو...... اب چھوڑو بھی۔''

عاشق نے کہا۔ ''میں اب تک کیا کر رہا تھا چھوڑ ہی تو رہا تھا۔''

مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

سوداگر

سنو!\
میں ہوں کچھ بیچنے آیا\
اگر تم کو ضرورت ہو\
تو پھر کچھ بھاؤ کرتے ہیں\
مرے حصے کی سب خوشیاں\
مری یہ روح یہ جسم و جاں\
تم اپنے نام لکھوالو\
میں ہوں بے نام سا بندہ\
یہ سب کچھ مجھ سے لے کر تم\
مجھے اِک نام دے دینا\
کہ اپنی زندگانی سے\
مجھے اِک شام دے دینا

شاعر: ارشد محمود ارشد\
مرسلہ: ثنا اجالا، بھلوال

بنادی۔ اس میں بیس ارکان تھے...... تمام تحقیقات کے معائنہ جات کی فائل بنائی گئی اور کیس اپروو ہونے کے لیے متعلقہ محکمہ اور افسران بالا کو بھیج دیا گیا۔ ایشین بینک کی ٹیم نے وعدہ کیا تھا کہ اگر چھ کلو میٹر گہرائی تک پانی میٹھا نکل آیا تو یہ پروجیکٹ شروع ہوجائے گا گھر گھر دعائیں مانگی جارہی تھیں۔

جب پانی تک رسائی کے لیے بورنگ شروع ہوئی تو بستی کے چھوٹے بڑے جمع تھے مگر جب پانی کا پہلا ڈول اوپر آیا تو پانی کڑوا اور ناقابلِ استعمال نکلا۔ ایک سناٹا چھا گیا۔ مایوسی نے ہر چہرے پر ڈیرے ڈال لیے۔

ٹیم نے کچھ فاصلے پر جا کر دوبارہ بورنگ کی، دو دن بعد پانی نکلا مگر وہ بھی کڑوا، بڑے بوڑھے کہنے لگے کہ ساری بستی کی زمین زہریلی ہے۔ یہاں سانپ بھی زیرِ زمین جاکے مرجاتے ہیں مگر پانی کی کمیٹی کے بے حد اصرار اور منت سماجت پر ایک ہفتہ بعد تیسری اور زیادہ گہری بورنگ ہونے لگی۔

اب تو ہر ضرب پر دھڑکن بڑھتی تھی، خوف کے مارے دم سادھے بندے ٹھہرے تھے، عورتیں روتی، ناک سنکتی اور آنچل پھیلاتی تھیں۔ ندیم بھی اس موقع پر موجود تھا۔ اس لمحے سے ڈر لگتا تھا جب کڑوے پانی کی خبر ملے۔ ندیم مایوس ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے دل میں فیصلہ کرلیا تھا خواہ اب بھی پانی کڑوا نکلے وہ اس کام سے پیچھے نہیں ہٹے گا۔

مگر بدقسمتی نے راہ دیکھ لی تھی، تیسری ناکامی ایک بم دھماکا تھی۔ ہر شخص کے چہرے کا لہو نچڑ گیا۔ امید کی روشنی بجھ گئی، یہاں ہر جگہ زیرِ زمین پانی ایک جیسا تھا۔ لوگوں نے سمجھ لیا کہ نسل در نسل یہی ان کا نصیب ہے، وہ آہیں بھرتے منتشر ہوگئے۔

ندیم ٹیم کے انچارج سے وقت لے کر ملنے پہنچ گیا۔ اس نے بتایا کہ اس کا اس بستی سے تعلق اب صرف والد صاحب کی قبر جتنا ہے وہ واپس چلا جائے گا اور سب کچھ بھول بھی جائے گا مگر یہاں انسان بستے ہیں جانور اور پرندے بھی پانی پر حق رکھتے ہیں۔ یہاں 40 فیصد اموات پانی کی عدم دستیابی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ اسے یہاں پانی لانا ہے کسی بھی قیمت پر لانا ہے، قیمت کی پروا نہ کی جائے۔ انچارج نے اس کے جذبے کی تحسین کی اور کہا وہ بستی کی وڈیو بنا کے ویوژل رپورٹ فرانس ہیڈ آفس بھیجتا ہے۔ اس کے علاوہ پرنٹ میڈیا، سوشل میڈیا میں بھی اس کو پھیلایا جائے گا۔ نیز کمیٹی کی سطح پر وفاقی حکومت، صوبائی حکومت اور صاحبِ حیثیت لوگوں سے گرانٹ اور فنڈ کی اپیل کی جائے۔

اس ساری صورتِ حال کا افسوس ناک پہلو یہ ہوا کہ علاقے کے ممبر قومی اسمبلی نے ندیم کی مخالفت شروع کردی۔ وہ یہ خیال کررہا تھا کہ وہ لوگوں کے دل جیت کر سیاست میں آنا چاہتا ہے اور پیسے اکٹھے کر کے مال بنانا چاہتا تھا۔ بستی کے کچھ لوگ ندیم رجب کے خلاف ہوگئے۔

ماں کو ان باتوں کا پتا چلا تو فون پر ناراض ہوئیں۔ کہنے لگیں صدیوں سے جہاں پانی نہیں ہے تم کہاں سے لاؤ گے؟ وقت اور سرمایہ برباد کرو گے البتہ اگر کوئی امید ہوتی تو میں ضرور تمہارا... ساتھ دیتی۔ ندیم نے یقین دلایا کہ اسے امید ہے۔ دعاؤں کے ساتھ اس کا حوصلہ بڑھایا جائے اسے روکا نہیں جائے تب ماں نے مسندِ دعا سنبھال لی۔ نقوی صاحب کو اس جدوجہد کا علم تھا وہ بھرپور حوصلہ افزائی کررہے تھے۔ ندیم رجب کو اُن کے تعاون سے وقت اور مہلت مل رہی تھی۔ ندیم نے ایشین بینک کے معاہدے اور بانڈز کی کاپیاں کرا کے بستی کے لوگوں میں تقسیم کی، گھر گھر جا کر شکوک و شبہات دور کیے۔ ایم این اے سے ملاقات کا ٹائم لیا تاکہ باہمی لڑائی کو ختم کر کے مجموعی فلاح کے لیے کام کیا جائے۔ پانی کمیٹی نے ایم این اے کو یقین دلایا کہ اس کارِ خیر میں اس کی شمولیت سے اس کی عزت اور محبت بڑھے گی۔ اگر یہ کام ہوگیا اور اس کی مخالفت جاری رہی تو اسے ہمیشہ پانی لانے والوں کے مخالف کی حیثیت دی جائے گی، بات اس کی سمجھ میں آگئی۔

یہ سلسلہ ایک دو سال کا نہ تھا، اس میں پانچ برس لگے، پانچ برس میں ملتان کی عالیشان کوٹھی تکمیل پاگئی، لاہور میں ایک کوٹھی خرید لی گئی۔ ندیم رجب بیگ نے لاہور میں پہلا اور پھر ملتان میں دوسرا فوڈ پلانٹ لگالیا۔ سیماں اور فہیم کی شادیاں ہوگئیں۔

چکی شالی میں پانی کیسے آیا؟ پہاڑوں کے ساتھ نہر میں سے فلٹر لگوا کر پہاڑوں اور سنگلاخ سطحوں میں سے پائپ گزار کر بستی تک پانی پہنچایا گیا۔ یہ مہنگا اور لمبا کام تھا...... بہت سے ساتھی ساتھ چھوڑ گئے، البتہ کچھ نوجوان نئے شامل ہوگئے، گویا فرہاد کی طرح دودھ کی نہر کھود کے لانے کے مترادف تھا۔ مکانوں پر پانی کے میٹر لگوائے گئے تاکہ پانی بے دریغ ضائع نہ ہو...... لوگ پانی کے لیے خصوصاً تازہ صاف پانی کے لیے اتنے ترسے ہوئے تھے کہ وہ پانی ضائع کرنا گناہ سمجھتے تھے لیکن حفظِ ماتقدم ضروری تھا۔ جس دن پائپوں سے نکل کر پانی ٹونٹیوں سے بہنے لگا۔ جس دن ہر گھر میں پانی تھا۔ جس دن لوگوں کے چہرے دُھلے ہوئے، لب سیراب تھے اور زبان پر اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے ندیم رجب کے لیے دعا تھی وہ عیدوں کا سردار دن تھا......

ماں جی، فہیم، مامی، ندیم گاؤں میں پہنچے ہوئے تھے۔ اتنی خوشی! اتنی خوشی بستی کے ہر گھر میں بھری ہوئی تھی کہ دعاؤں کا ساون برس پڑا تھا۔ بچپن کی بارشوں سے بڑھ کر خوشی کا سماں تھا، ایشین ٹیم والے کپڑے دھوتی عورتوں، نہاتے بچوں، پانی پیتے جانوروں، پرندوں، ہرے بھرے پودوں، ہنستے مردوں کی تصاویر بنا رہے تھے۔

''رشناج ...... اس دن مجھے معلوم ہوا...... خدمت میں خدا مل جاتا ہے اور کہیں نہیں ملتا۔ مخلوق کی خدمت میں خدا چل کر ہمارے پاس آجاتا ہے، بندے کو گناہ اور کوتاہیاں دُھلتی محسوس ہوتی ہیں...... رشناج...... جس نے جو جنون پالا وہ اس کو بالآخر مل گیا...... شکر خورے کو شکر بالآخر مل جاتی ہے...... میرا جنون جائز اور بے حساب کمانا اور...... بلانت، لوگوں کے لیے خرچ کرنا تھا...... اور ہے......''

جبھی رشناج نے کہا۔ وہ ماں جی سے ملنا چاہتی ہے۔

''وہ بہت کم بلکہ گنتی کے لوگوں سے ملتی ہیں، اپنی محدود زندگی میں مطمئن ہیں۔ عبادت گزار تو جوانی سے ہی تھیں......'' رشناج نے اصرار کیا... کہ میری درخواست ان سے ضرور کیجیے گا...... رشناج کے لیے کہانی میں ابھی دو تجسس تھے۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی۔

''پھر بھی آپ امیر سے امیر ترین کیسے بن گئے؟ اور کوئی اداسی ہے جو آپ کی شخصیت کا حصہ ہے یہ کیسی اداسی ہے؟'' مگر ملاقاتیں منقطع ہوگئیں۔ منعم لاہور آچکا تھا...... اور لاہور میں منعم کا ہونا یعنی رشناج کو ہر گھڑی اس کے ساتھ ہونا تھا...... وہ دونوں ریستوران میں بیٹھے تھے۔ منعم پیرزادہ پہلے سے زیادہ ہینڈسم، دلنشین اور اعلیٰ ترین ملبوس میں اس کے سامنے بیٹھا خواب آلود لہجے میں اس کو مس کرنے کی سرگوشیاں کررہا تھا کہ اچانک پاس سے گزرتے ویٹر کے ہاتھ میں برف کے کیوبز کی ٹرے چھلکی اور ایک برف کی ڈلی منعم کے ہاتھوں پر آگری منعم کا چہرہ غصے سے مسخ ہوگیا اور ساری نرماہٹیں بھک سے اُڑ گئیں۔ وہ چلایا۔

''اوہ...... ڈاگ، بلائنڈ......''

''کوئی بات نہیں، کم آن۔'' رشناج نے فوراً ہی منعم کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

''سوری سر...... سوری جناب۔'' ویٹر سوری کی گردان کررہا تھا اور ہال تماش بین تھا۔

"ڈنگر...... بی ہیو کرنے کی ٹریننگ نہیں دی جاتی تم (فحش گالی) لوگوں کو۔"

"سر...... گالی نہیں...... سر......" وہ برف کی اِدھر اُدھر پڑی ڈلیاں اٹھاتا ہوا منت کرتا جا رہا تھا۔

"تو مجھے روکے گا......؟ تڑی دے گا؟" منعم ایک دم کھڑا ہو گیا۔ ہوٹل کا منیجر دوڑا آیا اور وہ مزید "ایکسٹریملی سوری" کرنے لگا۔ منیجر نے ویٹر کو مزید ڈانٹا تو رشناج نے مداخلت کی۔

"اٹس اوکے...... ویٹر سے جسٹ مسٹیک ہوئی ہے......" منعم لال بھبھوکا چہرہ لیے بیٹھا رہا۔ جیسے اس کی بہت بڑی توہین ہو گئی ہو، اس کا موڈ بحال ہونے میں نہیں آ رہا تھا لہٰذا وہ دونوں اٹھ گئے۔ گاڑی چل رہی تھی اور رشناج کی سوچیں چل رہی تھیں۔ "کیا قارون نو دولتیا تھا اور فرعون جدی پشتی دولت مند......؟ کیا فرق دولت لاتی ہے یا فرق مزاج کا ہوتا ہے؟ زندگی کے مجموعی رویے میں ہمارے طبقے کا گھمنڈ، خود پسندی، انا پرستی، اسراف، اور سب سے بڑھ کر مسرت، عزت اور احترام کا معیار صرف دولت کو سمجھنا کس قدر مکروہ ہے مگر ہمیں کبھی مکروہ لگتا ہی نہیں...... کتنے نایاب احساسات ایسے ہیں جن سے پیدائشی امیر نابلد جیتا ہے، بالکل عاری ہوتا ہے، درحقیقت غریب پر غور کرنا پیدائشی امیر کا اپنے آپ کو ہیچ کرنا ہے کیونکہ غربا فقرا سے بولنے کا لہجہ اور ٹون بھی الگ ہوتی ہے اور الفاظ بھی اور ہوتے ہیں۔ خواہ یہ حکمیہ نہ ہو مگر اس میں اکتاہٹ گویا کسی چھوٹے دماغ سے پالا پڑ گیا ہو، رچی ہوتی ہے۔"

"کیا سوچ رہی ہو ڈیئر......؟ اتنی دیر سے چپ ہو......" منعم پیرزادہ پھولوں کی نمائش میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

"آئس کریم کھاؤ گی......؟" اس نے انکار کر دیا۔ "کم آن یار...... تم تو میرا موڈ ٹھیک کر رہی تھیں، اب خود...... leave that fuss"

رشناج نے زبردستی مسکراہٹ کا مظاہرہ کر کے خوشگوار ہونے کا تاثر دیا۔

"یہاں لاہور میں کچھ بھی ایسا نہیں ہے جہاں انجوائے کیا جا سکے، ڈانس کلب تو بہت وکٹورین بات ہے یورپین ملک بہت آگے جا چکے ہیں، ہر شخص کی اپنی لائف ہے، ہر شخص کو اپنے طور پر انجوائمنٹ...... کا حق ہے کوئی جگہ تو ایسی ہو کہ ذہن پر لگے جالے صاف ہو جائیں...... پاکستانی قوم مسائل کی مار کھائی ہوئی، تھکی ٹوٹی ہوئی ہے ہماری sick سوچیں ہیں...... ہمارا کتھارسس رونا آنسو بہانا ہے...... ہمارے سر میں درد ہے کہ ہم قوم کا غم کھاتے رہیں۔ اس کا درد اپناتے رہیں، روزانہ ٹی وی پر وحشت کے منظر دیکھ کر مجذوب بن جائیں۔ میں پاکستان میں رہنا نہیں چاہتا، ٹھیک ہے ہمارے assests ہیں پراپرٹی، کاروبار...... وہ سب رہیں مگر... ہم نہ رہیں...... کیا کہتی ہو ڈارلنگ...... شادی کریں اور چلیں یہاں سے۔"

"ہم نے ڈیسائڈ کیا تھا کہ شادی میں جلد بازی نہیں کریں گے۔" رشناج نے آئی پوڈ سے دیدہ زیب پھولوں کی تصاویر لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو انڈر اسٹینڈ کرنے کے لیے ٹائم لیا تھا نا...... وہ تو کر لیا۔"

"کر لیا......؟" وہ موبائل بند کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں...... تمہارا پروجیکٹ بھی مکمل ہو گیا؟"

"تقریباً......"

"کیا نام تھا اس نو دولتیے کا...... کیا تھا وہ؟"

"یوں نہیں منعم...... نو دولتیا لفظ میں نیگیٹو تاثر ہے...... وہ سیلف میڈ capitalist ہے۔"

"اس نے شادی کیوں نہیں کی؟ کوئی فزیکل فالٹ ہی ہوگا۔" دوسری نخوت کا مظاہرہ...... "ویسے پروپوزل تو یہ بھی اچھا ہے...... یہی سوچتی ہوگی تم۔"

"جیلسی......؟" وہ ہنس پڑی۔

"ارے جیلسی کیسی......؟ اولڈ بوائے سے شادی کا ڈراما کر لو پھر چپکے سے پتا کاٹ دیں گے...... کیا ونڈر فل آئیڈیا ہے۔" رشناج حیرت سے پتھر کی ہو گئی...... وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تمہارے تیر نظر سے کچھ تو گھائل ہوا پڑا ہوگا...... یا ربائی گاڈ you can do"

"منعم......" وہ کراہ اٹھی۔

"ہاں...... منعم کی جان......" اسے پروا نہیں تھی۔

"اتنا horrible joke نہ کرو......" وہ دکھ سے چور ہو گئی تھی۔

"اوکے...... ٹیک اٹ ایزی......" رشناج کو افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے ندیم رجب کے اثاثے اور کاروبار کا کیوں بتایا...... منعم لاکھ بنے کہ وہ مذاق کر رہا تھا مگر تاثرات سچ بول چکے تھے۔

اُدھر رشناج کی ممی بھی بیٹی کی زبانی ندیم رجب کی دولت کا سن کر اٹک سی گئی تھیں۔ رجب فوڈز چین، دبئی اسٹائل رجب ہوٹل، سو بیگھے زرعی زرخیز زمین، باغات، لائیو اسٹاک، ملک پلانٹ اتنی چمک تھی کہ اپنی طرف کھینچتی تھی۔ پہلی بار وہ منعم پیرزادہ کا فون سننے سے معذرت خواہ ہو گئی تھیں۔ اب وہ رشناج سے منعم کے بجائے ندیم رجب کی باتیں کرنے لگی تھیں اور اُن کے لہجے کی تراوٹ اُدھر منتقل ہو گئی تھی۔ رشناج اسے اپنے بیانیہ کی کامیابی قرار دے رہی تھی۔ یہ اس کی خوش گمانی تھی۔

رشناج، ندیم رجب بیگ سے والدہ صاحبہ کی ملاقات کے ٹائم لینے کی خاطر دو بار فون کر چکی تھی لیکن وہ ملک سے باہر تھے اور سیکرٹری کو واپسی کا معلوم نہیں تھا۔ ڈاکومنٹری کا ریکارڈ پروڈیوسر خالہ کو دے دیا گیا تھا۔ کرداروں کا انتخاب ہو رہا تھا یہ کام تو ایک طرح سے ہو ہی چکا تھا مگر اس شوق نے تین زندگیوں کو ہلا دیا تھا۔ حالات پہلے جیسے نہیں رہے تھے اور یہ سب کچھ رشناج کی طرف سے تھا۔ ندیم رجب کے بارے میں ایسی کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی تھی۔

منعم پیرزادہ اب بھی پہلے کی طرح سارا وقت رشناج بٹ کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا مگر اسے وہ رسپانس نہیں مل رہا تھا۔ وہ ہوشیار اور ذہین تھا اور اس کا سبب جاننا چاہتا تھا۔

منعم پیرزادہ اپنے والد پیرزادہ صاحب کے ساتھ گاڑی میں سائٹ پر جاتے ہوئے اچانک بٹ صاحب کے ہاں آ پہنچا تھا۔ دراصل اس نے ہی والد صاحب سے اصرار کیا کہ کچھ وقت نکال کر ملا جائے۔ پیرزادہ خاندان کا حشم...... رکھ رکھاؤ، برسوں سے دوستی اور ہم پلہ برادری کو یوں نظر انداز کر دینا رشناج کی ممی کے بس کی بات نہیں تھی جبکہ رشناج کے پاپا ان کی آمد سے بے حد خوش اور پُرجوش تھے۔ باتوں، باتوں میں شادی کی تاریخ رکھنے کے لیے پیرزادہ خاندان کے جلد ہی آنے کی بات بھی ہو گئی۔ رشناج گھر پر نہیں تھی۔ وہ واپس آئی تو یہ نئی خبر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ رشناج نے اتنی اہم خبر کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بتایا کہ اسے ایک بار پھر ملتان جانا ہے۔ ممی کی آنکھوں میں تارے چمکے۔

"کب......؟ میں بھی چلوں؟"

"آپ کس حساب میں ممی......؟ ہم ان کے رشتے دار نہیں ہیں۔"

"نہیں ہیں تو کیا ہوا، ہو تو سکتے ہیں۔" ممی نے سرا پکڑا۔ رشناج اسی ماحول کی جم پل تھی۔ اتنی بے وقوف نہ تھی کہ ممی کا مطلب سمجھ نہ پاتی تاہم تجاہلِ عارفانہ سے پوچھا۔

"کیا مطلب......؟"

"مطلب ہے کہ...... رشی تو نے بتایا تھا کہ رجب بیگ کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی...... کوئی وجہ تو ہوگی؟"

"وجہ معلوم کرنے کے لیے ان کی والدہ سے مل رہی ہوں۔"

"اتنے مال ملکیت والا ہے، ہزاروں کی نگاہ میں ہوگا...... شاید قسمت نے اسی لیے تم سے ملایا ہو بے بی۔" رشناج اپنے ہینڈ بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے رک گئی۔

"مما...... آپ کو پیرزادہ بھول گئے...... اور ابھی مجھے کیا نیوز سنا رہی تھیں آپ؟"

"تو ہم کوئی باؤنڈ تو نہیں ہیں۔ ایسا better chance نہیں ملتا تو دوڑ کے avail کرتے۔"

"آپ کتنا جانتی ہیں ندیم رجب بیگ کو؟"

"جان لیں گے...... اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"تو پھر آنکھیں بند کر کے آنے والوں کا گولڈ تول لیا کیجیے اور انتخاب ہوگیا...... انڈراسٹینڈنگ تو ڈھونگ ہوا ناں......"

"status کونشس ہونا گناہ نہیں، ہر کوئی ہوتا ہے...... جب ہیرا ہاتھ میں آتا ہے یہ کوئی نہیں دیکھتا کس دلدل سے اٹھایا گیا ہے...... میں نے تو ایک آئیڈیا دیا ہے...... تم نہیں چاہتیں تو ملتان کا یہ آخری چکر سمجھو...... فضول تماشا بند کرو۔" مما غصے سے تلملاتی نکل گئیں۔ رشناج کو بے طرح غصہ آرہا تھا۔

"ایک نامناسب سوچ خواہ مخواہ میرے ذہن میں ڈال دی...... گویا لائن مارنے کا جدید طریقہ اختیار کیا تھا میں نے، کس قدر سطحی اور لالچی ہیں ہم اندر سے۔" وہ اضطراب واشتعال میں سفر کرتی رہی۔

ائرپورٹ پر بیگ صاحب نے گاڑی اور ڈرائیور بھیج دیا تھا۔ وہ عظیم الشان حویلی میں داخل ہوئی...... ملازمہ نے اس کی ماں جی کے کمرے تک رہنمائی کی۔ کمرا کیا تھا...... راحت، سکون اور تقدس کی تصویر تھی، ملائم سفید پردوں پر بادلوں کا گمان ہوتا تھا، سفید بگلوں جیسے گلدان اور پیازی پھولوں کی تازگی، بستر کی چادر تک بے داغ سلکی سفید تھی، بڑی بڑی کھڑکیوں کے پار گلابی، پیازی پھولوں سے لدی بیلیں کمرے کو خوشگوار مہک بھری خنکی مہیا کرتی تھیں۔ ماں جی دیوان پر تشریف فرما تھیں۔ ان کے لباس، رنگ، رنگت اور چاندی جیسے بالوں کا اجلا پن مصفا تھا۔ وہ نرماہٹ سے اشارہ کر کے اپنی تسبیح مکمل کرتی رہیں۔ رشناج صوفے پر بیٹھ رہی...... تسبیح مکمل کر کے انہوں نے ایک منقش ڈبیا میں رکھی، رشناج نے اٹھ کر ادب سے سلام کیا۔

"وعلیکم اسلام...... جیتی رہو...... مجھے ندیم بیٹا نے بتایا مجھ سے ملنا چاہتی ہو تم...... مجھے وجہ سمجھ نہیں آئی۔ میں نہایت سادہ عام انسان ہوں۔"

"جی...... ندیم رجب بیگ صاحب کی لائف پر فلم بنائی جارہی ہے۔ ایک ایسے انسان کی محنت اور تدبر کی کہانی جس نے تن تنہا خود کو عزت، دولت، حشمت کے نمایاں ترین مقام پر پہنچایا بلکہ انسان کی خدمت اور دوستی اور دستگیری کی اور انسانیت کی پہچان کروائی۔"

"یہ اللہ کا کرم ہوتا ہے...... ہوجاتا ہے بیٹی۔"

"آپ کیا محسوس کرتی ہیں......؟ کیا آپ کو کبھی ان کے لڑکپن، بچپن میں لگا کہ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہیں؟" اس دوران تمیز دار تربیت یافتہ ملازمہ نفیس ٹرے میں تازہ جوس لا کر رکھ گئی۔ ماں جی نے سوچتے ہوئے آغاز کیا۔

"صلاحیتوں کا تو مجھے اندازہ نہیں تھا البتہ ندیم شروع سے صابر بچہ تھا۔ اس کا صبر بھی عجیب طرح کا ہوتا...... یہ نہ صرف صبر کرتا بلکہ اس مصیبت کو دور کرنے کے راستے سوچتا...... اپنی ذمے داری بنا لیتا...... اس نے کراچی میں پندرہ سال کی عمر سے پچیس سال تک تنہا جدوجہد کی...... پاؤں جمائے...... مگر کبھی کسی خط یا فون میں مایوسی، بہت زیادہ اداسی، گھر واپس آجانے کی بے قراری، یہاں تک کہ اپنے مسائل تک کا ذکر نہ کیا......

میں پوچھتی کھانا کیسا ہوتا ہے؟ جہاں رہتے ہو جگہ کیسی ہے...... کہتا سب ٹھیک ہے بہتوں سے اچھا ہے......" وہ خاموش ہوئیں۔

"اس کے علاوہ...... میرا مطلب ہے اپنے بیٹے کی عادات کے متعلق کچھ اور بتائیں۔" رشناج نے جوس کا گلاس رکھتے ہوئے درخواست کی۔

وہ کچھ دیر سوچتی رہیں...... پھر کہا۔

"ضرورت مند کھوج کر، ڈھونڈ کر اس کی مدد کرتا ہے...... اور سچ پوچھو تو یہ بتاتے ہوئے مجھے اچھا نہیں لگ رہا کیونکہ ندیم بیٹا پرچار پسند نہیں کرتا، وہ اپنی نیکی کا ذکر کرنا اور سننا بھی پسند نہیں کرتا...... اپنے گاؤں میں پانی پہنچانے کا واقعہ تو تم نے سنا ہوگا...... وہ اس کا ذکر اس لیے کرتا ہے کہ اس طرح کے علاقوں میں لوگوں کو اپنی مدد آپ کا جذبہ پیدا ہو...... مجھے ندیم کے اچھے کاموں کا زیادہ تو پتا نہیں...... فہیم بیٹا نے ایک بار بتایا تھا کہ وہ سیکڑوں گھرانوں کی سرپرستی کررہا ہے...... میں یہ سمجھتی ہوں کہ وہ زندگی کے جن تلخ حالات سے گزرا ہے اس سے اس کا حق دار اور پیشہ ور...... کی شناخت کا مشاہدہ بڑھا ہے...... پھر اسے احساس ہوتا ہے کہ فٹ پاتھ پر سونے والا چھت کے لیے کیسے ترستا ہے، پڑھائی والا طالب علم داخلے کے پیسوں کے لیے کیسے روتا ہے، پڑھا لکھا انسان، روزگار کے لیے کتنا مضطرب ہوتا ہے۔ وہ بہت عبادت گزار نہیں ہے...... مگر سچ تو یہ ہے کہ......"

"ہوں...... کوئی خامی یا کمی...... جو آپ کو لگتا ہو کہ آپ کے بیٹے کی شخصیت میں رہ گئی ہے؟ انسان خطا کا پتلا بھی تو ہے ناں......" وہ مسکرا کر پوچھنے لگی۔

"ہاں جی...... بالکل بشر ہے فرشتہ نہیں...... مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ...... کچھ سپاٹ سا ہوگیا ہے...... جذبوں کی شدت اس میں نہیں ہے...... نہ بے تحاشا غصہ کرتا ہے نہ غم...... اور نہ ہی خوشی...... وہ کبھی قہقہے نہیں لگاتا۔"

"انہوں نے شادی کیوں نہیں کی؟"

ماں جی نے اس بات پر غور سے رشناج کو دیکھا پھر چپ رہیں۔ رشناج نے پھر بات چھیڑی۔

"یہ کہنے کی تو ضرورت نہیں کہ ان کے پاس سب کچھ ہے، کسی چیز کی کمی نہیں۔ کئی ہاتھ ان کی جانب بڑھے ہوں گے...... پھر آخر کیوں......؟"

"شے کی کمی یا زیادتی کا شادی سے تعلق نہیں ہوتا...... غریب بھی شادی کرتے ہیں...... میں نے جب بھی اصرار کیا...... ندیم بیٹے نے ذکر بدل دیا...... فہیم اور اس کی بیوی کو کہتی ہوں کہ تم لوگ کوئی اچھے گھر کی لڑکی دیکھو...... مگر...... وہ اپنی دنیا میں مگن ہیں دلچسپی نہیں لیتے...... بلکہ عجیب طرح سے فہیم نے ایک بار کہہ دیا...... اچھی زندگی بسر کررہا ہے...... کیا ضروری ہے شادی کرنا......"

رشناج اب معاملے کی تہ میں جارہی تھی۔ فہیم اس لیے نہیں چاہتا تھا کہ کنوارے بھائی کا وارث وہ اور اس کی اولاد ہی ہوگی...... سب کے سب اپنی، اپنی اغراض کو لیے ہوئے تھے۔ اچانک ہی جیسے زبان سے پھسلا۔

"سیماں آتی جاتی ہوں گی؟" ماں جی نے سرد آہ بھر کر کھڑکیوں کے پار خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"دو بچیوں کی ماں ہے...... بیوہ ہوگئی...... بے چاری...... وہ بہت پیاری بچی تھی نصیب اچھے نہیں لائی تھی۔"

"سیماں بیوہ ہوگئی، اوہ خدایا......" ایک سناٹا اندر اترا اور قلب پر سکوت چھا گیا، بے سبب گھبراہٹ ہونے لگی، ایسے لگا کہ وہ نہایت الجھے تاروں میں پاؤں پھنسائے بیٹھی ہے اور اس کا ہونا قطعی مروتاً ہے رسمی اور غیر ضروری...... اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے ماں جی سے اجازت لینے لگی۔

"بیٹھو بیٹی...... چائے آتی ہوگی۔"

"چائے کے لیے شکریہ...... اب چلتی ہوں......"

ماں جی نے اس کے جھکے سر پر دستِ شفقت رکھا اور ملازمہ کو ہدایت کی کہ اسے ندیم صاحب تک پہنچادیں۔ رشناج نے ملازم کو روک دیا اور کہا۔

"ماں جی...... میرا کام مکمل ہو چکا ہے۔ انہیں زحمت نہیں دیجیے۔" عالیشان حویلی کے زینے سے اترتے ہوئے سامنے پھیلے نہایت خوب صورت سر سبز لان کو دیکھتے اسے یاد آیا کہ ندیم رجب نے بتایا تھا کہ ایبٹ آباد میں اس نے ایک آئیڈیل گھر بنوایا ہے وہ کیسا ہوگا۔ اس سرد خوشگوار شہر میں آئیڈیل گھر میں ندیم رجب کس کے ساتھ رہنا چاہتے ہوں گے، انسان کے دماغ کے نہایت اندر کیا ہوتا ہے، کیا واقعی انسان خود بھی نہیں جانتا؟

چہچہاتے پرندوں اور پھولوں کی خوشبو سے لدی ہواؤں کے سنگ باغ کی روش پر قدم بڑھاتی وہ اپنے آپ میں مگن جارہی تھی کہ اچانک سامنے سے ندیم رجب بیگ آتے دکھائی دیے، ان کے ہمراہ باوردی ڈرائیور جس نے کچھ ہدایت لے کر دوسرا راستہ بدل لیا۔ سامنا ہونے پر رشناج نے سلام کیا اور ایک بار پھر شکریے کے روایتی الفاظ دُہرائے۔

"تو...... آپ کا پروجیکٹ مکمل ہو گیا......؟"

سوال کے اندر کہیں ملال چھپا تھا۔

"الحمدللہ...... ہونا ہی تھا ایک دن......" ملال اس جانب بھی تھا۔

"ماں جی نے...... میری شکایتیں کی ہوں گی۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"وہ آپ سے بے حد محبت کرتی ہیں۔"

"آپ......؟"

"جی......؟"

"آپ...... میرا مطلب ہے...... آپ اب لاہور جارہی ہیں؟" پتا نہیں بات بدلی گئی تھی یا رشناج کو ایسا لگا، ایسا لگنا تکلیف دہ تھا۔

"جی ہاں...... ایسا ہی ہے......" وہ چلتے جارہی تھی۔

"کوئی...... آخری سوال نہیں......؟" ندیم رجب نے اضطراری حالت میں کہا۔ پھر فوراً ہی اپنے...... بےقرار تاثرات کو سپاٹ کرتے ہوئے وضاحت کی۔

"کل کا کیا بھروسا!" رشناج رک گئی، لمحہ بھر غور سے ان کے چہرے پر دیکھتے رہنے کے بعد کہا۔

"ہاں...... ایک سوال ہے۔"

جیسے ندیم رجب کی آنکھوں میں روشنی لوٹ آئی جیسے ابھی بات کرنے کو کوئی بات باقی ہے۔

"ادھر بیٹھیے گا......" باغیچے میں رکھی کرسیوں کی نشان دہی کی۔

"نہیں...... یہیں ٹھیک ہے۔" وہ سفید پھولوں سے ڈھکے درخت کے ساتھ پشت ٹکاتے ہوئے بولی۔

"مجھے...... ابھی کچھ دیر پہلے یاد آیا...... آپ نے کہا تھا کہ پاکستان کے شہروں میں سے آپ کو ایبٹ آباد پسند ہے۔"

"ہاں...... وہاں میں نے گھر بھی بنوایا ہوا ہے۔"

"اسے آپ نے ان تمام پھولوں، پودوں سے سجایا ہے جو آپ کو دنیا میں کہیں بھی پسند آئے؟" اس کی بات پر وہ مسکرا اٹھا۔

"ایسا ڈریم ہاؤس آپ نے کس کے لیے بنایا ہے؟" سوال بے ساختہ اور براہِ راست تھا مگر انجان بننے کا عمل جاری رہا۔

"کس کے لیے...... مطلب......؟"

"obviously کرایہ داروں کے لیے تو نہیں......"

"بات تو آپ کی صحیح ہے مگر...... ماں جی ایبٹ آباد کی سردی برداشت نہیں کرسکتیں۔"

"ایسا کوئی ناقابلِ برداشت سرما نہیں ہوتا...... شاید آپ کسی خاص وقت کا انتظار کررہے ہیں۔"

"یہ...... مجھ پر خود بھی واضح نہیں ہے۔"

"اسے خود پر جلد واضح کرلیجیے بیگ صاحب...... اور ہاں، سیماں کے شوہر کی ڈیتھ کا سن کر افسوس ہوا۔"

"جی......" ندیم رجب کی آواز مدھم ہوگئی۔

"ماں جی نے کچھ اور بھی کہا؟"

"اس کی دو کمسن بچیاں ہیں۔"

"جی......"

"تو آپ ان کی سرپرستی کیوں نہیں کرلیتے؟"

"سرپرستی کرتا ہوں مگر ان ڈائریکٹ...... ایسی باتوں کو چھپا رہنے دیتے ہیں۔ سیماں کے بھائی کے ذریعے میں...... اور...... ہاں اس سے پہلے کہ کوئی دوسرا سوال آپ کے لبوں پر آئے بتادوں کہ سیماں شکیل نے دوسرے نکاح سے انکار کردیا ہے...... وہ شکیل کے نام پر زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ ایک صنعتی سینٹر میں ٹریننگ لے رہی ہے تاکہ جاب کرسکے۔" وہ تادیر ندیم رجب کے چہرے پر پرچھائیاں تلاش کرتی رہی مگر لگتا تھا کہ بچپن کے یہ ساتھی، دونوں ہی خول چڑھانے کے ماہر تھے۔ اس کی زبان پر تلخ سچ آہی گیا۔

"زندگی شکیل کے نام پر گزاریں گی، زندگی کا سائبان کوئی اور ہوگا۔"

"رشناج......" ان کی پکار میں سرزنش اور چپ کرادینے کی تنبیہ تھی۔ مزید ٹھہرنا بے معنی تھا۔ رات کے دھندلکے دیر ہوجانے کی خبر دیتے تھے۔ پس ایک گریز تھا آخری باب کے بند ہوجانے کا، بے سود کرید اور بے وضاحت الفاظ ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

"مس رشناج......" وہ چلی تو ندیم رجب نے کہا۔ "زمانے کے سرد و گرم نے میری حسیات عام لوگوں سے تیز کردی ہیں...... میں آواز سن کر پہچان لیتا ہوں کہ کون کتنا بے غرض ہے......"

بات اتنی عمیق تھی کہ پھر رشناج کے قدم رکے، ملازم بیگ صاحب کا بجتا ہوا موبائل لیے آرہا تھا۔ موبائل لے کر ایک نظر ڈال کے بند کرتے ہوئے ندیم نے پوچھا۔

"منعم صاحب کیسے ہیں؟" وہ دونوں اس گاڑی تک پہنچ چکے تھے۔ جس نے رشناج کو...... ائرپورٹ ڈراپ کرنا تھا۔ رشناج نے نظر بھر کر دیکھا ندیم رجب بیگ...... اسمارٹ باوقار شخصیت، اس کے پسِ پشت عالیشان محل، ڈرائیو وے پر رکی پجارو کے علاوہ تین گاڑیاں...... سب پر نظر ڈال کر گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے کہا۔

"آپ اس چمکتے منظر نامے کا حصہ نہ ہوتے تو میں جواب دینے کے لیے بہتر پوزیشن میں ہوتی، منعم صاحب ٹھیک ہیں۔"

گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور دل جیسے آنسوؤں سے بھر گیا مگر آنکھیں خالی کی خالی رہیں۔

وہ ملتان سے لاہور کی فلائٹ کے انتظار میں ویٹنگ ہال میں تنہا بیٹھی اپنے گردونواح سے مکمل لاتعلق سوچے جارہی تھی کہ خالہ نوشیلہ کا فون آگیا...... اور اس کی بے منزل سوچوں کو بریک سی لگی مگر خالہ نوشیلا بھی ندیم رجب کے کیریکٹر پر بات کرنے لگیں آج کل ان کی ٹاپ مصروفیت یہی تھی...... وہ چپ چاپ سننے میں لگ گئی۔ وہ صرف سننا چاہتی تھی کہنے کے لیے اس کے پاس اب کچھ نہیں تھا۔

ڈائریکٹر خالہ کہہ رہی تھیں۔

"میں اپنے کرداروں کی ڈیپ اسٹڈی کرتی رہتی ہوں۔ سیلف میڈ شخصیتیں کڑی تنہائی جھیلتی ہیں...... ذات پر انحصار کے سوا جینے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا تو ہر چہرہ مشتبہ اور ہمدردی مشکوک لگتی ہے۔ سرما کی یخ بستگی اور گرما کی کڑی دھوپ اپنی کھال پر آپ سہنا ہوتی ہے۔ خوف زدہ کمسنی کو اشک بہانے کے لیے کندھا میسر نہیں ہوتا۔ بیماری، لاچاری میں بھی

دیہاڑی کھونے کا ڈر آ دھمکتا ہے...... اور پھر اپنے آس پاس رشتوں اور محبتوں کے مناظر...... لاڈ اٹھواتے ہم عمر...... بے فکر نوجوان کہ جو پڑھتے بھی ہیں تو ماما بابا پر احسان کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ بے فکر، پُرجوش چہرے حسرتوں کو ناسور بنا کر اندر اتار دیتے ہیں، اندر جہاں اس ناسور پر مرہم جانے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا، کسی ماہرِ نفسیات سے پوچھا جائے تو معلوم ہو اس کی ذہنی بالیدگی میں کتنی ان کہی ان دیکھی دراڑیں ہیں...... ندیم رجب ارب پتی سہی مگر اس کے پاس کیا نہیں ہے جانتی ہو؟ اس کے پاس لطف اندوزیوں سے چھلکتا بچپن، لڑکپن، اسٹائل مارتی ہیرو ٹائپ جوانی، بے فکر ہنسی، بے ساختہ خوشی نہیں ہے۔ وہ ان سارے زمانوں میں کسی محنت کش چیونٹے کی طرح کام کرتا رہا ہے۔ اور اسی کام نے اس کے ہر پہلو کی اپنے طور پر تعمیر کی ہے۔''

''یار خالہ...... نتیجہ کیا نکلا؟ مجھے یہ بے نتیجہ بحث تھکا رہی ہے۔''

''کوئی امتحان تھا کہ نتیجہ نکلتا......؟ ہر طرزِ حیات میں اچھا برا ہوتا ہے، استثنٰی بھی ہوتا ہے۔''

''خالہ...... آپ آسان بات نہیں کر سکتیں...... ویسے ہی سر میں درد ہو رہا ہے۔ فلائٹ لیٹ پہ لیٹ ہو رہی ہے۔''

''تو...... بتا...... کیا سوچ رہی تھی؟''

''اس وقت میں اگر کچھ سوچ رہی ہوں تو یہی سوچ رہی ہوں کہ کاش میں یہ بکھیڑا نہ پالتی......''

خالہ ہلکا سا ہنسیں۔

''بکھیڑا نہیں ہے یہ، جستجو ہے، میرے لیے اس اسٹوری میں بڑی توجہ کے مقامات ہیں، یہ ایک ٹرانس ہے...... رشناج...... جو ہیرے ضرب کھا کے چمکتے ہیں ان کی سطح سخت ہوتی ہے اور چمک اثر انگیز ......مگر پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر...... اس کے سنگلاخ دل کو موم کرنا اس سے ممکن ہوگا جو سراپا پھول یعنی purity ہوگی، یہ قفل وہ کھولے گی جو ایک کامل دیانت ہوگی...... اس کی شادی نہ ہونے کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ خود لاشعوری تلاش میں چل رہا ہے وہ پہل سے نابلد ہے۔'' اب کانوں پر رکھا رابطے کا آلہ رشناج کے لیے بے معنی شور ہو چکا تھا۔ وہ سوچوں میں اٹک گئی تھی......

''وہ کامل دیانت نہیں ہے۔'' وہ خود سے مخاطب تھی۔

''رشناج بٹ تم خود کو ہرگز کامل دیانت کی تعریف پر کھینچ تان کر پورا کرنے کی کوشش نہ کرو...... تم جیسے لوگ اغراض کے غلام ہوتے ہیں...... میری ماں، میرے منگیتر، میرے اپنوں نے مجھے بہتر غرض حاصل کرنے کو ہی زندگی کی کامیابی سکھایا ہے آج اگر کسی پل میں خود کو بے غرض محسوس کر بھی لوں تو کل نہیں تو پرسوں میری اغراض میرے مفاد مجھے مسخ کر دیں گے، مجھ پر غالب آجائیں گے۔ مجھے کوئی حق نہیں کہ میں پھول کی پتی خود کو قرار دوں جبکہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ ہیرے کا جگر کاٹنے والی پھول کی پتی کون ہے...... ہاں البتہ یہ بکھیڑا میں نے کسی اچھے مقصد کے لیے کیا ہوگا اگر میں سیماں کو تلاش کروں...... اور سیماں کی سوچ کو اس نہج تک لا پاؤں جہاں محبت خود کو پہلی بار دریافت کرتی ہے...... میرا یہ کام اپنے یا خالہ کے کاروباری مفاد سے بالاتر اور الگ ہوگا...... منعم کہتا ہے کہ میں اپنے فیصلوں میں ضدی ہوں اور کسی کام کو پروجیکٹ بنالوں تو پھر پیچھے نہیں ہٹتی...... ضدی رشناج کے اس نئے پروجیکٹ کی تکمیل تک منعم کو انتظار کرنا ہوگا۔''

رشناج نے امید و بیم کا پل صراط پار کر کے ڈیپارچر لاؤنج میں صوفے کی پشت پر سر ٹکا دیا۔ اس کے ہونٹوں پر تبسم اور بند آنکھوں کے کونوں میں آنسو کے موتی چمک رہے تھے۔

☆☆☆

میری کامیابی میں تیرا بھی حصہ ہے

شائستہ زریں

مارچ کا مہینہ بہاروں کی نوید لیے آتا ہے اور بہاروں کا تصور صنفِ نازک کے بنا ادھورا ہے۔ ایک مردِ آہن نے کہا تھا...... ''وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ'' اور اس وقت ان رنگوں میں مزید نکھار آجاتا ہے جب خواتین اپنی ہم صنف کو اپنے عملی رویوں سے بہاروں کا پیغام دیتی نظر آتی ہیں، ان کی خوبیوں کو سراہتی ہیں، حصولِ منزل کے لیے ان کے ساتھ بے لوث اور بھرپور تعاون کرتی ہیں، ایسے میں مردوں کا یہ دعویٰ باطل قرار پاتا ہے کہ ایک خاتون دوسری خاتون کو آگے بڑھتا نہیں دیکھ سکتی۔ ایسی خواتین کی بھی کمی نہیں جو اپنی صنف کے لیے رول ماڈل ہیں اور ایسی خواتین بھی کثیر تعداد میں پائی جاتی ہیں جو دیگر خواتین کی کامیابی میں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔ ۸ مارچ کو ہر سال عالمی سطح پر یوم خواتین منایا جاتا ہے، اسی مناسبت سے بہار نمبر کے لیے ایک سروے رپورٹ کے ذریعے خواتین سے معلوم کیا کہ

۱: آپ کون سی خاتون سے متاثر ہیں؟ اور کیوں؟

۲: آپ کی زندگی کی سب سے اہم خاتون کون سی ہیں جنہوں نے آپ کی کامیابی میں کلیدی کردار ادا کیا؟

غزالہ عارف

(نعت خواں)

۱: میں بینظیر بھٹو شہید سے بے حد متاثر ہوں وہ بہت مضبوط اور بہادر خاتون تھیں، میں انہیں کبھی نہیں بھلا سکتی۔

۲: میں ہمیشہ اپنی ماں کی شکر گزار رہوں گی۔



غزالہ عارف

دوسری اہم خاتون تنظیم فلاح خواتین کی چیئرپرسن قمر النسا قمر صاحبہ ہیں دونوں خواتین نے میری شخصیت کی تعمیر میں مثالی کردار ادا کیا۔

ثمینہ پیرزادہ

(آرٹسٹ)

میں زندگی سے بہت متاثر ہوں جس سے میں نے بہت سیکھا ہے اور آپ کو شاید یہ سن کر حیرت ہو کہ میری بیٹیاں انعم اور امل میرے لیے رول ماڈل ہیں، میں ان سے بے حد متاثر ہوں۔ انعم کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا اس کے بعد جس ہمت کا اس نے مظاہرہ کیا وہ میرے لیے بہت مشکل تھا میں نے انعم


ثمینہ پیرزادہ

سے عزم وہمت کا درس لیا۔ اصل اپنی سوچ سے میرا سنگِ میل بدل دیتی ہے۔ میری بیٹیاں زندگی کو سمجھ کر جس طرح اپنی جگہ بنا رہی ہیں مجھے بہت اچھا لگتا ہے اور مجھے ان پر فخر ہے۔ میری زندگی میں ایک نہیں تین خواتین اہم ہیں۔ میری ماں جن سے میں نے خودمختاری سیکھی، خالہ سے میں نے صبر سیکھا اور ساس سے سیکھا کہ فیملی کو کیسے اکٹھا رکھا جاتا ہے۔ مجھے تو یہ مفروضہ ہی غلط لگتا ہے کہ عورت ہی عورت کی بدترین دشمن ہے۔ ہر ایک کا تجربہ مختلف ہے، زندگی میں میرا اصول ہے کہ معاف کردو اور یہ امی کی تربیت کا حصہ ہے۔ معاف کیا تو مجھے سمجھ میں آگیا کہ انسان اگر معاف کردے تو یہ اس کی خوشی بھی ہے اور طاقت بھی۔

ایڈووکیٹ ڈاکٹر رعنا خان

(قانون دان)

۱: میں حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بہت متاثر ہوں۔ انہیں اپنا روحانی پیشوا مانتی ہوں، جب، جب میں نے ان کے وسیلے سے دعا مانگی میرے حصے میں کامیابیاں آئیں۔ میں بی بی سیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نقشِ قدم پر چلنا عین سعادت سمجھتی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اپنی دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے ان کی صفات اپنی ذات کے لیے


ایڈووکیٹ ڈاکٹر رعنا خان

مانگتی ہوں۔ ان کا مثالی صبر، تدبر اور دیگر صفات میرے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

۲: یوں تو میں بہت بلند حوصلہ ہوں لیکن قانون کی تعلیم وتربیت کے دوران جب بھی کبھی مایوسی اپنے حصار میں لے لیتی تب جسٹس ریٹائرڈ قیصر اقبال صاحبہ کی مورل سپورٹ ہمیشہ مایوسی سے نکال کر میرے اندر نئی امنگ اور جذبہ بیدار کرکے مجھے کامیابی کی راہ پر گامزن کردیتی تھی۔

فرزانہ جبیں

(انکم ٹیکس کمشنر)

۱: میں اردو کی ایک بہترین مصنفہ جمیلہ ہاشمی سے متاثر ہوں۔ اردو ادب میں نایاب اضافہ انہوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے کیا ہے ''دشتِ سوس'' ہو..... یا ''تلاشِ بہاراں'' وہ اردو ادب کا ایک


فرزانہ جبیں

درخشاں باب ہیں جن کی مثال عصرِ حاضر کے قلمکاروں میں مشکل سے ملتی ہے۔ میں ان کی تحریروں کی مداح ہوں۔

۲: میری زندگی کی سب سے اہم خاتون میری ماں ہیں۔ آج اگر میں یہ کہوں کہ جو کچھ بھی ہوں وہ صرف اپنی والدہ کی وجہ سے ہوں تو غلط نہ ہوگا۔ انہوں نے نہ صرف میری دینی اور دنیاوی تعلیم پر توجہ دی بلکہ ایک عورت کی جن خطوط پر تربیت ہونی چاہیے، جہاں وہ باہر کی دفتری زندگی کے فرائض کے ساتھ ساتھ گھریلو زندگی میں بھی اپنے فرائض پہچانے وہ احسن طریقے سے کی ہے۔ خدا خوفی سے لے کر اخلاقیات تک، تعلیم و تربیت سے لے کر گھریلو مسائل تک، بلند حوصلگی سے لے کر رواداری تک ہر قسم کی تربیت ان ہی کی مرہونِ منت ہے۔

ذکیہ سلطانہ

(پروفیسر، سابق نیوز ریڈر)

۱: میری دوسری ماں یعنی میری ساس نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ میری ماں کے برعکس وہ بہت بہادر اور سلیقہ شعار خاتون تھیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی میرے رفیقِ زندگی رفیق احمد نقش جیسے علم دوست اور مثالی انسان کی ماں ہونا ہے۔

۲: میری ماں میری زندگی کی اہم ترین خاتون ہیں انہوں نے مجھے بہت زیادہ اعتماد دیا اس طرح کہ انہوں نے خود بزدل ہوتے ہوئے بھی مجھ پر بھروسا کیا۔ میرے ماحول کے خلاف مجھے آزادی دی۔ مجھے بااعتماد اور حوصلہ مند بنایا۔ نتیجتاً میں نے ہر مشکل کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کامیابیوں سے ہمکنار ہوئی۔

۱۹۷۴ء کا ذکر ہے، دسویں جماعت میں پکنک کے لیے لطیف آباد (حیدرآباد) کے اپوا اسکول سے ٹنڈو جام زرعی یونیورسٹی کے لیے صبح سویرے روانہ ہوئے شام پانچ بجے واپسی تھی مگر بس تقریباً رات آٹھ بجے تک نہیں آئی، اس وقت لسانی فسادات عام تھے۔ طالبات کا تو رو رو کر برا حال ہوگیا، کچھ تو بے ہوش ہوگئیں۔ خدا خدا کر کے بس آئی۔ بس میں لڑکیاں دم سادھے بیٹھی تھیں، میں نے لطیفے سنانے شروع کردیے۔ ایک ٹیچر نے حیرانی سے پوچھا ''بٹیا! آپ کو گھر والوں کی ڈانٹ کا خوف نہیں ہے؟'' میں نے جواب دیا کہ ''مس روتے دھوتے جائیں یا ہنستے ہنساتے ڈانٹ تو دونوں صورتوں میں پڑے گی تو ابھی کا وقت کیوں برباد کریں؟ اور ڈانٹ نہ پڑی تو افسوس ہوگا کہ خواہ مخواہ ہی واپسی میں بور وقت گزرا قصہ مختصر کہ جب میں اپنی پڑوسن ہم جماعت عقیلہ کو اس کے گھر چھوڑ کر اپنے گھر واپس آئی اور امی کو بتایا کہ ''عقیلہ بہت ڈر رہی تھی مگر میں نے اس کی امی کو سمجھایا تو اس کی بچت ہوگئی'' تب امی نے مجھے بہت شاباش دی اور کہا... ''اچھا ہوا جو تم اسے اس کے گھر چھوڑ کر آئیں'' امی کا یہ رویہ

میرے لیے بہت حوصلہ افزا تھا اور میری عمدہ تربیت میں معاون بھی۔

مومنہ درید

(CEO مومل پروڈکشن)

میں ایک نہیں بیک وقت دو خواتین سے



مومنہ درید

متاثر ہوں اور وہ دونوں میری مائیں ہیں۔ ایک میری ماں جنہوں نے مجھے جنم دیا۔ وہ سرحد میں پیدا ہوئیں وہیں پلی بڑھیں اور ایسے ماحول میں جہاں عورت کو اعتماد نہیں دیا جاتا امی نے ہم چاروں بہنوں کی پرورش اس طرح کی کہ ہمیں بہت پُراعتماد بنایا جو اس ماحول میں ممکن نہیں تھا۔ آج یہی اعتماد میرے بہت کام آرہا ہے۔ شادی کے بعد سسرال گئی تو وہاں بھی ایک ماں ملی' اپنی شادی کے بعد اگر میں نے کوئی بہت اچھی دوست بنائی ہے تو وہ ممی یعنی میری ساس سلطانہ صدیقی ہیں۔ ان جیسی عورت شاید ہی کہیں نظر آئے جو اپنی بہو پر اتنا بھروسا کرے کہ اپنی آرگنائزیشن جس کو خود اپنے ہاتھوں پروان چڑھایا ہو بہت اعتماد سے اپنی بہو کو سونپ دے۔ اسے اپنی کرسی دے دے یہ کہہ کر کہ ”مجھے یقین ہے کہ اس آرگنائزیشن کو تم بہت آگے لے کر جاؤ گی۔“ ممی نے ہر قدم پر میری رہنمائی کی۔ پروڈکشن میں میری تربیت کی جہاں مشکل مقام آیا میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا میری حوصلہ افزائی کر کے اس بات کو یقینی بنایا کہ میں اپنا کام خوش اسلوبی سے کرسکوں۔ ممی نے ہمیشہ مجھے بیٹی اور دوست سمجھا۔ میری دونوں ماؤں کے اثرات میری زندگی پر بہت گہرے ہیں یہ ان دونوں کا کمال ہے کہ میں گھر اور دفتر میں توازن برقرار رکھتے ہوئے کامیاب زندگی بسر کر رہی ہوں۔

شازیہ سعید

(صحافی۔ آر جے)

۱: وہ خواتین مجھے بہت متاثر کرتی ہیں جو کسی کا بھی سہارا لیے بغیر اپنا کام کر رہی ہیں۔ خواہ وہ شربت بیچنے والی ہو، چھابڑی والی یا چنا بیچنے والی ہو۔ یہ تمام خواتین تعلیم یافتہ نہیں ہیں لیکن اپنی زندگی کو منظم انداز میں گزار رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ



شازیہ سعید

ہر ورکنگ وومن نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا اور مجھے ان سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔

۲: سچ تو یہ ہے کہ ہمارے آس پاس رہنے والی ہر خاتون کوئی نہ کوئی سبق دیتی ہے خواہ وہ ماں ہو، بہن ہو، میری رفیقِ کار ہو یا میری باس ہوں یا کوئی بھی، ان سب کے طرزِ زندگی سے، ان کی باتوں سے، ان کے کردار سے بہت کچھ سیکھا، زندگی کامیابی سے گزارنے کا گُر سیکھا، مجھے یہ معلوم ہوا کہ کون سی غلطیاں ہیں جو مجھے کبھی نہیں دُہرانیں اور کون سے عوامل ہیں جن سے میں ایک کامیاب زندگی گزار سکتی ہوں۔

روبی دُرّانی

(آر جے ایف ایم ۱۰۰، پروگرام آرگنائزر، ٹی وی آرٹسٹ)

میری امی ہمیشہ میرے لیے رول ماڈل رہیں۔ بہت ینگ ایج میں میرے پاپا کی وفات کے بعد جس طرح امی نے بلند حوصلے اور ہمت سے ہم بہن بھائیوں کی پرورش کی، ہمیں تعلیم دلوائی وہ میرے لیے قابلِ فخر ہے۔ امی نے مجھے اعتماد دیا۔ میں ایف



روبی درانی

ایم ۱۰۰ کی پہلی آر جے ہوں۔ جب ۱۹۹۵ء میں ایف ایم ۱۰۰ کی اسٹیشن منیجر کی حیثیت سے مجھے لاہور اور اسلام آباد بھیجنے کی پیشکش ہوئی تو امی نے مجھ پر بھروسا کیا اور میں نے خود پر۔ یہ امی کا دیا ہوا اعتماد ہی تو ہے کہ میں نے شوبز کی دنیا میں قدم رکھا آج میں بیک وقت شوبز کے کئی محاذوں پر سرگرمِ عمل ہوں، عزت و وقار اور کامیابی کے ساتھ یہ سفر جاری و ساری ہے۔

☆☆☆

قارئین! ثابت ہوگیا ناں کہ وسیع النظر، وسیع القلب اور مثبت سوچ رکھنے والی خواتین نہ صرف خود شاہراہِ حیات پر کامیابی سے گامزن ہوتی ہیں بلکہ دیگر خواتین کے لیے بھی نشانِ منزل بن کر ان کی معاون بن کر انہیں کامیابیوں اور حقیقی مسرتوں سے ہمکنار کرتی ہیں اور کیوں نہ کریں کہ ان میں سے ہر ایک کو یہ اعتماد اور اعزاز بھی حاصل ہے کہ

میں راہِ ترقی کا ہوں دیا
دنیا نے مجھے تسلیم کیا
مجھے عزت، مان، وقار دیا
میں عفت، عزت، عصمت ہوں
میں ہمت ہوں میں قوت ہوں
میں طاقت ہوں، میں جرأت ہوں
میں عورت ہوں، میں عورت ہوں
(کلام۔ عنبرین حسیب عنبر)

اور ایسی ہی خواتین کو دیکھ کر یقین آجاتا ہے کہ

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں

اور جب بہاریں ہی بہاروں کا دامن تھام لیں تو فضا خوشگوار اور مشکبار ہی نہیں روح بھی سرشار ہو جاتی ہے۔ ہر سمت چراغاں ہونے لگتا ہے..... عزمِ نسواں تجھے سلام......

☆☆☆

وہ آئے بزم میں......

نزہت اصغر



قابلِ صد احترام ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی سے پُرکیف ملاقات

باذوق قارئینِ پاکیزہ! آج ہمارے ساتھ ایک بہت معتبر، پیاری، شفیق اور باعمل شخصیت موجود ہیں۔ جن کی پیاری پیاری پُراثر گفتگو دل و دماغ پر صرف وقتی اثر نہیں کرتی بلکہ عملی زندگی میں بھی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ جی ہاں! ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی صاحبہ ہماری آپ کی جانی پہچانی بے حد محبت کرنے والی ہستی ہیں۔ اگرچہ ذکیہ آپا علالت، کمزوری اور کچھ کسرِ نفسی کے باعث باقاعدہ انٹرویو پر رضامند نہیں تھیں

مگر ہمارے پُرزور اصرار پر انہوں نے ہم سب کی فرمائشوں کی لاج رکھ لی۔ (بہت بہت شکریہ آپ کا ذکیہ آپا) ذکیہ بلگرامی صاحبہ نہ صرف ایک قابل اور اعلیٰ تعلیم یافتہ رائٹر ہیں بلکہ ایک روحانی استاد بھی ہیں۔ قرآن پاک کی کتابت جیسا کارنامہ بلاشبہ ان کے لیے صدقۂ جاریہ اور آخرت کے لیے حسین اور سنہرا زادِ راہ ہے۔ ہماری دعا ہے کہ پروردگارِ عالم ذکیہ آپا کو صحت و سلامتی عطا فرمائے اور ہم سب کو ان کے کردار و عمل سے سبق لینے کی توفیق عطا ہو، آمین ثم آمین۔

پاکیزہ ✧......ذکیہ آپا گفتگو کا باقاعدہ آغاز کرنے سے قبل ادارے کی جانب سے آپ کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ آپ نے اپنی ناسازیِ طبع اور دیگر مصروفیات کے باوجود ہماری درخواست پر غور کیا اور پاکیزہ قارئین کے لیے وقت نکالا۔ آپ کے اس بارے میں کیا تاثرات ہیں؟

ذکیہ بلگرامی ✧......پاکیزہ ڈائجسٹ سے میرا بہت پرانا تعلق ہے، میں نے اس ڈائجسٹ میں بہت لکھا...... ظاہر ہے اتنا پرانا ساتھ ہے تو قلبی لگاؤ ہونا بھی لازمی ہے۔ مجھے خصوصی طور پر اس ڈائجسٹ کے لیے انٹرویو دینا بہت اچھا لگ رہا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اس میں لکھنے اور پڑھنے والے سب ایک فیملی کی طرح سے ہیں اس لیے جب کسی کا انٹرویو شائع ہوتا ہے تو سب ہی دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ اب میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں جلد تھک جاتی ہوں اس وجہ سے شاید بہت زیادہ باتیں نہ کر پاؤں۔

پاکیزہ ✧......ڈاکٹر صاحبہ اگرچہ آپ کی شخصیت ہمہ جہت ہے یعنی آپ نے دنیاوی تعلیم میں بھی اعلیٰ ترین ڈگری حاصل کی اور اس کے بعد ایک باعمل مسلمان ہونے کی حیثیت سے قرآن پاک کی بھی تعلیم حاصل کی بلکہ اس کی کتابت کا منفرد فریضہ انجام دیا۔ آپ کا قلب و ذہن قرآن پاک کی کتابت کی جانب کب اور کیسے راغب ہوا؟

ذکیہ بلگرامی ✧......آپ نے ایک ہی سوال میں کئی سوال کر لیے۔ جی ہاں میں نے دنیاوی تعلیم حاصل کی۔ ڈاکٹریٹ کرنا میرا خواب تھا جو اللہ تعالیٰ نے پورا کر دیا۔ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ مجھے ایم فل اور پھر پی ایچ ڈی کرنے کے دوران مختلف قسم کے مسائل اور وسائل کا سامنا تھا لیکن یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت تھی کہ میری تمام مشکلات ایک، ایک کر کے دور ہوتی چلی گئیں۔ راستے خود بخود ہموار ہوتے رہے اور میں کامیابی کی منزلیں طے کرتی چلی گئی۔ میرا ایم فل خشک میوہ جات پر ہے جبکہ پی ایچ ڈی کے لیے میں نے بادام کو چنا۔ مختصر الفاظ میں اتنا کہوں گی کہ میں نے جگر میں کینسر پیدا کرنے والی فنجائی fungi کے حوالے سے کام کیا ہے۔ اب رہی بات قرآن پاک پڑھنے اور اس کی کتابت کرنے کی تو یہ معاملہ کچھ اور ہے۔ یہ فیصلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو نور عطا کرتا ہے اور اسی نور سے دنیا میں روشنی پھیلتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے لاکھوں مومن بندوں کو نور عطا کیا جو سب کے سب بھلائی کے کاموں میں مصروف ہیں۔ مجھ ناچیز اور گنہگار کو بھی نور عطا ہوا اور اسی نور کی روشنی میں، میں دور تک بھاگتی چلی گئی۔ میں نے کتابت 1972ء سے شروع کی جبکہ میری شادی کو 13 سال گزر چکے تھے۔ میں عرصہ چھ سال سے قرآن حکیم باترجمہ پڑھنے میں مصروف تھی۔ بہت کثرت سے پڑھا کرتی تھی۔ پڑھتے پڑھتے دل لکھنے کی جانب مائل ہوا۔ میرے اس کام میں نہ خطاطی کا دخل ہے اور نہ خوش خطی کا...... بلکہ ایک جذبہ ہے آپ اس جذبے کو کوئی بھی نام دے سکتی ہیں۔ دیوانگی، passion یا پھر عشق۔ میں نے 40 سال کے عرصے میں 17 کلام پاک لکھے۔ میرے دل و دماغ، روح میں یہی سمایا رہتا تھا۔ اسی کے بارے میں سوچنا، آئندہ کی

پلاننگ کرنا...... سائز، رنگ، ڈیزائن کیسا ہونا چاہیے...... اسے پڑھنا، لکھنا، سجانا، سنوارنا ہی میری زندگی تھی۔ اسی سے میری آنکھیں ٹھنڈی رہتی تھیں...... اور آج بھی ہیں...... اس میں میرا کوئی کمال نہیں...... میں کچھ نہیں ہوں بہت گنہگار دنیادار، ایک عام سی خاتون...... بس یہ اللہ کا کرم ہے اسی کی عطا ہے وہی جس کو چاہتا ہے سیدھے راستے پر لگاتا ہے اور جس کو چاہے بھٹکا دیتا ہے۔" وہ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے جس کو چاہے ذلت دیتا ہے۔" قرآن حکیم لکھنے پڑھنے کے بارے میں، میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول لکھ رہی ہوں جو مجھے بے حد پسند ہے۔ آپ کا قول ہے، "جب میرا دل چاہتا ہے کہ میں اللہ سے باتیں کروں تو نماز پڑھتا ہوں اور جب میرا دل چاہتا ہے کہ اللہ مجھ سے باتیں کرے تو میں قرآن پڑھتا ہوں۔" میرا بھی یہی حال ہے مجھے اللہ تعالیٰ سے باتیں کرنا اور اللہ کی باتیں پڑھنا، انہیں لکھنا، سجانا سنوارنا سب اچھا لگتا ہے لیکن میں پھر یہ بات دُہراؤں گی کہ انسان بے اختیار ہے سب اللہ تعالیٰ کی عطا ہوتی ہے...... انسان اس وقت تک اللہ کی رضا حاصل نہیں کر سکتا جب تک اپنے اندر سے "میں" کو نہیں نکالے گا جو کچھ عطا ہو اس پر شکر ادا کرنا چاہیے اور توبہ استغفار کو عادت بنالینا چاہیے۔

پاکیزہ ✧...... جب آپ نے کہانیاں لکھنے کا آغاز کیا تو آپ کے ہم عصر کون کون سے نام ڈائجسٹ کی دنیا میں تھے؟

ذکیہ بلگرامی ✧...... میں نے لکھنے کا آغاز ناول نگاری سے کیا تھا۔ افسانے 1977ء سے لکھنے شروع کیے اس وقت تک میرے چار ناولز شائع ہو چکے تھے۔ اس وقت جب میرے افسانے چھپتے تھے۔ میرے ساتھ بشریٰ رحمن، وحیدہ نسیم، شوکت رانا الطاف، شکیلہ رفیق، ساجدہ حبیب، رفعت ناہید سجاد، اختر شجاعت، اقبال بانو، ہما کوکب بخاری، غزالہ نگار، خالدہ اسد اور بہت سے نام جو اب بیماری کے باعث ذہن میں نہیں آپاتے۔ سب اچھا لکھتی تھیں۔ وحیدہ نسیم میری استاد تھیں۔ باٹنی کی پروفیسر۔ (کچھ نام یاد نہیں آرہے ان سے معذرت)

پاکیزہ ✧...... کیا آپ ان سے متاثر تھیں؟

ذکیہ بلگرامی ✧...... میں کسی سے متاثر نہیں تھی۔ لکھنے کی صلاحیت خداداد ہوتی ہے اور ہر شخص اپنی سوچ، تعلیم، تربیت، فیملی بیک گراؤنڈ کی بنیاد پر ہی لکھتا ہے۔ ہر رائٹر کا انداز بھی منفرد ہوتا ہے۔ سب اچھا ہی لکھتے ہیں۔

پاکیزہ ✧...... سائنس کی تعلیم حاصل کرتے کرتے کہانیاں یعنی افسانے ناول وغیرہ لکھنے کی طرف کیسے دھیان گیا؟

ذکیہ بلگرامی ✧...... سائنس کی تعلیم اپنی جگہ...... لکھنے کا تعلق اس سے نہیں کہ آپ نے کیا پڑھا ہے۔ یہ God gifted ہوتا ہے۔ بات گھر کے ماحول کی بھی ہوتی ہے۔ میرے گھر کا ماحول خالص ادبی تھا۔ بڑی بہن نے اردو، انگریزی اور فارسی ادب میں ڈگریاں لی تھیں۔ بہت چھوٹی تھی تو علامہ اقبال کی بے شمار نظمیں یاد تھیں، بیت بازی کے مقابلے ہوتے تھے، مجھ سے بڑے بھائی کم عمری ہی سے افسانے اور کہانیاں لکھتے تھے اور بہت اچھے مقرر بھی تھے۔ آج کل وہ surrey میں رہتے ہیں اور عمر رسیدہ ہیں مگر لکھنا اور پڑھنا ان کی ہابی ہے۔ انہوں نے بھی سائنس ہی پڑھی ہے۔ میں نے بھی 12 سال کی عمر سے افسانے لکھے اور میٹرک کرنے تک میں بے شمار ناول اور افسانے پڑھ چکی تھی۔ پھر فرسٹ ائیر سے لے کر MSC کرنے تک مجھے لکھنے کا وقت نہ مل سکا لیکن امتحان سے فارغ ہوتے ہی ناول لکھنے بیٹھ گئی تھی یعنی 21 سال کی عمر میں پہلا ناول "غم دل" لکھا۔

پاکیزہ ✧...... آپ کے ابتدائی ناولوں میں کیا موضوعات ہوتے تھے؟



دائیں سے سعدیہ راشد، ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی اور مسعود احمد برکاتی

ذکیہ بلگرامی ✧...... ابتدائی ناولوں میں لائٹ کہانی ہے اور پڑھنے والوں کی دلچسپی قائم رہتی ہے لیکن کچھ بعد میں چند ناول ایسے لکھے جس میں پارٹیشن کے بعد ہونے والے حالات اور ان سے متاثر گھرانوں کی حقیقی داستانیں رقم کیں جہاں کردار اور واقعات کے علاوہ مقامات کو بھی تبدیل کر کے لکھا۔ ظاہر ہے اس طرح کی تحریریں پُراثر ہوتی ہیں اور حقیقت سے قریب ہونے کی وجہ سے زیادہ پسند کی جاتی ہیں۔

پاکیزہ ✧...... اس فیلڈ میں آپ کو کس قسم کی مشکلات یا بندشوں کا سامنا ہوا؟

ذکیہ بلگرامی ✧...... کسی قسم کی نہ مشکلات تھیں نہ بندشیں بلکہ سب کا حد سے زیادہ تعاون شامل تھا۔

پاکیزہ ✧...... شادی سے پہلے اور بعد میں لکھنے لکھانے میں کیا فرق آیا؟

ذکیہ بلگرامی ✧...... شادی سے قبل میری امی اور ابا دونوں بے حد خوش ہوتے تھے اور حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔ شادی کے بعد میرے شوہر نے میرا بہت زیادہ ساتھ دیا۔ آج جو کچھ بھی میں ہوں وہ ان ہی کی وجہ سے ہوں۔ وہ چاہتے تھے کہ بہت زیادہ لکھوں بہت پڑھوں میری کامیابیوں پر فخر کرتے تھے۔ مجھے M phil اور PHD کروانے والے وہی تھے۔ ایک عدد گاڑی اور ڈرائیور مہیا کیا۔ ڈیفنس سے کراچی یونیورسٹی 25 کلومیٹر ہے۔ میرے بچے کالج میں تھے۔ (چھوٹا بیٹا اور بیٹی) بڑا بیٹا MSC کے پہلے سال ہی میں تھا تب میں نے biological research center میں M phil/PHD پروگرام میں باقاعدہ داخلہ لیا اور 7 سال کی انتھک محنت کے بعد کامیابی حاصل کی جو صرف اور صرف اللہ کی رحمت سے ممکن ہوا۔ ان دنوں بھی میں کثرت سے قرآن حکیم کی تلاوت کرتی تھی اور ہر تجربہ اللہ ہی کے نام سے شروع ہوتا اور شکرانے کی نماز پر ختم ہوتا۔ اس دوران بہت سے ایسے واقعات ہوئے جو اللہ کی طرف سے مدد ہی ہو سکتی ہے جس کا لکھنا یہاں مشکل ہے۔ میرے اندر اتنی طاقت نہیں ہے کہ قلم چلاؤں میرے پاس سوال نامہ ہے، اگر کوئی ریکارڈ کرتا تو بہت کچھ بتا سکتی تھی۔ یہ جو کچھ لکھ رہی ہوں، قسطوں میں لکھ رہی ہوں۔ (ذکیہ آپا ہم نے آپ کی بے آرامی کا خیال کرتے ہوئے اپنی لمبی نشست نہیں رکھی، ہاں، یہ ہو سکتا تھا کہ کیسٹ اور ریکارڈر آپ کے پاس ہی چھوڑ دیتے اور آپ ٹیپ کروا دیتیں۔ بہرحال اس تعاون پر ہم

آپ کے تہ دل سے شکر گزار ہیں)

پاکیزہ ✧......کوئی تحریر لکھنے سے قبل آپ کے ذہن میں کیا ہوتا تھا؟ کسی خاص واقعے یا بات سے متاثر ہو کر لکھا؟

ذکیہ بلگرامی ✧......اپنے اردگرد ہونے والے واقعات، حالات، مشکلات سب سامنے تھیں جو ہمیشہ ہوتی ہیں اور قلم کار ان کو اپنی کہانیوں میں پیش کرتا ہے۔ میں نے بھی یہی کچھ کہا۔

پاکیزہ ✧......اپنی قلمی کاوشوں پر قارئین کی جانب سے آنے والی تنقید پر کیسا ردِ عمل ہوتا ہے؟

ذکیہ بلگرامی ✧......ابھی تک کوئی تنقید سننے کو نہیں ملی مگر اب سب بیکار ہے عمر گزر گئی جو کچھ لکھنا تھا لکھ چکی اب دوسروں کی باری ہے۔

پاکیزہ ✧......ذکیہ آپا ایک زمانے میں ڈائجسٹ کی رائٹرز کی پزیرائی نہیں ہوا کرتی تھی لیکن جب وہ کتابی شکل میں ناول یا افسانوں کا مجموعہ چھپواتیں تو ہاتھوں ہاتھ بکتا اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

ذکیہ بلگرامی ✧......ہو سکتا ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ لوگ قسط وار ناول سے بور ہو جاتے ہیں۔ مہینوں انتظار کرنا پڑتا ہے جبکہ ناول کتابی صورت میں ہو تو فوراً پڑھ لیا جاتا ہے۔

پاکیزہ ✧......آج کل وہی ڈائجسٹ کی رائٹرز ٹی وی چینلز پر کامیابی کے جھنڈے گاڑھ رہی ہیں اور انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا ہے، اس تبدیلی پر کیا کہیں گی؟

ذکیہ بلگرامی ✧......ڈائجسٹ کی رائٹرز اچھا لکھ رہی ہیں اور آج کل چینلز کی بھرمار ہے۔ اس وجہ سے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا ہے۔ اگر چینلز کو کہانیاں نہ ملیں تو یہ بے چارے کریں گے کیا!

پاکیزہ ✧......کیا آپ سمجھتی ہیں کہ آج کی نسل بھی مطالعے پر زور دے رہی ہے جیسا کہ آپ کے زمانے میں نہایت دلچسپی سے لوگوں کے زیرِ مطالعہ کوئی نہ کوئی کتاب رہا کرتی تھی؟

ذکیہ بلگرامی ✧......مطالعے کا رجحان کم ہو گیا ہے ہم بچپن سے اردو کہانیاں پڑھا کرتے تھے۔ آج کل بچے انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں اس وجہ سے فرق پڑا ہے۔

پاکیزہ ✧......آج برقی ذرائع ابلاغ زیادہ مؤثر ہو گئے ہیں، کیا یہ کتاب سے دوری کی وجہ تو نہیں؟

ذکیہ بلگرامی ✧......برقی ذرائع کتنے بھی مؤثر ہو جائیں کتاب کی اہمیت کم نہیں ہو گی آج کل جتنے ناول شائع ہو رہے ہیں پہلے نہیں ہوتے تھے۔

پاکیزہ ✧......ایک مصنف نوجوان نسل کی رہنمائی کس طرح کر سکتا ہے؟

ذکیہ بلگرامی ✧......قلم میں بہت طاقت ہوتی ہے، اصلاحی کہانیاں اور اچھے مضامین لکھ کر نوجوان نسل کی رہنمائی کی جا سکتی ہے۔

پاکیزہ ✧......ایک قلم کار عام آدمی سے کس طرح مختلف ہوتا ہے؟

ذکیہ بلگرامی ✧......قلم کار حساس ہوتا ہے پھر اس کے پاس اظہار کی طاقت ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اپنی تحریروں کے ذریعے اپنے احساسات اور جذبات کو دوسروں تک پہنچا سکتا ہے جبکہ عام انسان حساس ہوتے ہوئے بھی اپنی کیفیات کو بیان نہیں کر پاتا۔

پاکیزہ ✧......اچھا ذرا قارئین کو اپنے خاندانی پس منظر اور بچوں کے بارے میں بھی بتائیں؟

ذکیہ بلگرامی ✧......میں یوپی (up) کے ایک قصبہ بلگرام میں پیدا ہوئی۔ میرے دادا بیرسٹر تھے جبکہ والد زمین دار تھے۔ ہمارا گھرانا اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانا ہے اور ہم سید فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ میرے تین بچے ہیں۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی، بڑے بیٹے آصف عزیز بلگرامی نے اپلائڈ فزکس میں ایم ایس سی کیا مگر سافٹ ویئر کو اپنا کیریئر بنایا۔ ایک بڑی پوسٹ پر کام کر رہے ہیں۔ دوسرے بیٹے کاشف عزیز بلگرامی نے این ای ڈی سے بی ای مکینیکل کیا۔ IBA سے MBA کیا


ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی شیلڈ وصول کرتے ہوئے

فرنچ کے 14 کورسز کیے...... پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے کینیڈا گئے وہاں Calgary یونیورسٹی سے ایم ایس سی انجینئرنگ کیا۔ مستقل رہائش وہیں ہے مگر اب چار سال کے لیے مسقط میں کانٹریکٹ جاب پر آگئے ہیں۔ عالیہ ضیا میری بیٹی ہے جو آج کل شاعری کر رہی ہے۔ اس نے اکنامکس میں فرسٹ کلاس ماسٹرز کیا ہوا ہے۔ ہاؤس وائف ہے۔ تینوں بچے شادی شدہ ہیں اور تینوں کے دو، دو بچے ہیں۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔

پاکیزہ ✧......آپ کے بچوں میں بھی آپ کا یہ شوق اور ہنر منتقل ہوا یا نہیں؟

ذکیہ بلگرامی ✧......میرے تینوں بچے بچپن میں کہانیاں لکھتے تھے جو ماہنامہ تعلیم و تربیت میں شائع ہوتی تھیں۔ کاشف فرنچ میں شاعری کرتے ہیں۔ عالیہ ضیا شادی سے قبل افسانے لکھا کرتی تھی مگر اب شاعری کر رہی ہے۔ عالیہ کے افسانے ماہنامہ دلکش میں بھی شائع ہوئے تھے۔

پاکیزہ ✧......یہ بتائیں کہ پاکیزہ سے آپ کا ناتا کب اور کیسے جڑا؟

ذکیہ بلگرامی ✧......پاکیزہ ڈائجسٹ میں 1977ء سے لکھنا شروع کیا...... اور آج تک یہ رشتہ قائم و دائم ہے اس کی وجہ پاکیزہ ڈائجسٹ کے تمام اسٹاف کا اعلیٰ اخلاق ہے۔

پاکیزہ ✧......کیا آپ نے پاکیزہ یا کہیں اور فرمائشی تحریریں بھی دیں؟

ذکیہ بلگرامی ✧......میں نے بچوں کے لیے بہت سی کہانیاں لکھیں۔ ماہنامہ تعلیم و تربیت میں میری ایک سیریز چچا بھلکو کے نام سے چلی تھی جو بے حد مقبول ہوئی تھی اس کے لیے اکثر کہانیوں کے پلاٹ ایڈیٹر خود بتاتے اور فرمائش کر کے لکھواتے۔ یہ کہانیاں دو والیوم میں فیروز سنز نے شائع کیں جو پاکستان کے ہر اچھے اسکول کی لائبریری میں موجود ہیں۔

پاکیزہ ✧......ذکیہ آپا اب آپ کے اس کام پر بات کریں گے کہ جس کی بدولت قارئین کے دلوں میں آپ کے لیے عقیدت و احترام میں مزید اضافہ ہوا یعنی قرآن پاک کی کتابت...... یہ خیال آپ کو کیونکر آیا؟

ذکیہ بلگرامی ✧......اس سوال کا جواب میں پہلے تقریباً دے چکی ہوں۔ ایک بار پھر دوسرے انداز سے کہہ دوں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حفاظت کا ذمہ خود لیا ہے۔ ایک طریقہ حفظ کرنے کا ہے اور دوسرا کتابت کرنے کا...... لاکھوں مسلمان حافظِ قرآن ہیں یہی وجہ ہے کہ کوئی لفظ نہ صرف زیر زبر کی بھی آج تک کوئی تبدیلی نہیں آئی اور نہ آئے گی۔ جب تک قرآن پاک کی اشاعت شروع نہیں ہوئی تھی، قرآن پاک ہاتھ ہی سے لکھا جاتا تھا

اور اسی سے پڑھا جاتا تھا۔ یہ کام بے شمار مرد انجام دیتے تھے۔ ایک نہیں لاکھوں کاتبِ قرآن مرد گزرے ہیں۔ ہاں اسلامی تاریخ میں کسی خاتون کاتبِ قرآن کا نام نہیں ملتا۔ یہ اور بات ہے کہ کسی خاتون نے ایک قرآن پاک لکھا اور تحریر میں رکھ لیا لیکن کسی نے تا حیات یہ کام نہیں کیا۔ لوگوں کی معلومات کے لیے بتادوں کہ سب سے پہلے 1877ء میں استنبول میں قرآن پاک کی اشاعت عمل میں آئی یہ بہت اچھا اور معیاری کتابت اور طباعت کے لحاظ سے تھا۔ اس کے بعد 1922ء میں قاہرہ سے جو قرآن پاک شائع ہوا، وہ بے حد اچھا تھا اور وہ اس قدر پسند کیا گیا کہ اسے ایک ایونٹ کے طور پر منایا گیا اور اس قرآن پاک کی لاکھوں کاپیاں پرنٹ ہوئیں۔

پاکیزہ ✧...... جب آپ نے کتابت کا آغاز کیا تو کلام پاک کا ترجمہ بھی پڑھا ہوگا اس سے آپ کو کیا تحریک ملی، کیا آپ کے خیالات میں انقلابی کیفیت پیدا ہوئی؟

ذکیہ بلگرامی ✧...... کتابت کا آغاز میں نے 1972ء سے کیا جبکہ پڑھنے کا عمل 1966ء سے شروع کیا تھا۔ ترجمہ، تفسیر سب کچھ سے ظاہر ہے انسان کے اندر مثبت سوچ پیدا ہوتی ہے...... میں بھی اسی عمل سے گزری ہوں۔

پاکیزہ ✧...... ہمارے علم میں آیا کہ آپ کے ہاتھ کے کتابت شدہ کلام پاک کی تعداد چودہ سے زائد ہے جن کی پاکستان کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی پزیرائی ہوئی تو یہ سب آپ کو کیسا لگتا ہے؟

ذکیہ بلگرامی ✧...... میں نے اب تک سترہ قرآن پاک لکھے جن کا ڈیزائن سائز، رنگ سب کچھ مختلف ہے۔ میں نے اپنے کام کو بیس سال تک مخفی رکھا میں کوئی شوشا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے جو کچھ کیا وہ اللہ کی رضا کے لیے کیا، کسی کو بتانے کے لیے یا دکھانے کے لیے نہیں کیا...... لیکن 1992ء میں جب حکیم سعید صاحب نے شامِ ہمدرد میں بلا کر مجھ سے قرآن پاک لیا تھا تو یہ بات سامنے آگئی پھر مختلف جگہ قرآن پاک رکھے جانے کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ 1995ء میں ایک بڑے سائز کا قرآن پاک قومی عجائب گھر کراچی میں رکھا گیا پھر کراچی یونیورسٹی، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں بھی رکھا گیا۔ 2010ء میں میرا کتابت شدہ قرآن پاک حکومت کی طرف سے ترکی بھیجا گیا۔ یہ منفرد قرآن پاک ہے جس میں عربی کے ساتھ Marmaduke Pickthal کا انگریزی ترجمہ بھی ہے۔ اس میں 1600 سے زیادہ صفحات ہیں اور وزن 16 kg ہے۔ اس کے بعد میں نے بھی ترکی کا دورہ کیا جس میں دونوں حکومتوں کا تعاون شامل تھا۔ یہ جو کچھ ابھی میں نے مختصر طور پر لکھا اس کی صرف خوشی ہے اور اطمینانِ قلب نصیب ہوتا ہے ورنہ مجھے اپنی حقیقت خوب معلوم ہے۔ دنیا دار گنہگار بہت جلد مٹی میں مل جانے والی ہوں۔ شکر ادا کرتی ہوں مگر یہ کام بھی اچھی طرح نہیں کر پائی۔ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے معافی کی طلبگار رہتی ہوں۔

پاکیزہ ✧...... کیا آج کل بھی آپ کچھ لکھ رہی ہیں؟

ذکیہ بلگرامی ✧...... فی الحال ریسٹ کر رہی ہوں۔

پاکیزہ ✧...... ڈائجسٹ میں چھپنے والے آپ کے اس روحانی سفر کی روداد پڑھ کر بہت سے قارئین اس حد تک متاثر ہوئے ہیں کہ انہوں نے بھی آپ کے اس پاک عمل کی تقلید کرنا چاہی، کیا ہر ایک کے لیے یہ ممکن ہے؟

ذکیہ بلگرامی ✧...... جی ہاں، ہر شخص اچھائی کو اختیار کر سکتا ہے۔ جذبہ سچا ہونا چاہیے اور یہ کام صرف اور صرف اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے کرنا چاہیے بلکہ ہر نیکی اللہ کی رضا کے لیے ہی کرنی چاہیے، نام و نمود کے لیے نہیں۔



دائیں سے عالیہ ضیا (بیٹی) ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی بسمہ آصف (بڑی بہو) آمنہ کاشف چھوٹی بہو

پاکیزہ ✧...... ویسے لکھنے لکھانے کے علاوہ آج کل آپ کی کیا مشغولیات ہیں؟

ذکیہ بلگرامی ✧...... میں آج کل زادِ راہ جمع کرنے کی سعی کر رہی ہوں کیونکہ راستہ لمبا، منزل دور اور ہاتھ بالکل خالی ہیں۔ ایک خاص قسم کا غم ہر وقت ساتھ رہتا ہے کہ اللہ کے سامنے کیا منہ لے کر جاؤں گی۔ میں تو تہی دامن ہوں...... سب سے دعا کی اپیل ضرور کرتی ہوں۔ (بے شک پروردگار ہم سب کے گناہوں کو بخشنے والا ہے)

پاکیزہ ✧...... آج آپ اپنے اردگرد کیسا ماحول دیکھتی ہیں۔ کیا مادیت پرستی نے پڑاؤ ڈال لیا ہے یا اخلاقی اقدار اور خاندانی روایات بھی نظر آتی ہیں؟

ذکیہ بلگرامی ✧...... آج کل ہر طرف پیسے کی دوڑ ہے۔ ہر شخص قیمتی سے قیمتی اشیا خریدنا چاہتا ہے خواہ ضرورت ہو یا نہیں ہو۔ شادی بیاہ کے اخراجات اور خرافات کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں...... ان سب باتوں کے باوجود بے شمار گھرانے ہیں جو اخلاقی اقدار کو نبھا رہے ہیں اور برائی کو برائی ہی سمجھتے ہیں۔

پاکیزہ ✧...... آپا کیا آپ نے تقریباً ساری زندگی ورکنگ وومن کی حیثیت سے گزاری؟ اچھا ایک ورکنگ لیڈی کس طرح گھر، رشتے داریاں اور اپنی ذاتی زندگی مینج کر سکتی ہے؟

ذکیہ بلگرامی ✧...... میں نے تمام زندگی ورکنگ لیڈی کی حیثیت سے نہیں گزاری بلکہ ہاؤس وائف کی حیثیت سے زندگی گزاری، گھر کے جملہ کام کیے...... شادی سے قبل سرسید گرلز کالج میں چار سال پڑھایا تھا لیکن اس دوران شادی ہو چکی تھی اور ہمارا تبادلہ بھی ہو گیا تھا اور ہم مسلم باغ چلے گئے تھے جو کوئٹہ سے 75 میل دور ایک پہاڑی مقام ہے۔ وہاں تین سال گزارے اس کے بعد کراچی دوبارہ آگئے۔ میرے شوہر کو میرا سروس کرنا پسند نہیں تھا اس وجہ سے سروس نہیں کی۔ ان کا خیال تھا جو بالکل درست بھی ہے کہ پیسہ کمانا اور بیوی بچوں کا خرچ اٹھانا مرد کی ذمے داری ہے جو انہوں نے ہمیشہ نبھائی...... وہ میرے لکھنے پڑھنے اور ہر کام میں حد سے زیادہ تعاون کرنے والے تھے۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں کہ مجھے تعلیم دلوانے اور خرچ اٹھانے والے وہی تھے اور میرے PHD کرنے پر سب سے زیادہ خوش ہونے والے بھی وہی تھے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ ان کے اپنے بھائی بہن، بہنوئی، بھتیجی، بھانجے وغیرہ سب کے پاس ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں تھیں۔ یہ سب دس بھائی بہن تھے جن میں سے نو کا

انتقال ہو چکا۔ صرف ایک بڑے جیٹھ ڈاکٹر صبیح الدین بلگرامی (جیولوجسٹ) زندہ سلامت ہیں اللہ تعالیٰ انہیں لمبی عمر دے، آمین۔ میں نے اپنے بچوں پر کوئی ٹیوٹر نہیں رکھا خود ہی تمام مضامین پڑھائے۔ میں نے تینوں بچوں کو قرآن پاک بھی خود ہی پڑھایا۔ مولوی نہیں رکھا۔ میری تمام مصروفیات میں ترجیح گھر کو تھی۔ گھر کے کام، بچے اور شوہر پہلے اس کے بعد پھر دوسرے کام۔

پاکیزہ ✧...... یوں سمجھیں آج کل ہر دوسرے گھر میں خواتین بھی معاشی دوڑ میں مردوں کے ساتھ ساتھ ہیں تو آپ کیا سمجھتی ہیں، یہ صحت مند رجحان ہے یا اس سے گھر اور بچے متاثر ہوتے ہیں؟

ذکیہ بلگرامی ✧...... عورت کے ملازمت کرنے سے گھر اور بچے متاثر ہوتے ہیں۔

پاکیزہ ✧...... یہ سوال ہم تقریباً اپنے ہر مہمان سے پوچھتے ہیں تاکہ ہر طرح کی سوچ سامنے آئے اور ایسے لوگوں کے خیالات کی نفی ہو جو یہ کہتے ہیں کہ ہر حال میں عورت کو صرف گھر میں ہی محدود رہنا چاہیے...... آپ کا کیا خیال ہے؟

ذکیہ بلگرامی ✧...... اگر ضرورت ہو تو عورت کو ضرور کام کرنا چاہیے۔ مذہب کی طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے۔ لیڈی ڈاکٹر، نرس، پروفیسرز وغیرہ نہ ہوں تو کیسے کام چلے۔ بہر حال اپنے حالات کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کرنا چاہیے۔

پاکیزہ ✧...... آپ نے جو کچھ بھی کارنامے انجام دیے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں اور گھر والوں کی کیا رائے رہی؟

ذکیہ بلگرامی ✧...... میرے خیال میں، میں نے کوئی خاص کارنامے انجام نہیں دیے۔ ایک سے ایک قابل خواتین موجود ہیں۔ ہاں مجھے اطمینان ہے کہ میں نے نیکی کی راہ اپنائی اور میرے بچے اور رشتے دار بھی خوش ہوتے ہیں۔

پاکیزہ ✧...... آپ کی حمدیہ اور نعتیہ شاعری بھی بہت عمدہ ہے، کیا کوئی مجموعۂ کلام بھی منظرِ عام پر آیا؟

ذکیہ بلگرامی ✧...... حمدیہ اور نعتیہ شاعری بھی بس اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئی۔ تعداد بہت کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں حمد و نعت ﷺ لکھ ہی نہیں پائی۔ بس نہ جانے کیسے کبھی کبھی نزول ہو جاتا ہے۔ میں نے جو چند نعتیں، حمد وغیرہ لکھی تھیں وہ آپ بیتی کی کتاب میں ”روحانی سفر“ دوسرا حصہ میں شائع کروا چکی ہوں۔ یعنی کتاب کے اندر دو پورشن ہیں۔ ایک روحانی سفر، دوسرا نعت کا...... مجموعہ کیسے آسکتا ہے جبکہ مجھے نعت لکھنا آتی ہی نہیں اور تعداد بھی بہت کم ہے۔ اچھا اب ایک عجیب بات بھی بتا دوں یہ جو نعتیں شائع ہوئی ہیں کتاب میں وہ 15 سال پہلے کی ہیں...... عرصہ دس سال سے نعت کی آمد بند تھی پھر میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے خدا مجھے نعت لکھنے کی توفیق عطا فرما، مجھے صلاحیت دے دے، بس مجھے ایسی بے قراری تھی کہ دعا فوراً قبول ہوگئی یہ پہلی شعبان 2012ء کی بات ہے۔ رات کا وقت تھا میں عشا کے بعد سونے کے لیے لیٹی تو اچانک نعت کی آمد شروع ہوگئی اور نعت کے اشعار مجھ پر اس طرح برسے جیسے آبشار...... میں پریشان ہوگئی کہ کیسے سب کو لکھوں۔ رات کو کمزوری بہت ہوتی ہے۔ بہر حال بیٹھ گئی۔ نہ جانے کتنے اشعار ضائع ہوگئے۔ یہ کیفیت تین یا چار دن رہی۔ تمام اشعار ایک ہی ردیف قافیہ کے ساتھ تھے۔ میں سب لکھ نہ سکی مگر 75 اشعار لکھنے میں کامیاب ہوگئی۔ جس کے پہلے دو اشعار لکھ رہی ہوں۔

اِک شور سا اٹھتا ہے مرے قلب و جگر میں
روتی ہیں بہت دید کی پیاسی ہیں نگاہیں
جذبوں کو میں دیکھوں کہ ان آنکھوں کو سنبھالوں
ہر روز برستی ہیں سسکتی ہیں نگاہیں

تمام اشعار ”نگاہیں“ پر ہی ختم ہو رہے ہیں۔


ذکیہ آپا ایک باوقار شخصیت

بہر حال اس کے بعد دوبارہ نعت ﷺ لکھنے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے جو آج کل پاکیزہ میں شائع ہوتا دیکھ رہی ہوں۔ اس کے علاوہ جسارت اخبار میں بھی شائع ہوتی ہیں۔ یہ واقعہ ان دنوں پیش آیا جب میں اپنا سولہواں قرآن پاک لکھ رہی تھی...... ہر بار کوئی نہ کوئی انوکھی بات یا واقعہ ضرور ہوتا ہے لیکن ہر بات بتائی نہیں جا سکتی۔

پاکیزہ ✧...... ادارہ پاکیزہ کے ساتھ آپ کا یہ سفر یہ قلبی تعلق کیسا رہا؟

ذکیہ بلگرامی ✧...... بہت اچھا۔

پاکیزہ ✧...... اچھا آپ کو سیر و تفریح کا کس حد تک شوق رہا اور کن ممالک کا سفر کیا؟

ذکیہ بلگرامی ✧...... میں پاکستان کے بہت سے شہروں میں رہی ہوں۔ اپنے رشتے داروں کے گھر اور جہاں تک باہر کے ممالک کا تعلق ہے تو اس میں سعودی عرب، کینیڈا، ترکی اور عمان شامل ہیں۔

پاکیزہ ✧...... امور خانہ داری میں کھانا پکانے سے کتنی دلچسپی رہی یا اب بھی ہے؟

ذکیہ بلگرامی ✧...... چونکہ ہاؤس وائف کی حیثیت سے زندگی گزاری اس لیے ہر وہ کام کیا جو کوئی بھی خاتون اپنے گھر میں کرتی ہے...... اب صحت ٹھیک نہیں تو میں کوئی کام نہیں کرتی میری بہو بسمہ نے پورے گھر کے کام کاج کی ذمے داری سنبھالی ہوئی ہے۔ ویسے گھر میں ماسیاں بھی کام کرتی ہیں۔

پاکیزہ ✧...... آج آپ کے دل میں کوئی ایسی خواہش، آرزو، تمنا ہے کہ جس کے پورا نہ ہونے کی کسک ہو؟

ذکیہ بلگرامی ✧...... جیسا کہ میں بتا چکی ہوں میں نے بہت کم نعتیں لکھی ہیں میری یہ خواہش ہے کہ کوئی معروف نعت خواں میری کوئی نعت پڑھے اور وہ ٹی وی، ریڈیو پر چلتی رہے اب اتفاق دیکھیے ریڈیو پاکستان سے ایک پروگرام آتا ہے voice of America اس پروگرام کو جو صاحبہ پیش کرتی ہیں وہ کراچی آئی ہوئی تھیں۔ وہ 11 دسمبر 2013ء کو میرے گھر میرا انٹرویو ریکارڈ کرنے آئیں جو 12 دسمبر 2013ء کو آن ائر گیا آف دی ریکارڈ انہوں نے مجھ سے یہی سوال کیا تھا تو میں نے ان کو بھی یہی جواب دیا تھا اس پر انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ آپ کی نعتیں ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتی رہیں گی، یہ میرا وعدہ ہے اور پھر وہ میری 3 عدد نعتیں لے کر امریکا گئی ہیں۔ انٹرویو...... میں بھی ایک نعت میں نے سنائی۔

پاکیزہ ✧...... اپنے قارئین بلکہ نوجوان لڑکیوں سے کیا کہنا چاہیں گی کیونکہ آپ کی بتائی گئی باتیں یقیناً مؤثر اور قابلِ عمل ہوں گی!

ذکیہ بلگرامی ✧...... زندگی میں تحمل، برداشت، صبر، درگزر اور خاموشی کو اپنائیں...... تمام معاملات درست رہیں گے...... معاف کردینے کی عادت ڈالیں۔ شکرانے کی نماز ضرور پڑھا کریں۔

پاکیزہ ✧...... ترجمہ سمجھے بغیر قرآن حکیم پڑھنا کیسا ہے؟

ذکیہ بلگرامی ✧...... قرآن حکیم پڑھنا ہر حال میں باعثِ ثواب اور باعثِ برکت ہے خواہ اس کا

ترجمہ سمجھ میں آئے یا نہیں آئے۔ قرآن کے تمام الفاظ میں شفا ہے۔ ترجمے میں نہیں...... اس کے ہر حرف پر 10 نیکیوں کا ثواب ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا میں نہیں کہتا کہ الم ایک حرف ہے الف ایک لام دوسرا اور میم تیسرا حرف ہے اس طرح الم پر 30 نیکیوں کا ثواب ملے گا۔ دیکھیں میرے پیارے نبی ﷺ نے مثال بھی دی تو کس لفظ کی الم جس کے معنی کسی کو معلوم نہیں۔ اس بات کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ترجمہ نہ پڑھیں اگر آپ پڑھی لکھی خاتون ہیں تو ترجمہ پڑھنا لازمی ہے۔ بلکہ اولیت دینی چاہیے لیکن اگر کوئی ان پڑھ ہے اور قرآن پاک مسجد میں جا کر بچپن میں پڑھنا سیکھ چکا ہے تو وہ قرآن پاک ضرور پڑھے گا۔ میں اپنی پاکیزہ بہنوں کی معلومات کے لیے ایک بات کہنا چاہ رہی ہوں کہ پاکیزہ ڈائجسٹ کے ایک صفحے پر 62 لائنیں ہوتی ہیں یعنی 5 صفحات میں تقریباً 300 لائنیں ہوتی ہیں۔ ایک سیپارے میں بھی 300 لائنیں ہوتی ہیں۔ اس لیے اگر آپ ایک سیپارے کا ترجمہ پڑھیں گی تو اتنا ہی وقت لگے گا جتنا پاکیزہ کے 5 صفحات پڑھنے میں...... کسی کسی دن رسالے کے 5 صفحات کم پڑھیں اور ایک سیپارے کا ترجمہ پڑھ لیا کریں۔ (بہت خوب)

پاکیزہ ✧...... بغیر معنی سمجھے ہوئے قرآن پاک کو حفظ کرنے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ذکیہ بلگرامی ✧...... جب بچے کم عمر ہوتے ہیں تب ان کو حفظ کرنے کے لیے بٹھایا جاتا ہے اور وہ 8 یا 9 سال کی عمر میں قرآن حکیم حفظ کر لیتے ہیں۔ ظاہر ہے وہ اس وقت معنی نہیں سمجھ سکتے۔ اب ان لوگوں میں دو طرح کے افراد ہوتے ہیں۔ تعلیم یافتہ اور ان پڑھ جو لوگ تعلیم یافتہ ہیں اور حافظِ قرآن بھی وہ ترجمہ ضرور پڑھتے ہیں انہیں سب کچھ پتا ہوتا ہے۔ اب جو معمولی پڑھے لکھے ہیں وہ ترجمہ نہیں پڑھے ہوتے پر گھر گھر جا کر بچوں کو قرآن حکیم پڑھاتے ہیں۔ سورتیں یاد کرواتے ہیں، نماز سکھاتے ہیں، حلال روزی کماتے ہیں۔ نماز، روزے کی پابندی بھی کرتے ہیں۔ ہر حرف پر 10 نیکیوں کا ثواب بھی حاصل کرتے ہیں۔ حافظِ قرآن ہونا کوئی معمولی بات نہیں بہت بڑی بات ہے۔ ان کا مرتبہ بہت بلند ہے خواہ وہ اس دنیا میں کتنے ہی غریب کیوں نہ ہوں۔

پاکیزہ ✧...... آپ کی زندگی کا یادگار دن؟

ذکیہ بلگرامی ✧...... یوں تو زندگی میں بے شمار یادگار دن ہیں۔ مگر پچھلے دنوں ہمدرد فاؤنڈیشن کی صدر محترمہ سعدیہ راشد صاحبہ، برکاتی صاحب کے ساتھ میرے گھر تشریف لائی تھیں وہ ایک یادگار دن تھا اس روز میں نے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے چھ عدد قرآن حکیم دیے تھے۔ جس میں دو عدد قرآن پاک پرانے تھے یعنی 1976ء اور 1980ء کے لکھے ہوئے اور چار نئے تھے۔ دراصل وہ مجھے مدینۃ الحکمت میں reception دینا چاہ رہی تھیں لیکن میں نے اپنی صحت کی وجہ سے ان سے معذرت کر لی تھی اور کہا تھا کہ آپ خود ہی قرآن پاک منگوا لیں۔ یہ ان کی اعلیٰ ظرفی تھی اور پھر قرآن پاک کی عظمت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ خود آئیں چنانچہ وہ آئی تھیں پھر ان کی دلی خوشی، سادگی، اخلاق سب کچھ اتنا اچھا تھا کہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔ تمام قرآن حکیم لاؤنج میں رکھ دیے گئے تھے۔ میں آپ کو کیا بتاؤں گھر کی فضا کیسی تھی۔ ہر جانب نور ہی نور پھیلا ہوا تھا۔ حیرت انگیز طور پر میری طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ میرے بڑے بھائی جو خاصے عمر رسیدہ ہیں اور ان دنوں کمزوری وغیرہ محسوس کرتے ہیں انہوں نے بھی یہی کہا کہ اس دن ان کی صحت بالکل ٹھیک تھی۔ میں نے کسی کو مدعو نہیں کیا تھا بس میری بیٹی عالیہ آئی تھی اور بڑے بھائی و بھابی ...... تصویریں اتاری گئیں...... سعدیہ صاحبہ نے فرمائش کی کہ انہیں بھی فوٹو بھیجی جائیں چنانچہ میں نے تصاویر بھیج دی تھیں۔

انہوں نے میرے لکھے ہوئے نسخوں کی نمائش لگائی ہمدرد سینٹر میں بھی اور پھر مدینۃ الحکمت لائبریری میں پھر تمام تصاویر مجھے بھیجیں۔ مجھے یہ اطمینان ہے کہ میرے تمام قرآن پاک درست جگہ پہنچ گئے اور اب وہ حفاظت سے رہیں گے۔

پاکیزہ ✧...... آپ اپنی خاص دوستوں کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ذکیہ بلگرامی ✧...... ویسے تو میری بے شمار دوستیں ہیں لیکن کچھ واقعی خاص ہوتی ہیں۔ اسکول کے ساتھ کی ذکیہ حفیظ اور ریحانہ متین میری بہت پرانی اور مخلص دوست ہیں۔ کالج کے زمانے کی ڈاکٹر تنویر زبیری (الٹرا ساؤنڈ اسپیشلسٹ) بے حد مخلص اور محبت کرنے والی ہیں۔ ایم ایس سی کے زمانے میں عالیہ حیات جو اب امریکا میں ہیں...... سب سے زیادہ قریبی دوست ہیں اور بے شمار نام ہیں لکھنے بیٹھوں تو صفحات کم پڑ جائیں گے۔ قلم کاری کے حوالے سے یوں تو کئی دوستیں ہیں لیکن سب سے زیادہ قریبی دوست انجم انصار ہیں جن سے قلبی لگاؤ ہے۔ ہم لوگ ہر بات ایک دوسرے سے شیئر کرتے ہیں۔ اگرچہ بات چیت فون پر ہی ہوتی ہے مگر برابر ہوتی ہے...... میرے خیال میں حقیقی دوست وہ ہوتا ہے جس کے ساتھ مل کر انسان آنسو بہاتا ہے۔ میں نے انجم انصار کے ساتھ مل کر آنسو بھی بہائے ہیں، یہ اس وقت کی بات ہے جب میں بہت بیمار ہو گئی تھی۔ ہاں انجم انصار مجھے آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں مگر شرط یہ کہ آپ میرے گھر آئیں۔ فون پر کیا بات ہو سکتی ہے۔ (آپ بلائیں اور میں نہ آؤں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ انجم انصار)

پاکیزہ ✧...... آخر میں ایک مرتبہ پھر آپ کا از حد شکریہ کہ اتنے خوب صورت خیالات سے تفصیلی طور پر نوازا اور قارئین کے لیے پُر مغز و پُر روح گفتگو کی۔ پروردگارِ عالم آپ کو صحتِ کاملہ سے نوازے اور آپ یونہی لکھتی رہیں اور ہماری رہنمائی کا فریضہ بھی انجام دیتی رہیں! الٰہی آمین

ذکیہ بلگرامی ✧...... نزہت اصغر صاحبہ میں آپ کا بے حد شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے میرے انٹرویو کے لیے پاکیزہ ڈائجسٹ میں جگہ نکالی۔ میں عذرا رسول صاحبہ، انجم انصار کا بھی شکریہ ادا کر رہی ہوں۔ پاکیزہ ڈائجسٹ میں لکھنے والی تمام رائٹرز اور پڑھنے والی خواتین و بچیاں سب میرے دل کے بہت قریب ہیں۔ میرے دل میں کسی کے خلاف کوئی بات نہیں...... میں اپنے جذبات کی ترجمانی کرنے کے لیے اپنے چند تازہ اشعار لکھ رہی ہوں:۔

میرا دل تو خالی ہے بس نور کی شمع جلتی ہے
کیوں کر ہوگا من میں اندھیرا، نور کی شمع جلتی ہے
سونا چاندی دھن دولت ہو کچھ بھی میرے پاس نہیں
نور کے رستے بھاگ رہی ہوں نور کی شمع جلتی ہے

اب آپ سے اجازت چاہوں گی، اللہ حافظ!

☆☆☆

عزیز قارئین! ہمیں امید ہے کہ آپ کو ہماری اتنی پیاری آپا کی باتیں ضرور مثبت سوچوں کی طرف راغب کریں گی اور آج کے دور میں اسی طرح کے اندازِ فکر اور طرزِ عمل کو اپنانے کی شدید ضرورت بھی ہے تاکہ ہم سچے، پکے اور فعال مسلمان بن سکیں اور آنے والی نسلوں کو اسلامی اقدار سے بہرہ ور کرتے ہوئے پروان چڑھائیں۔

ایسی ہی کسی پُر اثر ہستی سے ملاقات لیے پھر حاضر ہوں گے۔ بس خوش رہنا اور خوش رکھنا سیکھیں۔ ان صفحات کے لیے آپ کے تاثرات کے منتظر رہیں گے۔ اللہ نگہبان......

جنوں کے راستے یوں تو کٹھن سے لگتے ہیں
مگر یہ راستے منزل تلک نکلتے ہیں
زمانہ ہر قدم پہ راہ روکنے والا
عزائم پختہ ہوں جن کے وہ کب بھٹکتے ہیں

☆☆☆

میرا خضرِ راہ چلا گیا

شیریں حیدر

میرا راہنما تھا، چلا گیا
جو تھا خضرِ راہ...... چلا گیا
میرا معترف، وہ نقاد میرا
اتالیق بھی وہ تھا میرا!

لفظ ''تھا'' لکھنا ایسا مشکل کب ہوا تھا پہلے؟ کب سوچا تھا کہ میں اپنی عمر کے اس دور میں اپنے والدِ محترم کے لیے خراجِ تحسین کے الفاظ لکھوں گی مگر انہیں وہ خود نہ پڑھ سکیں گے۔ وہ گھر میں سب سے پہلے پاکیزہ وصول کرتے اور اس وقت تک کسی اور کے حوالے نہ کرتے جب تک کہ وہ میری تحریر اور بہنوں کی محفل نہ پڑھ لیتے۔ جس ماہ انہیں پاکیزہ میں میری تحریر نظر نہ آتی، مجھے پوچھتے کہ میں نے کچھ لکھا کیوں نہیں...... میں کہتی۔ کہانیاں یوں تھوڑی لکھی جاتی ہیں کہ جب چاہو لکھ لو، یہ تو موڈ اور آمد پر منحصر ہے یا جب کوئی واقعہ دل کو چھو لے اور اس پر کہانی لکھوں۔

جانے والے برس کے آخری تین دنوں میں میرے ابا جی اچانک دماغ کی نس پھٹ جانے کے باعث کوما میں چلے گئے۔ انہیں گجرات سے راول پنڈی منتقل کیا گیا اور امید بندھ گئی کہ وہ کسی بھی وقت جاگ جائیں گے۔ آس اور یاس کے بیچ، بین قیامت کی گھڑیاں طویل ہو رہی تھیں...... کسی لمحے دل ڈوبتا اور کسی وقت سطح پر ابھر آتا کہ ڈاکٹرز کہتے کہ وہ کسی بھی وقت جاگ سکتے ہیں۔ ان کا اپنا جسمانی مدافعتی نظام، ڈاکٹروں کی دعائیں اور ہماری اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر کی گئیں دعائیں...... اللہ نے ہمیں کسی لمحے مایوس نہ کیا تھا، امید پر قائم تھے کہ چار جنوری کی صبح سے ہی اسپتال سے کہا گیا کہ ان کے لیے دعا کریں، بلڈ پریشر کم ہو رہا تھا۔

دن کے ایک بجے وہ خبر آئی کہ جسے کبھی کانوں نے سننا ہی نہ چاہا تھا، ابا جی دنیا میں نہیں رہے تھے۔ میرے پیارے ابا جی زندگی کی مشقت سے تھک کر ایسے سوئے کہ جاگے ہی نہ تھے، فرشتوں کی معصومیت کے ساتھ، ہر ایک سے بے نیاز ہو کر 21 جنوری 1927ء کو شروع ہونے والا سفر 4 جنوری 2014ء کو اختتام پزیر ہوا، یہ سفر انہوں نے کس طرح طے کیا۔

بچپن میں انہیں ناز و نعم سے پالا گیا۔ اپنے گاؤں بھدر کے مڈل اسکول سے فارغ ہو کر لالہ موسیٰ کے اسلامیہ ہائی اسکول میں میٹرک کرنے کے لیے داخلہ لیا، وہاں استادوں کو اپنا یہ اسمارٹ اور ذہین طالب علم بہت بھایا اور اسے نمایاں اہمیت ملنے لگی۔ وہ گاؤں میں اپنی عمر کے لڑکوں میں لیڈر کی حیثیت رکھتے تھے تو شہر کے اسکول میں ان کی قائدانہ صلاحیتوں کو فوراً پہچان لیا گیا اور انہیں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں نمایاں ذمے داری دی گئی۔ ایف اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور اس کے بعد پولیس میں بھرتی ہو کر سندھ چلے گئے۔ اپنی پیشہ ورانہ ذمے داری کے طور پر انہیں قائداعظم کے جنازے کو کندھا دینے کی سعادت بھی نصیب ہوئی جسے وہ ہمیشہ فخریہ بیان کرتے تھے۔

اپنی ملازمت کے دوسرے برس ہی انہیں اپنی زندگی کے پہلے بڑے المیے کا سامنا ہوا...... فقط بائیس برس کی عمر میں ان کے باپ کا سایۂ شفقت ان کے اور ان کے دس بہن بھائیوں کے سر سے اٹھ گیا اور وہ اپنی ماں کے دستِ راست بن گئے۔ آفرین ہے ان پر کہ انہوں نے ماں کے ساتھ ان کی ہر، ہر ذمے داری کو بطریقِ احسن نبھایا...... بہن بھائیوں کے بھی فرائض پورے کیے، انہیں تعلیم دلائی اور شادیاں کیں، اس کے بعد ان کے بچوں تک کی ذمے داریاں نبھانے میں بہن بھائیوں کا ساتھ دیا۔

یکم جولائی 1957ء کو ان کی شادی ہوئی...... اللہ نے انہیں نو اولادیں دیں جن میں سے ایک بیٹی کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا، اپنے بہن بھائیوں کے بعد وہ ہم آٹھ بچوں کی ذمے داریوں میں مصروف ہو گئے۔ زندگی ایک مسلسل مشقت کی طرح گزاری مگر پھر بھی ان کے ماتھے پر بل نہ پڑے نہ کبھی تاثرات میں بیزاری دیکھنے کو ملی۔ بہت بڑے ظرف والے انسان کہ میں نے اپنی زندگی میں ایسی برداشت اور حوصلے والا کوئی شخص نہیں دیکھا۔ وہ انتھک محنت کرنے والے، حاضر دماغ اور حاضر جواب، بذلہ سنج، ہر موضوع پر گفتگو کے ماہر، اللہ پر توکل، سادہ مزاج، خوش لباس، سادہ غذا کھانے والے، بڑوں کی عزت اور چھوٹوں سے شفقت کرنے والے، ملکی اور خاندانی مسائل پر ہر پہلو سے نظر رکھنے والے، دوست پرور، انتہائی سعادت مند بیٹے، ذمے دار بھائی، مثالی شوہر، انتہائی شفیق باپ اور محبت کی حدوں کو چھوتے ہوئے دادا اور نانا تھے۔ چھوٹے سے چھوٹے کام کے لیے بھی کسی کو زحمت نہ دیتے، دوسروں کے لیے ہمہ وقت مدد کو تیار رہتے، وعدے کی پاسداری کرتے خواہ وہ کسی بچے سے کیا گیا چھوٹے سے چھوٹا وعدہ ہو، نیت کے پاک، دل کے صاف، ارادوں کے مضبوط، اصولوں کے پاسدار، وقت کے انتہائی پابند، عبادت گزار، یاروں کے یار، بہترین استاد، ناصح، مصلح اور نقاد تھے۔ پیار کا ایک ایسا سمندر تھے کہ جس میں کبھی ذخیرہ ختم نہیں ہوتا۔ انہوں نے چار نسلوں تک پیار بانٹا ہے اور اس قدر بانٹا ہے کہ ان کے جانے سے سب کی زندگیوں میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا ہے۔

ہر عمر کے لوگ ان کی صحبت میں خوش اور محظوظ رہتے تھے...... بات سے بات نکالنا ان کا خاص وصف تھا۔ ہر موضوع پر انہیں گفتگو میں خاص مہارت تھی، ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ مذہب، سیاست، سیاحت، قانون، زراعت، کھیل، میڈیا...... غرض ان کے دائرۂ علم سے کوئی موضوع باہر نہ تھا، گھنٹوں سیر حاصل گفتگو کرتے اور سننے والے پورے انہماک سے سنتے تھے۔ انہیں انگریزی، اردو، فارسی، پنجابی اور سندھی زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا، اس کے علاوہ وہ ہندکو، سرائیکی اور پشتو زبانیں بھی بول اور سمجھ سکتے تھے۔ علم کا ایک منبع تھے، ایک انسائیکلوپیڈیا تھے جس سے ہم محروم ہو گئے ہیں۔

میرے لیے وہ ایک باپ نہیں...... میرا پورا جہان تھے، وہ میرے استاد، ناصح، نقاد، معترف اور میرے لیے ہر وقت دعائیں کرنے والے، میری ہر کامیابی پر کھل اٹھنے والے تھے۔ 2005ء میں میری پہلی کتاب ''ایک محبت دو افسانے'' کی تقریب رونمائی میں وہ بطورِ خاص گجرات سے کراچی شرکت کے لیے آئے، جب مجھے اسٹیج پر بلایا گیا تو میں نے خود سے پہلے اپنے والد صاحب کو بلائے جانے کی درخواست کی، اس کے بعد میں اس اسٹیج پر گئی...... اس شام وہ بہت خوش تھے، مجھ سے کہنے لگے۔ ''دنیا کی ہر اولاد اپنے باپ کے نام سے جانی جاتی ہے، آج اسٹیج پر جب مجھے شیریں حیدر کا باپ کہہ کر پکارا گیا تو میں ہواؤں میں اڑتا ہوا اسٹیج تک پہنچا تھا۔ مجھے تم پر بہت فخر محسوس ہوا، تمہاری تعریف میں بولا گیا ہر لفظ مجھے اپنی تعریف لگ رہا تھا!''

مجھے اپنے والد صاحب کے حوالے سے جانا، جانا ہمیشہ سے اچھا لگتا ہے، جب کوئی مجھے کہے کہ اس میں یہ خوبی اس لیے ہے کہ یہ ان ماں باپ کی بیٹی ہے تو میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے، دونوں برداشت اور صبر کا مجموعہ ہیں۔

گاؤں کی جن گلیوں میں کھیل کر وہ جوان ہوئے...... انہی گلیوں میں ان کا جسدِ خاکی لایا گیا تو ارد گرد کے کئی دیہات امڈ کر آئے اور پورا ماحول چیخوں، آہوں، کراہوں اور سسکیوں میں ڈوب گیا۔ ان کی چھیاسی سالہ زندگی ایک مثبت زندگی کی بہترین مثال تھی، انہوں نے اپنی شخصیت کے گہرے اثرات لوگوں کے دلوں پر چھوڑے ہیں۔ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے میں ان کے سفرِ آخرت کے آخری مراحل طے ہوتے دیکھ رہی تھی، وقت کی رفتار تک نہ تھمی اور میری پہلی محبت کا محور تہہ خاک چلا گیا۔

کون ہوگا جسے ملنے کی تڑپ میں میرا دل بھاگ، بھاگ کر گجرات جائے گا...... کون ہوگا جو میرے سفر کے دوران کال کر کے پوچھے گا کہ میں کہاں پہنچی ہوں...... کون ہوگا جو گھنٹا گھنٹا بھر گیٹ پر کھڑا ہو کر میرے انتظار کی گھڑیاں کاٹے گا، میرے سر پر بوسہ دے کر اپنے سینے سے لگا کر استقبال کرے گا، روانگی کے وقت کہے گا ''کچھ دیر اور رک جاؤ، اچھا۔ گھر پہنچ کر خیریت سے پہنچنے کی فوری اطلاع کرنا!'' گھر پہنچ کر کال کروں گی تو کون کہے گا۔ ''میرا دل تو ابھی سے اداس ہو گیا ہے بیٹا، پھر کب آؤ گی!''...... میری دنیا بدل گئی ہے، سوچیں بدل گئی ہیں......

مگر دنیا کا نظام چلتا رہے گا، موسم بدلتے رہیں گے، دریا اسی طرح بہیں گے، بادل برسیں گے، پرندے چہچہائیں گے، لوگ آتے جاتے رہیں گے...... سب کچھ ہوگا مگر ہمارے دلوں کے موسم بدل چکے ہیں، یہاں تہ میں غم یوں جم گیا ہے کہ کوئی بھی موسم ہو، غم کی آمیزش اس میں ہولی رہے گی، ہم خوش ہو کر بھی مکمل خوش نہ ہوں گے، ہم ہنسیں گے مگر ہنسی میں بھی ایک دکھی کھنک ہوگی، ہمیں ان کی یاد قدم، قدم پر آئے گی اور دل دکھائے گی۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں خاص الخاص جگہ عطا فرمائے، ان کے درجات بلند کرے اور انہیں اپنے پیارے نبی ﷺ کی شفاعت عطا فرمائے...... آمین۔

☆☆☆

بہنوں کی محفل



مدیرہ

★ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ!

★ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

★ پیاری بہنو! مارچ کے پُربہار نمبر کے ساتھ حاضر ہوں...... پورے ملک میں سردی کا زور ٹوٹ گیا ہے اور موسم خوشگوار ہوگیا ہے اور ہر طرف کھلنے والے پھولوں نے ماحول پر ایک اچھا اثر ڈالا ہے۔ شہر لاہور اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے پہلے ہی بہت مشہور تھا...... اور اب مزید مشہور اور خوب صورت ہو جائے گا کہ ہماری قلم کار شہزادی عمیرہ احمد سیالکوٹ سے رخصت ہو کر لاہور شہر میں آرہی ہیں۔ ان کے چارمنگ پرنس سول سروس سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک نمایاں پوسٹ پر فائز ہیں...... اور ہمیں ان سے صرف یہی کہنا ہے کہ اب ہماری پیاری، پیاری شہزادی لاہور آرہی ہیں اور اس کے لیے میری اور میرے ادارے کی جانب سے دعاؤں کے اور پھولوں کے ہزاروں کنٹینرز قبول ہوں اسی لیے آپ بھی ہماری شہزادی کو پھولوں کی طرح رکھیے گا کہ یہ ہماری لڑکی ہم سب کے دلوں میں رہتی ہیں۔ پیاری عمیرہ شاد رہو...... آباد رہو...... اور زندگی کے ہر پل کی خوشیاں تمہیں مبارک ہوں۔ آمین ثم آمین۔

☆ عزیز بہنو...... آج آپ سب سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے...... آپ سب اپنے، اپنے گھروں کے کچن کی کمانڈرز تو ہیں ناں...... تو پھر ہمارے باورچی خانوں میں بازاری مسالوں کے ڈبے کیوں اتنا چھا گئے ہیں۔ اب جس گھر میں جاؤ، وہاں ہر کھانا مسالے کے ڈبے کی وجہ سے بن رہا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اگر چھلا ہوا لہسن بازار سے خریدیں تو وہ تیزاب میں بھیگا ہوا ملتا ہے، تلی ہوئی پیاز کے پیکٹ خریدیں تو اس میں لکڑی کا بھوسا ملایا جارہا ہے۔ سیاہ پسی ہوئی مرچ میں نہ جانے کون سا کالا پاؤڈر ملا ہوا ہے اب درجنوں قسموں کے مسالے کے ڈبے بازار میں نظر آرہے ہیں۔ ایک دو کو چھوڑ کر زیادہ تر ڈبوں میں کیا کیا مضر رساں اشیا ملی ہوئی ہو سکتی ہیں، ہم سوچ بھی نہیں سکتے پہلے جو بیماریاں پانچ فی صد تھیں اب پینتیس فی صد بڑھ چکی ہیں اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اب ہمارے باورچی خانوں میں بھی صاف ستھری اصلی چیزیں ناپید ہو چکی ہیں تو آپ اس طرف بھی توجہ دیجیے...... آج سے پچیس سال پہلے گھر کے مسالوں سے آخر قورمے، بریانی اور کباب بنا ہی کرتے تھے...... تو اب کیوں نہیں بن سکتے......؟ پہلے تو ہم ہاون دستے کی مدد سے لاہوری نمک پیس کر استعمال کیا کرتے تھے اب تو لاہوری نمک بہ آسانی چکی سے پسوا کر ہم مہینوں استعمال کر سکتے ہیں...... جیسے ہی مجھے کوئی نئی بات پتا چلتی ہے تو میں اپنی بہنوں سے شیئر کیا کرتی ہوں تو پلیز بازاری نمک استعمال کرنے کے بجائے لاہوری نمک پسوا کر استعمال کریں...... اسی طرح بازاری پسی ہوئی ہلدی استعمال کرنے کے بجائے ثابت ہلدی اور کچی ہلدی کا استعمال کریں۔ کچی ہلدی سبزی مارکیٹ سے اروی کی شکل کی مل جاتی ہے جو ذائقے اور استعمال میں ہمارے لیے ہر لحاظ سے مفید ہے۔ آپ کچن کمانڈر ہیں...... اب آپ نے یہ خود سوچنا ہے اور قدم اٹھانا ہے کہ اپنی اور اپنے خاندان کی اچھی صحت کے لیے...... آپ کیا کیا کر سکتی ہیں؟

☆ جیسا کہ آپ سب جانتی ہیں کہ پاکیزہ کے اپریل اور مئی کے شمارے سالگرہ نمبر ایک اور سالگرہ نمبر دو ہوں گے۔ ان خصوصی نمبرز کے لیے آپ اپنے خوب صورت ترین مراسلات، تصویر کے ساتھ اپنے انٹرویوز بھی ہمیں بھیج سکتی ہیں...... مگر جلد از جلد... تاکہ وہ ان خاص نمبرز میں جگہ بھی پا سکیں۔

☆ آئیں اب سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے پہلے صرف ایک بار درودِ ابراہیمیؑ پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین مرتبہ آیتِ کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالم اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔

آیتِ کریمہ یہ ہے۔

لاالٰہ الا انت سبحانك انی کنت من الظالمین

ترجمہ: تیرے سوا کوئی معبود نہیں اور تو ہر عیب اور کمزوری سے پاک ہے، میں قصورواروں میں سے ہوں۔

نوٹ: یہ حضرت یونسؑ کی مشہور دعا ہے جو انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں اللہ سے کی تھی۔ یہ آیتِ کریمہ کہلاتی ہے اس کے پڑھنے کے فوائد کثرت سے ہیں اور اب آپ اپنی مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی سرگرمیوں پر ایک نظر تو ڈالیں کہ کیا کچھ ہو رہا ہے۔

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ ہماری بے حد پیاری راج دلاری مایہ ناز مصنفہ عمیرہ احمد کا نکاح گزشتہ ماہ ہوگیا ہے اور اب انشاء اللہ ان کی رخصتی مارچ میں ہوگی۔ (بے حد مبارک باد اور بے شمار دعائیں)

☆ ہماری پیاری مصنفہ رخ چوہدری کا ٹی وی سوپ دل کا دروازہ ایک نجی چینل سے شروع ہوگیا ہے۔ (مبارک باد)

☆ ہماری پیاری مصنفہ سائرہ عارف کا ٹی وی سوپ محبت بہتا دریا ایک نجی ٹی وی چینل سے دکھایا جارہا ہے (مبارک باد)

☆ ہماری پیاری مصنفہ رفاقت جاوید اسلام آباد سے دو دن کے لیے کراچی آئیں اور پھر راشد آباد روانہ ہوگئیں۔ رفاقت جاوید کے حوالے سے دوسری نیوز یہ ہے کہ ان کی دو نئی کتابیں شائع ہو کر مارکیٹ میں آگئی ہیں۔ ان کے ناول بہاروں کی پت جھڑ میں ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو لاڈ و پیار میں پروان چڑھی اور عملی زندگی کی تیز و تند تھپیڑوں کا مقابلہ نہیں کر سکی اور ڈپریشن میں چلی گئی۔ اسے زندگی میں محبت اور ایثار کے ساتھ جینے کا درس کس نے دیا یہ آپ اس ناول میں خود پڑھیں...... اس ناول کا انتساب شبیر بھائی اور ان کی بیگم خورشید کے نام ہے، جنہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کی شہادت کے فخر میں اپنے بیٹے کے نام پر سندھ میں ایک نیا شہر راشد آباد بسایا ہے اور اپنی زندگی دوسروں کے لیے وقف کر دی ہے۔ اس کتاب کی قیمت صرف تین سو روپے ہے...... رفاقت جاوید کا دوسرا ناول، خوشبو شناسائی کی ایک سچی کہانی کو ناول کا روپ دیا گیا ہے۔ اس میں ایک ایسے خاندان کا ذکر ہے جو اپنے خون سے انصاف نہ کر سکے تو پھر وہ پرائے خون کے ہمدرد اور محافظ کیونکر ہو سکتے تھے۔ اس ناول کی قیمت بھی صرف تین سو روپے ہے۔ آپ کو یہ دونوں ناول القریش پبلی کیشنز، سرکلر روڈ، چوک اردو بازار لاہور سے مل سکتے ہیں۔

☆ پاکیزہ کے مستقل قاری ارشد محمود ارشد کا تیسرا مجموعۂ کلام شام کی دہلیز پر شائع ہوگیا ہے...... چھوٹی بحر میں لکھی ہوئی نظمیں اور غزلیں دل پر دستک دیتی ہیں...... اور بعض غزلوں میں اداسی اور دلداری...... میر کے رنگ میں بھی رنگی نظر آتی ہیں...... اس خوب صورت مجموعے کی قیمت صرف دو سو روپے ہے...... جسے منگوانے کے لیے آپ ارشد محمود سے ڈائریکٹ رابطہ کر سکتے ہیں 0300.6008622 جی ہاں یہ ان کا موبائل فون ہے۔

☆ ہماری پیاری اور کم عمر مصنفہ انیقہ محمد بیگ، سیالکوٹ کا نیا ناول خواب آنکھیں کتابی صورت میں شائع ہوگیا ہے۔ جس میں ایک ایسی محبت کرنے والی لڑکی کی کہانی ہے جس کی تمام زندگی قربانیاں دیتے گزر جاتی ہے...... اور آخر میں اسے منزل ملتی ہے یا نہیں...... اس کے لیے یہ آپ خود پڑھیے...... اس ضخیم ناول کی قیمت صرف تین سو روپے ہے۔ جسے خزینہ علم و ادب لاہور نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے...... انیقہ محمد بیگ کے حوالے سے دوسری نیوز یہ ہے کہ ٹی وی کے مختلف چینلز پر ان کے لکھے ہوئے ڈرامے دکھائے جارہے ہیں...... یہ ہے تو چھوٹی سی تو لڑکی مگر کام کر رہی ہے بڑے بڑے...... (مبارک کاں)

☆ شاعرہ مصنفہ افتخار شوق میاں چنوں جو شعبۂ تعلیم میں ایک اہم منصب پر بھی فائز ہیں۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ

میاں چنوں کے اسکولوں میں انہوں نے جلترنگ کے خاکے وہاں کے فنکشن میں پیش کروائے...... جسے سب نے بے حد پسند کیا۔ (نوازش)

☆ ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ نے مزاح نمبر نکالا ہے جس میں ہماری کتب سے لے کر مزاحیہ تحریر لگائی ہیں۔ (نوازش)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری فریدہ سجاد کراچی کے کینیڈا میں مقیم بیٹے طلحہ کا رشتہ فرح کے ساتھ طے ہوگیا ہے۔ طلحہ کے پاکستان آنے پر نکاح کی تقریب ہوگی۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار، صبا نور لسبیلہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے اب ایف اے کا امتحان دیں گی۔ (ماشاءاللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار سعدیہ سلیم، سڈنی اپنی فیملی کی شادی کی تقریب اٹینڈ کرنے کے لیے آئندہ ماہ اسلام آباد آرہی ہیں۔ (خوش آمدید)

☆ پاکیزہ کی شاعرہ، مستقل تبصرہ نگار فریدہ افتخار، امریکا سے واپس پاکستان آگئی ہیں اور اب پشاور سے اسلام آباد بھی آگئی ہیں۔ (ماشاءاللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری ڈاکٹر راضیہ فوجدار، ساہیوال کی پیاری بیٹی عتیقہ کی شادی انشاء اللہ مارچ میں ہوگی۔ (مبارکاں)

☆ ہماری پیاری مستقل تبصرہ نگار شیریں ظفر عمرے کی سعادت حاصل کرکے واپس ملتان آگئی ہیں۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار سنبل ملک اعوان، تحصیل فیروز والا کے ہاں پہلا بھتیجا ہوا ہے جس کا نام ملک شمعون باسط رکھا گیا ہے (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ شہلا نواز، لاہور کے بھائی حیدر علی اپنی فیملی کے ساتھ عمرے کی سعادت حاصل کر کے آئے ہیں۔ (مبارکاں)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری اور تبصرہ نگار مریم اب کینیڈا شفٹ ہوگئی ہیں۔ (ماشاءاللہ)

☆ آپ کی باجی انجم انصار ان دنوں بیمار ہیں۔ ان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔ میں کچھ دنوں اپنی رہائش گاہ پر نہیں تھی۔ بہنوں سے فون پر بات نہیں ہوسکی۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری ثروت شعیب، سوات کی طبیعت اب قدرے بہتر ہے۔ (ماشاءاللہ)

☆ ہم سب کی لاڈلی تبصرہ نگار امینہ عندلیب، سلانوالی کی طبیعت ان دنوں پھر خراب ہے...... اس کی صحت اور زندگی کے لیے آپ سب ضرور دعائیں کیجیے۔

☆ ہماری بے حد پیاری مصنفہ رضوانہ پرنس لندن روانہ ہوگئی ہیں وہاں ان کی والدہ طاہرہ باجی کی طبیعت ناساز ہے...... والدہ کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ ہماری مستقل تبصرہ نگار ذکیہ ایوب، لاہور سے کراچی واپس آگئی ہیں اور وہ بسترِ علالت پر ہیں ان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ ہماری بے حد پیاری مصنفہ نگہت نسیم، سڈنی ان دنوں بسترِ علالت پر ہیں ان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ پاکیزہ کی شاعرہ پروین عذرا تشنہ ان دنوں علیل ہیں ان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری عذرا بی بی، راولپنڈی کی پریشانیاں دور ہونے کے لیے ضرور دعا کریں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار، تمثیلہ زاہد نے افسانہ نگاری کا آغاز کردیا ہے اور ان کے افسانے شائع بھی ہورہے ہیں۔ (ماشاءاللہ) دوسری خبر ان کے لیے یہ ہے کہ ان کی والدہ کی صحت کے لیے دعا کیجیے۔

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار اور شاعرہ عالیہ بشیر اسلام آباد تا حال بسترِ علالت پر ہیں ان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ پاکیزہ کی شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار ظل شاہین ان دنوں علیل ہیں ان کی صحت کے لیے دعا کریں۔

انتقالِ پُرملال

☆ پاکیزہ کے مستقل قاری جناب و بیگم آصف خان، ملتان کی جوان کزن فوت ہوگئی ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری بسم اللہ بیگم، کراچی کی اس ماہ برسی ہے۔

نوٹ: تمام مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کے ساتھ تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔

٭٭٭



سلمیٰ اعوان، لاہور سے۔ ”پاکیزہ پڑھا تو صورتِ حال سے آگاہی ہوئی۔ تمہارے جواب نے بحث کے دروازے بند کردیے ہیں مگر مجھے امید ہے کہ میری مصروفیت سے تھوڑی سی ہمدردی رکھتے ہوئے اس موضوع کے ساتھ بہنوں کی محفل میں میرا داخلہ ممکن ہوجائے گا۔ پہلی بات پاکیزہ اور دیگر خواتین کے ڈائجسٹ، میگزین اور خواتین کے لکھے ہوئے ناول جنہیں ہمارے بڑے ادیب اور نک چڑھے نقاد کبھی پاپولر ادب، کبھی کمرشل، کبھی پاپولر فکشن کا نام دے کر نظرانداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو یقیناً مثبت رویہ نہیں کہ یہی وہ پودے ہیں جو کل تناور درختوں کا روپ دھارتے ہیں۔ سوال صرف اتنا سا ہے کہ ایک ایسا ترقی پزیر ملک جس کی شرح خواندگی 28% ہے۔ یہ پرنٹیج سیکنڈری، انٹر اور گریجویشن لیول تک اور کم ہوجاتی ہے۔ اس عمر کے بچوں کے لیے آپ کے پاس پڑھانے کے لیے کون سا ادب ہے؟ پندرہ سے بیس سال کے بچے بریخت پڑھیں گے۔ کافکا کی کہانیاں، گورکی اور پاسترنک کے ناول، رٹ سوس، انگریتی اور پشکن کی شاعری سے لطف اندوز ہوں گے، ضرور ہوں گے۔ اس وقت جب شرح خواندگی سو فیصد ہوگی اور بچے پہلا سبق میر، داغ اور غالب کا لیں گے اور ذہنی سطح انہیں قبول کرنے کی پوزیشن میں ہوگی۔ ذہنی بلوغت کا عمل بتدریج دھیرے، دھیرے اور مسلسل مطالعے سے ہوتا ہے۔ انسانی فطرت کے تقاضے ان کی عمروں اور ماحول کے حساب سے ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں تو چھوٹے بچوں کے لیے ان کی عمر کے مطابق لٹریچر نہیں۔ مغرب نے اس پر بہت کام کیا ہے مگر کیا وہ ادب ہمارے کلچر، ہماری روایات سے مطابقت رکھتا ہے اور دوسرے قیمت کے لحاظ سے وہ عام بچے کی پہنچ میں ہے نہیں۔ اب پندرہ سے بیس پچیس سال کی لڑکیوں کے لیے بلکہ لڑکوں کو بھی اس میں شامل کرلیں۔ ان بچوں کو آپ آگ کا دریا، ڈاکٹر انور سجاد کی جنم جلی اگر پڑھائیں گے تو وہ ان کے سروں پر سے گزر جائے گی۔ یوں بھی عمر کے اس دور کے تقاضوں سے ہم سب واقف ہیں جب کہانی پڑھتے ہوئے ہیرو کے وارد ہونے میں کہیں تاخیر ہوجاتی تھی تو ورق الٹ کر دیکھے جاتے تھے کہ وہ دلبر کہاں رہ گیا ہے۔ معراج رسول، ریاض محمود اور دیگر لوگوں نے کہانی کو کتابی صورت دیے اور اس کہانی سے نئی نسل کو اردو پڑھنے کی جس تحریک کا آغاز کیا اور جس طرح انجم آپ لوگوں اور لکھنے والوں نے اپنا کردار ادا اور اپنا حصہ ڈالا وہ قابلِ تحسین ہے کہ پاکستان کے دور افتادہ جگہوں پر بھی بچیاں ان رسائل کو پڑھتی ہیں۔ 1988ء میں بلتستان کی دور افتادہ دشوار گزار سیاچن گلیشئر کے عین نیچے وادیوں میں جب میں نے ہائی اسکول کی لڑکیوں سے ان کے مشاغل اور وہ کچھ پڑھتی بھی ہیں کے متعلق پوچھا تو میرے لیے یہ مسرت انگیز بات تھی کہ وہ پاکیزہ اور دیگر ڈائجسٹ کی باقاعدہ قاری تھیں۔ یہی صورتِ حال چمن اور زیارت میں تھی۔ آپ اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔ قومی زبان کی ترقی میں اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔ مطالعے کی عادت کو شخصیت کا حصہ بنا رہے ہیں۔ یہ جہاد ہے۔ نانیوں اور دادیوں کے زمانے پرانے ہوگئے ہیں۔ آپ لوگ کہانی کی روایت کو نئے رنگ و آہنگ سے پیش کر رہے ہیں۔ ہم لوگ احساسِ کمتری میں مبتلا قوم ہیں۔ اپنے اثاثوں پر فخر کرنا ہمیں جرم لگتا ہے۔ رات گئے ٹی وی پروگرام میں وصی شاہ سے اسی موضوع پر بات کرتے ہوئے جب میں نے کہا کہ اے آر خاتون ہماری شارلٹ برونٹے ہیں۔ ان کے ناول ان عورتوں سے کسی طرح کم نہیں تو اس پر وہ بحث چھڑی کہ وصی شاہ سارے پروگرام میں اس کے ناول جین آئر کا دفاع کرنے سے باز نہ آئے۔ وہ کلاسیکل

ادب ہے اور یہاں کون جانتا ہے اے آر خاتون کی یہی تو بدقسمتی ہے۔ ارے بیبا میں نے بھی غصے سے کہا تم شمع و افشاں اور تصویر کو پڑھو۔ ممتاز شہروں دلی اور لکھنو کی بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں کے برصغیر کے مسلمان اشرافیہ کی تہذیبی زندگی کی جو تصویر ان ناولوں میں ملتی ہے۔ وہ کسی بھی طرح ان کلاسیکل ناولوں سے کم نہیں۔ افسوس اگر ہے تو بس ہمیں اپنے رویوں کا ہے۔ ہم لوگ تو انہیں پڑھتے، پڑھتے اور ان ہی کی جوتیوں کے صدقے یہاں تک پہنچے ہیں۔ انجم آپ مزاحیہ ادب کی دنیا میں غیر معمولی کام کررہی ہیں۔ مردوں میں تو چلو مشتاق یوسفی، کرنل محمد خان، شفیق الرحمٰن، ڈاکٹر یونس بٹ اور جنٹل مین بسم اللہ والے شاید صولت...... نام کی غلطی اگر ہو تو معافی چاہوں گی۔ لوگ ہیں مگر عورتوں میں کون ہے؟ مجھے تو اس حوالے سے ایک نام بھی یاد نہیں۔ اپنے اردگرد پھیلے واقعات سے جس طرح تم مزاح کشید کرتی ہو وہ تمہارا ہی کام ہے۔ ملک مقبول صاحب کی کتاب میں اگر ڈائجسٹوں کی مصنفات کے نام نہیں تو انجم کچھ غم نہیں۔ عمیرہ احمد، فرحت اشتیاق، عنیزہ سید، رفعت سراج ان کے پڑھنے والے لاکھوں میں ہیں۔ بک اسٹالوں پر ان کی کتابیں ہیں۔ جو دھڑا دھڑ بکتی ہیں۔ عمیرہ احمد نے تو کیا ناول کیا ڈراما سب میں جھنڈے گاڑ دیے ہیں۔ اکیسویں صدی کی ابتدائی دہائیاں آپ لوگوں کی ہیں آنے والا وقت اسے تسلیم کرے گا۔ اس لیے اگر کہیں نام درج نہیں ہوا تو پرواہ مت کرو۔ تم مزاحیہ ادب کی بانی خاتون ہو۔'' (پیاری سلمٰی پُرخلوص خط لکھنے کا شکریہ۔ آپ کی عزت افزائی مجھ جیسی ادنیٰ ادیبہ کو مزید پُرجوش کردیتی ہے)

☆ فیروزہ بیگم، کراچی سے۔ ''نایاب جیلانی اور مدیحہ عدنان، سیمایا سمین مجتبیٰ کی تحریریں خصوصی طور پر پسند آئیں۔ قسط وار ناولز میں زیادہ شوق سے نہیں پڑھتی ہوں۔ شمع ہدایت کے تحت خصوصی مضامین شائع کرنے کا شکریہ مگر اس دفعہ کے مضمون نے لکھنے کا حق ادا نہیں کیا۔ روحانی مشورے اس مرتبہ بھی ٹاپ پر رہے۔ بہنوں کی محفل میں خطوط پڑھ کر اندازہ ہوا کہ بہنیں آپ سے کتنی محبت کرتی ہیں۔ ہاں انجم جب سے آپ کے گھر فون کرکے پتا چلا ہے کہ آپ بیمار ہیں تو میں ہمہ وقت آپ کی کلی صحت اور زندگی کے لیے دعائیں کررہی ہوں۔'' (جزاک اللہ)

سائرہ رضا، کراچی سے۔ ''پاکیزہ مجموعی طور پر اچھا رسالہ ہے۔ اس مرتبہ میں خاص طور پر نمرہ احمد کے پارس کی بات کروں گی۔ نمرہ احمد کی تحریریں ہمیشہ اچھی ہوتی ہیں مگر پارس کی بات الگ ہے۔ انہوں نے بے حد جاندار اور خوب صورت تحریر لکھی، میں پاکیزہ قارئین سے یہ کہنا چاہوں گی کہ آپ لوگ رائٹرز کی کہانیوں و کردار نگاری پر اپنی رائے ضرور دیا کریں۔ میری طرف سے سب کے لیے نیک تمنائیں حاضر ہیں۔'' (تبصرے کا شکریہ)

نزہت اشفاق، کراچی سے۔ ''ٹائٹل اچھا لگا۔ سکینہ فرخ، سیمایاسمین، مدیحہ کے افسانے اور ناولٹ پڑھ کر مزہ آگیا۔ سلسلے وار ناولوں میں اس دفعہ پڑھنے میں دل ہی نہیں لگ رہا۔ شاید اس کی وجہ ہے کہ دونوں ناول بس ٹھیک ہیں کے نمبر میں آتے ہیں۔ بہنوں کی محفل میں بار بار پڑھتی ہوں۔ شمع ہدایت پسند آیا۔ شائستہ زریں کا سروے اچھا لگا۔'' (شکریہ)

شگفتہ ناصر، فیصل آباد سے۔ ''طبیعت خرابی کی وجہ سے ہر ماہ اس محفل میں شامل نہیں ہو پاتی مگر باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔ سب سے زیادہ مزہ مجھے جلترنگ پڑھ کر آتا ہے۔ کم از کم مسکرانے کو دل چاہتا ہے۔ رضوانہ پرنس کا ناول اچھا جارہا ہے۔ مدیحہ عدنان، نایاب جیلانی اور سیمایاسمین کی تحریریں شاندار تھیں۔'' (نوازش)

ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ ''میں لاہور سے آگئی ہوں۔ طبیعت ابھی تک ٹھیک نہیں ہے۔ پاکیزہ پڑھا اور سب سے زیادہ پڑھنے کا لطف مجھے بہنوں کی محفل میں آیا۔ دیگر تحریریں چند ہی پڑھ سکی ہوں مگر رضوانہ پرنس کا ناول ایک اچھے موڑ پر پہنچ گیا ہے۔ سکینہ فرخ، رتیزا، مدیحہ عدنان اور نایاب جیلانی نے بھی اچھا لکھا۔ ہاں یہ مسز عظمیٰ خورشید کے تبصرے نظر نہیں آرہے۔ کہاں ہیں وہ؟'' (مسز خورشید کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اس لیے وہ باقاعدگی سے شامل نہیں ہو پارہی ہیں۔ ہاں آپ اپنا بہت زیادہ خیال رکھیے گا۔)

فریدہ افتخار، اسلام آباد سے۔ ''بہنوں کی محفل میں شکوے جوابِ شکوے زور شور سے جاری وساری ہیں بلکہ

شکووں کے جواب پڑھ کر پورا یقین ہے کہ آپ اگلے الیکشن اگر ہوئے تو بھاری اکثریت سے کامیاب ہوجائیں گی اور ہر طرف آوے ہی آوے۔ پاکیزہ کی مقبولیت کا راز انتھک محنت، نیک نیتی، انکساری اور بے لوث خدمت میں مضمر ہے۔ اس کا سہرا یقیناً آپ کے سر ہے۔ جنوری میں جہاں اللہ نے مجھے پوتی ہونے کی خوش خبری سنائی وہاں ہماری بڑی ہمشیرہ شیریں گل ایک بڑے صدمے سے دوچار ہوئیں۔ ان کی جواں سال بیٹی حمیرا دو سال گردوں کی تکلیف میں مبتلا رہ کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملی جبکہ ہماری یہ بے حد پیاری ہمشیرہ پہلے ہی جواں سال بیٹے اور داماد کا غم سہہ چکی ہیں۔ پروردگار مزید غموں سے بچائے رکھے، آمین۔ سلسلے وار کہانیوں نے اب جان پکڑلی ہے۔ پارس شاندار تھا۔ پیامِ محبت میرے خدا چار سال تک صرف موبائل پر پیغام رسانیاں ہی ہوتی رہیں پڑھائی کیا خاک ہوئی ہوگی، واہ نئی نسل۔ امانت میں ستارہ کا ہولناک انجام دل لرزا گیا پولیس والے تو بڑی گہری نظر رکھتے ہیں کیا جابر علی کو اپنا بڑے داماد کی خباثت اس کے چہرے پر نظر نہیں آتی تھی۔ دوستی کا دیا اچھا لگا۔ پاکیزہ ڈائری بے حد نکھر گئی ہے۔ روحانی مشورے اور جلترنگ میں ذرا مرچ مسالے زیادہ کردیں۔ شاندار، قابلِ عمل ہومیو کلینک کے لیے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ انسانی غلطی جیسے خطوط شائع نہ کیا کریں۔ معصوم بچیاں بھی پڑھتی ہیں میگزین پہلے ہی اخبارات، دیواریں اس قسم کے اشتہارات سے مزین نظر آتے ہیں یہ میری پُرزور استدعا اور خواہش ہے ادارہ اس بارے میں قدم اٹھائے۔'' (آپ کی رائے متعلقہ شعبے تک پہنچائی جارہی ہے۔ تبصرے کا شکریہ)

بیگم رضا ذوالفقار، فیصل آباد سے۔ ''پارس کی اختتامی قسط شائع ہوئی تو پہلی قسط پڑھی اختتام تک... کیا منظر نگاری کی ہے اس میں نمرہ صاحبہ نے۔ کانفرنس روم، بنگلا، پارک شجاع جب سیکریٹری کے پاس بیٹھا تو پارس نے کس طرح خود کو چھپانے اور خود نظر رکھنے کا منظر بنایا۔ پارس کے شال لینے کے مختلف انداز نمرہ صاحبہ نے تو مجھے ان نظاروں سے نہیں نکلنے دیا۔ قانتہ رابعہ نے مات لکھ کر کہ صرف صبوحہ کی امی بلکہ اختتام تک ہمارے ذہنوں کو بھی مات دے رکھی لیکن اینڈ پڑھ کر میں نے اپنے آپ کو غریب محسوس کیا جس کے آگے جانے کو پلے میں زادِ راہ کچھ بھی نہیں۔ کہانی میں دلچسپی بھی برقرار رکھی اور بہت کچھ سمجھا بھی دیا بہت بہتر۔ ثمینہ عظمت کی بیٹی بات تو سچ ہے کہ بھائی نہیں رکھتے کیونکہ محتاجی میں نبھالینا بہو کو پڑتا ہے اور بہو تو بیٹی نہیں ہوتی لیکن ہمارا معاشرہ ایسا بھی نہیں کہ داماد اپنے گھر میں ایکسٹرا اٹینشن پالے تو دعا یہ ہے اللہ سب کو محتاجی سے ہی بچائے، آمین۔ زمر نعیم کی بے وفا سے وفا میں فائق مرد ہوکر بھی ثمین سے بہتر نکلا جس نے دوست کو اپنی محبت پر فوقیت دی جبکہ تیمور سے کوئی خونی رشتہ نہیں تھا اور ثمین جس نے اپنے مرحوم باپ کے قائم کردہ رشتے کو قائم رکھا نہ ہی اپنے شوہر کی ماورائی محبت کی قدر کی۔ امیدِ صبح رابعہ نیازی کی کا نتیجہ تو بچپن سے پڑھتے آئے ہیں کہ جیسا کروگے ویسا بھروگے۔ یہ زندگی کے رستے بڑی حیرت ہے عورتوں کی یہ قسم بھی ہوتی ہے۔ عورت تو اپنی عزت کی خاطر نشئی، غریب اور بات بات پر ہاتھ اٹھانے والے مرد کے ساتھ بھی گزارہ کرتی ہے۔ راہ آسان ہوگئی میں واقعی عدیلہ کی مثبت سوچ جو کہ ایثار، خلوص اور محبت جیسے جذبے سے بھرپور ہو اس کی راہ اللہ کی رحمت سے اور آسان ہوتی ہے۔ اللہ بیٹیوں کو عدیلہ جیسی سوچ دے۔ شبیم فضل خالق کی ہار جیت میں جیت جیسی بھی ہوئی بالآخر مرد کی ہی ہوئی۔ عورت کے حصے میں گھاٹا نقصان اور ہار ہی آتی ہے خواہ وہ حسین وجمیل، امیر ترین عورت ہی کیوں نہ ہو۔ امانت میں جابر علی معلوم نہیں کیا کرنے آیا ہے ستارہ کے گھر۔ آگے آگے دیکھیں ہوتا ہے کیا۔'' (جی ضرور دیکھیے اور پھر ہمیں بتائیں کہ آپ کو کیسا لگا)

مسز فرح امجد، لاہور سے۔ ''مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ نے آج کے بہت ہی اہم مسئلے کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ہر شخص اپنے آپ میں مگن ہے، محبتیں جو پہلے ایک دوسرے سے ہوا کرتی تھیں وہ اب کم ہوتی جارہی ہیں اولاد کی اپنی مصروفیات ہیں ان کے پاس والدین کے لیے ٹائم نہیں ہوتا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ ہمارے حالوں پر رحم کرے اور ہمارے دلوں میں محبتوں کو فروغ دے، آمین۔ امانت میں رفعت سراج جی کہانی کو بہت پُرخطر موڑ پر لے آئی ہیں جہاں پر ایک سگا باپ اپنی اولاد کا قتل واجب سمجھتا ہے اور دین کی آڑ میں اپنے فرض کو ترجیح دیتا ہے۔ کہانی بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہی ہے ویل ڈن رفعت

جی باقی تمام کہانیاں اور سلسلے خوب صورتی سے آگے بڑھ رہے ہیں بعض تحریریں ہمارے ذہن میں انمٹ نقوش چھوڑتی ہیں ہمای رائٹر بہنیں بہت خوب صورتی سے لکھتی ہیں اسی لیے تو پاکیزہ ہمیشہ تروتازہ ہوتا ہے اور ہمیں بھی تازگی کا احساس بخشتا ہے۔ آپی میں ان بہنوں کو مبارک باد پیش کروں گی جن کی کتابیں شائع ہوئی ہیں اور آپی میں خوش ہوں کہ میری باجی فرزانہ ظفر اور بہنوئی عمرے کی سعادت حاصل کرنے مکہ مکرمہ گئے ہوئے ہیں۔ میری طرف سے ان دونوں کو بہت بہت مبارک باد۔'' (تبصرے کا شکریہ۔ ہماری جانب سے بھی مبارک باد پہنچادیں)

✍ فصیحہ آصف خان، ملتان سے۔ ''اس ماہ کے پاکیزہ پر ایک جائزہ۔ اسلامیات کے مضامین کے بعد امانت کی طرف گئے۔ عجب موڑ دیا اس قسط میں۔ ستارہ کا قتل عجیب لگا۔ جابر اگر اتنا دین دار ہے تو کیا اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ قتل کی سزا کیا ہے اسلام میں؟ برہان نے تو واپس آنا ہی تھا سب سے قابلِ رحم کردار صابرہ کا ہے۔ مہر جان جانے کب تک ماضی کے گھوڑے دوڑائے گی۔ عہد اچھا لگا۔ رواج کا آخری حصہ رشتوں کو جوڑ گیا۔ مصباح نوشین نے پرانے موضوع پر نئے الفاظ کی تہ چڑھائی۔ روزی کی تلاش سیما یاسمین کی جاندار تحریر لگی۔ ہنسی بھی آئی کہ یہ محبت انسان کو کہاں، کہاں جا رولتی ہے۔ شام شہر یاراں عنیزہ سید نے ہر کردار کی طنابیں مضبوطی سے پکڑ رکھی ہیں اور ان سے بھرپور استفادہ لے رہی ہیں۔ دوستی کا دیا لگتا ہے ہماد جاہت نے فلم تھری ایڈیٹس بڑے غور سے دیکھی اور اسی کو تھیم بنا کر کہانی لکھی۔ مرد کی جوتی بس گزارے لائق لگی۔ رضوانہ پرنس اِک نئے موڑ پر ہر بار نیا موڑ لاتی ہیں۔ ترکِ وفا کا پہلا حصہ بہت اچھا لگا۔ پیام محبت بالکل پسند نہیں آئی۔ حضور پاک ﷺ پر سیدہ ناز کا سیر حاصل مضمون پاکیزہ کی جان رہا۔ اک وضاحت کردوں کہ خبر غلط شائع ہوگئی۔ شاعرہ فریدہ خانم نے بی ایڈ کا امتحان پاس کیا ہے۔ فریدہ فری نے نہیں۔ جلترنگ میں مینارِ محبت بہت زبردست لکھا آپ نے۔'' (شکریہ)

✉ سیدہ علیشاہ بہاول پور سے۔ ''سب سے پہلے بات کرتے ہیں نمرہ احمد کے پارس کی نہایت خوب صورتی سے آپ نے اپنے ناول کا غیر متوقع اختتام کیا اس کے لیے مبارک باد اب کوئی مسلسل ناول شروع کرکے پاکیزہ کی شان کو مزید بڑھائیں پلیز، اک نئے موڑ پر رضوانہ پرنس کا منی ناول اب بیچ میں نئے موڑ پر ہے، زنیرا کے ساتھ فاران کچھ اچھا نہیں کررہا۔ اجالا ایک نیک سیرت کردار کے روپ میں سامنے آئی اینڈ لگتا ہے فاران اور علیشاہ کے درمیان نزدیکیاں بڑھیں گی بہر حال اسٹوری اچھی ہے، قانتہ رابعہ کا مات بھی اچھا افسانہ تھا ویری گڈ قانتہ جی، بیٹی، ثمینہ عظمت علی کی تحریر دل کو چھوگئی۔ سچ ہے آج بیٹیاں، بیٹوں سے زیادہ ماں باپ کے بارے میں سوچتی ہیں۔ ویری نائس ثمینہ، محبت کھوگئی ہے ناہید فاطمہ حسنین کا ناولٹ بے حد پسند آیا اور اسٹوری کا ٹائٹل اسکیچ بھی بہت اچھا لگا۔ خالد باری ہمیشہ ہی عمدہ اسکیچنگ کرتے ہیں، اینی وے آگے بڑھتے ہیں شمیم فضل خالق صاحبہ کے ہار جیت کی طرف بیچ دین سے بھٹکے ہوئے لوگوں کے بھروسے اکثر ٹوٹ جایا کرتے ہیں اور ہمارے معاشرے میں ایسے لاتعداد واقعات بکھرے ہوئے ہیں جن میں اکثر امیر گھروں میں کچھ کھو جانے کا ذمے دار بے قصور ملازمین کو ٹھہرایا جاتا ہے، اور ناحق کی سزا بھی پاتے ہیں ایک اہم موضوع پر قلم اٹھانے کے لیے شمیم صاحبہ مبارک باد کی مستحق ہیں۔ امیدِ صبح رابعہ نیازی کی اچھی کوشش تھی خاص طور پر عادل اور آمنہ کے کردار بہت اچھے لگے۔ یہ زندگی کے رستے میں بھولی کا کردار انتہائی خود غرض لگا عورت کی ذات محبت، خلوص، حیا اور وفا کے علاوہ ایثار کی بھی علامت ہے مگر بھولی جیسی خواتین صرف عبرت کا نشان بن کر رہ جاتی ہیں۔ اسٹرونگ میسج دیتی ہوئی تحریر تھی۔ یہ کیسی محبت عالیہ حرا کی دل کو چھو جانے والی تحریر تھی۔ ناولٹ بے وفا سے وفا اپنے نام کی طرح ہی تھا مگر موضوع کچھ کچھ یہ زندگی کے رستے سے ملتا جلتا لگا۔ سلسلے وار ناول شام شہر یاراں کی یہ قسط بہت پسند آئی۔ پاکیزہ ڈائری عظمیٰ آپی ہمیشہ ہی بہت محنت سے سجاتی ہیں۔ ویل ڈن عظمیٰ آپی اینڈ I love you جلترنگ میں یہ سال بے وفا لوگوں کے نام رہے گا اور بالی عمریا بہت مزے کے لگے خاص طور پر ہر دوسری لڑکی شاعرہ بن جائے پڑھ کر بہت ہنسی آئی ہی ہی ہی...... کیونکہ آج کل کی لڑکی تو میں بھی ہوں اور شاعری سے شغف بھی ہے۔'' (میری گڑیا شاعرہ...... تبصرے کا شکریہ)

✉ امینہ عندلیب، سلانوالی۔ ''میں اپنی سب قاری بہنوں کی شکر گزار ہوں کہ وہ میری صحت اور زندگی کے لیے کتنی محبت سے، دعائیں کررہی ہیں...... اللہ تعالیٰ آپ سب کو اس کی جزا عطا فرمائے...... آمین، فروری کے شمارے میں سب سے پہلے بہنوں کی محفل پڑھی...... مصنفات اور تبصرہ نگار بہنوں کے خطوط بے حد عمدہ تھے...... شائستہ زریں کے سروے مجھے ہمیشہ پسند آتے ہیں پلیز میری رائے ان تک ضرور پہنچادیجیے گا...... انجم باجی جب سے مجھے پتا چلا ہے کہ آپ بھی بیمار ہیں...... تو میں اللہ سے یہ دعا کرتی ہوں کہ خدایا مجھ سے میری ماں کو نہ چھیننا......'' (پیاری امینہ سب سے پہلے تو اس بات کی معذرت گزشتہ ماہ بہنوں کی محفل میں تمہارے نام کے ساتھ مسز شائع ہوگیا اور رہی بات تمہاری محبت بھری دعاؤں کی تو اس کے لیے میں شکریہ ادا ہی نہیں کرسکتی)

✍ ثنا اجالا، بھلوال سے۔ ''پاکیزہ میں پہلی بار خط لکھ رہی ہوں کافی عرصے سے پاکیزہ پڑھ رہی ہوں اس کی کہانیاں عجیب ہوتی ہیں...... یعنی انداز جدا جدا اسی وجہ سے میرے باقی ڈائجسٹ پڑے رہتے ہیں مہینے میں دوبار پاکیزہ شائع کیا کریں۔ اس کے علاوہ کیوٹ سی عذرا رسول صاحبہ کو سلام۔ عظمیٰ جی کو بھی بہت پیار آپ کے تمام اسٹاف کو خدا اسی طرح ہمت دے کہ ہر ماہ پاکیزہ بہتر سے بہترین ہو۔'' (ثنا اجالا، خوش آمدید، آپ کی حوصلہ افزائی ضرور کروں گی۔ آپ شاعری کے بجائے نثر میں اپنے مراسلات بھیجیں)

✉ سنبل ملک اعوان، تحصیل فیروز روالا سے۔ ''ایک بات آپ سے شیئر کرتی ہوں میں اپنے گاؤں شیخوپورہ کی واحد لڑکی ہوں جو خط کتابت کرتی ہوں اور میرا کوئی اتنا نام بھی مشہور نہیں تو آنٹی اگر میری ڈیتھ ہوجاتی ہے تو کیا آپ کو بھی پتا چلے گا۔ (بیٹا جوان بچیاں ایسی باتیں نہیں کیا کرتیں اللہ تمہیں لمبی حیاتی دے۔ آمین)...... کیونکہ اگلی سانس آنے کا پتا تو کسی کو بھی نہیں اگر ہم گھر کے ایک فرد کی طرح ہیں تو گھر کے افراد تو ایک دوسرے سے بے نیاز اور بے پروا نہیں ہوتے عنبر وسیم کا کیا حال ہے...... صبا نور اپنی اسٹڈی جاری کی ہے تو آگے بھی ضرور پڑھنا...... امینہ عندلیب کب آرہی ہو پھر لاہور...... میری آنکھیں آپ کو دیکھنے کو بے قرار ہیں...... امینہ عندلیب آپ کے بارے میں اپنے گھر والوں کو بھی بتادیا ہے۔ ایک سویٹ سی لڑکی سلانوالی سے آئے گی، آؤ گی ناں...... میں نے اپنی آنکھیں تمہاری راہوں میں بچھا رکھی ہیں۔ پاکیزہ سے میرا رابطہ جب سے ہوا ہے ٹوٹا نہیں...... خط لکھنے میں تاخیر میرے پیارے پیارے بھتیجے کی آمد ہے (الحمدللہ) آنٹی اگر کسی کے پاس گھٹنوں کی تکالیف کے لیے کوئی آیت ہو تو بتایئے گا۔'' (یٰسین شریف روزانہ پڑھا کرو...... اور زیتون کے تیل پر سورۂ فاتحہ 41 بار دم کر کے اس کی مالش کیا کرو)

✍ عمرانہ رمضان، سرگودھا سے۔ ''ہم بھی اپنی چھٹی کے ساتھ آپ کی محفل میں شریک ہونے کے لیے آگئے ہیں سب سے پہلے مبارک باد قبول کیجیے کہ ماہنامہ پاکیزہ دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے ترقی کی دوڑ میں بہت آگے نکل گیا ہے اور یہ آپ سب کی محنت اور کاوشوں کا ثمر ہے، ویل ڈن اللہ رب العزت...... مزید زورِ قلم عطا فرمائے۔ (آمین) ماہ فروری کا شمارہ پڑھ کر میرے منہ میں پانی آگیا ہے دل چاہتا ہے کہ میری بھی تحریر اس ماہنامے کی زینت بنے بس اسی خواہش پہ ایک افسانہ لکھا ہے مجھے امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ پاکیزہ میرے ساتھ دوستی کا پاکیزہ بندھن ضرور بنائے گا۔'' (پیاری عمرانہ اس محفل میں خوش آمدید، ماشاء اللہ تم لکھنا جانتی ہو مگر تم نے جو افسانہ مجھے بھیجا ہے اس میں تو صرف محبت کی خرمستیاں ہیں۔ کسی معاشرتی موضوع پر لکھو...... بے شک شوخ و چنچل انداز میں ہی لکھو...... مگر اس کو پڑھ کر کچھ حاصل تو ہو...... صرف شادی ہونا ہی تو زندگی کا مسئلہ نہیں رہا ہے)

✍ مہرو میر، کشمیر سے۔ ''ہماری نگارشات کو جگہ دینے کا بہت شکریہ۔ میری سسٹر کی شاعری شامل کرنے پر ان کی جانب سے خصوصی شکریہ بقول سسٹر کے ہم نے تو امید چھوڑ دی تھی انتظار جو کرنا پڑتا تھا ورنہ ملک ایک اچھی شاعرہ سے محروم ہوجاتا سمجھا کریں ناں...... باقی اس کے تمام سلسلے اچھے ہیں مگر تھوڑی بہت تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ نفسیاتی مسائل کا حل، خواب کی تعبیر جیسے سلسلے اگر ممکن ہو تو شامل کریں۔ ہم اپنی تحریر ارسال کررہے ہیں اگر تھوڑی سی گنجائش ہو تو اسے بھی قیمتی صفحات

میں جگہ عنایت کر کے شکریہ کا موقع دیجیے گا ورنہ ہم اتنی آسانی سے بخشنے والوں میں سے نہیں، وہ کیا ہے ناں ہم اپنی ہار تسلیم کرنے والوں میں سے نہیں لکھنا تو ہمارے خون میں شامل ہے ہمارا پورا گھرانا شاعروں ادیبوں سے بھرا پڑا ہے۔ کبھی کبھار ہم بھی یہ شغل فرما لیتے ہیں کئی رسائل وغیرہ میں ہماری تحریریں شائع ہوتی ہیں مگر اصل نام سے کم ہی لکھا ہے ہر رسالے کے لیے جدا نام ہے ہمارا۔ آپ نے پچھلی دفعہ لکھا تھا کہ ناقابلِ اشاعت تحریروں کے عنوان شائع کریں گے مگر نہیں ہوئے اور شروع میں خط کتابت کا پتا دیا کریں۔ کئی لڑکیاں خط لکھنا چاہتی ہیں مگر انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ پتا کون سا ہے۔" (اس دفعہ بہنوں کی محفل میں پاکیزہ کا ایڈریس موجود ہے اور فہرست کے صفحے پر ہمیشہ ہوتا ہے)

☜ شہلا نواز، لاہور سے۔ "امانت نے کیا ٹرن لیا ہے ستارہ کے قتل کا پڑھ کر دل لرزہ براندام ہو گیا بہت اچھا پسند کردار ہے جابر علی کا۔ لگتا ہے اصیل خان اور گل جان سے کوئی بھیانک غلطی ہوئی ہے جبھی تو بے چارہ ابھی تک اس غلطی کا تاوان نہیں بھر پایا۔ ہمیں رفعت سراج کا اندازِ تحریر از حد پسند ہے رفعت کے ہیرو بہت سلجھے اور مضبوط کردار کے ہوتے ہیں۔ رفعت خود بھی بہت مثبت سوچ کی حامل ہیں۔ رفعت سے درخواست ہے کہ ہمیں اپنا کوئی ناول کستوری یا خوشبو کا دریا تحفتاً بھجوائیں ہمارا خیال ہے کہ اتنا حق ہمارا بے چاری رائٹر پر بنتا ہے۔ روزی کی تلاش میں سلیم صاحب کا سادہ سا گھر اور ان کا خلوص بہت پسند آیا کیونکہ ہم بھی بہت پُرخلوص اور طبیعتاً سادگی پسند ہیں اتنے کہ ہمارے گھر میں سلور کا ایک کٹورا ہے ہم اکثر اس میں سالن کھاتے ہیں۔ ہم اپنی اوقات یاد کرتے ہیں جبکہ ہماری اماں جان ہمیں ڈانٹتی ہیں کہ اس میں کھانا نہ کھایا کرو، آپ ہی بتائیں کیا ماضی کو یاد کرنا غلط ہے۔ ناؤ کاغذ کی مہر النسا کی بے وقوفی پر بہت ترس آیا بھی کاغذ کی نیا بھی پار لگی ہے۔ ترکِ وفا ابھی پڑھی نہیں تبصرہ محفوظ ہے۔ اندھیرے اجالے ایک سبق آموز افسانہ اچھا لگا اگر ہم سادگی کو اپنا شعار بنائیں تو کبھی ناکام نہیں ہوں۔ آنٹی جی اس سیزن سردیوں میں میرے صرف چار سوٹ بنے مگر وہ مجھے کبھی کم نہیں لگے، میں انہیں ریپیٹ کر کر کے پہنتی رہی الحمدللہ مجھے اللہ نے قناعت کی دولت دے رکھی ہے پتا نہیں وہ کون لوگ ہیں جن کے کپڑوں کی الماریوں میں کپڑوں کو پڑے، پڑے دیمک لگ جاتی ہے اس سے اچھا ہے آپ کسی غریب کو دے دیں میرا جب نیا سوٹ بنتا ہے تو میں لازمی پرانا سوٹ نکال کر کسی حقدار کو دے دیتی ہوں۔ فریدہ جاوید فری بہت پیاری لگ رہی ہیں۔ پیامِ محبت میں سمیر سجاول کے جذبے نے بہت متاثر کیا میرا خیال ہے آپ پاکیزہ میں کلاسک ادب سے بھی کوئی افسانہ ہر ماہ لگائیں۔ میرے جیسے لوگ جو مہنگی کتب افورڈ نہیں کر سکتے کم از کم اس طرح ان کی تشنگی کچھ تو بجھے گی پلیز ضرور غور کیجیے گا میرا خیال ہے کافی بہنیں میری اس رائے کی تائید کریں گی۔ روحانی مشورے کتنے لوگوں کی دعائیں سمیٹ رہی ہیں آپ اس کالم سے جزاک اللہ، اللہ تعالیٰ آپ کو بھی صحتِ کاملہ عطا فرمائے۔ (آمین ثم آمین) جلترنگ میں جادو بہت اچھا لگا۔ آنٹی جی پاکیزہ بہنوں کو دُبلا ہونے کے لیے ایک ٹپ بتا دیں نیم گرم پانی پینے کی اس سے چربی بھی پگھلے گی اور معدہ بھی درست ہوگا ایک تھرماس میں پانی نیم گرم کر کے رکھ لیں اور جب پیاس لگے تو پئیں، پینے سے پہلے اپنا وزن ضرور کریں ہمارا تو ایک کلو ایک مہینے میں کم ہوا گویا ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آئے اور خاکسار کو دعاؤں میں یاد رکھیں۔" (تبصرے کا شکریہ، وزن گھٹانے کی ترکیب بتانے کا شکریہ)

☜ پروین عذرا تشنہ، کراچی سے۔ "تم سے باتیں کرنے کو بہت جی چاہتا ہے لیکن جب بھی ڈرتے، ڈرتے فون کرتی ہوں، تم اس قدر مصروف ہوتی ہو کہ ٹھیک طرح بات بھی نہیں کر پاتیں... تو شرمندہ ہو کے رہ جاتی ہوں۔ اس بات سے بہت خوشی ہوتی ہے کہ تمہارا شمار ان لوگوں میں ہے جو اپنی محنت اور لگن سے کامیابی اور ترقی کی منزلیں طے کرتے چلے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اور زیادہ کامیابیوں سے ہمکنار کرے...... آمین۔" (پیاری عذرا آپ جب بھی فون کرتی ہیں، آپ سے بات تو ہوتی ہے...... ہاں فون پر طویل گفتگو تو میں کسی سے بھی نہیں کر پاتی)

☜ فرزانہ نگہت، راول پنڈی سے۔ "میرا تعارف یہ ہے کہ میں راول پنڈی کی شہری ہوں، میں نے گزشتہ سال اردو لٹریچر اور ہسٹری میں بی اے کیا ہے اور اب ایک اسکول میں پڑھا رہی ہوں۔ ساتھ ساتھ قلم و کاغذ کا رشتہ بھی نبھا رہی ہوں۔

میں محترمہ ناہید سلطانہ اختر اور آنٹی انجم انصار کی زبردست فین ہوں۔ ان کی ہر تحریر کی عاشق...... جاسوسی، سسپنس، پاکیزہ سرگزشت میں لکھنے والے سب ہی مجھے پسند ہیں۔ اللہ ان کے زورِ قلم میں ترقی اور آپ کو دنیائے ادب میں عروج اور سربلندی عطا فرمائے۔" (گڑیا اس محفل میں خوش آمدید، ہاں آپ کا افسانہ قابلِ اشاعت ہے)

☜ شبنم کنول، حافظ آباد سے۔ "پاکیزہ بہت اچھا رسالہ ہے، اس رسالے میں ہر طرح کی تحریریں اور شاعری موجود ہے۔ پاکیزہ اپنے نام کی طرح پاک ہے اور اس میں لکھنے والوں کی تو کیا ہی بات ہے۔ شیریں حیدر صاحبہ نے تتلی ناول بڑا ہی اچھا لکھا ہے۔ آج کل کے حالات کے مطابق سب بہت ہی پیارا لکھتے ہیں آپی میں کیا کروں سارا ڈائجسٹ پڑھ کر بھی مجھے سکون نہیں ملتا نہ میری کوئی غزل نہ شعر شائع ہوا۔ سوچتی ہوں کہ اپنی کہانی بھی ارسال کر دوں پھر سوچتی ہوں پہلے آپ کے دل میں تھوڑی سی جگہ بنا لوں۔ اس بار اپنی بہن کو سالگرہ وش کرنا چاہتی تھی پاکیزہ کے ذریعے۔ میری بہن کی سالگرہ سترہ دسمبر کو تھی۔ پلیز، پلیز آپی ضرور شائع کیجیے گا۔ (تبصرے کا شکریہ، کہانی کا معیاری ہونا شرط ہے)

☜ عظمت صبا آصف، شاہدرہ سے۔ "ماہنامہ پاکیزہ کی پرانی قاری ہوں۔ تمام سلسلے بہت اچھے ہیں۔ افسانے، ناول، مستقل عنوانات ہر چیز اپنی مثال آپ ہے۔ میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ میری دلی خواہش تھی کہ ماہنامہ پاکیزہ میں اپنی کوئی کاوش بھیجوں۔ سچی بات ہے حوصلہ نہیں ہوتا تھا۔ سوچتی تھی کہ پتا نہیں آپ کے معیار پر پوری اترے یا نہیں۔ نئے لکھنے والوں کے ساتھ پتا نہیں آپ کا کیا سلوک ہو...... مگر پاکیزہ میں نئی لکھنے والیوں کی کاوشیں پڑھ کر حوصلہ ہوا پھر کافی عرصہ گھریلو مسائل کی وجہ سے لکھنے کا سلسلہ منقطع ہو گیا، دوبارہ لکھنے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے آپ حوصلہ افزائی کریں گی۔" (اس محفل میں خوش آمدید، میں آپ کی حوصلہ افزائی ضرور کروں گی آپ اپنی شاعری بھی بھجوائیں)

☜ عاشقہ مسعود، فیصل آباد سے۔ "آج کل مصروفیت بہت ہے۔ تین ڈرامے آن ائر آ رہے ہیں دو نئے لکھ رہی ہوں۔ چوتھی کتاب پر بھی کام ہو رہا ہے۔ ہاں اس مرتبہ لکس اسٹائل ایوارڈ میں بھی نامزدگی ہوئی ہے اس لیے فرصت نہیں ملتی مگر آپ کا ہمارا شروع کا ساتھ ہے۔ اس لیے آپ کا اصرار سر آنکھوں پر آخر پاکیزہ ہمارا پہلا گھر ہے...... بس مزید حیران نہ ہوں...... یہ خط اصل میں پانچ سال پہلے لکھ دیا ہے۔ یہ صورتِ حال تو 2018ء میں ہوگی اگر آپ مجھ پر کرم نوازی کرتی رہیں تو اس مرتبہ ناقابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں غلطیاں بتائیے گا ضرور...... تاکہ اصلاح ہو سکے اور دوبارہ سہ بارہ بلکہ سو بار بھی کوشش کروں گی۔" (گڑیا، دلچسپ خط پڑھ کر مزہ آیا۔ تمہارا افسانہ قابلِ اشاعت ہے...... ہاں بھئی تمہاری مستقل مزاجی بھی اچھی لگی)

☜ طلعت رانا، چیچہ وطنی سے۔ "فروری کا شمارہ ہاتھ آیا سکون آیا ماڈل بہت اچھی لگ رہی ہیں اور رومینٹک سا تاثر دے رہی ہیں۔ خصوصاً ریڈ لپ اسٹک مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ اداریہ تو ایسے لگا میرا دل ہی پھرول دیا ہے کاش محبت و خلوص کی کوئی قدر ہوتی تو ہم بھی زندوں میں شمار ہوتے بہرحال خوب صورت پیغام پلّو سے باندھ لیا ہے پھر اپنی موسٹ فیورٹ رفعت سراج صاحبہ کا امانت دم سادھے دل تھامے پڑھا۔ یہ دھما کا خیز قسط الٰہی خیر طوفان تو اگلی دفعہ برپا ہوں گے کیا سے کیا بچ آ گئے رفعت سراج جی آپ کا لکھا ہوا حرف، حرف میری نگاہ میں معتبر اور سبق آموز ہے خدا مزید ترقیاں دے۔ (آمین) دیگر مستقل سلسلے بہت مزے کے رہے اسپیشل سندیسے بڑے پیارے لگے اور بہنوں کی محفل میں شہزادیوں ملکاؤں پریوں کے محبت نامے، تنقید، تعریف نامے، وضاحتیں، پیار محبت کا کھٹا میٹھا انداز اور پاروی بجو...... کا سمجھانے کا لائٹ ویٹ انداز دل و دماغ کو تر و تازگی بخشتا ہے خدا سب پریوں کی خیر ہو سلامتی ہو۔" (اللہ سب کو سلامت رکھے...... آمین)

☜ عابدہ وحید، راول پنڈی سے۔ "مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ نے بڑا اہم سوال اٹھایا کہ انسانی جان کی حفاظت کی ذمے داری کس کی ہے۔ جلترنگ پڑھ کر میں بالکل فریش ہو جاتی ہوں۔ جان بوجھ کر بھولے ہوئے پاندان کا قصہ بڑے ہی مزے کا تھا۔ معذرت کے ساتھ جلترنگ پڑھ کر جتنا فریش ہوتی ہوں امانت پڑھ کر اتنی ہی ٹینس ہو جاتی ہوں۔ ایک بوجھ سا

دل پہ محسوس ہوتا ہے، یہ تحریر رفعت سراج کی دوسری تحریروں سے مختلف ہے۔ رضوانہ پرنس کا ناولٹ پسند آرہا ہے۔ شام شہر یاراں قدرے دلچسپ ہے۔ زوئی کا اپنی ساس سے ملنے کا سین بہت مزے کا تھا ہمارے یہاں کی اسّی فی صد مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں، میرال کا ماضی سامنے آنے والا ہے۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

قرۃ العین عقیل، پنجاب سے۔ ''عنیزہ سید جی آپ تو میری فیورٹ رائٹر ہیں اور آپ کی یہ تحریر بھی باقی تحریروں کی طرح دل میں جگہ بنا گئی۔ امانت بھی اچھا جارہا ہے۔ رضوانہ پرنس کا منی ناول بالکل پسند نہیں آیا یہ میری ذاتی رائے ہے۔ اسما قادری نے بھی اچھا لکھا اور نمرہ احمد کے لیے یہی کہوں گی کہ نام ہی کافی ہے۔'' (شکریہ)

✎ صبا نور، لیہ سے۔ ''آپی آپ نے کہا تھا کہ میں پیسے ضائع نہ کیا کروں تو سویٹ آپی آپ بھی تو میرا اتنا خیال کرتی ہیں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آپ نے مجھے حوصلہ دیا، ہمت دی اور آج میں آپ کی وجہ سے ایف اے کی اسٹوڈنٹ ہوں اور اپیا جب آپ مجھ سے اتنا پیار کرتی ہیں تو کیا مجھے آپ سے پیار نہیں ہوگا بلکہ میں تو آپ سے تب سے پیار کرتی ہوں جب آپ مجھے جانتی بھی نہیں تھی تو سو پیاری آپی پیار میں پیسے ضائع تھوڑی ہوتے ہیں بلکہ خوشی ہوتی ہے۔'' (پیاری صبا میں پھر بھی یہی کہوں گی کہ مجھے کارڈز بھیج کر اپنے پیسے مت ضائع کیا کرو۔ ہر بات جب خط میں لکھی جاسکتی ہے تو پھر کیا ضرورت ہے کہ ہم کارڈ کا سہارا لیں اور اپنے پیسے برباد کریں)

✎ نصرت جبیں، پنجاب سے۔ ''سلسلے وار ناولوں میں عنیزہ سید اول آرہی ہیں۔ شام شہر یاراں میں وہ جس خوب صورتی سے کہانی آگے بڑھا رہی ہیں یہ انہی کا خاصہ ہے۔ وہ ہر کردار میں اتر کر اس کے ڈائیلاگ ادا کرتی ہیں۔ ہماری آپا رفعت سراج بھی امانت کو بڑے طریقے سے آگے بڑھا رہی ہیں مگر جب بھی کہانی میں کہیں جھول آجائے تو وہ ناگوار گزرتا ہے شاید وہ ایسا بھاگم بھاگ میں لکھتے ہوئے کر جاتی ہیں۔ یہ کیسی محبت ہے میں عالیہ حرا نے عورت کے مزاج کی بہت خوب صورتی سے منظر کشی کی کہ جب وہ کسی کی محبت میں مبتلا ہوجائے تو اس کی ذات کے صرف مثبت پہلوؤں میں زندہ رہتی ہے اور منفی باتوں کی طرف جانے والے راستوں پر قفل چڑھالیتی ہے۔ اذیت سہتی ہے، اذیت سے گزرتی ہے مگر بند آنکھیں کھولنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ مجھے رابعہ نیازی کی تحریر امید صبح بھی بہت پسند آئی میں نے زندگی میں بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جنہوں نے دوسروں کے راستوں میں پتھر بچھائے آخر خود انہی سے ٹھوکر کھا کر گرے باقی یہ زندگی کے رستے عقیلہ حق، ہار جیت شمیم فضل خالق، بیٹی، ثمینہ عظمت علی بھی بہترین تحریریں تھیں۔'' (شکریہ)

✎ شیریں ظفر، ملتان سے۔ ''پاکیزہ ڈائجسٹ کی تحریریں سبق آموز ہیں۔ اس کے لیے حوالے میں سکینہ فرخ کا عہد اور ہما وجاہت کا دوستی کا دیا جیسے دو ننھے منے افسانے بھی کافی ہیں۔ بہت بڑی، بڑی رائٹرز کے نام اور کام گنوانے کی تو ضرورت ہی نہیں۔ گل رعنا کا مرد کی جوتی مجھے سمجھ نہیں آیا اینڈ تک کی دو چار لائنز۔ رضوانہ جی نے اک نئے موڑ، کی خوب صورت قسط لکھی۔ زنیرا ٹھیک ٹھاک ٹریجک اینڈ کی جانب جارہی ہے۔ مجھے اس کردار سے شدید ہمدردی ہورہی ہے۔ رضوانہ جی پلیز فاران سے الگ نہ کیجیے گا پلیز۔ شہزادی کہیں فلمی ہیروئن بن کر تو نہیں آنے والی، یہ منی ناول کہیں بارہ اقساط کا نہ بن جائے، ہاہاہا۔ شاہدہ ملک نے اندھیرے اجالے میں صحیح، صحیح پہنچادیا، زبردست۔ رتیزا اشی نیا نام نیا کام۔ پیام محبت ایک اچھی اور سادہ تحریر تھی۔ کوئی خاص تاثر نہیں تھا۔ ثمرین کا کردار الجھا ہوا تھا یا شہرینہ کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ اگر سمیر سجاول چھ فٹ کا جوان تھا اور چاہے جتنا بھی بے بی فیس تھا اس کو اپنا بھتیجا کہنا۔ میرا خیال ہے کوئی لڑکی بھی نہیں کہے گی۔ عنیزہ سید نے ایک اور شاندار قسط لکھی شام شہر یاراں کی۔ عنیزہ جی سیاست دانوں کی نبض شناس آپ کا اتنا عمیق مطالعہ ہے مطلب آبزرویشن۔ بہت باریکی سے لکھتی ہیں آپ۔ یہاں تک کہ فیس ایکسپریشن اور کرداروں کی سوچ کا عکس یا ہاتھوں کی جنبش تک جو آپ لکھتی ہیں۔ جلترنگ کے بارے میں کمنٹ کرنا سورج کو چراغ دکھانے والی بات ہے۔ مجھے تو انجم جی کی اس صلاحیت کی داد دینی پڑے گی جو وہ لوگوں کے رویّے کے چھوٹے چھوٹے سے پہلو کو بھی ایک عجب انوکھا انداز دے کر بتاتی ہیں۔ میری تو بے ساختہ ہنسی ہی نکل جاتی ہے۔ جادو والی بات تو سچ کہی انجم آنٹی نے آج کل یہ وبا اتنی عام ہے کہ ہر دوسری عورت کہتی ہے کہ مجھ پر جادو

کروادیا گیا ہے یہاں تک کہ میری ایک فرینڈ نے کہا کہ اس کی اپنی بہن نے اسے پڑھوا کر چپل گفٹ کی ہے اور اس چپل کو پہننے سے اس کا ہونے والا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ افسوس ضعیف الاعتقادی مگر یہ ایک سچائی بھی ہے کہ اللہ کے بندوں کے راز اللہ ہی جانے۔'' (ہاں آج کل ایسا ہی ہورہا ہے)

✎ نسرین جمیل سیال، گجرات سے۔ ''طویل غیر حاضری کے بعد ایک بار پھر حاضر خدمت ہوں۔ 1999ء میں آخری ناولٹ دشتِ ہجراں میں کس کی موت دو قسطوں میں ستمبر، اکتوبر میں لگا تھا۔ اس کے بعد زندگی کے جھمیلوں میں یوں ایک جکڑ بند سا لگا کہ اپنے پیارے پاکیزہ سے ملاقات کرنا بھی مشکل ہوگیا لیکن آخر کب تک؟ جب تک زندگی ہے آپ لوگوں کو بھولنا بہت مشکل ہے اور زندگی میں انسان جدائی کب تک برداشت کرسکتا ہے ہم پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔'' (خوش آمدید، تمہارے آنے کی خوشی ہوئی)

✎ سدرہ کلثوم مروت، صوبہ سرحد سے۔ ''ہر تحریر لاجواب، ویل ڈن۔ امانت ناول نے واقعی تجسس میں لے رکھا ہے چونکہ میں پٹھان ہوں اس لیے ہمارے ہاں ایسی خواتین موجود ہیں جو بہت سخت ہیں اور مرد بھی اُف جابر علی سے بھی زیادہ سخت لیکن عورتیں بھی اسی طرح سخت ہوتی ہیں کیونکہ ہمارے ہاں ماحول ہی ایسا ہے۔ ہماری تربیت اسی طرح ہوتی ہے۔ باقی ناولٹ افسانے بھی بہت زبردست لگے میری رائٹر سے ایک گزارش ہے برائے مہربانی اگر اس پر تھوڑا غور کریں تو بڑی نوازش ہوگی وہ یہ کہ کبھی ہنسی مذاق والی تحریریں بھی دیا کریں کیونکہ میرا تو یہ حال ہے کہ جب بھی اداس ہوتی ہوں فوراً ڈائجسٹ اٹھالیتی ہوں۔ باقی تمام روشن ستاروں کو مجھ ناچیز کا سلام۔ آپی فریدہ جاوید، امینہ عندلیب اور آپی غزالہ جلیل راؤ کے لیے ڈھیروں ڈھیر دعاؤں کے ساتھ نیک تمنائیں۔ خداوند کریم آپ کی ہر مشکل دور کرے۔ ہر بیماری دور فرمائے خدا آپ کو شفا دے۔ آپی فریدہ جاوید فری کی شاعری بہت اچھی تھی تصویر سمیت۔'' (ہاں، ہمیں بھی بہت اچھی لگتی ہے)

✎ کوثر اعجاز چوہدری، قصور سے۔ ''رضوانہ پرنس کا منی ناول اِک نئے موڑ پر اک اداس موڑ پر آگیا ہے۔ رضوانہ جی فاران کو اتنا ہیرو بھی نہ بنائیں کہ زندگی کی اصل ہیروئن کو اداس دیوی بنا کر رکھ دے وہ بیوی ہے یار اس کے خیالات و جذبات فطری ہیں۔ بہر حال اس کے ساتھ برا نہ کیجیے گا۔ اپنی بہت پیاری دوست فریدہ جاوید کی غزل بہت پسند آئی اور تصویر دیکھ کر دل باغ، باغ ہوگیا۔ جلترنگ اس بار مزاح کی لپیٹ میں حقیقت کا آئینہ دار تھا۔ بہت سے گھروں کی کہانی مینارِ محبت اور جادو مزہ آگیا پڑھ کر پاکیزہ ڈائری اور میں اکثر گنگناتی ہوں ہمیشہ کی طرح لاجواب تھا۔ فصیحہ آصف کا اور عروبہ ناز کا شعر اداس کر گیا، اپیا پاکیزہ میں پلیز رائٹرز اور شاعرات وتبصرہ نگار بہنوں کے انٹرویو کا سلسلہ وصفحات شامل کریں۔ سندیسے فضول سا لگتا ہے اس کو ختم کردیں۔'' (بہت بہتر)

☆ خطوط کی محفل کا کوٹا ختم ہوا۔ آیئے ہم سب مل کر دعا مانگتے ہیں۔ یا اللہ یا رحمٰن یا رحیم میرے جسم کو شفا دل کو اپنی ذات کا یقینِ کامل اور آنکھوں کو نورِ بصیرت عطا فرما اور جب تک میں زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرمادے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے۔ یارب العالمین تو مجھ سے، میری آل اولاد سے ہمیشہ، ہمیشہ راضی رہنا اور دونوں جہانوں میں مجھے خیر عطا فرمانا۔ بے شک میرا رب ہر چیز پر قادر ہے اور میرا رب برکت اور بلندی والا ہے۔

یا مجیبُ یا مجیبُ یا مجیبُ

دعا گو

آپ کی باجی

انجم انصار

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.c فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500



پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

آرزو

کعبہ کی طرف ہو اب جو بھی سفر ہو
اس آرزو میں اب میرے شب و روز بسر ہوں
پیغام یہ دے دینا صبا تو جا کے حرم میں
بیٹھا ہے کوئی ظلمت میں، اُس کی بھی سحر ہو
چھٹ جائیں اندھیرے جو مل جائے اجازت
باقی کی میری عمر جو کعبہ میں بسر ہو
کر دیجیے سفارش کچھ آپ ہی رب سے
کر دے وہ کرم یہ بھی مجھ پر بھی نظر ہو
آ جائے بلاوا اب میرا بھی حرم سے
سن لے تو صدا میری، دعا میں جو اثر ہو

کلام: عالیہ ضیا، کراچی

نعتِ رسول مقبول ﷺ

رسولِ پاک مدینے کی فضائیں یاد آتی ہیں
وہ انمول گھڑیاں وہ ہوائیں یاد آتی ہیں
میرا دستِ طلب اور خواہشوں کا سیل بے ہنگم
آپ کی جود و سخا اور عطائیں یاد آتی ہیں
نہ دنیا کی خلش کوئی نہ عقبیٰ کی ہوس باقی
محض روضے سے لپٹی سبز قبائیں یاد آتی ہیں
وفورِ شوق میں گزرا جو عالم میرے اس دل پر
وہ آنسو اور بے خودی صدائیں یاد آتی ہیں
کاش پھر سے چوم لوں روضے کی جالی کو
چمکتی چاند سی دنیا اور ردائیں یاد آتی ہیں
اس پاک دھرتی پہ چھائے نور کے جلوے
وہ انوکھے جاوداں منظر اور ندائیں یاد آتی ہیں
بھول کیسے سکتا ہے کوئی وہ شرف باریابی کا
وہ سجدہ یاد آتا ہے التجائیں یاد آتی ہیں
یاد آتے ہیں بے حد خود فراموشی کے وہ حسیں لمحے
یاد آتی ہے بارش رحم کی اور دعائیں یاد آتی ہیں

شاعرہ: عالیہ بشیر، اسلام آباد

حسنِ اخلاق

مشہور صوفی حضرت بایزید بسطامی کے بارے میں ایک حکایت بیان کی جاتی ہے کہ آپ کے گھر کے قریب ایک آتش پرست کا گھر تھا۔ ایک دفعہ وہ سفر پر گیا ہوا تھا۔ اس کے گھر چراغ نہ ہونے کی وجہ سے اس کا شیر خوار بچہ اندھیرے میں رویا کرتا تھا۔ حضرت بایزید نے اپنا معمول بنالیا جونہی رات ہوتی وہ چراغ اٹھا کر ہمسائے کے گھر رکھوا آتے یوں بچہ خوش ہو جاتا۔ وہ شخص سفر سے واپس آیا تو اس کی بیوی نے سارا حال سنایا، وہ شخص آپ کے حسنِ اخلاق سے اس قدر متاثر ہوا کہ فوراً آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔

مرسلہ: لاریب، ماہ زیب، چونیاں

سنہرے موتی

☆ سورۂ نسا میں ارشاد ہے۔ ”رشتے داروں سے تعلقات بگاڑنے سے پرہیز کرو۔“

☆ جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کا مال کھاتے ہیں درحقیقت وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں۔ وہ ضرور جہنم میں جائیں گے۔

مرسلہ: صدف نورین، لاہور

بہترین علاج

حضرت تمیم داریؓ نے ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں کشمش کا تحفہ پیش کیا تو آپ نے کشمش کا ایک دانہ ہاتھوں میں لے کر صحابہ اکرامؓ سے

فرمایا۔ ”اسے کھاؤ یہ بہترین کھانا ہے۔ یہ تھکن کو دور کرتی ہے، غصے کو ٹھنڈا کرتی ہے، اعصاب کو مضبوط کرتی ہے، چہرے کو نکھارتی ہے اور بلغم کو نکالتی ہے۔“

(حلیۃ الاولیا)

مرسلہ: سیدہ علیشاہ، بہاول پور

ہیرے

ایک قافلہ ایک اندھیری سرنگ سے گزر رہا تھا کہ اُن کے پاؤں میں کچھ کنکریاں چبھیں۔ کچھ لوگوں نے اس خیال سے کہ کسی کو چبھ نہ جائیں نیکی کی خاطر اٹھا کے جیب میں رکھ لیں کچھ نے زیادہ اٹھائیں کچھ نے کم۔ جب اندھیری سرنگ سے باہر آئے تو دیکھا وہ ہیرے تھے۔ جنہوں نے کم اٹھائے وہ پچھتائے کہ کم کیوں اٹھائے۔ جنہوں نے نہیں اٹھائے وہ بھی پچھتائے۔ دنیا کی زندگی کی مثال بھی ایسی اندھیری سرنگ کی سی ہے اور نیکیاں یہاں کنکریوں کے مانند ہیں۔ اس زندگی میں جو نیکی کی وہ آخرت میں ہیرے جیسی ہوگی۔ اب بھی وقت ہے چن لو ہیرے۔

مرسلہ: سحر فیروز، سیالکوٹ

بہار کے زخم

میں تو اس کرب و اذیت سے
ابھی سنبھلی بھی نہ تھی
دشت وحشت کی تنہائی
سے نکلی بھی نہ تھی
پچھلی بہار کے زخموں کا
ابھی باقی تھا حساب
سردیوں کی دھوپ میرے آنگن سے
ابھی ڈھلی بھی نہ تھی
کہ بہار کے سارے رنگ
اپنی بہن کی آنکھوں میں دیکھ کر لرز گئی
کہ وہ بھی تو کبھی اس سراب میں
اتری نہ تھی

شاعرہ: پروین عذرا تشنہ، کراچی

سوچنے کی باتیں

☆ شاہراہ پر خوشنما پھول دیر تک قائم نہیں رہتے۔
(ایڈیسن)

☆ محبت کا ایک گھنٹا سو برس کی بے محبت زندگی سے بہتر ہے۔

☆ خوب صورت عورت دیکھنے سے آنکھ لیکن نیک دل عورت دیکھنے سے دل خوش ہوتا ہے۔
(شیلے)

☆ امیدوں کے سہارے جینا خود کو دھوکا دینا ہے۔

☆ بڑھاپا زندگی کی مسرتوں کو کم لیکن زندگی کی ہوس کو زیادہ کر دیتا ہے۔
(گولڈ اسمتھ)

☆ بحث گفتگو کی موت ہے۔
(لڈوگ)

☆ دروازہ جو غریبوں کے لیے نہیں کھلتا وہ ڈاکٹروں کے لیے کھلتا ہے۔
(پٹیل)

☆ ایک مرد کی تعلیم صرف ایک فرد کی تعلیم ہے۔ ایک عورت کو تعلیم دینے سے آپ ایک کنبے کو تعلیم یافتہ بناتے ہیں۔
(میکلور)

مرسلہ: جبیں ہاشمی، بھیرہ

پیار کا موسم

بہار میں پھول کھلتے ہیں
ہر سو خوشبو بکھرتی ہے
یہ موسم پیار کا موسم
کسی کے اقرار کا موسم
موسم جو تھم سا جائے تو
ہر سو ایک آگ لگاتا ہے
یہ جو ٹوٹے بکھرتے رشتے ہیں
اُن کو بلاتا ہے
تو تم ایک کام کر لینا

اس موسم کا ہر لمحہ
تم میرے نام کر دینا
آفس سے واپسی پہ تم
ضرور ایک گلاب لے آنا
کانٹے نہ ہوں جس میں
بس یہ خیال کر لینا

شاعرہ: عظمیٰ آفاق
مرسلہ: مونا وقار، لاہور

پھول اور کانٹے

☆ تم اپنے سائے کے سوا کچھ نہیں دیکھ سکتے کیونکہ تم نے سورج کی طرف پیٹھ کر رکھی ہے۔
☆ بے شک وہ ہاتھ جو کانٹوں کے تاج بناتے ہیں اُن ہاتھوں سے بہترین ہیں جو کچھ نہیں کرتے۔
☆ جس چیز کا ہمیں اشتیاق ہو اور وہ ہمیں حاصل نہ ہو وہ چیز ہمارے دل کو اس چیز سے زیادہ محبوب ہوتی ہے جو ہمیں حاصل ہوتی ہے۔
☆ جو محبت روزانہ نہیں اُمڈتی وہ روزانہ مرتی رہتی ہے۔
☆ جب تم نے ہوا پر اپنا راز ظاہر کر دیا تو اب اگر ہوا اسے درختوں پر ظاہر کر دے تو تم ہوا کو برا مت کہو۔
☆ فرشتے جانتے ہیں کہ بیشتر عملی لوگ حسین خوابوں کی دنیا میں کھوئے ہوئے خیالی لوگوں کی گاڑھی کمائی سے روٹی کھاتے ہیں۔
☆ حق کی سننے والا حق کا اظہار کرنے والے سے کچھ کم نہیں۔
☆ سخاوت یہ ہے کہ اپنی استطاعت سے زیادہ دو اور...... استغفار یہ ہے کہ اپنی ضرورت سے کم لو۔
☆ زیادہ امید والا دراز زندگی کا مالک ہوتا ہے۔

مرسلہ: مسز نگہت غفار، کراچی

غزل

اب کے بہاروں میں آ جانا
پرانا گیت وہی پھر سنا جانا
نہ جانا پھر لوٹ کر تم
لمحہ لمحہ ساتھ تو بتا جانا
دل پہ چھائی غموں کی بدلی
اداسیوں کے موسم مٹا جانا
آنکھیں یہ پتھرا نہ جائیں
سندر مکھڑا دکھا جانا
نہ ہونا پھر جدا ہم سے
گلے سے ایسے لگا جانا
نہ خزاں میں کبھی مرجائیں
بہار کے پھول اتنے کھلا جانا
دل کی یہ آرزو ہے
اپنا نام میرے ساتھ سجا جانا

شاعرہ: فصیحہ آصف خان، ملتان

معذرت کے ساتھ

ایک بیمار استانی سے اس کا شوہر بولا۔ ”تم اس بار کسی جانوروں کے ڈاکٹر کو دکھاؤ تبھی تم ٹھیک ہوگی۔“
استانی۔ ”کیوں؟“
شوہر۔ ”روز صبح مرغے کی طرح جلد اٹھ جاتی ہو، گھوڑے کی طرح بھاگ کر ڈیوٹی پر جاتی ہو، گدھے کی طرح دن بھر کام کرتی ہو، لومڑی کی طرح اِدھر اُدھر سے انفارمیشن لیتی ہو، بندر کی طرح پرنسپل کے اشارے پر ناچتی ہو، گھر آ کر فیملی پر کاٹ کھانے کو آتی ہو۔ انسانوں کا ڈاکٹر تمہیں کیا خاک ٹھیک کرے گا۔“

مرسلہ: مسز اقصیٰ عمران، لاہور

محنت کی پکار

محنت زندگی ہے اور کاہلی موت۔ تم کام کیے جاؤ نام کے لیے نہیں، شہرت کے لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ یہ زندگی کی پکار ہے۔ اگر تم نے محنت سے کام کیا تو یقین کرو تمہاری زندگی پھولوں کی طرح رنگین اور شہد کی طرح میٹھی ہوگی۔ (مالکٹ)

دوپٹا ایک پٹا

100 سال پہلے کی عورت حرم سرا کی اونچی دیواروں کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ 75 سال پہلے کی

عورت سرتاپا برقع میں ملبوس تھی۔ 50 سال پہلے کی عورت ایسے برقع میں ملبوس تھی جس کے نقاب پر ایسی جالی تھی جس میں چہرہ بدلی میں چھپے چاند کی طرح دمکتا تھا۔ 25 سال پہلے کی عورت اس برقع میں ملبوس تھی جس کا نقاب الٹا ہوا تھا۔ 15 سال پہلے کی عورت شلوار، قمیص پر صرف دوپٹا اوڑھے نظر آتی تھی۔ 10 سال سے عورت دوپٹے کے بجائے صرف ایک پٹا اوڑھ رہی ہے اور آج کل کی عورت کو آپ دیکھ ہی رہے ہیں اب ذرا چشمِ تصور سے محض دو سال بعد کی عورت پر غور کیجیے۔

مرسلہ: ارم کمال، فیصل آباد

جگنو

آنکھیں ہجر سمندر جگنو
آ جاتے ہیں اکثر جگنو
رات کی گہری تاریکی میں
ہر سو رقص میں منظر جگنو
میرے گورے گال کو اکثر
چھو جاتے ہیں پتھر جگنو
میری قسمت جیسے یہ بھی
گھوم رہے ہیں بے گھر جگنو
ٹوٹ کے شاید آنکھیں روئیں
ہم نے دیکھے در در جگنو
دامن میں برسات فری ہے
میرے اندر باہر جگنو

شاعرہ: فریدہ جاوید فری، لاہور

گھر کا بھیدی

ایک بچے نے اپنی ماں سے پوچھا۔ ”ممی، کیا آپ کو معلوم ہے کہ جان کہاں سے جاتی ہے؟“
”شاید منہ سے، ناک سے یا پھر آنکھ سے۔“ ماں نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔
”نہیں امی، آپ غلط کہہ رہی ہیں جان ہمیشہ کھڑکی سے جاتی ہے۔“ بچے نے کہا۔
”لیکن بیٹے تمہیں کیسے پتا چلا؟“ ماں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔
”کل پاپا کھڑکی کے پاس کھڑے ہوئے ماسی کی بیٹی سے کہہ رہے تھے...... میری جان ذرا سنبھل کر اترنا کہیں کھڑکی سے گر نہ جانا۔“ بچے نے معصومیت سے جواب دیا۔

مرسلہ: شہلا نواز، لاہور

موسمِ گل

یہ جو ہم تم میں ہیں رابطے
خدا کرے یہ سدا رہیں
یہ چراغ ہیں تو جلے رہیں
یہ پھول ہیں تو کھلے رہیں
تجھے نصیب ہوں مسکراہٹیں
تیرے پاس تیرا حبیب ہو
تو جہاں رہے سکھی رہے
تیرے ساتھ میری دعا رہے
تو دعا کرے تو قبول ہو
جو وفا کرے تو وصول ہو
کوئی غم نہ تیرے قریب ہو
تیرا جیون خوشی سے بھرا رہے
تو جہاں چلے صبا چلے
تو جہاں رکے بہار ہو
تیری جس طرف بھی اٹھے نظر
وہاں موسمِ گل کھلا رہے

مرسلہ: صبا نور، لیہ

ثبوت

نئی نویلی دلہن نے شوہر سے کہا۔ ”کیا یہ حقیقت ہے کہ چاند کی چاندنی آدمی کو پاگل کر دیتی ہے؟“
شوہر نے ٹی وی سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا۔ ”مجھے تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ تم یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ میں نے چاندنی رات میں ہی تم سے اظہارِ محبت کیا تھا۔“

مرسلہ: شبنم کنول، گاؤں پاپا نگری



یہ بھاریں یہ سماں

جب موبائل آٹے اور چاول سے سستا ہوجائے گا تو اس کا غلط استعمال بھی ہوگا...... نئی نسل کا شناختی کارڈ بعد میں بنتا ہے...... موبائل پہلے آجاتا ہے۔ پاکستان میں موبائل جتنا استعمال ہوتا ہے اتنا تو ترقی یافتہ ممالک میں بھی نہیں ہوتا ہوگا۔ اسی کے طفیل عشق ہوتا ہے، اسی کے طفیل شادیاں اور اسی کے طفیل طلاقیں...... گویا محبت کے گیت بھی اس پر گائے جاتے ہیں اور لڑائی، جھگڑوں کے داؤ بھی اسی پر آزمائے جاتے ہیں۔ بڑے شہروں میں خواتین دو موبائل لازمی رکھتی ہیں۔ ایک آنے جانے کے لیے اور تقریباتی موبائل جو اچھا خاصا مہنگا ہوتا ہے...... ہاتھ میں پکڑ کر ایسے چلا جاتا ہے جیسے کسی چوزے کو دابے چل رہی ہوں۔ دوسرا سستا اور گھٹیا سا موبائل جو شاپنگ پر جاتے ہوئے اور گھر میں استعمال ہوتا ہے...... ایسے موبائل اگر سڑک پر چھن بھی جائیں تو ملال تین گھنٹے سے زیادہ نہیں رہتا۔

مسز فاروقی کی فیملی کو موبائل فیملی بھی کہا جاتا تھا۔ یہ لطیفہ انہی کے گھرانے سے منسوب تھا کہ ایک مرتبہ فقیر اُن کے گھر آیا اور کہا۔ ''بہت بھوکا ہوں کچھ کھانے کے لیے دے دو۔''

''ابھی کھانا تیار نہیں ہوا ہے۔''

''اچھا جب کھانا پک جائے تو مس بیل دے دیجیے گا میں آجاؤں گا۔'' فقیر نے کہا۔

اسی گھرانے کے سپوتِ درجۂ اول خاصے عاشق مزاج تھے۔ ان کے پاس کئی موبائل تھے۔ اسی لحاظ سے ان کی سہلیاں بھی تھیں...... آخر دن رات کی گھنٹیوں نے ان کا دماغ کچھ ایسا ماؤف کیا...... کہ ایک دن وہ دندناتے ہوئے گھر آئے اور بے دھڑک انداز میں بولے۔

''راجا کی جائے گی بارات
رنگیلی ہوگی رات
مگن میں ناچوں گا''

مسز فاروقی اپنے سب سے بڑے بیٹے کی اس ہٹ دھرمی کی وجہ سے سکتے کی حالت میں آگئیں...... ان کا دل و دماغ اپنی ہیٹی محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنی بڑی بیٹی ثمینہ کو کہلوا دیا کہ رشتہ دے آؤ ورنہ تمہارا بھائی خود ہی اس کلموہی کی کلائی پکڑ کر لے آئے گا۔ بیٹے کے لہجے سے انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اپنی پسند کی شادی کر کے رہے گا۔

ثمینہ آپی جو ایسے موقع کی تاک میں رہا کرتی تھیں کہ ایسی جگہ جایا جائے جہاں خاطر مدارات کے ساتھ وی آئی پی درجہ بھی ملے۔ وہ جھٹ تیار ہوگئیں...... غضب یہ کیا کہ میک اپ میں خود ہی لت پت ہوگئیں...... ان کے پسندیدہ بیوٹی پارلر میں ایمر جنسی طور پر جانا محال تھا وہاں

اس شام دلہنوں کی فوج تیار ہونے آئی ہوئی تھی۔ چلو اس پر بھی صبر کیا جا سکتا تھا کہ اکثر خواتین میک اپ خود کر کے جب ہمیں ڈراتی ہیں...... تو ہمیں بھی یہ حق حاصل ہونا چاہیے...... یقیناً ان کے ایسے ہی جذبات ہوں گے کہ گھر والے بھی ان کا عجیب تناؤ زدہ چہرہ دیکھ کر از خود ٹینشن کا شکار ہو رہے تھے مگر انہوں نے غضب جو کیا...... وہ یہ تھا کہ چلتے وقت اپنے موٹے موٹے شیشوں کا چشمہ اتار دیا۔

''کیا لینس لگا کر جاؤ گی؟'' مسز فاروقی نے پوچھا۔

''امی...... جب بھی لینس لگاتی ہوں...... آنکھیں خونخوار سی ہوجاتی ہیں اور اس قدر تکلیف ہوتی ہے کہ گھنٹوں آنکھوں سے پانی علیحدہ بہتا رہتا ہے۔'' ثمینہ بولی۔

''ثمینہ جب تم چشمہ اتار کر دیکھتی ہو تو آنکھوں کو سکیڑ کر گول کر کے دیکھتی ہو...... اس سے آنکھوں کی خوب صورتی پر حرف آتا ہے...... وہاں جا کر کم از کم اترا کر تو آنا تھا کہ انہیں بھی اندازہ ہو کہ ہم کسی سے کم نہیں ہیں۔'' مسز فاروقی نے کہا۔

''امی...... حرف تو اس بلاؤز پر بھی آنا چاہیے جو آج میں پہن کر جا رہی ہوں...... درزی کو خدا ہی سمجھے میری ساڑھی کا ستیاناس مار دیا۔ کم بخت کو اٹھارہ سال ہوگئے میرے کپڑے سیتے ہوئے مگر اسے آج تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ میرے کون سے راز فاش کرنے ہیں اور کس کی پردہ پوشی کرنی ہے۔''

''چلو آج پلو گرانا نہیں!'' مسز فاروقی نے مضمحل لہجے میں سمجھایا۔

''او کے......!'' ثمینہ ہنس دیں۔ قل قل کرتی ہنسی جیسے جھرنوں میں جلترنگ سا بج رہا ہو۔

''مائی سویٹ ہارٹ...... تمہاری ہنسی بے حد خوب صورت ہے۔ لڑکی والوں کے ہاں جا کر اسی طرح ہنسنا بلکہ ان کی ہر بات ہنسی میں اڑانا کہ لڑکی ڈری ڈری سی ہمارے گھر آئے......! چند روز کے بعد میں تمہاری دوسری بہن کو لے کر جاؤں گی اور خوب فلک شگاف قہقہے لگا کر آؤں گی تا کہ وہ ہم سے خوفزدہ سی رہے۔ ثمینہ بیٹا مجھے یہ لگ رہا ہے کہ لڑکی والے چونکہ بہت بڑی کوٹھی میں رہتے ہیں اور عشق کے طفیل یہ شادی ہو رہی ہے تو اس خبیث سی لڑکی نے ہمارے معصوم سے لڑکے کو قابو میں کرلیا ہوگا۔ ہمارا سیدھا سادہ سا بچہ اس کے مکر و فریب میں آگیا ہوگا۔ تم اشارے کنائے میں یہ ضرور باور کرا دینا کہ سسرال کی راجدھانی میں ہم اس کا جھنڈا نہیں گڑنے دیں گے، ہاں۔''

''ڈونٹ وری مما...... میں آپ کی ہونہار بیٹی ہوں۔'' ثمینہ نے پھر قہقہہ لگایا...... جو خاصا لمبا ہوگیا...... تب مسز فاروقی کو پانی پلانا پڑا۔

ثمینہ کو سجے سجائے ڈرائنگ روم میں بیٹھے کافی دیر ہوچکی تھی۔ لڑکی کی ماں اور ایک نوعمر لڑکا ان سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ حیران تھیں کہ اس قدر آزاد خیال لڑکی آنے میں کیوں شرما رہی ہے۔ ان کا تو خیال تھا کہ وہ تو ان کو ریسیو کرنے گھر کے گیٹ کے باہر ہی مل جائے گی...... یا اپنی کوٹھی کے قریب والے سگنل پر اپنی گاڑی لیے کھڑی ہوگی...... اور وہ اس کی گاڑی کے پیچھے اپنی گاڑی لگا دیں گی۔

آخر جب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تو

انہوں نے کہا۔

''ارے بھیا...... اپنی بہن رخشی کو تو بلاؤ۔''

''ارے یہی تو رخشی ہے...... جس سے تم گھنٹا بھر سے باتیں کررہی ہو۔'' ان کی مما ہنسیں۔

''جی......!'' ثمینہ نے اسے غور سے دیکھا اور اچھل کر دو فٹ دور جا کر کھڑی ہوگئیں۔

بوائے کٹ بال، لمبا قد، ترچھی آنکھیں اور ناک کے نیچے بالوں کا گھرا رواں...... جیسے مسیں بھیگ رہی ہوں۔

''یہ...... یہ...... ہے...... رخشی یا...... رشید......'' ان کے منہ سے ٹوٹے پھوٹے لفظ نکل رہے تھے...... اور کف علیٰحدہ بہہ رہا تھا۔ ان کے ذہن میں اخبار میں شائع شدہ وہ تصویریں گھوم گئیں...... گزشتہ دنوں پنجاب میں دو سہیلیاں آپس میں شادی کرنا چاہ رہی تھیں...... تو کیا...... اب...... اس سے زیادہ ان کا ذہن کچھ سوچنے کو تیار نہیں تھا۔

''ہاں بھئی...... یہی ہے ہماری رخشی تمہیں پسند آتی ہے تو آئے اور نہیں آتی تو نہ آئے...... ہمیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

اب اس کی مما ناراضی سے ثمینہ سے کہہ رہی تھی اور حیرت سے ثمینہ کو دیکھ بھی رہی تھیں۔ ''بہن کہیں باؤلی تو نہیں ہوگئی کہ جب لڑکا سب مدارج طے کر گیا تو یہ کون ہے مین میخ کرنے والی۔''

''میں رخشی تھی...... رخشی ہوں اور رخشی ہی رہوں گی اگر آپ مجھے پہچان نہیں سکی ہیں تو اپنی آنکھوں کا علاج کروائیں۔ حیرت ہے کاشف کے پاس میری اتنی تصویریں ہیں اور آنے سے پہلے آپ نے انہیں دیکھا تک نہیں ہے۔''

''سویٹ کاشف نے کسی کو دکھانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی ہوگی۔ جبھی تو یہ بے چاری یہاں آ کر حواس باختہ ہوگئیں!'' رخشی کی مما نے چمک کر کہا۔

''مما...... میں نے تو کاشی کو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم اپنی آپی کو ہمارے گھر کیوں بھیج رہے ہو میں تو کوئی بھی نند افورڈ نہیں کرسکتی۔'' رخشی کی زبان چل رہی تھی۔

''نند افورڈ نہیں کرسکتی......'' ثمینہ کو چکر سے آنے لگے۔

''غضب خدا کا، چندرانا تو دیکھو، میری تصاویر دیکھنے کے باوجود ایسی بن رہی ہیں جیسے ان کی آنکھیں خراب ہوں۔ بڑے بڑے دیدے تو ضرور ہیں...... مگر نظر کچھ نہ آنے والا معاملہ ہے۔'' رخشی کا غصہ سوا نیزے پر پہنچ گیا تھا۔

''آنکھیں...... آنکھیں...... آنکھیں......!''

آنکھوں کی اس قدر یلغار ہر جملے میں ہو رہی تھی کہ ناچار ثمینہ کو اپنے پرس سے اپنے بے حد موٹے شیشوں کا چشمہ نکال کر آنکھوں پر چڑھانا پڑا۔

امی کی باتیں علیٰحدہ یاد آرہی تھیں کہ لگ رہا ہے کہ کاشف کا عشق جوبن پر ہے...... ضرور اس کلموہی کا ہاتھ پکڑ کر خود لے آئے گا۔ گو لڑکی کو انہوں نے ابھی تک نہیں دیکھا تھا مگر ان کی باتیں سن کر انہیں پورا یقین ہوگیا تھا کہ ان کے گھرانے میں آنے والی پہلی کلموہی بھاوج کا افتتاح ہونے والا ہے۔ لرزتے ہاتھوں سے رومال سے چشمے کا شیشہ صاف کیا تو رخشی کا دھجی سا دوپٹا صوفے کی ہتھی پر پڑا نظر آیا۔

کان میں ننھے، ننھے سے ٹاپس بھی دکھائی دینے لگے۔

ناک میں ہیرے کی لونگ بھی چمکنے لگی۔

ثمینہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر...... بڑے بھرپور انداز میں اپنی ہونے والی بھابی کو گلے لگایا اور کہا۔

''ایمان سے رخشی...... تمہارے آنے سے ہمارا گھر جنت بن جائے گا۔ بس اب جلدی سے آجاؤ۔ تمہارے آنے کے بعد ہمارا گھر خوشبوؤں سے مہکے گا۔ جب تم آؤ گی تو بہاریں جھوم کر آئیں گی۔''

ثمینہ قصداً قہقہے لگا رہی تھیں...... مگر آج ان کی ہنسی اتنی بری تھی کہ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اپنے آنسوؤں کی پردہ پوشی کررہی ہیں۔

''ہمیں معلوم ہے کہ جہاں ہم جاتے ہیں...... لوگ ہم سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ یوں بھی ہمیں اندازہ ہے کہ ہم کیا ہیں۔'' رخشی نے شانے اچکا کر بھویں سکوڑ کر نخوت سے کہا۔ آخر سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوئی تھی۔

''واقعی تم ٹھیک کہتی ہو...... مگر گڑیا...... اب ہم سے زیادہ انتظار نہیں ہو رہا...... ہم چاہتے ہیں کہ تم بہار کی صورت میں جلدی سے آ کر ہمارے گھر کو معطر سا کردو۔'' ثمینہ پھر ہنستے ہوئے کہہ رہی تھیں...... مگر اس تلخ حقیقت کا اندازہ پہلی بار ہو رہا تھا کہ وہ کتنا گاڑھا جھوٹ بولنا جانتی ہے کہ اپنی زبان بھی پرائی لگ رہی تھی اور جھنڈا تو کیا...... بہت سارے جھنڈے انہیں نظر آ رہے تھے...... جو رخشی...... ان کے ہاں آ کر چپے، چپے پر گاڑنے والی تھی۔ بہار سے تو اس کا دور کا بھی واسطہ نظر نہیں آرہا تھا۔

☆☆☆

وٹامن بی کی خصوصیت

کام کی کثرت کی وجہ سے ذہنی دباؤ کے شکار افراد حیاتین ب کی کمی سے کام کرنے کی صلاحیت کھونے لگتے ہیں۔ ذہنی دباؤ میں شخصیت کے نکھار اور توانائی میں کمی کے علاوہ مزاج میں خرابی، فکر و پریشانی اور الجھن جیسی شکایات پیدا ہو جاتی ہیں۔

سوئم برن یونی ورسٹی میں اس سلسلے میں ہونے والی تحقیق کے نگراں پروفیسر کون اسٹوف کے مطابق اس میں شامل 60 افراد میں سے نصف کو حیاتین ب کی اضافی مقدار کھلائی گئی جبکہ 30 کو مصنوعی حیاتین ب 30 سے 90 دنوں تک کھلائی گئی۔ اس تجربے کے بعد جائزہ لینے سے اندازہ ہوا کہ حیاتین ب کا استعمال کرنے والے کام کے دباؤ اور تھکن سے محفوظ رہے جبکہ مصنوعی حیاتین استعمال کرنے والوں میں بہتری کے آثار نہیں پائے گئے۔ حیاتین ب کے اہم قدرتی ذرائع میں ثابت اناج، بے چھنا آٹا، گوشت، پھلیاں اور سیدھے سادے طریقے سے تیار کردہ تازہ غذائیں ہیں۔ ڈبا بند اور تیار شدہ بازاری غذاؤں میں یہ حیاتین بہت کم ہوتی ہے۔ کون اسٹوف کے مطابق کام کی کثرت سے پیدا ہونے والی شکایات کا علاج یہی ہے کہ حیاتین ب پر مشتمل غذائیں کھائی جائیں۔ نئی تحقیق کے مطابق ڈبا بند غذائیں سرطان پیدا کرنے میں معاون ہوتی ہیں۔

انتخاب: فضہ بتول، بہارہ کہو



میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆فصیحہ آصف خان......ملتان

آنکھوں میں جو بھی خواب اترا
روح تک اس کا عذاب اترا
خوشبو بدن سے پھوٹ پڑی
مجھ میں وہ صورتِ گلاب اترا

☆سیدہ علیشاہ......بہاول پور

میں دور ہونے لگی ہوں تو ایسا لگتا ہے
کہ چھاؤں جیسی تھیں مجھ پر رفاقتیں اس کی

☆جبین نیاز......ملتان

تیری وحشت کو سمیٹوں گا تو میں ہی آخر
تو ہے گر بپھرا سمندر تو کنارہ ہوں میں

☆ارم کمال......فیصل آباد

یہ پھول مجھے کوئی وراثت میں ملے ہیں
تم نے میرا کانٹوں بھرا بستر نہیں دیکھا

☆کائنات عبدالحلیم......میر پور خاص

میں برگ، برگ اس کو نمو بخشتی رہی
وہ شاخ، شاخ میری جڑیں کاٹتا رہا

☆نزہت بین ضیا......کراچی

تری ہنسی میں نئے موسموں کی خوشبو تھی
نوید ہو کہ بدن سے پرانے خواب اترے
سپردگی کا مجسم سوال بن کے کھلوں
مثالِ قطرۂ شبنم ترا جواب اترے

☆ایلیا عباس......لاہور

شوخ ہو جاتی ہے اب بھی تری آنکھوں کی چمک
گاہے گاہے، ترے دلچسپ جوابوں کی طرح

☆نگہت رضوی......اسلام آباد

سبھی سودے خسارے کے نہیں تھے
مگر فرصت نہ تھی کارِ جہاں سے

☆نفیسہ آرا......راس الخیمہ

ہم تو سمجھے تھے کہ اک زخم ہے بھر جائے گا
کیا خبر تھی کہ رگِ جاں میں اتر جائے گا
وہ جب آئے گا تو پھر اس کی رفاقت کے لیے
موسمِ گل مرے آنگن میں ٹھہر جائے گا

☆عروبہ ناز......کوٹلی

یہ ترے شہر کے انسان ہیں پتھر کی طرح
ان کو احساس عطا کر انہیں بینائی دے

☆عرشیہ جنید......کراچی

مرے سکوت سے جس کو گلے رہے کیا کیا
بچھڑتے وقت ان آنکھوں کا بولنا دیکھے
اسی سے پوچھے کوئی دشت کی رفاقت جو
جب آنکھ کھولے، پہاڑوں کا سلسلہ دیکھے

☆غزالہ طارق......سرگودھا

نظر بھی آیا اسے اپنے پاس بھی دیکھا
مری نگاہ نے یہ التباس بھی دیکھا
یہی کہا کہ نہیں اس کا راستہ تھا الگ
پھر اس کے بعد ہی خود کو اداس بھی دیکھا

☆عنبر وسیم......گوجرانوالہ

ابھی میں ایک محاذِ دگر پہ الجھی ہوں
چُنا ہے وقت یہ کیا مجھ کو آزمانے کا
کچھ اس طرح کا پُراسرار ہے ترا لہجہ
کہ جیسے راز کُھلا ہو کسی خزانے کا

☆غزالہ شاہد......کراچی

جو بات ہے دل میں مرے لب پر بھی وہی ہے
اس جرم کی پاداش میں کانٹوں پہ چلا ہوں

☆امینہ مشیر......نئی دہلی

موجود تھے ہزار مضامیں میں کتاب میں
تم کیوں الجھ کے رہ گئے لفظوں کے باب میں
بیداریوں نے مجھ کو ستایا ہے عمر بھر
دیکھی ہے میں نے خواب کی تعبیر خواب میں

☆صائمہ بنگش......کوہاٹ

دل کو اسی فریب میں رکھا ہے عمر بھر
اس امتحان کے بعد کوئی امتحاں نہیں

☆نگہت غفار......کراچی

نہ میرے لطف میں حیراں نہ اپنی الجھن پر
مجھے یہ شخص تو ہر شخص سے جدا ہی لگا

☆ماہ نور قیصر......راولپنڈی

کتنے چہروں سے اتر جائے نقابِ عظمت
گر خدا زخم کو بھی قوتِ گویائی دے
ہر طرف پھول، شفق، قوسِ قزح رقصِ بہار
وہ تو آتے ہی مجھے تحفۂ بینائی دے

☆مسز تسنیم......جہلم

ہمارے دل کا جو عالم ہے آپ کیا جانیں
یہ اور بات ہے ہم مسکرائے جاتے ہیں

☆ثوبیہ ظہور......ضلع اٹک

جذبۂ مہر و وفا کا دل میں ہونا شرط ہے
دشمنوں میں لوگ کر لیتے ہیں پیدا آشنا

☆فاطمہ بلال......کینیڈا

خشک پتوں پہ ذرا پاؤں سنبھل کر رکھنا
دیکھنا شور ہواؤں میں بکھر جائے گا

☆شہلا محمود......واہ کینٹ

وابستہ ان کی یاد ہے یوں زندگی کے ساتھ
جس طرح روشنی کی جھلک تیرگی کے ساتھ
کیسی گزر رہی ہے جہان خراب میں
وہ مجھ سے پوچھتے ہیں بڑی سادگی کے ساتھ

☆شبنم کنول......پنجاب

زینے پہ رکھ گیا کوئی ٹہنی گلاب کی
ایسے دیا کسی نے سندیسہ بہار کا

☆امینہ عندلیب......سلانوالی

کچھ اس طرح سے نظر انداز ہم ہوئے
جیسے اضافی حرف تری زندگی کی کتاب سے

☆عالیہ بتول......ملتان

غلط تھے وعدے مگر میں یقین رکھتا تھا
وہ شخص لہجہ بڑا دلنشین رکھتا تھا

☆صدف شہاب......کراچی

مل جاتے ہیں ہر موڑ پہ ہمدرد ہزاروں
شاید میری بستی میں بھی فنکار بہت ہیں

☆سلیم فاطمہ......کراچی

یہ شہر صداقت بھی عجب شہر ہے شمیم
میں نے یہاں ایک شخص بھی سچا نہیں دیکھا

☆☆☆

خوش ذائقہ

پاکیزہ بہنیں



پکوڑے چکن کے

ارے آپ پریشان نہ ہوں...... آپ کو بیسن کے بجائے چکن پکوڑے کھانے کو ملیں گے...... جیسا کہ آج کل عام ہے کہ بچے، چکن، چکن اور بس چکن کی رٹ لگاتے ہیں تو انہیں پکوڑوں میں بھی چکن چاہیے ہوتی ہے اس لیے آج آپ اس ترکیب کو ضرور آزمائیے گا۔

اشیا: مرغی کا گوشت، ایک پاؤ۔ (چھوٹی چھوٹی بوٹیاں ایک بھاپ میں گلا لیں) انڈا، ایک عدد۔ میدہ، تین کھانے کے چمچ۔ کارن فلاور، دو کھانے کے چمچ۔ سفید مرچ، کالی مرچ پاؤڈر، حسبِ ذائقہ۔ نمک حسبِ ضرورت، سویا ساس دو کھانے کے چمچ۔ چلی ساس، ایک کھانے کا چمچ۔ تیل فرائی کے لیے، کارن فلیکس چُورا کیے ہوئے آدھی پیالی۔

ترکیب: انڈا، میدہ اور کارن فلاور اچھی طرح پھینٹ لیں باقی اشیا بھی شامل کرلیں اب چکن کی بوٹیاں اس آمیزہ میں ڈبو کر کارن فلیکس میں رول کر کے پہلے سے گرم شدہ تیل میں پکوڑوں کی صورت تلتی جائیں...... فرائی کرنے کے بعد خاکی کاغذ پر اتار لیں اور اپنی پسند کے ساس، چٹنی یا کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔ سبزی خور خواتین چکن کے بجائے باریک کٹی شملہ مرچ اور کرم کلہ (بند گوبھی) کے پکوڑے بھی اسی طرح بنا سکتی ہیں۔

مرسلہ: نفیسہ آرا، راس الخیمہ

راجماں (لال لوبیے کا سالن)

اشیا: لال لوبیا، آدھا کلو (18 گھنٹے بھگونے کے بعد نمک ڈال کر ابال لیں)۔ ٹماٹر، چار عدد۔ پیاز درمیانی، تین عدد (چوپ کرلیں)۔ لہسن، ادرک پیسٹ، ایک، ایک چائے کا چمچ۔ ہلدی، ایک چائے کا ہموار چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ کُٹی سرخ مرچ، حسبِ ضرورت۔ ہری مرچ، ہرا دھنیا، سجاوٹ کے لیے۔ تیل، حسبِ ضرورت۔ سفید زیرہ پسا ہوا، ایک چائے کا چمچ۔

ترکیب: دیگچی میں چوپ کی ہوئی پیاز گولڈن فرائی کریں پھر ٹماٹر ڈال کر لہسن، ادرک بھی ڈال دیں اور دس منٹ بعد بقیہ مسالا بھی شامل کریں اور اچھی طرح یکجان کرلیں۔ اب اس میں ابلے ہوئے لوبیا ڈال دیں (یقین کرلیں کہ لوبیا اچھے گلے ہونے چاہئیں) جب اچھی طرح پک جائے اور آمیزہ تیل چھوڑنے لگے تو پانی کا چھینٹا ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ یہ سالن لعاب پر ہوگا یعنی پتلا شوربا ہرگز نہیں گاڑھا، گاڑھا سالن ہوگا۔ ڈش میں نکال کر پسا زیرہ چھڑکیں اور ہری مرچ، ہرا دھنیا باریک کاٹ کر ڈال دیں۔ یہ ابلے چاولوں کے ساتھ بھی بہت

مزید اچھا لگتا ہے۔

مرسلہ: کلثوم عباس، کراچی

اسٹرابیری کا یوگرٹ شیک

اشیا: دہی، ایک کپ۔ دودھ، ایک کپ۔ اسٹرابیریز، آٹھ عدد۔ چینی، تین...... کھانے کے چمچ۔ برف چورا کی ہوئی حسبِ پسند۔

ترکیب: بلینڈر میں دہی، اسٹرابیریز، دودھ، چینی اور برف ڈال کر بلینڈ کرلیں۔ لیجیے اسٹرابیری کا یوگرٹ شیک تیار ہے۔ چند تازہ اسٹرابیریز اوپر سے ڈال کر مہمانوں کو پیش کریں اور خود بھی کھائیں۔

مرسلہ: حنا کاشف، حیدرآباد

سوکھی خوبانی کا میٹھا

اشیا: خشک خوبانی، ایک کلو۔ فریش کریم، تین پیکٹ۔ شکر پسی ہوئی، آدھا پیالی۔ بادام، بیس عدد۔ (باریک کاٹ لیں)

ترکیب: خوبانی خوب اچھی طرح دھو کر ایک لیٹر پانی میں ابال لیں جب نرم ہو جائیں تو ٹھنڈا کر کے بادام نکال کر خوبانی کو میش کر کے پیسٹ بنالیں۔ پیکٹ کی کریم چینی کے ساتھ خوب اچھی طرح پھینٹ لیں۔ خوبانی کا پیسٹ ڈش میں ڈال کر فریج میں ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ جب ٹھنڈا ہو جائے تو سرو کرتے وقت کریم ڈال کر اور باریک بادام کاٹ کر اوپر سے سجا دیں۔ کچھ لوگ گاڑھا گاڑھا کسٹرڈ بنا کر اس کی ایک تہ بھی لگاتے ہیں۔

مرسلہ: کوثر خورشید، یو کے

سبزیوں سے شریانیں صحت مند

آئیے قارئین مختلف کھانوں کے ساتھ ساتھ اجزا کی افادیت بھی جانتے ہیں جو بے حد ضروری ہے۔ پالک اور کاہو (lettuce) جیسی سبزیوں میں موجود نائٹریٹس سے شریانیں کھلی اور صحت مند رہتی ہیں۔ تحقیق اور مطالعے سے یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ سبزیوں اور پھلوں کے استعمال سے بلڈ پریشر کم ہو جاتا ہے۔

قدرت نے سبزیوں کے ذریعے سے بلڈ پریشر کو کنٹرول کرنے کا سامان فراہم کیا ہے۔

اسٹرابیری

جدید طبی تحقیقات کے مطابق اسٹرابیری کا روزانہ استعمال انسانی جسم کی قوتِ مدافعت بڑھانے اور صحت مند رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس میں حیاتین ج کی وافر مقدار پائی جاتی ہے، جس سے قوتِ مدافعت مضبوط ہوتی ہے۔ اسٹرابیری میں موجود مختلف حیاتین، معدنیات اور زود ہضم ریشے جلد کی شادابی، خلیوں اور مدافعتی نظام کی بہتری کے ساتھ ساتھ دل اور سرطان کے امراض کی شدت کم کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

اسٹرابیری جوڑوں کے درد کے مرض میں فائدے مند ہے۔ امراضِ چشم میں انتہائی مفید ہے، بینائی کے نقائص، بصری اعصاب کی تقویت اور آنکھوں کے تعدیے کے روکنے میں کارآمد ہے۔ اس میں بیس مختلف اجزا مانع پیری (اینٹی ایجنگ) پائے جاتے ہیں، جس کے باعث یہ جھریوں اور بڑھاپے میں موجود فائیو کیمیکلز کولیسٹرول کی سطح کو نارمل رکھتے ہیں جبکہ یہ پوٹاشیم اور میگنیزیم کی بدولت ہائی بلڈ پریشر میں فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔

اسٹرابیری کھانے سے پیاس کم لگتی ہے، اسٹرابیری کا استعمال چہرے کی رنگت میں نکھار کے علاوہ مہاسوں اور چھائیوں کو دور کر کے چہرے کو خوب صورت بھی بناتا ہے۔

☆☆☆

سندیسے

پاکیزہ

بہنیں



کامیابی کی تلاش

ہم پھرتے ہیں عمر بھر
کامیابی کی تلاش میں
لیکن......!
اس وقت نہ جانے
ہوتے ہیں کہاں؟
جب دن میں پانچ مرتبہ
پکارا جاتا ہے ہم کو
حی الا الفلاح......حی الا الفلاح

مرسلہ: لاریب، ماہ زیب، چونیاں ضلع قصور

خوشبو

ابرِ بہار نے پھول کا چہرہ
اپنے بنفشی ہاتھ میں لے کر
ایسے چوما کہ
پھول کے سارے دکھ
خوشبو بن کر
بہہ نکلے ہیں

مرسلہ: امینہ عندلیب......سلانوالی

پھول جیسی بات

نہ تم نے
پھول کوئی بھیجا
اور نہ ہی پھول
جیسی بات کی
مجھے حیرت ہے کہ
صرف منگنی کے بعد
تم...اتنے چڑچڑے
کیوں ہوگئے ہو......

شاعرہ: عظمیٰ آفاق

مرسلہ: ناہید بنت نور، واہ سیمنٹ ورکس

مجھ کو

بہت محتاط کاٹا ہے
سفرِ زیست میں نے بھی
زمانے کی ہوا کا رخ دیکھ کر ہی
قدم آگے بڑھائے ہیں
مگر......پھر بھی
نہ جانے کیوں......
قدم ہر موڑ پر ہی لڑکھڑاتے ہیں
زمیں پیروں تلے اکثر
کھنچی محسوس ہوئی مجھ کو

شاعرہ: زمر نعیم، لاہور

دوست جان بانو کے نام

محبت ایسا نغمہ ہے
ذرا بھی جھول ہوئے میں
تو سُر قائم نہیں رہتا
محبت ایسا شعلہ ہے
ہوا جیسی بھی چلتی ہو
کبھی مدھم نہیں ہوتا
محبت ایسا رشتہ ہے
کہ جس میں بندھنے والوں کے
دلوں میں غم نہیں ہوتا
محبت ایسا پودا ہے
جو تب بھی سبز رہتا ہے
کہ جب موسم نہیں ہوتا
محبت ایسا رشتہ ہے
اگر پیروں میں لرزش ہو
تو یہ محرم نہیں ہوتا
محبت ایسا دریا ہوتا ہے
کہ بارش روٹھ بھی جائے
تو پانی کم نہیں ہوتا

شاعر: امجد اسلام امجد

مرسلہ: صائمہ سجاد بخش، کوہاٹ

احساسِ بہار

آؤ
دل کی
بنجر زمین پر
اس کی یادوں کے
مہکتے گلاب کھلا کر
اس گلشن کی
ویرانی کو
ختم کریں

مرسلہ: فصیحہ آصف خان، ملتان

پیارے شوہر کے نام

تجھے میں اس لیے آنکھوں سے اوجھل کر نہیں سکتی
کہ کھو جائے تو بینائی بڑی مشکل سے آتی ہے

مرسلہ: ثنا مرتضیٰ، کراچی

بنامِ صنم

ستم کرتے ہیں لیکن ہے عجب طرزِ ستم
ٹپکتی ہے نگاہِ ناز سے شانِ کرم ان کی

مرسلہ: سائرہ اصغر، لاہور

بہت سُندر نمرہ احمد کے نام

آپ میرے خیالوں میں ہیں
پھولوں کی طرح، نغموں کی طرح
آپ کے انداز ہیں
جھرنوں کی طرح
سدا سلامت رہیں، سنگ ہمارے
یہی دعا ہے آپ کے لیے اپنوں کی طرح
دلی خلوص کے ساتھ آپ کی مداح
ثوبیہ ظہور، ضلع اٹک

قیصرہ حیات کے نام

یہ خواب ہے خوشبو ہے کہ جھونکا ہے کہ پل ہے
یہ دھند ہے بادل ہے کہ سایہ ہے کہ تم ہو
تم سلامت رہو ہمارے لیے ......تمہاری تحریریں ہوں صرف پاکیزہ کے لیے۔

دعاؤں بھرا تحفہ
نگہت آصف، اسلام آباد کی طرف سے

میری پیاری سہیلی نفیسہ آرا کے نام

قدم قدم پہ ابھرتے تھے روشنی کے بھنور
نہ جانے کون اندھیروں میں میرے ساتھ رہا
میری ہم دم، میری ہم راز، میری پیاری سہیلی کے نام خوشیوں بھری آرزو کا تحفہ۔

ازطرف: کوثر خورشید، یوکے

الفاظ کی جادوگر، خیالات کی ملکہ پیاری سائرہ رضا

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار
خلوصِ نیت کے ساتھ
عزت فاطمہ، کراچی

☆☆☆

روحانی مشورے

ادارہ



ڈپریشن سے بچاؤ

آج کل جوانوں اور بوڑھوں میں ڈپریشن کی بیماری خوب پھیل رہی ہے۔ دراصل انتہائی مایوسی کی صورتِ حال ڈپریشن کی صورت اختیار کرلیتی ہے اس کے بے شمار عوامل ہیں...... اس میں ایک مذہب سے دوری اور بے یقینی بھی ہے...... ایسے لوگ جو کسی پر بھی اعتبار نہیں کیا کرتے...... حد یہ کہ انہیں اپنے آپ پر بھی بھروسا نہیں ہوا کرتا...... اور اندھا دھند مادیت پرستی بھی اس کا بڑا سبب ہے...... وہ ڈپریشن کا شکار ہوجاتے ہیں، اس مرض سے نجات کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ نہ صرف پانچوں وقت کی نماز پڑھیں بلکہ دو رکعت نفل شکرانے کے بھی روزانہ ادا کریں۔ اگر آپ کو شوگر کا مرض لاحق نہیں ہے تو صبح نہار منہ اور رات کو سوتے وقت ایک چمچ شہد پر سورۂ فاتحہ اور درودِ ابراہیمی گیارہ، گیارہ بار دم کر کے کھائیں۔ سارا دن جو پانی استعمال کریں سورۂ فاتحہ دم کر کے پئیں۔ مار دھاڑ والی فلمیں، مخرب الاخلاق لٹریچر سے ہر ممکن بچیں فارغ اوقات میں یاحی یاقیوم کثرت سے پڑھیں اور صبح سویرے چڑیوں کو باجرہ خود ڈالیں۔ اور دیکھیں کس طرح پرندے ہر دانہ کھا کر...... آسمان کی طرف نظر اٹھا کر اللہ کا شکر ادا کیا کرتے ہیں۔ انشاء اللہ...... بہت جلد آپ کو اس بیماری سے نجات ملے گی اور دل میں جینے کی امنگ بیدار ہوگی۔

پڑھنے سے بیزاری

ہماری بہت سی ماؤں کو یہ شکایت عام ہے کہ ان کے بچے ہر کام شوق سے کرتے ہیں سوائے پڑھائی کے...... اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہی بچے پڑھائی سے بھاگتے ہیں جو پڑھنے میں کمزور ہوتے ہیں۔ بچے اگر اسکول جانے میں بہانے کرتے ہیں تو ماؤں کو ان کے اسکول وقتاً فوقتاً جاتے رہنا چاہیے اور ان کی تعلیمی حالت معلوم کرتی رہنی چاہیے اور اگر بچہ وہاں کسی وجہ سے پریشان رہتا ہے تو اس کا تدارک بھی کرنا چاہیے۔ اکثر بچے اسکول کے بعد آگے پڑھنے سے بے پروا ہوجاتے ہیں اور کالج جانا ضروری نہیں سمجھتے یا ذوق شوق سے نہیں پڑھتے ان کی دلچسپیاں دوسری چیزوں میں بڑھ جاتی ہیں تو ایسے بچوں کی بہت زیادہ تعریف کرنی چاہیے کہ ہمارا بچہ تو ماشاءاللہ...... خوب پڑھ کر اونچا مقام حاصل کرے گا۔ اس کا نہ کبھی مذاق اڑائیں اور نہ ہی اس کے بارے میں کم تر خیالات کا اظہار کریں۔ سورۂ فاتحہ کا دم کیا ہوا پانی پلائیں اور جب وہ سوجائے تو اس پر تین بار سورۂ کوثر اور سورۂ نصر پڑھ کر دم کریں۔ عمل کی مدت تین ماہ ہے، فجر کے وقت سے کچھ پہلے بچے کے ماتھے پر یا شہید 21 بار پڑھ کر دم کریں اتنی بلند آواز کہ بچہ نہ جاگ جائے۔

بیٹی کے سسرال والے سخت ہیں

ہر ماں یہ چاہتی ہے کہ جب اس کی بیٹی شادی ہوکر اپنی سسرال جائے تو وہ وہاں راج کرے...... مگر حقیقت میں ایسا کم ہی ہوتا ہے اور آج بھی ہمارے بہت سارے گھرانوں میں سسرال کے لوگ ظالم بن کر رہنا پسند کرتے ہیں اور ان کے ہاں بہو کا تصور سوائے نوکرانی کے کچھ نہیں ہوا کرتا...... اگر ایسے گھرانوں میں آپ نے اپنی بیٹیاں بیاہی ہیں تو

...... رات کو سونے سے پہلے نہ صرف چاروں قل اور آیت الکرسی پڑھنا اپنی عادت بنالیں بلکہ سورۂ انعام کی آیت نمبر 165 اول آخر درود شریف کے ساتھ 41 مرتبہ روزانہ پڑھ کر حالات کی بہتری کی دعا مانگیں۔ اس کے پڑھنے سے سخت دل یقیناً نرم ہوجائیں گے، انشاء اللہ۔

دکان نہیں چلتی

بارہا آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ ایک ہی لائن میں دکانیں ہیں اور چند دکانیں ان میں بہت چلتی ہیں اور بعض بالکل نہیں چلتیں۔ آپ جب اپنی دکان میں داخل ہوں...... بسم اللہ پڑھ کر یارزاق کی ایک تسبیح پڑھیں۔ دکان میں داخل ہونے والے ہر سائل کے ہاتھ میں کچھ نہ کچھ ضرور رکھیں۔ ہر جمعرات کو عصر اور مغرب کے دوران لوبان کی دھونی دیں...... اور روزانہ کی آمدنی سے کچھ روپے بطور صدقہ بھی ضرور دیں۔ انشاء اللہ وہ دکانیں بھی منافع دینے لگیں گی...... جن پر گاہک قدم نہیں رکھا کرتے۔

سانس کا مرض

موسم جب تبدیل ہوتا ہے تو دمہ یا سانس کا مرض بڑھ جاتا ہے۔ ایسے میں سانس پھولتی ہے اور سینے پر بلغم جما رہتا ہے اور بعض اوقات سانس لینے میں تکلیف بھی بہت ہوتی ہے۔ ایسے تمام مریضوں کو میں مسواک استعمال کرنے کا مشورہ دوں گی جو لوگ مسواک استعمال کرتے ہیں ان کے سینے پر کبھی بلغم نہیں رہتا۔ کھانسی اور بلغم سے نجات کا ایک آسان نسخہ یہ ہے کہ تھوڑی سی ادرک گرائنڈر میں پیس لیں پھر اسے ململ کے کپڑے میں چھان کر اس کا رس نکالیں، یہ رس ایک بڑے چمچ میں ایک چمچ نیم گرم شہد میں ملا کر رات کو سونے سے پہلے پئیں۔ ہر وقت چلتے پھرتے یا اللہ یا رحمٰن یا رحیم کثرت سے پڑھیں۔

شادی نہیں ہوتی

خوب سے خوب تر کی تلاش نے شادی کا مسئلہ مشکل بنادیا ہے۔ اب یہ خواہش کرنا کہ لڑکا ایسا ہو جو ماہانہ ایک لاکھ کمائے۔ خاصی مشکل بات ہے...... ہم لوگ اچھے اخلاق، شرافت، دیانت داری، حلال روزی کے بجائے ظاہرداری اور شو بازی کے دیگر عوامل سے زیادہ مرعوب اور متاثر ہوجاتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ اگر آج یہ کم بھی کمائے گا تو کل زیادہ کمائے گا...... لڑکے اور اس کے خاندان کا نیک، بااخلاق اور دیندار ہونا سب سے بڑی خوبیاں ہوتی ہیں۔ اپنے بچوں کی اچھی جگہ شادی کے لیے دو رکعت نمازِ حاجت پڑھیں مغرب کے بعد 313 مرتبہ یالطیف پڑھیں۔ عمل کی مدت تین ماہ ہے...... انشاء اللہ آپ کے بیٹے یا بیٹی کی جلد شادی ہوگی مگر نماز کی عادت اور درود شریف پڑھنا کبھی ختم نہ کریں کہ اس کے طفیل ہمیں دونوں جہانوں کی خوشیاں ملیں گی، انشاء اللہ۔

دانتوں کے مسائل

اکثر لوگوں کے دانتوں کے مسائل مستقل چلتے رہتے ہیں۔ کبھی کچھ کبھی کچھ اور بعض لوگوں کے مضبوط دانت بھی ہلنے لگتے ہیں۔ اس کا سب سے بہتر علاج تو یہ ہے کہ آپ باقاعدگی سے مسواک کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ جب آپ عشا کی نماز میں وتر پڑھیں تو یہ اس طریقے سے پڑھیں جیسا کہ امام اہل سنت احمد رضا خان رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ”جس کے دانتوں میں درد ہو تو وہ وتر کی پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورہ نصر پڑھے (یعنی اذا جاء نصر اللہ) اور دوسری رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ لہب پڑھے (یعنی **تبت یدا ابی لھب وتب**) اور تیسری رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ اخلاص پڑھے...... (یعنی **قل ھو اللہ**) جس نے ایسا عمل کیا تو انشاء اللہ اس کے دانت اتنے مضبوط ہوجائیں گے کہ اگر سو سال زندہ رہا تو گنا چبا سکے گا۔

☆☆☆

شوابے ہومیو کلینک

SCHWABE



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں' پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

منہ سے بدبو و خون

وسیم حیدر...... ضلع جھنگ

سوال: میری عمر 25 سال ہے اور شادی شدہ ہوں۔ ایک بچے کا باپ بھی ہوں لیکن اب مردانہ کمزوری ہوگئی ہے، کمر اور ٹانگوں میں درد ہوتا ہے اور بہت دبلا پتلا سا ہوگیا

ہوں، ہڈیاں نظر آتی ہیں، آنکھیں اندر چلی گئی ہیں' منہ سے بدبو بھی آتی ہے اور کبھی کبھی خون آتا ہے۔

جواب: مردانہ کمزوری کیا ہے، کیا آپ جانتے ہیں جس کمزوری کا آپ نے لکھا ہے وہ جسمانی کمزوری ہے۔ منہ میں بدبو اور خون آنا مسوڑھوں کی خرابی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ناشتے اور کھانے کے بعد اور رات کو سونے سے پہلے برش نہیں کرتے۔ لہٰذا ہر کھانے کے بعد برش کرنے کی عادت ڈالیں۔ متوازن غذا کھائیں اور ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔

Alfalfa Q کے دس قطرے 1/2 گلاس پانی میں ہر کھانے کے ایک گھنٹے بعد Calendula30 Merc.Sol 6 ...... کے 5.5 قطرے 1/2 کپ پانی ڈال کر دن میں 3 مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

ٹانسلز بیماری کی جڑ

زاہدہ بٹ...... لاہور

سوال: میرے بیٹے کی عمر 14 سال چھ مہینے ہے



مگر اس کا قد اپنی کلاس کے ہم عمر بچوں سے کم ہے اور صحت بھی کمزور ہے اُس کے گلے میں اکثر ٹانسلز کا مسئلہ بھی رہتا ہے۔ اُس کی پنڈلیوں اور ٹانگوں میں ساری رات، بہت درد رہتا ہے۔

جواب: آپ کو مسئلہ بیان کرنا چاہیے فرمائش نہیں اس لیے کہ آپ کے بچے کی کمزوری اور قد نہ بڑھنے اور ٹانگوں میں درد کی وجہ صرف ٹانسلز کی خرابی ہے۔ ٹانسلز خراب ہونے کی بنیادی وجہ ہر چیز کھا کر پانی پینا یا کولڈ ڈرنکس کا استعمال یا کچپ ٹھنڈی کھٹی چیزوں کا حد سے زیادہ استعمال ہے۔ بچے کو گھر کے کھانے کی عادت ڈالیں وہ بھی عام سادہ کھانے اور دودھ، دہی کا استعمال کریں۔ ٹانسلز کو خراب ہونے سے بچائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک باقاعدگی کے ساتھ استعمال کرائیں، کمزوری، ٹانسلز اور قد کا مسئلہ حل ہوجائے گا۔

Ferr.Phos 30, Calc. Phos 30, Baryta Carb 30 کے 7.7 قطرے 1/2 کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پلائیں۔

اولاد کا نہ ہونا

آنسہ

سوال: میری عمر 34 سال ہے میری شادی کو آٹھ سال ہوچکے ہیں۔ میرے شوہر کی عمر 36 سال ہے۔ ہمارے ہاں اولاد نہیں ہے۔ میں نے ایک مرتبہ بھی conceive نہیں کیا۔ میرے شوہر نسبتاً دبلے پتلے اور کمزور ہیں۔ کھانے پینے کے معاملے میں بہت بے پروا ہیں۔ سگریٹ اور چائے کا استعمال بہت زیادہ کرتے ہیں۔

میرے شوہر کو ہاتھ کے استعمال کی عادت بہت زیادہ رہی ہے۔ میری اووری polysystic ہے، eggs کم بنتے ہیں۔ مگر جو بنتے ہیں وہ فل سائز اور mature ہوتے ہیں۔ میرے دو ٹیسٹ FSH,LH نارمل ہیں جبکہ prolaction زیادہ ہے۔

جواب: آپ نے اور شوہر نے بہت وقت برباد کردیا ہے' 34 سال عمر بچے پیدا کرنے کے لیے زیادہ مناسب نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں آپ کے شوہر نارمل نہیں ہیں اور نہ آپ۔ دونوں کو مکمل سنجیدگی سے علاج کی ضرورت ہے۔ سادہ متوازن غذا استعمال کریں، پھل اور سبزیوں کا استعمال زیادہ کریں۔ شوہر کے لیے Staphisagria 30 Origanum 30 کے 7 قطرے 1/2 کپ پانی میں اور AvenaSativa Q اور AlfalfaQ کے 10 قطرے 1/2 کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں۔ چائے کم سے کم اور تمباکو کا استعمال بند کردیں تو بہتر ہے۔ آپ نے نہیں لکھا کہ سسٹ آپ کو کب سے ہے کیا دونوں میں ہے یا کسی ایک میں ہے؟ کب سے ہے؟ Calc.Iod 30 اور Pulsatilla 30 کے 5.5 قطرے 1/2 کپ پانی میں 3 ماہ تک استعمال کریں۔ الٹراساؤنڈ کی رپورٹ' سیرم پرولیکٹن کی رپورٹ کے ساتھ ارسال کریں۔ یاد رکھیں ادویات ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی استعمال کریں۔

جنسی رہنمائی کی کمی

موحب علی...... لاہور

سوال: میرا مسئلہ یہ ہے کہ احتلام بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ہفتے میں دو سے تین دفعہ ہوجاتا ہے۔ تقریباً 15 سال سے ہی شروع ہوگیا تھا اور اب دو سال ہوگئے ہیں۔ 14 سال کی عمر سے ہی بری صحبت کی وجہ سے مشت زنی کی عادت پڑگئی تھی۔ لیکن پھر کنٹرول کرلیا اور 2 سال سے ایسا کچھ نہیں کیا لیکن احتلام کی وجہ سے پھر بھی کمزور ہوجاتا ہوں۔ میرا مسئلہ بہت سے نوجوانوں کا بھی مسئلہ ہوگا۔ اگر صبح ناشتے میں انڈا کھالوں یا سونے سے آدھا گھنٹا پہلے پانی پی لوں تو پھر بھی احتلام ہوجاتا ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔

جواب: یہ یقیناً ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ کوئی شخص کوئی غلط کام کرے تو اس کو برا کہنے میں تو

سبقت لے جانے میں پیچھے نہیں رہتے؟ تحقیق نہیں کرتے کہ اس نے یہ غلط کام کیوں کیا؟ محرکات و وجوہات کو بالکل نہیں دیکھتے۔ طرح معاشرے میں برائی ختم نہیں ہوتی بلکہ برائی بڑھتی جارہی ہے اور وہ شخص بد سے بدتر ہی ہوجاتا ہے۔ ہمارا قومی اثاثہ ہمارے بچے اور نوجوان ہیں ان ہی نے مستقبل کی ذمے داریوں کو سنبھالنا ہے جس کے لیے ان کو تیار کرنا اور ان کی صحیح رہنمائی کرنا ہم سب کا فرض اولین ہے۔ زندگی کے سات مختلف فیز ہوتے ہیں شیر خوار، بچپن، لڑکپن، نوجوانی، جوان، ادھیڑ عمر، بڑھاپا۔ لڑکپن اور نوجوانی میں نوجوانوں میں ذہنی وجسمانی تبدیلیاں ہوتی ہیں یقیناً یہ لڑکے و لڑکیوں دونوں میں ہوتی ہیں۔ ان تبدیلیوں میں نوجوان انتشار کا شکار ہوتے ہیں۔ صحیح رہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے دوستوں سے انٹرنیٹ، موبائل کارڈ کے ذریعے نوجوان بہت ساری مختلف غلط عادتوں، حرکتوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ جس سے جسمانی ونفسیاتی مسائل کے ساتھ معاشرتی اور معاشی مسائل بھی جنم لیتے ہیں۔ اپنی زندگی کا مقصد متعین کریں کہ پڑھ لکھ کر آپ نے کیا بننا ہے، ملک وقوم اور اپنے ماں باپ کی خدمت کس طرح کرنی ہے۔ جنسی جذبات ایک کھانے کی طرح ہے کہ جب بھوک لگتی ہے تو کھاتے ہیں اور جب پیٹ بھر جاتا ہے تو پھر اس کھانے کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے، جنسی لذت کا بھی ایک وقت ہے اور وہ بہترین وقت وہ ہے جب آپ کی شادی ہوگی اور بحیثیت میاں بیوی کے اس لذت سے آشنا ہوں گے تو باعث اجر ثواب وصحت ہے بصورت دیگر گناہ واجب السزا اور بیماری آتشک سفلس ایڈز وغیرہ۔ اپنے گناہوں پر اللہ سے توبہ کریں، اچھے لوگوں کی صحبت اختیار کریں نماز کی پابندی کریں قرآن وحدیث کا مطالعہ کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 2 ماہ تک استعمال کریں Nat.Pho30, Dioscorea30 کے 5 قطرے 1/2 کپ پانی میں 3 مرتبہ اور Alfalfa Q کے 10 قطرے 1/2 گلاس پانی میں 3 مرتبہ لیں۔

پیشاب کی زیادتی

شہناز ناہید...... لاہور

سوال: میں آپ کا کالم بہت شوق سے پڑھتی ہوں میں اپنی امی کا مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں میری امی کی عمر تقریباً 82 سال ہے۔ انہیں پیشاب کی تکلیف ہے انہیں دن میں بہت زیادہ پیشاب آتا ہے اور رات کو بھی انہیں پانچ یا چھ دفعہ پیشاب آتا ہے۔

جواب: محترمہ بہتر یہی ہے کہ کسی معالج سے رابطہ کرکے ان کو پیشاب کی زیادتی کے متعلق بتائیں، کیونکہ یہ دواؤں کی وجہ سے بھی ہوتا ہے- Urine D/R کی رپورٹ کرائیں کہ کوئی انفیکشن تو نہیں ہے۔ عورتوں میں ایک اور وجہ رحم کا ٹلنا بھی ہوتا ہے لہٰذا مناسب تشخیص کے بعد ہی صحیح علاج تجویز کیا جاسکتا ہے۔

وزن کی زیادتی

کائنات

سوال: میری شادی کو چھ سال ہوگئے ہیں۔ میرے تین بچے بھی ہیں۔ میں گھر کا ہلکا پھلکا کام بھی کرتی ہوں اور مجھے پیریڈ بھی وقت پر ہوتے ہیں لیکن میرا وزن 75 کلو ہے اور میرا قد 5 فٹ 3 انچ ہے۔ میں اپنا وزن کم کرنا چاہتی ہوں۔

جواب: مرغن اور میٹھا بند کردیں پراٹھے بھی استعمال نہ کریں، کچی سبزیاں اُبال کر استعمال کریں۔ مچھلی گرل یا سکی ہوئی استعمال کریں۔ 2 گھنٹے کی واک کریں یا کوئی کھیل بھاگنے دوڑنے کا کھیلیں، جھاڑو پونچھے کا کام خود کیا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں Calc. Carb 200 ہر ہفتہ ایک خوراک 5 قطرے آدھا کپ پانی میں لیں۔ Phytolacca e baccisQ 10 کے 10 قطرے 1/2 گلاس پانی میں ہر کھانے سے پہلے

استعمال کریں۔ ایک ماہ بعد دوبارہ کیفیت بتائیں۔

چکروں کا مسئلہ

محمد ایوب خان...... راولپنڈی

سوال: میرے بائیں کان سے سائیں سائیں کی آوازیں آتی ہیں، کبھی کبھی سر میں چکر بھی آتے ہیں، اُلٹی متلی ہوتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ میرا کان بند ہے، ناک کا ایک نتھنا کبھی کبھی بند ہوجاتا ہے۔ میرے پاؤں کے پٹھوں میں اکڑاہٹ ہوتی ہے سیدھا چلنے میں دشواری ہوتی ہے۔ اچانک چکروں کی وجہ سے ڈیوٹی پر جاتے ہوئے پریشان ہوجاتا ہوں۔

جواب: ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Calc.Carb30 , 30 Gelsemium 30، Pulsatilla30 , Kali.mur 30 کے 5.5 قطرے 1/2 گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ ایک ماہ تک استعمال کریں۔ کھٹی و ٹھنڈی چیزوں سے پرہیز کریں اور ٹھنڈ سے بچیں۔

بریسٹ میں درد

ن ع...... کراچی

سوال: تقریباً چار سال پہلے زیر جامہ تنگ پہننے کی وجہ سے بریسٹ میں درد ہوا تھا۔ پھر اس کے بعد سے مسلسل ہلکا ہلکا درد ہوتا ہے (الحمدللہ گلٹی نہیں ہے) ماہواری سے قبل و بعد درد زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ ماہواری کے قبل و بعد لیکوریا بھی آتا ہے (انڈے کی سفیدی کی طرح لیس دار آتا ہے)

جواب: U/S Breast کرائیں تاکہ کنفرم ہو کہ مسئلہ کیا ہے۔ چار سال سے درد ہے ایسا ہونا نہیں چاہیے یا پھر آ کر ملیں۔ آپ کی چچازاد بہن کس کے کہنے پر ان ادویات کا استعمال کررہی ہیں؟

مرض جمع کرنے کے لیے نہیں ہوتے

سوال: میری عمر 36 سال ہے دو بیٹے ہیں عمر بالترتیب 16.18 سال ہے۔ 20 سال پہلے ٹائیفائیڈ کا اثر پھیپھڑوں پہ ہوگیا تھا۔ کافی علاج کروایا وقتی طور پہ



ٹھیک ہوجاتی ہوں مگر پھر سے دائیں سائیڈ پہ درد شروع ہوجاتا ہے، کھانسی آتی ہے، گلے میں ہر وقت بلغم رہتا ہے سینے پر بوجھ محسوس ہوتا ہے، دھوئیں اور گرد سے سانس بند ہونے لگتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر وقت سینے میں جلن رہتی ہے۔ حلق مرچوں سے بھرا رہتا ہے اور لوز موشن ہر وقت رہتے ہیں۔ چیسٹ کے نیچے سوزش بھی ہے۔ پیٹ بھی پھول رہا ہے۔ اس کے علاوہ تین سال سے مینسز پرابلم بھی ہے بلیڈنگ بہت کم ہوتی ہے لگی ...... کبھی ڈیڑھ تو کبھی 2 ماہ بعد وہ بھی برائے نام بلیڈنگ ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے منہ پہ موٹے موٹے بال نکل آئے ہیں اور منہ چھائیوں سے بھر گیا ہے۔ صبح اٹھنے پہ جسم سن ہوتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ نارمل کنڈیشن میں آتا ہے۔ جسم کے کسی نہ کسی حصے میں وقفے وقفے سے بل آتے رہتے ہیں جو کہ 10 سے 15 منٹ میں ٹھیک ہوجاتے ہیں۔

جواب: x.Ray chest PA U/S whole Abdomen کرا کر رپورٹ بھیجیں اس دوران Nat.Phos30,Calc.Phos30 (ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی) کے 5.5 قطرے 1/2 کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔

منہ سے بدبو پانی

نمرہ کریم...... لاہور

سوال: میرا مسئلہ دانتوں اور مسوڑھوں سے متعلق تھا۔ میرے مسوڑھوں سے خون رستا تھا جس کے لیے آپ کی تجویز کردہ دوا Calendula سے ہر کھانے کے بعد کلیاں کرتی ہوں جس سے الحمدللہ یہ مسئلہ حل ہوچکا ہے۔ اب مسوڑھوں سے خون نہیں رستا اگرچہ میں دانتوں کی صفائی صبح وشام کرتی ہوں لیکن پھر بھی بدبو آتی ہے۔ سونے کے بعد اکثر منہ سے گندہ پانی نکلتا ہے۔ دانتوں پر پیلا مواد بھی جم جاتا ہے۔

جواب: Merc.sol 6 اور Fragaria

3 مرتبہ استعمال کریں۔ یاد رکھیں یہ ادویات ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی ہوں۔

قد کا مسئلہ

حمیرا نسیم ...... نصرتی گاؤں

سوال: میرے کئی مسئلے ہیں۔ سب سے پہلا مسئلہ قد کا ہے۔ میری عمر انیس سال ہے اور میرا قد 4 فٹ 7 انچ ہے۔ میں چاہتی ہوں میرا قد اور بڑھ جائے۔ دوسرا مسئلہ غیر ضروری بال ختم کرنے کے لیے کوئی دوا بتائیں۔ تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے ریح بہت زیادہ آتے ہیں جس کی وجہ سے بہت شرمندگی ہوتی ہے روکنے پہ پیٹ میں درد رہتا ہے۔

جواب: 2/4 ماہ میں قد نہیں بڑھتا اور انیس سال کی عمر میں قد بڑھنے کے چانسز مزید کم ہو جاتے ہیں۔ خاندان کے اثرات بھی ہوتے ہیں۔ غیر ضروری بال چہرے اور گردن کے لیے Calc Phos 30 اور Oleum jec6 کے 5.5 قطرے 1/2 کپ پانی میں استعمال کریں دن میں 3 مرتبہ۔ Carbo.veg 30 کے 5 قطرے 1/2 کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی ادویات تمام بڑے شہروں میں دستیاب ہیں۔

دمہ کا مرض

زیتون بی بی ...... بھاولپور

مسئلہ نمبر 1: میں دمہ کی مریض ہوں اس بیماری کو دس سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ سانس کی نالیوں میں ریشہ رہتا ہے، جو خوراک کھاتی ہوں بلغم بن جاتا ہے۔ ... میں کمزور ہوں خون بنتا ہی نہیں۔ میرا پیٹ جسم کی نسبت بڑا لگتا ہے۔

جواب: ٹھنڈی کھٹی چیزوں سے پرہیز کریں۔ سادہ غذا کھائیں پھل سبزیوں اور دالوں کا استعمال زیادہ کریں۔ بکرا اور گائے کا گوشت استعمال کیا کریں۔ واک کیا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ calc carb 200 کی ایک خوراک ہر ہفتے لیں اور روزانہ 3 مرتبہ Arsenic Alb 30, Antimonium Tart 30 کے 5.5 قطرے 1/2 کپ پانی میں ڈال کر لیں۔

پیٹ و ذہنی مسئلہ

مسز امین ...... ملتان

سوال: ڈاکٹر صاحب میرے بھائی کی عمر 17 سال ہے۔ اکثر اس کے پیٹ میں درد اور قبض رہتا ہے اور کھاتا بھی کچھ خاص نہیں ہے۔ طبیعت میں غصہ اور چڑچڑاپن ہے۔ رنگ بھی تھوڑا سانولا ہے۔ پلیز ان سب مسئلوں کے لیے کوئی اچھی سی دوا بتا دیں۔ اللہ آپ کو اجرِ عظیم دے (آمین)

جواب: شکایت کب سے ہے؟ قبض کیسا ہے؟ کھانا جب پورے طور پر نہیں کھائے گا تو غصہ اور چڑچڑاپن تو ہو گا۔ رنگ اور جسمانی نشوونما پر بھی اثر پڑے گا۔ ہمیں لگتا ہے اکلوتا اور لاڈلا ہے۔ 17 سال عمر میں بچہ بھی جوان ہو جاتا ہے۔ اس کو کوئی ذہنی پریشانی بھی ہو سکتی ہے۔ حالت تفصیل سے لکھیں۔ ایک ماہ تک Chelidonium 30 کے 5.5 قطرے 1/2 کپ پانی میں ڈال کر استعمال کرائیں ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کے۔

☆☆☆